

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرون ملک مقیم ہیں
مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں۔



منجانب۔

سبیل سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان



۷۸۶
۹۷۱۱۶

پاسحب الزمان اردنی



لیک یا حسین

نقد و تحریف
نقد و تحریف

اسلامی کتب (اردو) DVD

ڈیجیٹل اسلامی لائبریری

SABIL-E-SAKINA

United,

Karachi, Hyderabad

Sindh, Pakistan

www.sabeelsakinah.com

sabeelsakinah@gmail.com

NOT FOR COMMERCIAL

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرون ملک مقیم ہیں
مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں۔

منجانب۔

سبیل سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

زیر نظر
اُستاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیر نمونہ جلد ۲

ترجمہ

حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفیؒ

زیر سرپرستی

حضرت آیت اللہ العظمیٰ الحاج سید علی رضا سید تانی مدظلہ





فہرست

۲۹	آیت ۱۹۸، ۱۹۹	سورۃ بقرہ
۲۹	موسم حج میں اقتصادی کارکردگی	آیت ۱۸۸
۲۱	عرفات کو عرفات کیوں کہتے ہیں	رشتہ خدی — ایک محبت
۲۲	آیت ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲	آیت ۱۸۹
۲۶	آیت ۲۰۳	شان نزول
۴۶	آیت ۲۰۳، ۲۰۵، ۲۰۶	طبعی اور فطری میزان اور پیمانے
۴۶	شان نزول	آیت ۱۹۰
۴۹	آیت ۲۰۷	شان نزول
۴۹	شان نزول	جنگ کیوں اور کس سے
۵۲	آیت ۲۰۸، ۲۰۹	آیت ۱۹۱، ۱۹۲
	عالمی صلح و آشتی صرف ایمان کے	آیت ۱۹۳
۵۲	سانے میں ممکن ہے۔	۱۔ ابتدائی جہاد آزادی
۵۳	آیت ۲۱۰	۲۔ دفاعی جہاد
۵۵	آیت ۲۱۱	۳۔ مشرک و بت پرستی کے خلاف جہاد
۵۵	آیت ۲۱۲	مردن میں جہاد کا حکم کیوں دیا گیا
۵۶	شان نزول	فتنہ کا قرآنی مفہوم
۵۷	آیت ۲۱۳	آیت ۱۹۴
۶۰	آیت ۲۱۴	آیت ۱۹۵
	شان نزول	خرچ کرنا معاشرے کو ہلاکت سے بچانا ہے
۶۰	سخت حوادثِ خدائی سنت ہیں	آیت ۲۱۶
۶۱	آیت ۲۱۵	عمرہ اور حج کے اعمال
۶۲	شان نزول	آیت ۱۹۷



۴۹	مشرکین کو ان میں	۶۲	آیت ۲۱۶
۸۰	آیت ۲۲۲ ، ۲۲۳	۶۲	آیت ۲۱۸ ، ۲۱۷
۸۱	شان نزول	۶۵	شان نزول
۸۲	بہاری میں جنسی عاپ کے نقصانات	۶۶	حبط ، اجباط اور تکفیر
۸۲	جنسی عاپ کی اجازت	۶۶	کیا حبط صحیح ہے؟
۸۶	نوع بشر کی حفاظت کا ذریعہ	۶۷	عقلی استدلال
۸۶	آیت ۲۲۲ ، ۲۲۳	۶۷	نقلی استدلال
۸۶	شان نزول	۶۸	آیت ۲۱۹
۸۸	نہیں — جو قابل اعتبار ہیں	۶۹	شان نزول
۸۸	آیت ۲۲۶ ، ۲۲۷	۶۹	اشعر کیا ہے
۸۹	زمانہ جاہلیت کے ایک طرز عمل کا خاتمہ	۶۹	اکھل کے مشروبات کے نقصانات
۹۰	علم اسوم اور دنیا کے مزب کا ایک تقابلی	۷۰	اکھل کا انسانی عمر پر اثر
۹۰	آیت ۲۲۸	۷۰	نسل انسانی میں شراب کا اثر
۹۱	”قروہ“ سے کیا مراد ہے	۷۰	اخلاق پر شراب کے اثرات
۹۲	عدت — صلح اور بازگشت کا ذریعہ ہے	۷۰	شراب کے اجتماعی نقصانات
۹۲	عدت — حفاظت نسل کا ذریعہ ہے	۷۰	شراب کے اقتصادی نقصانات
۹۲	حقوق اور فرائض	۷۱	قمار بازی کے بُرے اثرات
۹۵	عورت اور اس کے حقوق کی تجدید	۷۱	قمار بازی پر بیان انگریزی کا بہت بڑا ذریعہ
۹۵	عورت کی زندگی میں نیا مرحلہ	۷۲	قمار بازی کا جرائم سے تعلق
۹۷	مسادات کے مفہوم میں اشتباہ زد ہو	۷۲	قمار بازی کے اقتصادی نقصانات
۹۸	آیت ۲۲۹	۷۳	قمار بازی کے اجتماعی نقصانات
۱۰۰	اہل سنت کے مفتی اعظم نے شیعہ فقہ پر تسلیم کر دیا	۷۳	”عفو“ سے کیا مراد ہے
۱۰۱	خدا کی سمدیدیں	۷۵	دو قابل غور نکات
۱۰۱	آیت ۲۳۰	۷۶	آیت ۲۲۰
۱۰۳	شان نزول	۷۶	شان نزول
۱۰۳	بے راہ روی سے روکنے کا ایک عامل	۷۷	آیت ۲۲۱
۱۰۳	آیت ۲۳۱	۷۸	شان نزول



۱۳۴	حکومت کرن تھے	۱۰۵	خدا کے قوانین کا مذاق نہ اڑاؤ
۱۳۶	حکومت نے ملک کی باگ ڈور سنبھال لی	۱۰۶	آیت ۲۳۲
۱۳۸	قیادت کی سشدائے	۱۰۷	شانِ نزول
۱۳۹	تاکوت کیا ہے	۱۰۸	ایک اور زنجیر ٹوٹ گئی
۱۴۰	تحد المملکہ فرشتوں نے اے اظہار کیا ہے	۱۰۹	آیت ۲۳۳
۱۴۲	تنازع بقا کا مفروضہ	۱۱۰	فرزائیدہ بچوں کو دلا دھونے کے بجائے میں سات مٹام
۱۴۵	آیت ۲۵۳	۱۱۱	آیت ۲۳۴
۱۴۸	کیا مختلف مذاہب اختلاف کا سبب ہیں	۱۱۲	آیت ۲۳۵
۱۴۹	آیت ۲۵۴	۱۱۳	کیا دونوں صفت عورتوں سے خواستگاری کی جاسکتی ہے
۱۵۰	آیت ۲۵۵	۱۱۴	آیت ۲۳۶
۱۵۲	خدا کے دندہ جوئے کا مفہم	۱۱۵	آیت ۲۳۷
۱۵۳	کیا خالق کا بھی کوئی خالق ہے	۱۱۶	آیت ۲۳۸، ۲۳۹
۱۵۴	القیوم	۱۱۷	شانِ نزول
۱۵۶	لا تاخذہ منہ وہ نوم	۱۱۸	صلوۃ دسٹی کرن سی نماز ہے
۱۵۷	خدا کی حکمت مطلقہ	۱۱۹	آیت ۲۴۰
۱۵۸	شعاعت کوئی پارٹی بازی نہیں	۱۲۰	کیا یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے
۱۵۹	عرش و کرسی سے مراد کیا ہے	۱۲۱	آیت ۲۴۱، ۲۴۲
۱۶۱	آیت ۲۵۶	۱۲۲	آیت ۲۴۳
۱۶۱	شانِ نزول	۱۲۳	شانِ نزول
۱۶۲	غریب جبری نہیں ہو سکتا	۱۲۴	چند اہم نکات
۱۶۳	اسلام میں فوجی طاقت کے استعمال کے مواقع	۱۲۵	۱۔ ایک درسِ عبرت
۱۶۴	۱۔ عرکِ ہدایت پرستی کی بنا گئی کے ہے	۱۲۶	۲۔ یہ تاریخ ہے یا تفسیل
۱۶۵	۲۔ اسلام کے خطہ میں کوئی ممالک سے	۱۲۷	۳۔ رجعت کی طرف اشارہ
۱۶۶	۳۔ تبلیغ کی آزادی حاصل کرنے کے لیے	۱۲۸	آیت ۲۴۴، ۲۴۵
۱۶۷	آیت ۲۵۷	۱۲۹	خدا بندوں سے قرض لینا ہے
۱۶۸	چند اہم نکات	۱۳۰	آیت ۲۴۶، ۲۴۷
۱۶۹	۱۱۔ فردِ عظمت کی تشبیہ	۱۳۱	ایک عبرت خیز واقعہ
۱۷۰	۱۲۔ فرد کے مقابل عظمت کیوں	۱۳۲	



۱۷۹	۱۲۱ ریاکاری کی مشابہت	۱۷۵	آیت ۲۵۸
۱۹۰	۱۲۲ اتفاق کے اسباب	۱۷۷	چند اہم نکات
۱۹۰	آیت ۲۶۶	۱۷۷	۱۱ حضرت بزرگوار کے درمقابل کون تھا
۱۹۱	ایک اور مثال	۱۷۷	۱۲ یہ سب احادیث کب ہوا
۱۹۱	چند اہم نکات	۱۷۸	۱۳ بحث سے فرد کا مقصد
۱۹۱	۱۱ اصحاب الکبر والکبر والکبر والکبر والکبر	۱۷۸	۱۴ فرد کا دعویٰ الہییت
۱۹۲	۱۲ اصحاب فیہ نار	۱۷۸	بہت پرستی کی مختصر تاریخ
۱۹۲	آیت ۲۶۷	۱۷۹	آیت ۲۵۹
۱۹۲	شان نزول	۱۷۹	واقعہ کی تفصیلات
۱۹۵	آیت ۲۶۸	۱۷۹	آیت ۲۶۰
۱۹۵	اتفاق کی رکاوٹوں اور شیطانی انگلیوں سے مقابلہ	۱۷۹	چند اہم نکات
۱۹۷	آیت ۲۶۹	۱۷۹	۱۱ چار پرندے
۱۹۸	آیت ۲۷۰	۱۷۹	۱۲ پہاڑوں کی تعداد
۱۹۹	آیت ۲۷۱	۱۷۹	۱۳ واقعہ کب رونما ہوا
۱۹۹	خرچ کیسے کن چاہیے	۱۷۹	معاد جسمانی
۲۰۱	آیت ۲۷۲	۱۷۹	شبہ آکل دماغ
۲۰۲	شان نزول	۱۸۱	آیت ۲۶۱
۲۰۲	ہدایت کی اقسام	۱۸۱	اتفاق جتنی تفاوت کا ایک حل
۲۰۳	۱۱ ہدایت کوئی	۱۸۲	کیا یہ ایک فرضی تشبیہ ہے
۲۰۳	۱۲ ہدایت تشریفی	۱۸۲	آیت ۲۶۲
۲۰۳	۱۳ وسیعہ کی فراہمی	۱۸۲	کس اتفاق کی قدر و قیمت ہے
۲۰۳	۱۴ نعمتوں اور جزا و ثواب کی طرف ہدایت	۱۸۵	آیت ۲۶۳
۲۰۴	اتفاق کرنے والوں پر اس کے اثرات	۱۸۷	آیت ۲۶۴، ۲۶۵
۲۰۵	وجد اللہ کا مفہوم	۱۸۸	راہ خدا میں خرچ کرنے کے اسباب و نتائج
۲۰۶	آیت ۲۷۳	۱۸۹	چند اہم نکات
۲۰۶	شان نزول	۱۸۹	۱۱ بعض اعمال ایک عمل کے نتائج کو
۲۰۷	اتفاق کا بہترین موقع	۱۸۹	ختم کر دیتے ہیں

۱۸۸۔ وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

ترجمہ

۱۸۸۔ ایک دوسرے کے اموال آپس میں باطل اور ناحق طریقے سے نہ کھاؤ اور گناہ کے ذریعے لوگوں کے مال کا ایک حصہ کھانے کے لیے اس میں سے (کچھ مال) قاضیوں کو نہ دو جب کہ تم جانتے ہو۔

تفسیر

اس آیت میں مسلمانوں کو ایک بہت ناپسندیدہ عمل سے روکا گیا ہے۔ ان سے ارشاد ہوتا ہے: ایک دوسرے کے مال و دولت میں ناحق تصرف نہ کرو اور غیر صحیح طریقے سے مال پر قبضہ نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ دوسروں کے مال میں تصرف کرنے اور اسے ناحق کھانے سے انہیں قاضیوں کے درپردہ جلاظت اور پھرا نہیں بھی بدیر رشوت کے طور پر کچھ پیش کرنے لگیں تاکہ لوگوں کا مال غصب سے اپنی ملکیت بنا سکیں اس کام میں وہ دو بڑی خلاف ورزیوں کے مرتکب ہوتے ہیں

دوسروں کا حق کھانا اور رشوت دینا۔ رشوت کا مستند اسوم کی تفسیر میں اتنا اجماع ہے کہ امام صادق فرماتے ہیں:

وَأَمَّا الرِّشَاءُ فَالْحُكْمُ فَهُوَ الْكَفَرُ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ۔

باقی را فیصد کرنے میں رشوت دینا، تو یہ خدا نے عظیم سے کفر ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک مشہور حدیث منقول ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

لَعَنَ اللَّهُ الرَّاشِيَّ وَالْمُرْتَشِيَّ وَالشَّاعِيَ بَيْنَهُمَا۔

خدا اپنی رحمت سے دور رکھے رشوت دینے والے، رشوت لینے والے اور ان کے درمیان واسطہ بننے والے کو

سورہ فہم کی آیت ۲۹ میں بھی ایسا ہی مفہوم بیان ہوا ہے، ارشاد ہوتا ہے: "بائز اور صحیح راہ تجارت کے بغیر جو کچھ تم اپنے قبضے میں لیتے ہو اس میں تصرف نہ کرو۔"

زیر نظر آیت صراحت سے کہتی ہے کہ اگر کچھ لوگ رشوت کے ذریعے عدالت میں کامیاب ہو جائیں تو نزاعی مال ان پر حرام ہوگا اور ظاہری طور پر کسی کے حق میں عدالت کے حکم سے وہ مال کا حقیقی مالک نہیں بن سکتا، صراحت سے رسول اکرم کی ایک حدیث میں منقول ہے: آپ نے فرمایا:

میں قبضہ کی طرح کا ایک بشر ہوں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ ظاہری طریقے سے تبادرے درمیان فیصلہ

کروں (جو کہتا ہے بعض لوگ دلیل قائم نہ کر سکتے ہیں زیادہ قاضیوں اور میں ظاہری دلیل کی وجہ سے ان کے حق میں

لے وسائل ج ۱۲، باب ۵، من ابواب ما یکتسبون



فیصل کرداں لیکن یہ جان کر اگر کسی کسی کے حق کا واسطہ ہے کہ یہ فیصلہ کر بھی دوں مجھ بھی وہ جہنم کا ایک ٹکڑا اگر اسے حاصل کرنے والا آج چاہتا ہے تو اس کو نہ تعزیر کرے ورنہ اسے چھوڑ دے۔

رشوت خواری۔ ایک مصیبت

ایک عظیم مصیبت جو نہایت عظیم سے نوع انسانی کو دانتن گیر ہے اور جو آج کل تو بڑی شدت سے رائج اور جاری و ساری ہے اور رشوت ہے۔ عدالت اجتماعی کی راہ میں یہ ایک بہت بڑی رکاوٹ رہی ہے اور آج بھی ہے۔ اسی کے سبب وہ قوانین جو کمزوروں کے تحفظ کے ضامن تھے۔ طاقتوروں کے ان ظالم کے حق میں مستعمل ہوتے ہیں قانون جنہیں محسوس کرنا چاہتا تھا لیکن طاقتور اور قوی لوگ تو ہمیشہ اپنی قوت کے بن بستر پر اپنے منافع کی حفاظت کر سکتے ہیں یہ تو ضعیف اور کمزور لوگ ہی ہیں جن کے منافع اور حقوق کی حفاظت قانون کو کرنا ہے۔ واضح ہے کہ اگر رشوت کا روزہ کھدو رہے تو قوانین کا نتیجہ بالکل برعکس ملے گا کیونکہ قوی لوگ تو رشوت دینے کی قدرت رکھتے ہیں اس کے نتیجے میں ان کے حقوق پر ظلم و ستم اور تجاوز جاری رکھنے کے لیے ایک کھیل بن کر رہ جائیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ جس معاشرے میں رشوت نفوذ کرے گی وہاں زندگی کا شیرازہ بکھر کر رہ جائے گا اور ظلم و فساد، نا انصافی اور تبذیر کا دور دورہ ہوگا اور قانون عدالت برائے نام باقی رہ جائے گا۔ اسی لیے اسلام نے رشوت خواری کو پوری شدت کے ساتھ قباحت قرار دیا ہے۔ اس کی مذمت کی ہے اور اسے گناہان کبیرہ میں سے قرار دیا ہے۔ یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ رشوت جیسی برائی اور قباحت دوسرے پر فریب ناموں سے انجام پاتی ہے۔ رشوت غدار اور رشوت دینے والا اس کے لیے بدیہ، حق و حساب، حق و رحمت اور انعام جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن واضح ہے کہ ناموں کی یہ تبدیلی کس طرح بھی اس کی مابیت اور حقیقت کو نہیں بدل سکتی۔ برصورت میں جو بھی چیز اس طریقے سے وصول ہوگا وہ حرام اور ناجائز ہے۔

نبیجہ البلاغ میں اشدش بن قیس کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ ایک مرتبہ وہ حضرت علی کے محکمہ محل میں اپنے مد مقابل پر کامیابی کے لیے رشوت لے کر آیا۔ جو ایوں کہ رات کے وقت ایک لذیذ محوسے سے بھرا ہوا برتن لے کر حضرت علی کے دروازے پر آیا۔ وہ اسے ہدیہ قرار دے رہا تھا۔ حضرت علی نے غصے سے فرمایا:

”هبلتك الهبول اعن دين الله اتيتمني لتعخد عني..... والله
لوا عطيت الا قال لي السبعة بما تحت افلاكها على ان اعصى الله في نعمة
اسلها بطلب شعيرة ما فعلته وان دنياكم عندي لا هون من ورقة في فم
جدادة تقصصها ما العلى ولنعميم يعنى ولذة لا تبقى“

سودا تجھ پر بولیں۔ کیا تو اس لیے آیا ہے کہ مجھے فریب دے اور مجھے دین حق سے باز رکھے۔ خدا کی قسم اگر سات اہم ان سب چیزوں کے سمیت جو ان کے آسمانوں کے نیچے ہیں مجھے دے دی جائیں میں اس کے



ہے کہیں چپختی کے منہ سے جو کا ایک چھکا غلبہ سے چھین لوں تو میں ایسا برگز نہیں کروں گا۔ تمہاری یہ دُعا میرے نزدیک تیری کے منہ میں چپاتے ہوئے پتے سے بھی زیادہ بے وقعت ہے۔ غی کو فنا ہونے والی نعمتوں اور جلد گزرنے والی لذتوں سے کیا کام۔

اسلام رشوت کی ہر شکل و صورت کو مذموم سمجھتا ہے۔ پیغمبر اسلام کی تاریخ حیات کا ایک واقعہ ہے کہ آپ کو ایک مرتبہ خبر ملی کہ آپ کی طرف سے معین ایک حاکم نے ہدیہ کے نام پر رشوت قبول کر لی ہے، آنحضرت غضبناک ہوئے اور اس سے فرمایا،

”كَفَيْتَ تَأْخُذَ مَا لَيْسَ لَكَ بِحَقٍّ“

”تو وہ چیز کیوں لےتا ہے جو حق نہیں ہے؟“

اُس نے جواب میں معذرت کرتے ہوئے کہا:

”لَعَنَكَ كَانَتْ هَدِيَّةً يَا رَسُولَ اللَّهِ“

”اے رسول خدا، میں نے جو کچھ لیا وہ تو ہدیہ تھا۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا

”ارَأَيْتَ لَوْ قَعَدَ أَحَدُكُمْ فِي بَابِ دَارِهِ وَلَمْ يَقُولْ عَمَلًا أَكَاثَرُ النَّاسِ

يَهْدُونَهُ شَيْئًا؟“

”اگر تم گھروں میں بیٹھ رہو اور یہی دروازہ سے کسی جگہ پر داخل و حاکم نہ ہو تو کیا پھر بھی لوگ

تمہیں ہدیہ دیتے ہیں؟“

اس کے بعد آپ نے حکم دیا اور اس سے وہ ہدیہ لے کر بیت المال میں داخل کر دیا گیا اور اُسے آپ نے معزول کر

دیا۔

اسلام نے تو یہاں تک اہتمام کیا ہے کہ قاضی کہیں مخفی رشوتوں میں مبتلا نہ ہو جائے، اسامیے حکم دیا ہے کہ قاضی

خود بازار میں نہ جائے

۱۸۹۔ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْإِهْلَةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَاجَّةِ

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَكِنَّ

الْبِرَّ مَنْ أَتَىٰ أَثْقَىٰ وَأَتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللَّهَ

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ○

۱۸۹۔ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں چاند کی مختلف صورتوں کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہیئے کہ یہ تقسیم اوقات (اور طبعی



تقویم کا منظم ہیں نیز یہ لوگوں کے لئے نظام زندگی کے لیے اور حج کے وقت کے تعین کے لیے ہیں (اور جیسے زمانہ جاہلیت میں ہر دن تھا کہ حج کے موقع پر جب لوگ احرام باندھتے تو پھر گھر کے دروازے سے اندر نہیں آتے تھے بلکہ عقب سے داخل ہوتے تھے، یہ نیک کام نہیں کہ عقب مکان سے اندر آؤ جگہ نیکی یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کرو اور گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہوا کرو اور خدا کی نافرمانی سے پرہیز کرو تاکہ کامیاب ہو جاؤ۔

شان نزول

منقول ہے کہ :

معاذ بن جبل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم سے بار بار یہ سوال کیا جاتا ہے کہ یہ چاند کیسا ہے اور یہ تدبیر بنا بد کامل کی صورت کیوں اختیار کرتا ہے اور پھر دوبارہ پہلی حالت پر لوٹ آتا ہے ؟

منقول ہے کہ :

”یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ یہ چاند کس لیے ہے اور

اس کا کیا فائدہ ہے۔“

ان سوالات کے جواب میں محل نظر آیت نازل ہوئی جس میں بتایا گیا کہ چاند کی مختلف صورتیں انسانی نظام زندگی کیسے بہت سے فوائد کی حامل ہیں۔

تفسیر

جیسا کہ اس آیت کی شان نزول میں آیا ہے کہ کچھ لوگ جب یہ اسلام سے چاند کے متعلق سوالات کرتے تھے، اس سوال کے جواب میں خداوند عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ وہ چاند کے آثار و فوائد بیان کریں۔ انہیں بتائیں کہ مہینوں کی ابتداء طلوع ہلال کی صورت میں اور پھر تدبیر بنا اس کی تبدیلی عبادت اور دینی فرائض کی انجام دہی نیز مادی نظام زندگی کے لیے بہت کام آمد ہے۔ یہ اس لیے ہے تاکہ لوگ آسانی سے اپنے تجارتی امور اور دیگر پروگراموں کو ترتیب دے سکیں نیز وعدہ اور عہد و پیمان کے لیے وقت کا تعین کر سکیں۔ اس طرح روزہ رکھنے اور حج جیسی عظیم عبادت کی انجام دہی کے لیے مخصوص وقت ہے جس کے تعین کے لیے بہترین راستہ چاند ہی کی وضع کیفیت ہے۔ چاند دیکھ کر لوگ ہمیشہ ابتداء، وسط اور آخر ماہ کی تشخیص کر سکتے ہیں اور اپنے امور کو اس کے مطابق ترتیب دے سکتے ہیں۔

حقیقت میں چاند ایک طبیقی تقویم ہے جو تمام افراد بشر کے لیے عام ہے۔ اس سے تمام لوگ چاہے وہ پڑھے لکھے ہوں یا آن پڑھ اور دنیا کے کسی بھی حصے میں آباد ہوں اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس سے فقط آغاز، وسط اور آخر ماہ ہی کو نہیں پہچانا جاسکتا بلکہ غور و خوض سے مہینے کے ہر دن کی تشخیص کی جاسکتی ہے۔ واضح ہے کہ تقویم اور جہت تری یعنی لوگوں کے لیے



تاریخ کے تعین کا دقیق ذریعہ نہ ہو تو اجتماعی زندگی کا نظام نہیں چل سکتا۔ اسی بناء پر خدا نے جنگ و برتری نے نظام زندگی کی بقاء کے لیے یہ عالمی تقویم عنایت فرمائی ہے۔

طبیعی اور فطری میزبان اور پیمانے

قوانین اسلام کی ایک خصوصیت اور امتیاز یہ ہے کہ انہیں مومن طبیعی اور فطری میزبان کے مطابق قرار دیا گیا ہے کیونکہ طبیعی مقیاس ایک ایسا ذریعہ ہے جو سب لوگوں کے ماتحت دیا گیا ہے اور رفتار زمانہ اس پر اثر انداز نہیں ہوتی جب کہ اس کے برعکس غیر طبیعی نظام ہائے مقیاس سب لوگوں کے اختیار میں نہیں ہیں یہاں تک کہ دور حاضر میں بھی تمام لوگ مصنوعی مقیاسوں سے استفادہ نہیں کر پاتے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کبھی باشت کو اور کبھی قدم کو، کبھی انگلی کی گرہوں کو اور کبھی انسان کے طول قامت کو پیمانہ قرار دیتا ہے۔ اس طرح وقت کے تعین کے لیے غروب آفتاب، طلوع فجر، سورج کے نصف النہار سے گزرنے جانے اور چاند دیکھ لینے کو مختلف مواقع پر میزبان قرار دیتا ہے۔

”لیس الجزیانی فاقوا البیوت من ظلمودھا“ یعنی گھر کی پشت سے گھر میں داخل ہونا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ یہاں حج کے متعلق گفتگو جاری ہے اور بتایا گیا ہے کہ حج کے اوقات کو چاند کے ذریعے تعین کیا جاسکتا ہے۔ اب خداوند عالم نے حج کے موقع پر زمانہ جاہلیت کی ایک رسم کی طرف توجہ دلائے ہوئے اس سے منع فرمایا ہے۔ وہ لوگ جب احرام باندھ لیتے تو عام راستے اور گھر کی ڈھلوانی سے گھر میں داخل نہیں ہوتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ احرام باندھے ہوئے شخص کو گھر کے دروازے سے داخل نہیں ہونا چاہیئے۔ اس بناء پر وہ گھر کی پچھلی طرف نقب کھاتے اور احرام کی حالت میں صرف وہیں سے داخل ہوتے۔ وہ اس عمل کو کلابنک سمجھ کر انہماک دیتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک یہ عمل ایک طرح سے ایک مادت ترک کرنے کا اعتبار تھا۔ احرام چمکے مادت ترک کرنے کا نام ہے لہذا وہ خیال کرتے تھے کہ اس کی تکمیل اس عادت کے ترک کرنے سے ہونا چاہیئے۔

لیکن قرآن صراحت سے کہتا ہے کہ ٹکی تقویٰ میں ہے نہ کہ ایسی ہے جو عادت و رسوم میں اور پھر جانا صمد حکم دیتا ہے کہ گھروں میں ٹکی راستے ہی سے داخل ہونا گوارا نہ کرنا۔

البتہ آیت کا ایک وسیع تر اور زیادہ عام معنی بھی ہے اور وہ یہ کہ جب کسی بھی کام کے لیے ابتداء کی جائے چاہے وہ مذہبی اخل میں سے ہو یا ان کے علاوہ چاہیئے کہ اس کے صحیح راستے سے اس میں داخل ہونا چاہئے نہ کہ انحرافی، اُلٹے اور غیر عادی طریقوں سے۔ یہی مفہوم جاہل نے امام باقرؑ کے ارشاد سے نقل کیا ہے۔

تفسیر ابن بیت میں اس آیت کے بارے میں ہے :

ہم ابواب خداوندی اور اس تک پہنچنے کا راستہ اور جنت الہی کی طرف جانے والے ہیں۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے تمام مذہبی امور میں اس کے اصلی راستے سے داخل ہونا چاہیئے اور نظام حیات اہل بیتؑ سے



حاصل کرنا چاہیے کیونکہ حق انہی کے قریب آتی ہے اور وہ مکتبہ رحیمی الہی کے تربیت یافتہ ہیں۔

”لیس البر بن.....“ یہ جملہ جو ممکن ہے ایک اور تعریف نیک کی طرف بھی اشارہ ہو وہ یہ کہ معدود دینی کے متعلق سوال کرنے کی بجائے جیسے کے چاند کے بارے میں تہجد سوال کرنا ایسے پتھریا کوئی شخص تمہارے اسی دروازے کو چھوڑ کر اس کی پشت پر نقب زنی کرے اس میں داخل ہو جو کتنا برا کام ہے۔

۱۹۰۔ وَفَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُمَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا
إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْتَدِينَ ○

ترجمہ

۱۹۰۔ اور راہِ خدا میں تم اُن لوگوں سے قتال کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور حد سے تجاوز نہ کرو کیونکہ خدا تجاوز کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

شان نزول

ابن عباس سے منقول ہے کہ یہ آیت صلح حدیبیہ کے موقع پر نازل ہوئی۔ واقعہ یوں ہے کہ رسول خدا اپنے ۱۴۰ اصحاب کے ساتھ عمرہ کے لیے تیار ہوئے۔ جب مسجدِ منہدیہ پر، جو کہ کے قریب ایک جگہ ہے، پہلے تو مشرکین نے انہیں مکہ میں داخل ہونے اور مناسک عمرہ سمجھا لانے سے رکھا۔ طویل سزا گھنٹوں کے بعد انہوں نے پیغمبر اکرم سے صلح کر لی اور سب یہ پایا کہ رسول اللہؐ اگلے برس عمرہ ادا کرنے آئیں اور وہ ان کے لیے تین دن تک مکہ خالی کر دیں گے تاکہ آپؐ خانہ کعبہ کا طواف کریں۔ اگلے سال جب آپؐ مکہ کی طرف جانے کے لیے آمادہ ہوئے تو ذرا کہ شاید مشرکین دندا و فائدہ کریں اور رکاوٹ پیدا کریں۔ یوں جنگ شروع ہو جانے کا امکان تھا۔ اور آپؐ ماہِ حرم میں جنگ کرنے پر خوش نہ تھے۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی اور حکم دیا گیا کہ اگر دشمن جنگ شروع کر دے تو تم بھی اس کے مقابلے میں کھڑے ہو جاؤ۔

تفسیر

اس آیت میں قرآن نے ان لوگوں سے قتال کا حکم دیا جو آغازِ جنگ کریں اور مسلمانوں کے سامنے تلواریں اٹھائیں۔ قرآن نے اجازت دی ہے کہ دشمن کو خاموش کرنے کے لیے ہتھیار پر ہاتھ رکھا جائے اور ہر قسم کے دفاعی ذرائع سے استفادہ کیا جائے اور حقیقت میں اب مسلمانوں کے صبر و تحمل کا زمانہ ختم ہو گیا ہے، اور اب ظلمت اور جاہلیی سے اپنے حقوق کا دفاع کر سکتے ہیں۔

جنگ کیوں اور کس سے؟

اس آیت میں تین بنیادی نکتے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو جنگ کے موقع کی اسلامی مطلق کو عملی طور پر واضح کرتے ہیں:



۱۔ جملہ ”وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ“ خدا کی راہ میں جنگ کرو، اسلامی جنگوں کے اصل مقصد اور ہدف کو واضح کرتا ہے۔ انتقام، جاہ طلبی، حصول اقتدار، کشور کشائی، مال غنیمت اور دوسروں کی زمینوں پر قبضہ ان سب مقاصد کے لیے جنگ کرنا اسلام کی حکمت میں مذموم ہے۔ صرف راہِ خدا میں اور قوانینِ الہی کے پیچھے کے لیے جہاد کرنا صحیح ہے یعنی حق، عدالت اور توحید کے لیے اور ظلم، فساد، انحراف اور کج روی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے جہاد درست ہے۔

۲۔ جملہ ”الَّذِينَ يقاتِلُونَكُمْ“ اُن سے لڑو جو تم سے جنگ کریں، صراحت کرتا ہے کہ کن لوگوں سے جنگ کی جائے۔ جب تک کہ مقابل ہتھیار نہ اٹھائے اور جنگ کے لیے کھڑا نہ ہو جائے مسلمانوں کو پیش قدمی نہیں کرنا چاہیے (سوائے چند استثنائی مواقع پر جن کے بارے میں دیگر آیات جہاد میں اشارہ کیا جائے گا)۔ اس آیت سے ضمایر بھی معلوم ہوتا ہے کہ فوجیوں کے علاوہ دیگر اشخاص (خصوصاً طور توں اور بچوں) پر حملہ نہ کیا جائے کیونکہ وہ جنگ کے لیے نہیں اُٹھے لہذا انہیں محفوظ و مامون رہنا چاہیے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام کے عظیم پیشوا حضرت علی بن ابیطالب علیہ السلام اپنی فوج کو یہ حکم دیتے ہوئے نظر آتے ہیں:

”لَا تَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى يَبْدُؤَ كُمْ فَإِنْ كُنْتُمْ بِحَمْدِ اللَّهِ عَلَى حَبْطَةٍ وَتَرَكْتُمْ إِيَّاهُمْ حَبْطَةً أُخْرَى لَكُمْ“ ۱

جب تک وہ حملہ نہ کریں تم جنگ کی ابتداء نہ کرو کیونکہ تم حق کے پیروکار ہو اور ان کے خلاف قبضہ پاس ہو، دلیل سہمہ ہے۔ نیز جنگ کی ابتداء نہ کرنا ابتدائی عقابیت کی ایک اور دلیل ہے۔

۳۔ جملہ ”وَلَا تَقْتُلُوا“ (حد سے تجاوز نہ کرو) سے اس بات کا تعین ہوتا ہے کہ کب تک جنگ کی جائے۔ اسلام میں جنگ خدا کے لیے اور اس کی راہ میں ہوتی ہے اور راہِ خدا میں کسی قسم کی تعدی اور تجاوز نہیں ہونا چاہیے اسی لیے دورِ حاضر کی جنگوں کے برعکس اسلام جنگی امور کے بارے میں اخلاقی اصولوں کی پاسداری کی بہت تحقیق کرتا ہے۔ مثلاً جو لوگ ہتھیار زمین پر رکھ دیں یا جو جنگ کرنے کی قوت کھو بیٹھیں یا جو اصولی طور پر جنگ کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ جیسے بوڑھے، عورتیں اور بچے ان پر حملہ آور نہیں ہونا چاہیے باغوں اور درختوں کو تباہ و برباد نہیں کرنا چاہیے اور دشمن کے پنے کے پانیوں کو زہر آلود کرنے کے لیے زہر یا مواد استعمال نہیں کرنا چاہیے (یعنی کیمیائی ہتھیاروں اور جراثیمی ہتھیاروں کے استعمال کی اجازت نہیں ہے)۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

”فَإِذَا كَانَتِ الْهَزِيمَةُ بِأَذْنِ اللَّهِ فَلَا تَقْتُلُوا مَدْبِرًا وَلَا تَصَيِّبُوا مَعْرُورًا وَلَا تَجْهَرُوا عَلَى جَسَدِ رَجُلٍ وَلَا تَهَيَّجُوا النِّسَاءَ بِأَذَى وَإِنْ شَقَمَ أَعْرَاضُكُمْ وَمَسَّيْنِ أَعْرَاضُكُمْ“ ۲

جب خدائی حد سے دشمن کے ٹکڑے نہ ہوں، تو جرح نہ کرو، نہیں قتل نہ کرو اور زخموں کو نہ

درو۔ خون کو ازیت نہ سمجھو نہ پھینکو، اگرچہ وہ نہیں باوجود کہیں اور قبضہ سے سرداروں کو گالیاں نہ دیں۔

اس آیت کی تفسیر میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے جہاد ہائے اسلامی کے بارے میں دشمنانِ اسلام کے بے بنیاد بے شمار شبہات اور بہانوں کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ قرآن نے صلح کے ساتھ مقابلہ جنگ، جن سے جنگ کرنا ہے اور جہاد کے مختلف



کونٹ دھات کے بدلے میں وضاحت کر دی ہے۔ اس سے غاصین کے احکامات کا جو ب واضح ہو جاتا ہے۔ دیگر آیات جہاد میں فتنہ اللہ مزید تشریح و توضیح آئے گی۔

- ۱۹۱۔ **وَأَقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّى يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ كَذَلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ** ○
- ۱۹۲۔ **فَإِنْ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ** ○

ترجمہ

- ۱۹۱۔ اور انہیں (بت پرستوں کو جو کسی جرم و تجاوز سے منہ نہیں موڑتے، جہاں پاؤ قتل کرو اور جہاں (مکہ) سے انہوں نے تمہیں نکال دیا ہے۔ انہیں نکال باہر کرو اور فتنہ (و بت پرستی) قتل سے بھی بدتر ہے اور ان سے مسجد حرام کے پاس جنگ نہ کرو جب تک وہ وہاں پر متبادرے ساتھ جنگ نہ کریں پس اگر وہ تم سے جنگ کریں تو انہیں قتل کرو۔ یہی ہے کافروں کی جزاء
- ۱۹۲۔ اور اگر وہ رک جائیں تو خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

تفسیر

آیت ۱۹۰ تا ۱۹۵ میں خدا تعالیٰ نے ان کفار مکہ کے بارے میں مسلمانوں کی ذمہ داری کو واضح کیا ہے جنہوں نے مسلمانوں کو گھر سے بے گھر کیا، انہیں ہر قسم کی اذیت و آزار پہنچائی اور انہیں اسلام سے برگشتہ کرنے کے لیے ہزاروں جتن کئے۔ زیر نظر پہلی آیت میں اس حکم کے دائرے کو دست دیتے ہوئے مسلمانوں کو اجازت دی گئی ہے کہ ان دشمنوں کو جہاں بھی آگاہہ پیکار دیکھو قتل کر ڈالو اور جیسے انہوں نے اپنی پوری قوت سے مسلمانوں کو مکہ سے باہر نکالنے اور آوارہ منزل کرنے کے لیے اقدام کئے ہیں۔ ان سے وہی سلوک کرو اور انہیں مکہ سے باہر نکال دو۔

”وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ“

”بت پرستی قتل سے بدتر ہے“

فتنہ کے لغوی سے ”فتنہ“ کا ایک وسیع معنی ہے۔ اس کے مفہوم میں ہر قسم کا مکرو فریب، فساد، شرک کفر اور رسوائی شامل ہے۔ اس آیت میں اس سے مراد وہی شرک اور بت پرستی ہے جو بہت سے اجتماعی مفسدات



اختلاف، پراندہ کی، گنہ و فساد اور خونریزی کا سرچشمہ ہے۔

اس مفہوم کی شاہد ایک اور آیت ہے:

”قَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ“

اُن سے جنگ کرو تاکہ فتنہ بڑے ختم ہو جائے اور سب اللہ کا دین پرست ہو جائیں
اس بنا پر الفتنۃ اشد من القتل دے چلے کا معنی یہ ہوگا کہ بت پرستی کا مذہب اور اس سے پیدا ہونے
والے مک میں مروج بہت سے انفرادی و اجتماعی فسادات قتل کرنے اور مار دینے سے بھی سخت تر ہے کیونکہ ان امور نے
خدا کے امن و امن حرم کو آلودہ کر رکھا ہے۔ اس لیے خونریزی کے خوف سے شرک و بت پرستی سے جنگ کرنے سے دستبردار
نہیں ہونا چاہیئے اور جیسے بھی ہو سکے پسے صلح جرنی سے اور پھر شدت فعل اور سختی سے بت پرستی اور اس سے پیدا ہونے والے
فتنہ و فساد کی ریشہ کنی ہونا چاہیئے۔

اس کے بعد مزید فرمایا کہ مسلمانوں کو مسجد الحرام کا احترام کرنا چاہیئے اس جنگ کا احترام جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی
درخواست کے مطابق جانے امن قرار دیا ہے۔ جب تک وہاں خود دشمن بت پرست نہ اٹھائے اس وقت تک ان سے جنگ کرنے
اور قتل کرنے کی اجازت نہیں لیکن اگر وہ مسجد الحرام کا احترام نہ کریں تو پھر مسلمانوں کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے دفاع کے لیے مسجد الحرام
کے اندر بھی جنگ کر سکیں۔ البتہ پیش دستی نہیں کر سکتے اور نہ وہ یہ حق رکھتے ہیں کہ خدا نے جسے جانے امن قرار دیا ہے اس کا احترام
پامال کریں۔

آیت کے آخر میں تعبیح کی گئی ہے کہ یہ کفار کی سزا ہے کہ اگر وہ کسی مقدس جگہ پر تجاوز روا کریں تو انہیں سخت اور نہ توڑ جواب
دیا جائے تاکہ وہ حرم کے تقدس اور احترام سے غلط فائدہ نہ اٹھا سکیں۔

”فَإِنْ اَنْتَهُمْ فَاِنْ اَنْتَهُمْ غَضُورٌ رَحِيمٌ“

”اگر وہ رک جائیں تو خدا پر وہ پوٹتی کرنے والا مہربان ہے۔“

اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ کفر سے دستبردار ہونے اور بت پرستی اور شرک کے مذہب کو پس پشت ڈال دینے سے خدا
ان کی توبہ قبول کرے گا اور وہ مسلمانوں کے بھائی ہو جائیں گے یہاں تک کہ وہ ان مشرکوں اور کافروں سے بھی صرف نظر کرے گا جو
غرموں کے لیے ہوتا ہے۔

۱۹۳۔ وَتَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ
ترجمہ
فَإِنْ اَنْتَهُمْ فَاِنْ اَنْتَهُمْ غَضُورٌ رَحِيمٌ ○

۱۹۳۔ اور اُن سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ اور بت پرستی اور لوگوں سے سلب آزادی کی حالت باقی نہ رہے
اور دین خدا کے لیے مخصوص ہو جائے۔ پس اگر وہ اپنی غلط روش سے دستبردار ہو جائیں (تو ان سے مزاحمت



نہ کرو کیونکہ تعدی اور تجاوز ظالموں کے علاوہ کسی کا شیوہ نہیں ہے۔

تفسیر

اس آیت میں اسلامی جہاد کا مقصد بیان کیا گیا ہے۔ آیت کے مطابق جنگ کا ہدف وہ افراد ہیں جو عموماً جنگوں میں لوگوں کی ہوتی ہیں۔ اسلامی جہاد نہ زمین پر فرماں رواؤں اور مشور کشائی کے لیے ہے اور نہ غنائم پر قبضہ کرنے کے لیے۔ اس کا مقصد اپنے مال کی فروخت کے لیے مندیوں کا حصول ہے نہ خام مال پر قبضہ اور نہ ہی یہ جہاد ایک نسل کی دوسری نسل پر فوقیت قائم کرنے کے لیے ہے بلکہ اس کا مقصد ہے فقط پروردگار کی خوشنودی کا حصول اجتماعی عدالت کا قیام ان لوگوں کی حمایت جو مکر و فریب اور گمراہی کی زد میں ہیں، انسانی معاشرے سے شرک اور بت پرستی کی مبادی الٹنا اور احکام الہی کا نفاذ۔ اس بناء پر جیسا کہ مشاہدہ بتاتا ہے کہ اسلامی جنگ اس لیے ہوتی ہے کہ انسانی معاشرے میں نقصان باقی نہ رہے اور توحید پرستی کا دین تمام انسانی معاشروں میں رواج پا جائے۔

آیت کے ذیل میں مزید ارشاد جو تکبیر کے لوٹ آنے اور کفر، فساد اور بت پرستی سے دست بردار ہو جانے کی صورت میں مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ان سے متصرف نہ ہوں اور گزشتہ واقعات کا انتقام لینے کے ورپے نہ ہوں اور ماضی کو محمول جائیں کیونکہ تعرض اور تجاوز فقط شکر اور ظالم لوگ ہی کیا کرتے ہیں۔

اسلامی جہادوں کو حقیقت میں تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ ابتدائی جہاد آزادی

خداوند عالم کے احکام اور پروگرام نوع انسان کی سعادت، آزادی، بحال، خوش بختی اور آسائش و آرام کے لیے ہیں اور اس نے اپنے انبیاء و مرسلین کا یہ فریضہ قرار دیا ہے کہ وہ ان احکام کو لوگوں تک پہنچائیں، اب مگر کوئی شخص یا گروہ ان احکام کی تبلیغ کو اپنے پست منافق سے مزاحم سمجھتے ہوئے اس کی راہ میں روڑے اٹھاتے تو انہیں حق پہنچتا ہے کہ وہ پہلے صلح و اشتی سے اور اگر اس سے ممکن نہ ہو تو قوت و طاقت سے اپنی دعوت کی راہ سے یہ رکاوٹیں مٹادیں اور اپنے لیے تبلیغ کی آزادی حاصل کریں۔

دوسرے لفظوں میں تمام معاشروں میں لوگ یہ حق رکھتے ہیں کہ راہ حق کی طرف دعوت دینے والوں کی آزادئیں اور ان کی دعوت قبول کرنے میں آزاد ہوں۔ اب مگر کچھ لوگ ان کا یہ جائز حق چھیننا چاہیں اور انہیں اجانت نہ دیں کہ وہ راہ حق کی طرف پھارنے والوں کی پکار گوش دل سے سن لیں اور فکری و اجتماعی قید و بند سے آزاد ہوں تو پھر ان پر دگرگوسوں کے طرفداروں کو حق پہنچتا ہے کہ وہ حصول آزادی کے لیے ہر ذریعہ استعمال کریں۔ یہیں سے اسلام اور دیگر آسمانی ادیان میں ابستہ لطف جہاد کی ضرورت واضح ہوتی ہے۔ اس طرح مگر کچھ لوگ سوچیں ہر دہلاؤ میں کو وہ اپنے پانے مذہب کی طرف لوٹ جائیں تو یہ باوجود کرنے کے لیے بھی ہر ذریعہ استعمال کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ دفاعی جہاد

بعض اوقات کسی فرد یا گروہ پر جنگ طوفانی جاتی ہے اور اس پر تجاوز کیا جاتا ہے یا دشمن اس کی عظمت سے فائدہ اٹھا کر اپنا



حد کر دیتا ہے ایسی صورت میں حملے کا نشانہ بننے والے فرد یا گروہ کو تمام آسمانی اور انسانی قوانین دفاع کا حق دیتے ہیں۔ اُسے حق پہنچتا ہے۔ ایسے میں جو کچھ اُس سے چاہئے وہ خود کی بقاء کے لیے بن پڑے کرے اور اپنی حفاظت کے لیے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کرے۔ جہاد کی اس قسم کو دفاعی جہاد کہتے ہیں۔ احمد، حزب، موت، تیوک، جنین اور بعض دیگر اسلامی جنگیں جہاد کے اسی حصے کا جزو ہیں اور یہ سب جنگیں دفاعی پہلو کی حامل ہیں۔

۳۔ شرک و بت پرستی کے خلاف جہاد

اسلام لوگوں کو یہ آخری اور بلند ترین دین انتخاب کرنے کی دعوت دیتا ہے اس کے باوجود عقیدے کی آزادی کو بھی محترم شمار کرتا ہے۔ اسی لیے آسمانی کتب کی حامل قوموں کو اسلام نے کافی مہلت اور رعایت دی ہے کہ وہ مطالعہ اور غور و فکر سے دین اسلام کو قبول کریں اور مگر وہ اُسے قبول نہ کریں تب بھی ان سے اسلام ایک ہم پیمان اقلیت والا معاملہ کرتا ہے اور مخصوص شرائط کے ساتھ جو پیچیدہ ہیں نہ مشکل ان سے صلح آشتی سے باہمی زندگی گذرتا ہے۔

لیکن — شرک اور بت پرستی کوئی دین اور آئین نہیں اور نہ ہی وہ قابل احترام ہے بلکہ وہ تو ایک قسم کی بے ہودگی، کجروی اور حماقت ہے۔ دراصل وہ ایک فکری اور اخلاقی بیماری ہے جس کی ہر قیمت پر ریشہ کنی ضروری ہے۔ دوسروں کی فکر و نظر کی آزادی اور احترام کے الفاظ ان کے لیے استعمال ہوتے ہیں جن کے فکر و عقیدہ کی کم از کم کوئی صحیح بنیاد تو ہو لیکن کجروی، بے ہودگی، مگر اسی اور بیماری تو کوئی ایسی چیز نہیں جسے قلم بھاجائے۔ اسی لیے اسلام حکم دیتا ہے کہ جیسے بھی ہوا انسانی معاشرے سے بت پرستی کی ریشہ کنی کی جائے چاہے اس کے لیے جنگ مول لینا پڑے۔ بت غلے اور بت پرستی کے آثار صلح مغفلی سے نہ مٹ سکیں تو قوت و طاقت کے بل بوتے پر انہیں دیرین جنہم کیا جانا چاہیے۔

مدینہ میں جہاد کا حکم کیوں دیا گیا

ہم جانتے ہیں کہ جہاد ہجرت کے دسویں سال مسلمانوں پر واجب ہوا۔ اس سے پہلے واجب نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مکہ میں ایک تو مسلمانوں کی تعداد اتنی کم تھی کہ مسلح قیام عمل خود کشی کے مترادف تھا اور دوسری طرف مکہ میں دشمن بہت زیادہ طاقتور تھا لہذا مکہ کے اندر ان کا مقابلہ کرنا ممکن نہ تھا۔

جب پیغمبر اکرمؐ مدینہ تشریف لائے تو بہت سے لوگ آپؐ پر ایمان لے آئے اور آپؐ نے اپنی دعوت مدینہ کے اندر اور باہر ہر طرف پھیلائی۔ اس طرح آپؐ ایک مختصر سی حکومت کے قیام اور دشمن کے مقابلے میں ضروری وسائل جمع کرنے کے قابل ہو گئے۔ مدینہ چونکہ مکہ سے کافی دور تھا اس لیے یہ امور آسانی سے انجام پا گئے۔ انقلاب اور آزادی پسند قوتیں دشمن سے مقابلے اور دفاع کے لیے تیار ہو گئیں۔

نفسہ کا قرآنی مفہوم

نفسہ اور اس کے مشتقات قرآن میں مختلف معانی میں استعمال ہوئے ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ آزمائش و امتحان — جیسے یہ آیت ہے

”احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا امنا وهم لا یفتنون“

لہ عنکبوت آیت ۲



کیا ایک جیسے ہیں وہ ان کا کلمہ کافی ہے کہ وہ ایمان لائے آئے ہیں اور ان کا امتحان ہرگز ناشی نہیں ہوگا (احکوت ۲۰)

۲۔ فریب دہی ۔ ارشاد البی ہے:

”يَا بَنِي آدَمَ لَا يَفْتِنَكُمُ الشَّيْطَانُ“

اصحاف: آیت ۲۰۔

اے اولادِ آدم شیطان تمہیں نہ فریب دے

۳۔ بلاء اور عذاب ۔ فرمان البی ہے:

”وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبُ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً“

النفال: آیت ۲۵۔

اس عذاب سے ڈرو جو فقط ظالموں ہی کے لیے نہیں بلکہ ان کے لیے بھی ہے جنہوں نے خود تو ظلم نہیں کیا مگر ظلم ہوتا رہا

اور وہ چپ ماسے رہے۔

۴۔ شرک، بت پرستی اور مومنین کی راہ میں رکاوٹ بننا ۔ ارشاد ہوتا ہے:

”وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَثَلًا“

النفال: آیت ۲۴۔

اللہ ان سے جنگ کرے یہاں تک کہ شرک اور بت پرستی باقی نہ رہے اور وہیں صرف اللہ سے لغو ہو جائے

۵۔ گمراہ کرتا اور گمراہی ۔ سورۃ مائدہ میں ہے:

”وَمَنْ يَرِدِ اللَّهُ فِتْنَتَهُ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهُ مِنْ اللَّهِ شَيْئًا“

مائدہ: آیت ۲۴۔

اور جو خدا گمراہ کر دے اور اس سے توفیق سب کرے تو تم اس کے مقابلے میں کوئی قدرت نہیں رکھتے

مید نہیں کہ ان تمام مسائل کی ایک ہی بنیاد جو ایسے مشترک الفاظ کی ہی صورت ہوتی ہے اور وہ بنیاد یہ ہے کہ فتنہ کا اصل لغوی معنی ہے کہ سونے اور پاندی کو آگ کے دباؤ کے نیچے رکھنا تاکہ خاص اور ناخالص حصہ جدا ہو جائے۔ اس لیے جہاں کہیں دباؤ اور سختی جو یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً امتحان کے مواقع پر شدت اور مشکل درپیش ہوتی ہے جو امتحان کا باعث بنتی ہے۔ عذاب بھی شدت کی ایک قسم ہے۔ فریب سے بھی یہی مفہوم نکلتا ہے کیونکہ فتنہ ذرائع سے کسی کو دھوکا دیکر دباؤ ہی ڈالا جاتا ہے۔ یہی حال کفر اور ملوثی کی ہدایت کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرنے کا ہے۔ ان میں سے ہر ایک میں ایک قسم کا دباؤ اور شدت پائی جاتی ہے۔

۱۹۴۔ الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمَاتُ قِصَاصٌ فَمَنْ
اعْتَدَى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا
اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ○

ترجمہ

۱۹۴۔ حرام مہینہ حرام مہینے کے مقابلے میں (اگر دشمن اس کا احترام نہ کریں اور تم سے لڑیں تو تم بھی مقابلہ بالمثل



کا حق رکھتے ہیں اور تمام حرام امور قابل قصاص میں اور ابطور کلی جو شخص بھی تم پر تجاوز کرے تو اس کی طرح تم بھی اس پر تعدی کر سکتے ہو اور خداست ڈرتے رہنا اور زیادتی نہ کرنا اور جان لو کہ خدا پر ہیز گاروں کے ساتھ ہے۔

تفسیر

مشرکین جانتے تھے اور پیغمبر اکرم سے سن بھی چکے تھے کہ حرمت والے مہینوں ذی القعدہ، ذی الحجہ، غرم اور جب میں اسلام کے نقطہ نظر سے جنگ کرنا ناجائز اور خصوصیت سے مسجد الحرام اور مکہ میں تو اور بھی زیادہ غیر درست ہے نیز پیغمبر اسلام اس حکم کا احترام کرتے ہیں اس لیے ان کی خواہش تھی کہ مسلمانوں پر اپنی مہینوں میں غفلت کی حالت میں حملہ کر دیں اور وہ خود ان عزم مہینوں کے احرام سے بے پروا تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ مقابلہ کریں اور یوں ہی رہا تو وہ اپنا مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔

ذیر بحث آیت سنئے ان کی سازش سے پردہ اٹھا دیا اور کہا کہ حرام مہینوں میں جنگ کا جواب اپنی مہینوں میں دیا جائیگا اور مہینوں میں مسلمانوں کی طرف سے مقابلہ درحقیقت ان مہینوں کا احترام کرنا ہے۔

”والحرمات قصاص....“ واقع میں ان لوگوں کا دندان شکن جواب ہے جو حرام مہینوں میں جنگ کی اجازت دینے پر پیغمبر اکرم پر اعتراض کرتے تھے یعنی نگاہ اسلام میں ماہ حرم کا احترام ان لوگوں کے مقابلے میں ہے جو اسے عزم بھیس لیکن جو اس کے احترام کو ہمال کریں ان سے رعایت ضروری نہیں اور ان سے اس ماہ میں بھی جنگ کرنا جائز ہے۔ اسی لیے مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ جنگ کی صورت واضح ہو جانے تو مقابلے کے لیے کھڑے ہو جائیں مگر مشرکین دوبارہ حرام مہینوں کا احترام نازل کرنے کی جرأت نہ کریں۔

اس کے بعد ایک کی اور عمومی حکم صادر فرمایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ مقابلہ پیش ہر مسلمان شخص کا فریضہ ہے۔ تمام لوگوں کو اجازت دی گئی ہے کہ عالم کے مقابلے میں کھڑے ہو جائیں اور جس قدر غم و شہد زہن پر کیا گیا ہے اتنا ہی اس کا جواب دیں۔

یہ کام فطرت و آفرینش کے قوانین کے مطابق ہے۔ یہاں تک کہ بدن کے خلیے متحرک نہ کرنے والے جراثیموں کے مقابلے میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور مملکت بدن پر ان کے تجاوز اور حملے کا دفاع کرتے ہیں۔ نباتات بھی اسی طبعی اور تکنیکی قانون سے استفادہ کرتے ہیں۔ وہ حوادث، طوفانوں اور مختلف حملات و زلزلوں کے مقابلے میں استقامت دکھاتے ہیں اور ان حملوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔

میسیت کہتی ہے: اگر کوئی تبار سے دائیں رخسار پر تھپتا مارے تو بایاں میں اس کے سامنے کر دو اور اسے دوسرے پہرے کے لیے تیار کر دو۔

اس کے برعکس اسلام کہتا ہے: جس قدر تم پر ظلم و تعدی ہو اس کا جواب اس طرح دو اور تسلیم کا معنی موت اور مقابلے کا معنی زندگی ہے۔ یہ ہے اسلام کی منطق! البتہ یہ امر دوستوں کو صاف کہنے اور ان سے درگزر کرنے کے منافی نہیں اور یہ ایک الگ بحث ہے۔

”وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاحْلِسُوا إِلَيْهِ غُلًّا“ اللہ مع المستعین۔ اس جملے میں دوبارہ تاکید کی گئی ہے کہ جواب اور دفاع تہذیب کی مقدار سے زیادہ نہ ہو کہ جو کہ جواب دینے میں زیادتی حرم تقویٰ و پرہیزگاری سے بعید ہے۔



۱۹۵۔ وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ
وَاحْسِنُوا إِلَافَةَ اللَّهِ يُحِبِّ الْمُحْسِنِينَ ○

ترجمہ

۱۹۵۔ اور راہِ خدا میں خرچ کرو اور خرچ نہ کر کے، اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ اور نیکی کرو کہ اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

تفسیر

جس طرقت جہاد میں فتنے، طاقتور اور بقیہ کارہ دونوں کی ضرورت ہے اسی طرح مال و دولت کی بھی احتیاج ہے کیونکہ جہاد میں روحانی و مہمانی آمادگی کی ضرورت ہے اور خرچ کے لیے مناسب اسلحہ اور سامان جنگ کی بھی احتیاج ہے۔ یہ صحیح ہے کہ پہلے درجے کا عامی سرفروخت اور انتہام جنگ کا تعین مجاہدوں اور جانباڑوں ہی سے ہوتا ہے۔ لیکن مجاہد نو مسلم کی بھی ضرورت ہے نہ ہی وجہ ہے کہ آیت تاکید کر رہی ہے کہ اس راہ میں خرچ نہ کرنا گویا اپنے تئیں ہلاکت و تباہی میں ڈالنے کے مترادف ہے۔

نصرہ اہل نامہ میں تو بہت سے مسلمان جذبے اور عشقِ جہاد سے سرشار تھے لیکن فقیروں و محتاج تھے اور اسباب جنگ ہتیا کرنے کی سکت نہ رکھتے تھے جیسا کہ قرآن اعلان کرتا ہے کہ وہ لوگ پیغمبر ﷺ کی خدمت میں آتے اور آپ سے درخواست کرتے تھے کہ ہمارے لیے ماہانہ جنگ مہیا فرمائیں۔ ہمیں میدانِ جنگ میں بھیجیں چنانچہ اسبابِ ہتیا نہ تھے لہذا وہ افسردہ اور غمگین رہتی ہوئی آنکھوں سے پٹتے آتے۔

تَوَلَّوْا وَاعْيَنِيهِمْ تَقِيَهُنَّ مِنَ الذَّمِّ حَزَنًا أَلَا يَجْعَلُونَ مَا يُلْقُونَ

”تھوڑے دنوں میں یہ بے ہمتے کوٹ جاتے اور غم زدہ ہوتے کہ ان کے پاس مال نہیں ہے وہ اسبابِ جنگ مہیا کریں اور میدانِ جنگ میں حاضر ہوں۔“ (نوبہ - ۵۰)

خرچ کرنا معاشرے کو ہلاکت سے بچاتا ہے۔

یہ آیت اگرچہ آیاتِ جہاد کے زمرہ میں آتی ہے لیکن اس سے ایک کی واجتماعی حقیقت معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ خرچ کرنا افراد و معاشرہ کو ہلاکت سے بچانے کا باعث بنتا ہے۔ اس کے برعکس اگر اتفاق اور خیریت کرنے کے عمل کو فروغ دیا جائے اور دولت ایک ہی جگہ نہ پاس جمع ہو جائے تو ایک عروم اور بے فزائلیت وجود میں آجائے گی۔ زیادہ ویرانہ حالت قائم نہیں رہے گی اور جلد ایک دھماکہ ہوگا جس کے نتیجہ میں انسان اور سرمایہ داروں کا مل جل کر خاکستر ہو جائے گا۔ اس سے خرچ کرنے اور ہلاکت سے بچنے کا باہمی رابطہ بھی واضح ہو جاتا ہے۔

اس بناء پر اتفاق اور خرچ کرنا عروموں اور ممالکوں سے پہلے سرمایہ داروں کے لیے مفید ہے یعنی دولت و ثروت کا اعتدال دولت و ثروت کا مخالف ہے۔ چنانچہ عزت علی اس حقیقت کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:



”حَسَنُوا مَوَالِكُمْ بِالزَّكَاةِ“

زکوٰۃ دے کر اپنے مال کی حفاظت کرو۔

”وَاحْسَنُوا إِلَى اللَّهِ يَحِبُّ الْمُحْسِنِينَ“ آیت نے آخر میں احسان اور عمل کرنے کا حکم دیا۔ کیا ہے اس طرت جہاں انفاق سے ملے سے احسان دینا ہے۔ یعنی اس طرف۔ جوئی کی کمی ہے کیونکہ اسلام کی نظر میں احسان انسانیت کے کمال و ارتقاء کے بلند ترین درجے کا نام ہے۔

آیت انفاق میں اس جیلے کا آنا اس طرف اشارہ ہے کہ انفاق میں نیکی کی مکمل تصویر اور مہربانی کا پورا اظہار ہونا چاہیے اور ہر قسم کے احسان جتنے اور جتنے اور سے اس شمع کو پہنچانے میں سے نیکی کی کمی ہے، پہنچا جائیے۔

۱۹۶۔ وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ فَإِنْ أُخْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ وَلَا تَحْلِلُوا ذُرْوَسَكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى مِنْ رَأْسِهِ فَفِذِيَّةٌ مِنْ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامٌ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فَإِنَّ الْحَجَّ وَسَبْعَةً إِذَا رَجَعْتُمْ يَتْلُ عَشْرَةَ كَامِلَةً ذَلِكَ لِئَلَّا يَكُنْ أَهْلُهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝

ترجمہ

۱۹۶۔ حج و عمرہ کو خدا کے لئے مکمل کرو اور اگر محصور ہو جاؤ اور ایسی رکاوٹیں پیدا ہو جائیں جن کے باعث نماز میں داخل نہ ہو سکو مثلاً دشمن کا خوف ہو یا کوئی بیماری لاحق ہو جائے، تو جو قربانی فراہم ہو اسے ذبح کرو اور احرام سے خارج ہو جاؤ اور اپنے سروں کو نہ منڈواؤ جب تک قربانی اپنے مقام تک نہ پہنچ جائے اور قربان گاہ میں ذبح نہ ہو جائے اور اگر کوئی بیمار ہو جائے یا اس کے سر میں کوئی بیماریت و اذیت ہو اور مجبور ہو کر وہ اپنا سر نہ منڈوانے، تو اسے چاہیے کہ روزہ، صدقہ یا کو سفند کی نعمت میں فدیہ اور کفارہ دے۔ جب بیماری یا دشمن سے، ماسوں ہو جائیں تو جو لوگ طرہ



ختم کرنے کے ساتھ ہی حج کا آغاز کر دیا تو جو قبلی انہیں میسر ہوا اسے ذبح کریں اور جن کے پاس نہیں ہے تو وہ تین دن حج کے دنوں میں اور سات دن دس آکر مکہ میں رہیں۔ یہ پورے دس دن ہیں البتہ یہ ایسے شخص کے لیے ہے جس کے گھر والے مسجد الحرام کے پاس نہ ہوں، جو اہل مکہ اور اطراف مکہ میں سے نہ ہوں اور خدا سے ڈرو اور جان لو کہ وہ سخت عتاب کرنے والا ہے۔

تفسیر

لفظ حج قرآن میں دس مقامات پر آیا ہے۔ ان میں سے ہر موقع پر اس اہم امر سے مربوط کسی نہ کسی حکم یا سائے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً

۱۔ "ثُمَّ تَوَجَّهْ إِلَى مَكَّةَ مُتَمَرِّدًا رَاكِبًا فَدْعَا لِقَوْمِكَ وَأَعْلَنِ فِي ذُلِّ لَبْسٍ إِنَّكُم مِّنْ قَوْمٍ مُّسْلِمِينَ" (توبہ 3)۔

"وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَى كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ" (آل عمران 97)۔

۲۔ "وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَى كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ" (آل عمران 97)۔

"وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَى كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ" (آل عمران 97)۔

۳۔ "وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَى كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ" (آل عمران 97)۔

۴۔ "وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَى كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ" (آل عمران 97)۔

۵۔ "وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَى كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ" (آل عمران 97)۔

۶۔ "وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَى كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ" (آل عمران 97)۔

۷۔ "وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَى كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ" (آل عمران 97)۔

۸۔ "وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَى كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ" (آل عمران 97)۔

۹۔ "وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَى كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ" (آل عمران 97)۔

۱۰۔ "وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَى كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ" (آل عمران 97)۔

عمرہ اور حج کے اعمال

عام طور پر غارِ حط کے زائرین پہلے موسمِ عمرہ اس ترتیب سے جاتا ہے:

میں نفاذ نہیں میقات کہتے ہیں۔ اسے احرام باندھنے میں یہی وہ عہد کرتے ہیں کہ احرام باندھنے سے پہلے جو شخص پر جو احرام لازم ہے، انہیں ترک کر دیں گے اور احرام کا لباس جو وہ ان کے پیشے کے عہدوں پر مشتمل ہوگا اسے پہن لیتے ہیں اور عیب و عیب لگتے ہوئے خداوندی طرف سے پڑتے ہیں۔ سب سے پہلے سات مرتبہ نماز کعبہ کا طواف کرتے ہیں اور اس کے بعد اس جگہ پر جو مقام پر یہ عہد کے نام سے مشہور ہے اور رحمت نماز ادا کرتے ہیں۔ اس کے بعد صفا و مروہ کی دو بیڑیوں کے درمیان آتے جاتے ہیں اور پھر اپنے چوہاں یا ناخن کاٹنے سے احرام سے خارج ہو جاتے ہیں۔ موسم حج بھلائے گئے ہیں تو احرام باندھتے ہیں۔ نویں ذی الحج کو مکہ سے چار فرسخ دور سیاحان طواف کی طرف جاتے ہیں۔ اس دن زوال سے گئے کہ غروب آفتاب تک وہاں رہتے ہیں۔ یہاں اپنے پروردگار سے دعا و نذر کرتے ہیں۔ غروب آفتاب کے بعد مشعر احرام کی طرف لوٹ رہتے ہیں۔ یہ مقام مکہ سے دو چار فرسخ دور ہے۔ رات اس مقدس داؤی میں بسر کرتے ہیں اور طلوع آفتاب کے وقت اس سرزمین سے منیٰ کی طرف چل پڑتے ہیں۔ یہ مقام مشعر احرام سے قریب ہی ہے۔ یہ عہد قربان کا دن ہے اسی دن ایک خاص جگہ "مجرہ عقبہ" پر سات خلیجیں مارتے ہیں۔ اس کے بعد قربانی کرتے ہیں اور پھر سر کے بال منڈوا کر احرام سے خارج ہو جاتے ہیں۔ اسی دن یا اس کے بعد مکہ کی طرف چل پڑتے ہیں۔ وہاں طواف خانہ خدا، نماز صفا، صفا و مروہ کے درمیان سعی، طواف منیٰ اور نماز طواف منیٰ بجالاتے ہیں۔ گیارہ اور بارہ کی درمیان رات منیٰ میں گزارتے ہیں۔ اس طرح موسم حج انجام دیتے ہیں۔ یہ حج واصلہ یا تہجدی واقعہ ہے اور اس کے بعد موسم تہذیب نفس سے مربوط مسائل اور اجتماعی و معاشرتی نفس کی طرف کنایات و اشارات ہیں۔ ان میں سے ہر مسئلہ متعلق آیات کے ذیلی تفصیل سے بیان ہوگا۔

اب اس امر کی طرف توجہ دی جانا چاہیے کہ آیت کہتی ہے کہ یہ تمام اعمال خدا کے لیے اور اس کے فرمان کے مطابق ہونا چاہئیں اور انہیں ظاہریت، ریاضی اور بتوں کے لیے نہیں ہونا چاہیے۔

اس بناء پر آیت کا پہلا جو "واعتصموا بحبل الحق والعمرة لله" بتاتا ہے کہ حج و عمرہ کے اعمال میں تقویٰ انہیں نے سوا کوئی وجہ اور سبب نہیں ہونا چاہیے۔

"فان احصرتکم فما استیسر من الہدیٰ" مزید بتاتا ہے کہ اگر احرام باندھنے سے پہلے جو اور چوہاں رکاوٹ مثلاً بیماری یا دشمن کا خوف لاحق ہو جائے اور عمرہ و حج کے اعمال نہ بجالانے یا سکیں تو ضروری ہے کہ اپنی استطاعت کے مطابق قربانی ذبح کرو۔

توجہ رہے کہ اگر یہ رکاوٹ بیماری وغیرہ کی طرت کی ہو اور عمرہ معذور کا احرام باندھ کر کعبہ کی قربانی کو مکہ میں بھیجنا چاہیے تاکہ وہاں ذبح کی جائے اور اگر دشمن کی طرف سے ممانعت ہوئی ہے تو جہاں میں وہیں قربانی کا ذریعہ انجام دینا چاہیے۔ جیسے پیٹر اگر تم نے حد میں کے مقام پر لیا تھا۔ اگر حج کا احرام باندھ کر کعبہ اور بیڑی کا سامنا ہو تو قربانی منیٰ میں بھیجنا چاہیے۔

"ولا تعلقوا بربوبکم حتیٰ یبلغ الہدیٰ معملہ....." حج میں جن آدمیوں کو انجام دینا ہے ان میں سے ایک سر کے بالوں کا منڈا دانا ہے لیکن توجہ رہے کہ قربان آدمیوں میں قربانی ذبح ہونے سے پہلے تہذیب و تمدن کے لحاظ سے نہیں رکھتے۔

مگر جس شخص کو کوئی بیماری یا کچھ اور رکاوٹیں درپیش ہیں جن کی وجہ سے اسے وقت سے پہلے سر منڈوانا پڑے اور اس کام کے

چشم انداز سورت میں نہ دینی ہے کہ قریم و سع اور یہ قدر تین دن کے روزے یا چھ سو سالین کو کھانا کھانا اور یا ایک بھیر ذبح کرنا جو
مستحب ہے۔

”فَاذْكُوا مِنْهُنَّ حَتَّىٰ تَشَبِعُوا بِأَعْصَرَةٍ فَإِنَّهُنَّ لَكُنَّ حَتَّىٰ تَشَبِعُوا“ جب
بیماری یا دشمن سے آسودہ خاطر ہو جاؤ اور حج تمتع انجام دینا چاہو تو اپنی دست و پائی کے مطابق اونٹ، گائے یا بھیر کی قربانی دو۔ قربانی کا جانور
ذبح کیے یا مالی حالت اس کی اجازت نہ دے تو تین دن حج کے ایام میں ساتویں، نویں اور نویں کا دن، اور سات دن واپس جانے کے
بعد کل دس دن روزے رکھو۔

”ثَلَاثَ عَشْرَةَ كَامِلَةً“ معلوم ہے کہ تین اور سات کل دس دن بنتے ہیں۔ پھر بھی قرآن کہتا ہے: یہ
دس دن کامل ہو جائیں گے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ حرف واو آخر چھام حرج جمع کرنے کے لیے آئی ہے نہ کہ تفسیر کے لیے ثلاث
عشيرة کاملہ کا جملہ یا آئی ہے اور شاید لفظ ۱۱ اس حرف بھی اشد و کثرت ہو کہ دس دن کے روزے سے بعد کامل قربانی کا تمام
مقام بن سکتے ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے۔ دس واحد ایک لحاظ سے کامل ترین عدد ہے۔ یوں اعداد و وجوب ایک سے شمار کرتے ہیں تو وہ دس تک پہنچ
معدودی میراثی میل کرتے ہیں۔ اس کے بعد تو حقیقت میں دس اور کسی دس سے پہلے دس کی ترتیب ہے۔ مثلاً لیو دس اور ایک اور
بارہ اس اور دو ۱۱

”ذَلَّلْتُ لَكُمْ لَمْ يَكُنْ اَمَلًا حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ“ یہ حج
تمت کا پروگرام ان لوگوں کے لیے ہے جو مسجد الحرام میں موجود یا اس کے قرب و جوار میں نہ ہوں۔ (فقہاء میں مفسر یہ ہے کہ جو شخص مکہ سے
۴۸ میل دور رہتا ہے حج تمتع اکی ذمہ داری ہے لیکن برومک سے آشنا و رہیں اس کا فرض حج قرآن یا حج افراد ہے، اس مسئلے کی تفصیل
اور مدارک فقہی کتب میں موجود ہیں۔

آیت کے آخر میں حکم دیا گیا ہے کہ تقویٰ اختیار کرو اور اس سلسلے میں جو احکام دینے لگے ہیں ان کی تعمیل میں کسی قسم کی کوتاہی نہ
کرو اور چور و کار کے شدید عقاب سے اپنے آپ کو محفوظ رکھو۔

یہ تاکید شاید اس لیے ہے کہ حج ایک اہم اسلامی عبادت ہے اور اگر اس کے مراسم و اعمال پر پوری توجہ نہ دی جائے یا اس کی
روح کو فراموش کر دیا جائے تو مسلمانوں کو بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑے گا۔

حج وہ عبادت ہے جسے امیر المؤمنین نے اسام کا پرچم اور ایم شعار قرار دیا ہے۔ اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں آپ نے دینیت
کے جوئے ارشاد فرمایا:

”اَفْلَهُ اَفْلَهُ فِي بَيْتِ رَبِّكُمْ لَا تَعْلُوهُ مَا بَقِيْتُمْ فَاَتَا
اَنْ تَرَكْتُمْ لَمْ تَحَاطَرُوا“ :

تمیں خدا کی قسم دیتا ہوں جب تک زندہ ہو خانہ خدا سے دستبردار نہ بنایا کرو کہ اگر اس کی زیارت متروک ہو گئی
تو تمیں بہت نہیں دی جائے گی اور خدا و جود خطبے میں پڑ جائے گا۔



دشمنان اسلام کی طرف سے یہ جہد بھی مشہور ہے کہ وہ کہتے ہیں: جب تک حج کی رونق برقرار ہے ہم ان پر کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔
ایک اور دانشور کہتے ہیں:-

مسلمانوں کی حالت پر افسوس ہے اگر وہ حج کا معنی اور حقیقت نہ سمجھ سکیں اور دوسروں پر بھی افسوس ہے اگر وہ اس کا معنی سمجھیں۔

اس بحث کے آخر میں جس نکتے کی طرف اشارہ کیا ضروری ہے یہ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ حج تمتع (دو حج جو پہلے عمرہ سے شروع ہوتا ہے اور اس میں موسم کے تمام اعمال بجالانے کے بعد احرام سے نکل جاتے ہیں پھر نئے سرے سے حج کا احرام باندھتے ہیں اور اس کے بعد بکالات میں اشریت اسلام میں زیر نظر آیت کے مطابق ضرورت ہے اور اس آیت کی منسوخی کے بارے میں ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں۔ نیز اس مسئلے میں شیعہ اور اہل سنت کتب میں بہت سی روایات منقول ہیں۔ ان میں سے ہر سنت کے مشہور محدثین مثلاً نسائی نے اپنے متن میں امام احمد نے اپنے مسند میں۔ ابن ماجہ نے اپنے سنن میں۔ بیہقی نے اپنے مشہور سنن میں۔ ترمذی نے ہشدرہج میں اور مسلم نے بھی اپنی مشہور کتاب میں ان کی روایات نقل کی ہیں یہ حکم منسوخ نہیں ہوا اور قیامت کے دن باقی ہے۔

جو مشہد روایات عزت غریبے اس حج کی اور نکاح موقت کی حرمت کے بارے میں نقل ہوئی ہے وہ واضح ہے کہ ہر حج قرآن کے مقابلے میں وہ کسی طرح بھی قابل اعتبار نہیں ہے قطع نظر اس کے کہ پیغمبر اسلام کے علاوہ کوئی شخص کسی حکم کو منسوخ کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ اسی بنا پر اہل سنت کے بہت سے علماء نے بھی مذکور روایت کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

۱۹۷۔ الْحَجُّ أَشْهَرُ مَعْلُومَاتٍ ۖ فَمَنْ فَرَضَ فِيهِِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ ۚ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۚ وَمَا تَفَعَّلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ اللَّهُ ۚ وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّمْضُؤَ وَالثَّقُونَ يَأُولَى الْأَلْبَابِ ۝

ترجمہ

۱۹۷۔ حج معین معینوں میں ہے اور جو لوگ احرام اور مناسک حج شروع کرینے سے حج اپنے اوپر فرض کر لیتے ہیں انہیں توجہ رکھنی چاہیے کہ حج میں عورتوں سے جنسی ملاپ، گناہ اور جدال نہیں ہے اور جو اچھے کام تم انجام دیتے ہو، خدا انہیں جانتا ہے۔ زاد و راہ اور توشہ مہیا کرو کیونکہ بہترین زاد و توشہ پرہیزگاری ہے اور اسے صاحبان عقل مجھ سے ڈرو۔

تفسیر

اس آیت میں قرآن یاد دلاتا ہے کہ حج کا عمل معین معینوں میں انجام پانا چاہیئے اور اسے سال بھر انجام نہیں دیا جاسکتا اور جیسا کہ کتب حدیث، تفسیر اور فقہ میں ہے کہ یہ عظیم عبادت صرف شوال، ذی القعدہ اور ذی الحجہ کے پہلے دس دنوں میں انجام دی جاسکتی ہے

سنت نبوت ص ۱۱۵



۱۹۸۔ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِنْ رَبِّكُمْ
فَإِذَا أَقَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللَّهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ
الْحَرَامِ وَادْكُرُوهُ كَمَا هَدَيْكُمْ وَإِنْ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهِ
لَمِنَ الضَّالِّينَ ○

۱۹۹۔ شَعْرَ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ
إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ○

ترجمہ

۱۹۸۔ کوئی گناہ اور حرج نہیں کہ تم اپنے پروردگار کے فضل سے (اور ایام حج میں اقتصادی منافع سے) فائدہ اٹھاؤ (کیونکہ حج کا ایک فلسفہ اسلامی اقتصادی معاشرے کی بنیاد رکھنا بھی ہے) اور جب میدان عرفات سے کوچ کرو تو مشعر اطرام کے پاس خدا کو یاد کرو اسے اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے تمہیں ہدایت کی ہے اگرچہ اس سے پہلے تم لوگ گمراہ تھے۔
۱۹۹۔ پھر اس جگہ سے کہ جہاں سے لوگ کوچ کرتے ہیں اس سرزمین منیٰ کی طرف کوچ کرو اور خدا سے طلب مغفرت کرو جو بخشنے والا مہربان ہے۔

تفسیر
موسم حج میں اقتصادی کارکردگی

نماز جاہلیت میں موسم حج بجالانے کے موقع پر معامہ تجارت، مسافروں کو رہے جانا اور مسلمان لانا بے جہاد حرام اور گناہ سمجھا جاتا تھا۔ مسلمان فطری طور پر منتظر تھے کہ انہیں معلوم ہو کہ زمانہ جاہلیت والے احکام جوں کے توں باقی رہیں گے یا یہ کہ اسلام ان کے بے وقعت ہونے کا اعلان کرتا ہے۔
محل بحث آیت نے ان دنوں میں معامہ یا تجارت کے گناہ ہونے کو غلط قرار دے دیا ہے اور بتایا ہے کہ موسم حج میں کسی قسم کا معامہ یا تجارت کرنے میں کوئی مانع اور حرج نہیں اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ لوگ فضل خدا سے بہرہ ور ہوں اور کوئی نفع حاصل کریں اور اپنے اہل و عیال کی کمائی سے فائدہ اٹھائیں۔
اسلامی کتب اور منابع میں حج کے فلسفہ میں جہاں اس کے اخلاقی، سیاسی اور ثقافتی پہلوں کی طرف اشارہ ہوا ہے



”واذکروه کما هماک و.....“

اس جیسے میں قرآن متوجہ کرتا ہے کہ پروردگار کی ہدایت کے نکلانے کے طور پر مشعل المومنین میں اس کی یاد میں رہو ایسی یاد جو اس ہدایت کے مطابق ہے جو خدا کی طرف سے ہے اس نام پر جو ہو سکتا ہے کہ لفظ کا یہاں لیا یا مثل نے معنی میں ہو۔ اُس زمانے میں مسلمان اس عظیم نعمت یعنی ہدایت کی قدر قیمت کو اچھی طرح سمجھ سکتے تھے کیونکہ اُن کا ماحصل اس دور سے زیادہ نہ تھا۔ جب جزیرۃ العرب ہر طرف سے گلابی میں گلابوڑا تھا۔ اُن کے سامنے تھا کہ خداوند عالم نے کس طرف انہیں اس پاک دین کی برکت سے ان تمام بد نصیبوں، گلابیوں اور سرگردانیوں سے نجات دی ہے ”وان کنتم ممن قبلہ لمن العتالین“

عرفات کو عرفات کیوں کہتے ہیں۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ عرفات مکہ سے چار فرسخ کے فاصلے پر ایک وسیع و عریض بیابان ہے۔ وہاں حاجی حضرات نویں ذی الحجہ کو زوال آفتاب سے لے کر غروب تک ٹھہرتے ہیں۔

اس سرزمین کا نام عرفات کیوں ہے۔ اس بارے میں بہت سے پہلوؤں پر غور کریں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب خدا کی وحی کا ماحصل جبریل حضرت ہاشم کو مناسک حج کی نشاندہی کر رہا تھا تو حضرت ابراہیمؑ کہتے ”عرفت“۔ عرفت، یعنی میں نے پہچان لیا۔ میں نے پہچان لیا۔

لیکن بعید نہیں کہ یہ نام رکنا ایک اور حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہو اور وہ یہ کہ یہ سرزمین جہاں سے مراحل حج شروع ہوتے ہیں معرفت پروردگار اور اس کی پاک ذات کو پہچاننے کے لیے بہت آگاہ اور تیار ماحول مہیا کرتی ہے۔ اس لیے تو یہ ہے کہ وہ روحانی اور معنوی جذبہ جو انسان میں اس سرزمین میں داخل ہوتے وقت پیدا ہوتا ہے اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔

سب ایک ہی صورت میں، سب ایک انداز میں، سب بیابان نشیں، شہر کے شور و غل سے دور، مادی دنیا کے زخموں سے پرے، ذوق و برقی دنیا سے اوجھل ایک آزاد اور گناہ سے پاک نفا میں آسمان کے سامنے کھڑے اُس جگہ جہاں فرشتہ وحی کے پرچھوٹے رہے ہیں سے جبریل کا روبرو۔ ابراہیمؑ خلیل اللہ کی مروانہ وار پکار، پیغمبر اسلام اور صد اول کے مجاہدین کی حیات بخش صدا کی بھینبٹ آج بھی سنائی دیتی ہے۔ وہ مقام جہاں انسان نہ معرفت یہ کہ عرفان پروردگار کے نشتر میں سرمست ہو جاتا ہے اور کچھ لمحوں کے لیے ساری مخلوق کی تسبیح کے سرور سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر وہ جان لیتا ہے کہ وہ وہ شخص نہیں جو رات دن تلاش معاش میں حریصانہ کی دھمکی دہشتوں کو اپنے قدموں سے مارتا رہتا تھا اور جو کچھ ملتا تھا اُس سے میراب نہ ہوتا تھا یہاں وہ جان لیتا ہے کہ ایک اور گویہ اس کی روح کے اندر چھپا ہوا ہے جو دراصل اُس کے وجود کی حقیقت ہے۔

جی ہاں اس سرزمین کو عرفات کہتے ہیں۔ کس قدر عمدہ اور مناسب نام ہے۔



مشعر الحرام

کے نام کے بارے میں بھی کہا گیا ہے کہ وہ جو شائع کا مرکز ہے اور ان عظیم و پر شکوہ آسمانی مزاہم کی نشانی ہے۔
 لیکن یہ نہیں جھوٹا چاہیے کہ مشعر - مشعر کے مادہ سے ہے۔ اس تاریخی رات، اس ذی الحجہ کی رات، جب زاہرین
 تازہ خدا اور معرفت میں اپنا ترمیمی پروگرام مکمل کرنے کے بعد اوجہ کوچ کرتے ہیں۔ رات فوجی سے صبح تک نرم چٹھروں پر تاروں پر
 آسمان تلے، ایک ایسی سرزمین پر جو مشعر کبریٰ کا نور اور قیامت عظمیٰ کا ایک ظہور بنی ہوئی ہے۔ لوگ ہر طرف یوں پھیلے ہوئے ہیں
 جیسے شاخیں مارنے والے سمندر کی موجیں ہوں۔ صبح تک لوگوں کی آوازیں اس سرزمین پر سنائی دیتی رہتی ہیں۔
 جی ہاں آلائشوں سے پاک اس پاکیزہ اور بے دینے والے ماحول میں، احرام کے مصداق لباس میں، نرم لنگریوں پر بیٹھا
 انسان اپنے اندریں محسوس کرتا ہے جیسے ٹکر و شعور کے تازہ چشمے ابل رہے ہوں اور ان کا پانی دل کی گہوڑیوں میں گرا رہا ہو
 اور وہ اپنے اندر سے ان جہروں کی آواز صاف طور پر سن رہا ہو۔ جن اسی جگہ کو مشعر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

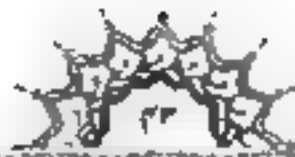
”ثُمَّ أَفْبَضُوا مِنْ حَيْثُ أَفْبَضَ النَّاسُ“

نہایت جلیل نے اس آیت میں ایک امتیاز اور خصوصیت پر خط بطلان کھینچا ہے جس کے قریش مکہ اپنے ہاں سے قائل تھے قریش
 اپنے تئیں محسوس و بر وزن محسوس، کہتے تھے اور وہ اپنے آپ کو اولادِ ابراہیم اور سرپرستِ کعبہ قرار دیتے تھے۔
 وہ کسی عرب کو اپنے برابر نہ کہتے تھے وہ کہتے تھے حرم مکہ سے باہر رہنے والوں کا احترام حرم میں رہنے والوں کے برابر نہیں کرنا
 چاہیے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر ہم ایسا کریں گے تو عرب بھڑی قدر و قیمت کے قائل نہیں ہوں گے۔ اسی بنا پر انہوں نے عرفات میں ٹھہرنا
 روک کر دیا تھا کیونکہ وہ محض حرم سے باہر تھا حالانکہ انہیں معلوم تھا کہ یہ فرائض حج اور دینِ ابراہیم کا جزو ہے سنا
 مندرجہ بالا آیت میں قرآن حکم دیتا ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ سب ایک ہی جگہ عرفات میں وقوف کریں اور وہاں سے سب
 نے سب مشعر کی طرف آجائیں اور چرواہوں سے سرزمینِ منیٰ کی طرف کوچ کریں۔
 ”وَاسْتَغْفِرُوا لِلنَّاسِ“

مزید فرماتا ہے کہ خدا سے طلب مغفرت کرو اور نہانہ جاہلیت کے ان افکار و خیالات سے کنارہ کشی کرو کیونکہ حج مساوات
 و برابری کا درس ہے اور یاد دلاتا ہے کہ خدا غفور و رحیم ہے۔

۲۰۰۔ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ
 اٰبَآئَكُمْ اَوْ اَشْهَدُ ذِكْرًا فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا اٰتِنَا
 فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝

پس جب تم نے مناسک تمہاری پوری کی تو اللہ کو یاد کرو جیسے تم اپنے والدین کو یاد کرتے ہو۔ اور لوگوں میں سے ایسے ہیں کہ کہتے ہیں: ہمارے رب! ہمیں دنیا سے عطا فرما، لیکن آخرت میں ان کے لئے کوئی حلقہ (خلاق) نہیں ہے۔



۲۰۱۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي
الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○
۲۰۲۔ أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا وَاللَّهُ سَكْرِينٌ
الْحِسَابِ ○

ترجمہ

۲۰۰۔ اور جب اپنے مٹاؤں کا حج انجام دے تو تو ذکر خدا کرو جیسے ازمانہ جاہلیت میں مہجوم مغافروں پر
فرد مہبات کرتے ہوئے، اپنے آباء کو یاد کرتے رہے، جو بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ایساں دو طرح کے
لوگ ہیں، بعض کہتے ہیں خدا یا ہمیں دنیا میں بھلائی عطا کر، ایسے لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔
۲۰۱۔ بعض کہتے ہیں خداوند ہمیں دنیا میں بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی اچھائی سے نواز اور ہمیں جہنم کی
آگ کے عذاب سے محفوظ رکھ۔

۲۰۲۔ وہ اپنی کوشش (اور دعا) کا صلہ اور حصہ پائیں گے اور خدا جلد حساب چکا دینے والا ہے۔

تفسیر

امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ زمانہ جاہلیت میں مہجوم حج کی انجام دہی کے بعد ایک اجتماع منعقد ہوا کرتا تھا اور لوگ
اپنے باپ دادا کی طرف سے ملنے والے مہجوم افکار و خیالات خوب بیان کیا کرتے تھے۔ فرقہ متوجہ کرتا ہے کہ اعمال حج بجالانے کے
بعد خدا کو یاد کیا کرو اور اس عظیم جنت میں خدا اور اس کی وسیع و بے شمار نعمتوں پر غفلت نہ کرو اور اپنے دلوں کو اس کی جانب مائل
کر دو اور اس یاد خدا میں اتنا توشوق و شغف اور سوز و گداز ہو جتنا زمانہ جاہلیت میں اپنے آباء و اجداد کے فرد مہبات کے ضمن میں
ہوتا تھا بلکہ خدا سے بڑھ کر کسی اور سے میں تو زیادہ جوش و خروش اور بھلائی ہونا چاہیئے۔

”فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَاءَكُمْ اَوْ اَشْذَكُرُوْا“

ضمنی طور پر اس آیت سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ بزرگی اور عظمت خدا سے مربوط رہنے میں ہے نہ کہ اپنے آباء و اجداد کے
مہجوم مغافروں مہبات سے وابستگی میں۔

”فَمَنْ النَّاسُ مَنِ يَقُولُ.....“

اس کے بعد فرقہ دو گروہوں کی کیفیت کو واضح کرتا ہے اور ان کے افکار و فہم کا تذکرہ کرتا ہے۔ ان میں سے ایک گروہ
وہ ہے جو مادی منافع کے سوا کچھ نہیں دیکھتا اور ان کے علاوہ خدا سے کسی چیز کی درخواست نہیں کرتا اور وہ کہتا ہے

”رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً“ خدا! ہمیں دنیا کی نعمتیں بخش دے۔



ایسے لوگوں کا معنویت و روحانیت میں کوئی حصہ نہیں اور آخرت میں ان کے نصیب میں کچھ نہیں۔ یہ لوگ اس ابدی و باقی اور ہمیشہ رہنے والے جہاں سے بے بہرہ ہیں۔ جہاں انسان کو ہر چیز کی ضرورت ہوتی۔

دوسرے گروہ میں وہ لوگ ہیں جن کے افکار و نظریات فقط مادی زندگی تک محدود نہیں بلکہ وہ حیات دنیا کو بھی معنوی نکال و ارتقا کے لیے مقدمہ سمجھتے ہیں اور آخرت کے فکری مسائل کے بھی طلب کار ہیں۔ یہ آیت درحقیقت اسلامی منطق کو مادی اور معنوی مسائل میں مطبوع کرتی ہے اور جو لوگ صرف مادیات میں ڈوبے ہوئے ہیں انہیں ان لوگوں کی طرح مذہب قرار دیتی ہے جو دنیاوی زندگی پر کوئی نظر نہیں رکھتے نیز یہ آیت انسانوں کی اس جہان میں دردناک عذاب سے نجات بھی چاہتی ہے۔

”وَقَسَا عَذَابُ النَّارِ“

”حسنہ“ کا معنی ہے ”نیک“۔ اس کا ایک وسیع مفہوم ہے۔ اس میں تمام مادی و معنوی نعمتیں شامل ہیں۔ لیکن بعض احادیث میں حسنہ کے مفہوم کے بارے میں پیغمبر اسلام سے منقول ہے۔

”وَمَنْ أَوْفَىٰ قَلْبًا شَاكِرًا وَلِسَانًا ذَاكِرًا وَزَوْجَةً مُّؤْمِنَةً قَمِيْنَةً عَلَىٰ أَمْرٍ دُنْيَا وَآخِرَةٍ فَقَدْ أَوْفَىٰ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقَدْ عَذَابُ النَّارِ“

پھر خدا اللہ کریم دل دے۔ یا حق میں شمول زبان بخشے اور صاحب ایمان بیوی ملے جو
اور دنیا و آخرت میں اس کی مددگار ہو اسے دنیا و آخرت کی نیکی بخشے ہے اور آتش جہنم کے
عذاب سے بچا ہے۔

واضح ہے کہ اس حدیث میں عام مفہوم کی بعض خاص امور کے حوالے سے تفسیر کی گئی ہے اور اس میں بعض واضح مسلمات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ مفہوم اس کا بس یہی مفہوم ہے۔

”أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ“

گذشتہ بحث کے بعد اس آیت میں ہے کہ دونوں گروہ اپنی کادشوں کے نتیجے سے بہرہ ور ہوتے ہیں، وہ بھی جو خدا سے صرف دنیا چاہتے ہیں اور وہ بھی جو دنیا و آخرت کے خواستگار ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی محروم نہیں ہوتا البتہ ہر ایک کا خدا اس کی خواہش تک محدود ہے۔

حقیقت میں یہ آیات سورہ اسراء کی آیات ۱۷ اور ۲۰ کی طرح ہیں جن میں فرمایا گیا ہے :

جو شخص دنیا کا طالب ہے جتنی مقدار ہم چاہتے ہیں اسے دے دیتے ہیں اور جو

آخرت کو چاہتا ہے اور اس کے لیے کوشش کرتا ہے جبکہ ایمان بھی لکھا ہے تو

اس کی سنی نیت بخش ہوگی اور ہر گروہ کو تیرے پروردگار کی عطا و بخشش پہنچے گی وہیگا۔

خلاصہ یہ کہ انسان دو کچھ پائے گا جو کچھ چاہے گا۔

جو نکتہ یہاں باقی رہا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اس آیت میں دعا کو کسب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا دعا



کو کسب و کسب کہا جاسکتا ہے ؟

قرآن مجید میں ۶۴ مقامات پر مادہ کسب اور اس کے مشتقات کا استعمال کیا گیا ہے ۔ ان کے مطالعہ سے نتیجہ نکلتا ہے کہ لفظ کسب جہان کاموں کے علاوہ روحانی اور قلبی امور میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔

سورہ بقرہ کی آیت ۲۲۵ میں ہے :

”وَلٰكِنْ يَتَوَخَّضْكُمْ بِمَا كَسَبْتُمْ فَلَوْ بَكْمُ“

یعنی جو تباہی دے دلی کسب کرتے ہیں اس پر ہم تباہی و ممانعت کریں گے

سورہ نساء کی آیت ۱۱۱ میں ہے ۔

”وَمَنْ يَكْسِبْ اَشْثًا فَانْشَأْ بِكَ سَبْہٌ عَلٰی نَفْسِہِ“

جو شخص کسب کرے گا وہ اپنے ہی نقصان میں کسب کرے گا ۔

اس بناء پر دُعا اور خواہش بھی ایک طرح کا کسب و کسب ہے ۔ علاوہ انہی حقیقی دُعا صرف زبان سے نہیں بلکہ پوسے و جود انسانی سے ہوتی ہے ۔

زیر بحث آیت کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی ہے وہ یہ کہ لفظ ”اولئک“ صرف دوسرے گروہ کی طرف اشارہ ہو جو دنیا و آخرت دونوں کے درپے ہیں جو مادیت و معنویت کو ایک دوسرے سے جدا دیتا ہے یہ ان لوگوں کا گروہ ہے جو نہ صرف مادی ہیں اور نہ صرف تادیک دنیا ۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی مادی توجہ و تشریک پہنچتی ہیں اور وہ ان سے بہرہ ور ہوتے ہیں لیکن دوسرے لوگوں کی ذاتیں اور کوششیں رائیگاں جاتی ہیں ۔

”وَاللّٰہُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ“

پروردگار کی جانب سے آیت کے تخری منے میں سرعت حساب کی یاد دہانی کرائی گئی ہے ۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ خدا چشمزدن میں سب کا حساب کر دے گا ۔

”اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی یَحْصِبُ الْخَلَائِقَ حَصْبَہُمْ فِی مَقْدَرِ الْمَصْرِحِ الْبَصْرِ“

یہ اس بناء پر ہے کہ خداوند عالم مخلوقات کی طرح نہیں ہے ۔ مخلوقات کا وجود اور ہستی چونکہ محدود ہے اس لیے جب وہ ایک معاملے میں مشغول ہوں تو دوسرے سے ناخالص ہوتی ہیں جب کہ خدا تعالیٰ یوں نہیں ہے ۔ علاوہ انہی محاسب کے لیے پروردگار کو کسی نہانے کی ضرورت نہیں ہوتی چاہیے کیونکہ ہمارے افعال کا اثر جسم و جان ، ہمارے کردار کے موجودات ، زمین اور ہوا کی موجوں میں باقی ہے ۔

حقیقت میں معطو ان خود کار مشینوں کا سب سے جن کی کارکردگی (output) اُن کے ساتھ ساتھ گھومنے والے نمبر سے ظاہر ہو جاتی ہے ۔



۲۰۳ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدَاتٍ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ لِمَنِ اتَّقٰ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝

ترجمہ

۲۰۳ — اور خدا کو معین دنوں (۱۱، ۱۲ اور ۱۳ ذی الحجہ) میں یاد کرو اور جو لوگ جلدی کریں اور (ذکر خدا کو) دو دنوں میں انجام دیں ان پر کوئی گناہ نہیں اور جو تاخیر کریں (اور تین دن انجام دیں) ان پر بھی کوئی گناہ نہیں یہ ان کے لیے ہے جو تقویٰ اختیار کریں۔ نیز خدا سے ڈرو اور جان لو کہ تم اس کی طرف محشور ہو گے۔

تفسیر

یہ آیت مراسم حج کے بعد ذکر خدا کا پروگرام پیش کرتی ہے۔ اس کے مطابق نماز، جاہلیت کے مہووم مغاخر کی بجائے چند روز یا الہی میں بسر کرنا چاہیے۔ یہ مدت کم از کم دو دن اور زیادہ سے زیادہ تین دن ہے۔ سابق آیات کے قرینہ سے یہ دن عید قربان کے مراسم کے بعد ہیں اور یہ یقیناً ذی الحجہ کی ۱۱، ۱۲ اور ۱۳ تاریخیں ہیں۔ روایات کی زبان میں ان دنوں کو ایام تشریق کہا جاتا ہے اور جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے یہ روشنی بخشنے والے دن ہیں جن میں ان بلند مرتبہ مذہبی مراسم کے ذریعے انسانی روح اور جان روشن ہو جاتی ہے۔

حدیث کے مطابق ۱۵ نمازوں کے فوراً بعد جو عید کے روز نمازِ ظہر سے لے کر ۱۳ ذی الحجہ کی نمازِ صبح تک ہیں ان ایامِ بخشش میں کافرا کا توبہ کیا جاتا ہے :

”اللّٰهُ اَكْبَرُ، اللّٰهُ اَكْبَرُ، اللّٰهُ اَكْبَرُ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ،
وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ، اللّٰهُ اَكْبَرُ عَلٰی مَا هَدَانَا، اللّٰهُ اَكْبَرُ عَلٰی
مَا رَزَقْنَا مِنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ“

”فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ“ (اس پر کوئی گناہ نہیں) ہو سکتا ہے یہ عید دو اور تین دن کے ذکر خدا میں اختلاف کی طرف اشارہ ہو یعنی اس تعداد میں سے جسے چاہو اختیار کرو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے (اور آیت سے ابتدائی طور پر بھی یہی مفہوم ظاہر ہوتا ہے)۔

یہ بھی ممکن ہے کہ آیت کے اس حصے میں خاندانِ خدا کے زائرین سے مطلق گناہ کی نفی ہو یعنی ایمان، غنیمت اور توبہ سے مناسبت حج انجام دینے سے جو ان اذکار سے عقل ہوتے ہیں، زائرین کو گناہوں کے آثار اور تہ در تہ



گناہ و معاصی ان کے قلب و جان سے دھل جائیں گے اور جب وہ اس مفیم تربیتی مکتب سے نکلیں گے تو ان کی روحیں آکاش گناہ سے پاک ہو چکی ہوں گی۔ "لَعَنَ النَّاسُ" یعنی۔۔۔ ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ اختیار کریں گے الفاظ اسی مفہوم کی تائید کرتے ہیں۔

۲۰۴۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهَدُ اللَّهُ عَلَى مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ ○

۲۰۵۔ وَإِذَا تَوَلَّى سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسَادَ ○

۲۰۶۔ وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ وَلَيْسَ الْمِهَادُ ○

ترجمہ

۲۰۴۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کی گفتگو دنیاوی زندگی کے لیے تمہیں بھلی معلوم ہوتی ہے اور وہ جودل میں چھپائے ہوئے ہیں خدا اس پر گواہ ہے اور (جبکہ) وہ سخت ترین دشمن ہیں۔

۲۰۵۔ (ان کی نشانی یہ ہے کہ) جب وہ رُخ پھیرتے ہیں اور تیری بارگاہ سے بھٹتے ہیں تو زمین میں فساد برپا کرنے کے درپے ہوتے ہیں اور وہ فصول اور چوپالوں کو تباہ و برباد کرتے ہیں اس کے باوجود کہ وہ جانتے ہیں کہ خدا فلاں کو پسند نہیں کرتا۔

۲۰۶۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا سے ڈرو تو ان کا اصرار اور بٹ و دھرمی بڑھ جاتی ہے اور عند اور تعصب انہیں گناہ کی طرف کھینچنے لگتے جاتے ہیں۔ جہنم کی آگ ان لوگوں کیلئے کافی ہے اور (جہنم) کیا بُری جگہ ہے۔

شان نزول

یہ آیات انھیں بن شریق کے متعلق نازل ہوئی ہیں۔ وہ خوبصورت اور خوش بیان شخص تھا۔ وہ پیغمبر اکرم سے دوستی کا اظہار کرتا تھا اور خود کو مسلمان ظاہر کرتا تھا۔ جب پیغمبر اسلام کی خدمت میں حاضر ہوتا اور آپ کے پاس بیٹھتا تو اظہارِ ایمان کرتا اور منافق ہونے کے باوجود قسمیں کھاتا اور کہتا کہ میں آپ کو دوست رکھتا ہوں اور خدا پر ایمان رکھتا ہوں۔ پیغمبر بھی دلفراں اسے تپک سے ملنے اور اس سے اظہارِ لطف و محبت فرماتے۔



ایک مرتبہ اس کے اور قبیحہ ثقیف کے درمیان دشمنی ہوئی۔ اُس نے ان پر شب خون مارا۔ اُن کے چوپائے مار ڈالے اور فصلوں کو آگ لگا دی۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ دو مسلمانوں کے کھیتوں سے گزرا اور انہیں آگ لگا دی اور ان کے چوپایوں کے پاؤں کاٹ دیئے۔ اس طرح اس نے اپنے اندرونی نفاق کو ظاہر کیا اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

بعض نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ مذکورہ آیات سریرہ جمیع کے بارے میں ہیں۔ واقعہ یوں ہے کہ مبلغین اسلام کی ایک جماعت پیغمبر اکرمؐ کی طرف سے اطرافِ مدینہ کے لیے روانہ ہوئی تاکہ مختلف گروہوں سے ملاقات کرے۔ ایک نامزدانہ سازش کے نتیجے میں وہ سب شہید ہو گئے۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

پہلی شان نزول آیات کے مضمون سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔ بہر حال آیات سے طے نالادرس عمومی ہے اور سب کے لیے ہے۔

تفسیر

جیسا کہ شان نزول میں آیا ہے آیات بعض منافقین کے نفاق کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور ان کا تعاقب ہے کہ پیغمبر اکرمؐ اپنے تئیں ان سے بچائے رہیں۔ فرمایا گیا ہے کہ کچھ لوگ اپنی باتوں سے اظہارِ ایمان کرتے ہیں اور قسم کھا کر یوں ظاہر کرتے ہیں کہ ان کی باتیں اُن کے اعتقاد کی منعبر ہیں مگر وہ اسامہ کے سخت ترین دشمن ہیں۔ اسی لیے یہ لوگ جب پیغمبرؐ کی خدمت سے انکار باہر جاتے ہیں تو زمین میں فساد کرتے ہیں۔ کھیتوں کو اجاڑ دیتے ہیں اور انسانوں کو تباہ کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اُن کے رُخ گردار سے پردہ اٹھاتا ہے اور اُن کے باطن کو پیغمبر اکرمؐ کے سامنے آشکار کرتا ہے اور فتنہ اور فساد میں اُن کی بڑھتی ہوئی غارت کے بارے میں بھی اکرمؐ سے کہتا ہے، اگر یہ لوگ اپنے اظہارات میں سچے ہوتے تو فساد اور تخریب کاری کی طرف ہتھ نہ بڑھاتے کیونکہ سب کو معلوم ہے کہ خدا تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ ”وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الْفُسَادَ“ ”یہ امر کہ پیغمبر اکرمؐ ایسے افراد سے کشادہ روئی سے کیوں ہمیشہ کہتے تھے تو وہ اس لیے کہ آپؐ مامور تھے کہ لوگوں کے ظاہر کو قبول کریں۔ جب تک کہ اُن سے کوئی مخالفت سرزد نہ ہو اور ہونا بھی اسی طرح پائیے۔

بعض کا احتمال ہے کہ جملہ ”اذ اتولی“ سے مراد ”حکومت“ ہے کیونکہ لفظ ”تولی“ مادہ ولایت سے ہے جس کا معنی حکومت ہے۔ اس مفہوم کی بناءً آیات کی تفسیر یوں ہوگی کہ منافقین جب حکومت حاصل کر لیتے ہیں تو فساد اور تخریب کاری کے ذریعے ہنگامِ خدا پر ظلم و ستم روار کھتے ہیں۔ آبادیاں ویرانوں میں بدل جاتی ہیں اور لوگوں کے مال و جان محفوظ نہیں رہتے جب انہیں اس بُرے عمل سے مدد کا جانا ہے تو ان کی ہٹ دھرمی اور تعصب میں اضافہ ہو جاتا ہے اور نہ صرف یہ کہ وہ نصیحت کرنے والوں کے نصح پر کان نہیں دھرتے بلکہ غرور اور اپنی خصوصی نخوت کے ساتھ حق



کے خلاف کاموں میں اضافہ کرتے ہیں ایسے افراد کو جہنم کی آگ کے سوا کوئی چیز نام نہیں کر سکتی ” فحسبہ جہنم“..... یعنی جہنم اس کے لیے کافی ہے اور وہ بڑی جگہ ہے۔

درحقیقت یہ آیت منافقین کی ایک اور صفت کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور وہ ہے خشک تعصب اور درشت ہمت و عمری جو انہیں بڑے سے بڑے گناہوں کی سہولت تک پہنچا دیتی ہے۔ ” اخذتہ العزۃ بالاثار“ جب کہ صاحبانِ ایمان حکومتِ ایمان کی تپاہ میں دس بری صفت اور اس کے خطرناک آثار سے دور ہیں۔

۲۰۷۔ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ
وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعَبَادِ ○

ترجمہ

۲۰۷۔ (علی جیسے صاحبِ ایمان اور خدا کا جنہوں نے ہجرت کی شب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پر سو کر گزاری اپکو لوگ اپنی جان خدا کی خوشنودی کے بدلے بیچ دیتے ہیں اور خدا اپنے بندوں پر مہربان ہے۔

شانِ نزول

اہل سنت کے مشہور مفسر شعبی لکھتے ہیں کہ جب پیغمبر اسلام نے ہجرت کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تو اپنے قرضوں کی ادائیگی اور موجود امانتوں کی واپسی کے لیے حضرت علیؓ کو اپنی جگہ مقرر کیا اور جس رات آپؓ غار ثور کی طرف جانا چاہتے تھے اس رات مشرکین آپؓ پر حملہ کرنے کے لیے آپؓ کے گھر کا چاروں طرف سے محاصرہ کئے ہوئے تھے آپؓ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ وہ آپؓ کے بستر پر لیٹ جائیں اپنی مخصوص سبز رنگ کی چادر انہیں اوڑھنے کو دی۔ اس وقت خداوند عالم نے جبرئیل اور میکائیل پر وحی کی کہ میں نے تم دونوں کے درمیان بھائی چارہ اور اخوت قائم کی ہے اور تم میں سے ایک کی عمر کو زیادہ مقرر کیا ہے۔ تم میں سے کون ہے جو ایثار کرتے ہوئے دوسرے کی زندگی کو اپنی حیات پر ترجیح دے ان میں سے کوئی بھی اس کے لیے تیار نہ ہوا تو ان پر وحی ہوئی کہ اس وقت علیؓ میرے پیغمبر کے بستر پر سویا ہوا ہے اور وہ تیار ہے کہ اپنی جان ان پر قربان کر دے۔ زمین پر جاؤ اور اس کے محافظ و نگہبان بن جاؤ۔

جب جبرئیل حضرت علیؓ کے سر ملنے آئے اور میکائیل پاؤں کی طرف بیٹھے تھے تو جبرئیل کہہ رہے تھے سبحان اللہ، آفرین آپ پر اسے علیؓ کہ خدا آپ کے ذریعے فرشتوں پر فخر و مہابت کر رہا ہے۔



اس موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور اسی بناء پر وہ تاریخی رات "لیلۃ الحبیت" کے نام سے مشہور ہو گئی۔

ابن عباس کہتے ہیں: جب پیغمبر مشرکین سے چپ کر ابو بکر کے ساتھ غار کی طرف جا رہے تھے یہ آیت علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی جو اس وقت بستر رسولؐ پر سوئے ہوئے تھے۔

ابو جعفر اسکانی کہتے ہیں: جیسے ابن ابی الحدید نے شرح منبع ابلاغ جلد ۲ ص ۲۷ پر لکھا ہے، حضرت علیؑ کے پیغمبر کے بستر پر ہونے کا واقعہ قراتر سے ثابت ہے اور اس کا انکار غیر مسلموں اور کم ذہن لوگوں کے علاوہ کوئی نہیں کرتا۔

تفسیر

جیسا کہ شان نزول میں بیان ہو چکا ہے یہ آیت ہجرت کی رات حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی لیکن اس کا ایک کلی و عمومی مفہوم بھی ہے۔ یہ آیت چونکہ گزشتہ آیت "وَمِنَ النَّاسِ مَن يَعْجَبُكَ..." کے مقابلے میں آئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس آیت میں انسانوں کے جس گروہ کی طرف اشارہ ہے سابق گروہ کے مقابلے میں ہے اور ان کی صفات بھی اُن کی صفات کے مقابل میں۔ وہ لوگ خود غرض، خود پسند، ہٹ دھرم اور بغض و عناد رکھنے والے تھے۔

ذریعے لوگوں میں اپنی عزت و آبرو بناتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو دین کا خیر خواہ اور مومن ظاہر کرتے تھے لیکن ان کا کردار اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ زمین میں فساد برپا کرتے تھے اور لوگوں کو ہلاک کرتے تھے جب کہ یہ دوسرا گروہ صرف خدا سے معاملہ کرتا ہے اور اپنا سب کچھ یہاں تک کہ جان بھی خدا کے پاس بیچ دیتا ہے۔ یہ گروہ اس کی رضا کے سوا کسی چیز کا خریدار نہیں اور خدائی طرز کے علاوہ کسی طریقے سے عزت و آبرو کے حصول کا قائل نہیں، اپنی انسانوں کی فداکاریاں میں جن کی وجہ سے دین و دنیا کے امور کی اصلاح ہوتی ہے، حق و حقیقت زندہ و پائیدار ہے، حیات انسانی خوش گوار ہے اور شجر اسہم بار آور ہے۔

یہیں سے آیت کے صدر و ذیل کی مناسبت یعنی "وَاللّٰهُ رَؤُوفٌ بِالْعِبَادِ" کا مفہوم آشکار ہو جاتا ہے کیونکہ اس قسم کے انسانوں کا لوگوں میں وجود اپنے بندوں پر خدا کی رحمت و مہربانی کا مظہر ہے اس لیے کہ اگر ایسے فداکار اپنی پردہ نہ کرنے والے جانیباں اُن پست عناصر کے مقابلے میں نہ ہوتے تو ارکان دین اور اسلامی معاشرہ

۱۔ الفخیر، جلد ۲، ص ۵۵ پر ہے کہ خزانہ نے احیاء العلوم ج ۳ ص ۳۳ پر صفحہ ۲۷۱ پر ابن صباغ مالکی نے فصول الہم میں سبط ابن جنہ نے تذکرہ خواص ص ۱۰ پر امام احمد نے مسند ج ۱ ص ۳۳ پر سید بن طاہر جلد ۲ ص ۹۹ پر سیرۃ ابن ہشام ج ۲ ص ۲۱۲ پر سیرۃ حبیب ج ۱ ص ۱۰۲ تاریخ یعقوبی ج ۲ ص ۲۱۲ پر لیلۃ الحبیت کے واقعہ کو نقل کیا ہے۔



پاش پاش ہو جاتا لیکن پروردگار مہربان ہمیشہ ان فداکار اور جفاکاروں کے ذریعے دشمنوں کی تباہ کاریوں کا ازالہ اور تلافی کرتا ہے جیسا کہ سورہ حج کی آیہ ۴۰ میں ہے۔

”وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ الدَّاعِيَ إِِلَيْهِمْ لَمِ دَعَاؤُهُمْ لِيُضِلَّ اللَّهُ سُبُلَ الْبَاطِلِ“

اگر خدا ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعے نہ لڑتا تو عبادت خانے، گرجے، یہودیوں کے عبادت خانے، گھر، اور مسجدیں سب ویران ہو جاتیں۔

یہ نفع بخش معاذ جو خدا والوں نے اپنے پروردگار کے ساتھ کیا ہے۔ قرآن کی دوسری آیات میں بھی مذکور ہے مثلاً سورہ توبہ کی آیہ ۱۱۱ میں ارشاد ہوتا ہے۔

”إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ لِئَانَّهُمْ يَفْعَلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ“

خدا مؤمنین سے ان کے نفوس اور مال خریدا ہے تاکہ اس کے بدلے انہیں جنت دے دے۔ وہ راہِ خدا میں جنگ کرتے، قتل کرتے اور قتل ہوتے ہیں۔

نفل بحث آیت حضرت علیؑ کی ایک بہت بڑی فضیلت ہے جس کا ذکر اکثر اسلامی کتب میں آیا ہے۔ یہ فضیلت میں قدیم علمائے عربوں میں کچھنے والی ہے کہ معاویہ جیسا خاندان رسالت کا سخت ترین دشمن بھی اس پر اتنا بے چین ہوا کہ اس نے سرور بن جندب کو چار ہزار روپے کی پیشکش کر کے کہا کہ اس آیت کو جہلی حدیث کے ذریعے عبدالرحمن ابن عوفؓ کی فضیلت میں بیان کرو۔ اس حکم منافق نے بھی ایسا کر دیا لیکن حسب توقع اس بدلتی حدیث کو ایک شخص نے بھی قبول نہیں کیا۔

قابل توجہ امر یہ ہے کہ اس آیت میں پہنچنے والی انسان ہے اور خریدنے والا خدا ہے۔ مال و متاع نفس و جان ہے اور اس کی قیمت خوشنودی پروردگار ہے۔ یہ آیت دیگر ان آیات سے مختلف ہے جن میں لوگوں کی خدا سے تجارت بیان کی گئی ہے۔ وہاں قیمت بہشت اور دوزخ سے نجات ہے لیکن زیر نظر آیت میں مذکور گروہ جنت کو نظر میں لاتے ہیں نہ دوزخ سے خوف نہ دہریں و اگرچہ یہ دونوں چیزیں بڑی اہم ہیں، بلکہ ان کی پوری توجہ پروردگار کی خوشنودی کے حصول کی طرف ہے اور یہ سب سے بڑا ہند ہے جو انسان انجام دے سکتا ہے۔ شاید ہی وجہ ہے کہ آیت ”مَنْ تَبِعْنِي“ یعنی ”وَمَنْ اتَّبَعَنِي“ سے شروع ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کچھ افراد ہی ہیں جو یہ فوق العادہ کام کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ جب کہ دوسری آیات جن میں جان کے معاملے کے سلسلے میں جنت کا حصول یا جہنم سے نجات کا ذکر ہے اور ان میں شریعت اور ملکیت کے پہلو کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ ”اَشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ“ میں اسی طرف اشارہ ہے۔



- ۲۰۸۔ یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ○
- ۲۰۹۔ فَإِنْ زَلَلْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْكُمْ الْبَيِّنَاتُ فَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ○

ترجمہ

- ۲۰۸۔ اے ایمان والو! سب کے سب صلح و آشتی میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو کہ وہ تو بے شک دشمن ہے۔
- ۲۰۹۔ اور اگر ان سب بات نیوں اور واضح پروگراموں کے بعد بھی تم سے لغزش ہو جائے اور تم گمراہ ہو جاؤ، تو جان لو کہ (تم خدا کی عدالت کے چنل سے فرار اختیار نہیں کر سکتے کیونکہ) خدا توانا اور حکیم ہے۔

تفسیر

عالمی صلح و آشتی صرف ایمان کے سائے میں ممکن ہے

”سلم“ اور سلام لغت میں صلح و آشتی کے معنی میں ہے۔ یہ آیت تمام لوگوں کو امن و صلح کی دعوت دیتی ہے۔ آیت کا روئے سخن چونکہ مومنین کی طرف ہے اس لیے اس کا مفہوم یہ ہو گا کہ صلح و آشتی صرف ایمان کے سائے میں ممکن ہے۔ ایمان کے بغیر یعنی مادی قوانین کے عبور سے پر دنیا سے جنگ و جدل اور پریشانی اور اضطراب کا مرکز خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ ایمان کی معنوی قوت کے ذریعے اس بات کا امکان ہے کہ انسان تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے آپس میں بھائیوں کی طرح مل بیٹھیں اور عالمی حکومت تشکیل دیں اس طرح برہم رقی پر صلح و آشتی کے ٹھنڈے سائے ڈالے جاسکتے ہیں۔

واضح ہے کہ مادی امور مثلاً زبان، نسل، ثروت و دولت، جغرافیائی حدود اور طبقہ بندی سب کے سب جدائی اور پرکندگی کے سرچشمے ہیں۔ ان کے ذریعے حقیقی عالمی امن قائم نہیں ہو سکتا کیونکہ حقیقی امن تو قلوب انسانی میں



کسی محکمہ رشتے کا محتاج ہے اور یہ محکمہ رشتہ انسانی صرف خدا پر ایمان کا نام ہے۔ یہی رشتہ تمام اختلافات سے بلند بالا ہے۔ اسی لیے امن و صلح ایمان کے بغیر ممکن نہیں ہے جیسا کہ خود وجود انسانی میں اور اس کی روح میں ایمان اور آسودگی ایمان کے بغیر میر نہیں آسکتی۔

وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ

اسی سورہ کی آیت ۱۶۷ میں اشارہ ہو چکا ہے کہ بروی اور شیطانی دوسو سے تہذیبی طور پر رونما ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک قرآنی تعبیر کے مطابق شیطان کے ایک قدم کی پیروی ہے۔ یہی بھی اسی حقیقت کا تکرار کیا گیا ہے کہ انحراف حق دشمنی، عداوت، نفاق، جنگ اور دخول بریزی۔ انسان کے مزاج میں آہستہ آہستہ داخل ہوتے ہیں۔ صاحب ایمان افراد کو پیسے سے بیدار رہنا چاہیے تاکہ وہ ان براہیوں کا مقابلہ کر سکیں۔

عربوں کی ایک مشہور ضرب المثل ہے۔

”ان بدو القتال اللطام“

”ایک تباہ کن جنگ کی ابتدا، ایک تھپڑ سے ہوتی ہے۔“

”امتلأ لکم عدو قسین“

شیطان کی انسان سے دشمنی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ ابتداء سے آفرینش حضرت آدم علیہ السلام سے وہ انسان کی دشمنی کے لیے کمر بستہ ہے اور اس نے سوا گنہگار بھی ہے کہ وہ اس دشمنی کو اپنے حتمی نتیجے تک پہنچانے کے لیے زیادہ سے زیادہ کوشش کرے گا لیکن جیسا کہ اپنے مقام پر ہم کہ چکے ہیں کہ یہ تضاد اور عداوت باایمان لوگوں کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ بلکہ یہ ان کے کمال و ارتقاء کے لیے ایک رمز ہے۔

”فان من اظلم من بعد ما جاشتكم البینات“

پرگرام، راستہ اور مقصد سب واضح ہیں تو پھر نفرتوں اور شیطانی دوسوں کی گنجائش نہیں ہونا چاہیے لیکن اگر تم ان سب چیزوں کے باوصف راستے سے ہٹ جاؤ۔ کج روی اختیار کرو تو مسلم ہے کہ اس میں تمہاری کسی کوتاہی ہے اور جان لو کہ خدا بھی عزیز (صاحب قدرت اور توانا) ہے اور کوئی شخص اس کی عدالت سے فدا اختیار نہیں کر سکتا اور وہ حکیم بھی ہے اور غائب عدالت کوئی حکم اور فیصلہ صادر نہیں کرتا۔

۲۱۰۔ مَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلَلٍ مِنَ
الْفُجَاءِ وَالْمَلَائِكَةُ وَاقِعِي الْأَمْرِ وَالِی اللَّهِ
تَرْجِعُ الْأُمُورُ

”ظلال“ بمعنی ”ظلمۃ“ کی۔ ”ظلال من الفجاء“ بمعنی ”سیرت من بادل“

ترجمہ

۲۱۔ کیا (شیطان کے پیروکار) یہ لوگ (ان تمام نشانیوں اور واضح پروگراموں کے بعد) پھر بھی منتظر ہیں کہ خدا اور فرشتے بادل کے سائے میں ان کے پاس آئیں (اور انہیں نئے دلائل پیش کریں جب کہ یہ امر محال ہے) اور تمام چیزیں انجام پا چکی ہیں اور تمام معاملات کی بازگشت خدا کی طرف ہے۔

تفسیر

یہ آیت اگرچہ قرآن کی پیچیدہ آیات میں سے نظر آتی ہے لیکن آیت کی تعبیرات میں وقت نظر اور غور و خوض سے ابہام دور ہو جاتا ہے۔ اس آیت میں صدا سے سخن پیغمبر کی طرف ہے۔ گزشتہ بحث کے بعد خداوند عالم فرماتا ہے کیا یہ سب نشانیاں اور واضح دلائل انسان کو لغزش سے بچانے اور عدو مبین (شیطان) کے جنگل سے نجات دلانے کے لیے کافی نہیں ہیں؟ کیا وہ منتظر ہیں کہ خداوند عالم فرشتوں کی بجزی میں سایہ فگن بادلوں کی اوٹ میں ان کی طرف آئے اور انہیں زیادہ واضح دلائل پیش کرے؟ ایسا ہونا تو محال ہے کیونکہ خدا جسم نہیں ہے اور لغزش محال ایسا ہو بھی تو اس کی ضرورت کیا ہے جب کہ تمام چیزیں انجام پا چکی ہیں اور کوئی فرد گناہت واقع نہیں ہوئی (و قضی الامر) اور تمام چیزوں کی بازگشت خدا کی طرف ہے اور سب امور کا سرانجام وہی ہے (و الحاکم متوجع الامر)۔

اس بناء پر آیت کی ابتدا میں آنے والا استفہام، استفہام انکاری ہے یعنی ایسا ہونا ممکن نہیں (علاوہ ذیہ ہم کہہ چکے ہیں کہ اس کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ انسانی ہدایت کی ضرورت کو پہلے ہی پورا کیا جا چکا ہے)۔

اس تعبیر کی بناء پر آیت میں کسی قسم کی "تقدیر" موجود نہیں اور آیت کے اصل الفاظ کی تعبیر یہی ہے لیکن مفسرین کی ایک جماعت نے اس استفہام کو استفہام انکاری کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا اور اسے گناہگاروں اور شیطانی پروگراموں کی پیروی کرنے والوں کے لیے ایک طرح کی تبدیلی قرار دیا ہے (ان کے نزدیک یہ عذاب دنیا یا عذاب آخرت کی ایک دھمکی ہے) وہ لفظ "الامر" سے پہلے لفظ "امر" کو مقدم سمجھتے ہیں۔ اس سے آیت کا مجموعی مفہوم اور معنی یہ ہوگا

کیا وہ ٹیڑھے اعمال بجا لا کر چاہتے ہیں کہ خدا کا حکم اور فرشتے انہیں سزا دینے اور ان پر عذاب نازل کرنے کے لیے آج پہنچیں، وہ دنیا و آخرت کے عذاب میں گرفتار ہو جائیں اور ان کے کام کا خاتمہ ہو جائے۔ جب کہ ان کے اعمال کا اس کے علاوہ اور کوئی نتیجہ بھی نہ ہوگا۔



۲۱۱- سَلِّ بَنِي إِسْرَآئِيلَ كَمَا آتَيْنَاهُمْ مِنْ آيَةٍ بَيِّنَةٍ
وَمَنْ يُبَدِّلْ نِعْمَةَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُ فَإِنَّ
اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ○

ترجمہ

۲۱۱- بنی اسرائیل سے پوچھ لو، ہم نے انہیں کیسی واضح نشانیاں دی تھیں (لیکن انہوں نے
خدا کی عطا کردہ مادی و معنوی نعمتوں کو غلط طور پر صرف کیا، اور جو شخص اللہ کی نعمت پا کر اُسے
تبدیل کر دے (اور اُسے غلط امور میں صرف کرے وہ خدا کے شدید عذاب میں گرفتار ہوگا کہ) خدا
شدید العقاب ہے۔

تفسیر

یہ آیت بنی اسرائیل کی روش اور طور طریقوں کے بارے میں ہے کہ وہ واضح آیات اور نعمات الہی کے حصول کے
بعد کیسے انہیں بدل دیتے تھے۔ کفرانِ نعمت کہتے تھے اور نتیجے کے طور پر وہ عذاب میں گرفتار ہو گئے۔
نعمت کی تبدیلی — کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے پاس موجود وسائل، توانائیاں اور مادی و معنوی صلاحیتیں خود ہی
اور انحرافی راستوں، گناہ اور ظلم و ستم میں استعمال کرے۔ خداوند عالم نے بنی اسرائیل کو روحانی مربی بھی عطا فرمائے، ان
میں سے ماقور سربراہ بنائے اور ہر قسم کے مادی و معنوی اسباب ان کے تصرف میں دیے لیکن وہ نعمت کی تبدیلی میں گرفتار
ہو گئے۔ اسی سے ان کی زندگی تباہ و برباد ہو گئی اور قیامت میں بھی دردناک عذاب ان کے انتظار میں ہے۔
نعمت کی تبدیلی کا مسئلہ بنی اسرائیل میں منحصر نہیں۔ اس زمانے میں بھی دنیا نے مسندت اس عظیم بد بختی میں مبتلا
ہے کیونکہ انسان کے اختیار میں اگرچہ آج بہت سی نعمتیں اور توانائیاں ہیں جو تاریخ کے کسی دور میں بھی انسان کو نصیب
نہیں ہوئیں لیکن انبیاء و مرسلین کی آسمانی تعلیمات سے دوری کی وجہ سے وہ تبدیلی نعمت کے عمل میں گرفتار ہے اور ان
ہی نعمتوں کو وحشت ناک حد تک اپنی فناء اور تباہی کی راہ میں صرف کر رہا ہے۔

”سَلِّ بَنِي إِسْرَآئِيلَ“ — یہ جملہ حقیقت میں اس لیے ہے کہ ان سے نعمات الہی کا اعتراف
کرتا جائے اور اس کے بعد انہیں پوچھا جائے کہ ان وسائل و ذرائع کے باوجود ایسا روزِ سیاہ تمہیں کیوں نصیب ہوا
اور کیوں آج تم دنیا میں پراگندہ و منتشر ہو۔

۲۱۲- زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُونَ



مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْتَهُمْ يَوْمَ
الْفِتْمَةِ ۚ وَاللَّهُ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝

ترجمہ

۲۱۲۔ دنیاوی زندگی کو کافروں کے لیے مزین کیا گیا ہے (لہذا) وہ صاحب ایمان لوگوں کا (کہ جو کبھی کبھی تہی دست ہوتے ہیں) تسخیر راستے میں حالانکہ اہل ایمان قیامت میں ان سے بالاتر ہوں گے (کیونکہ قدریں وہاں آشکار ہوں گی اور وہاں وہ اپنی اصلی صورت میں ہوں گی) اور خدا جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے روزی دیتا ہے۔

شان نزول

مشہد اسلامی معاصرین عباسی کہتے ہیں کہ یہ آیت اشرف اور رسالت قریش کے ایک مختصر گروہ کے بارے میں نازل ہوئی کہ جن کی زندگی بہت شاہ خرچ اور خوشحال تھی۔ وہ صدر اقل کے ثابت قدم عمار اور ہلال جیسے مومنین کا تسخیر کرتے تھے کیونکہ وہ مادی لحاظ سے فقیر اور تہی دست تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر پیغمبر کی کوئی شخصیت ہوتی اور وہ خدا کی طرف سے مبعوث ہوتے تو اشرف اور بڑے لوگ ان کی پیروی کرتے۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں ان کی بے بنیاد باتوں کا جواب دیا گیا ہے۔

تفسیر

مذکورہ بالا شان نزول کے مطابق آیت قریش کے خود خواہ اور دنیا پرست اشرف کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن یہ امر اس سے مانع نہیں کہ یہ گذشتہ آیت کی بحث کی تکمیل کرتی ہے جو یہودیوں کے بارے میں تھی نیز یہ اس سے بھی مانع نہیں کہ یہ ایک قیہ قاعدہ کے طور پر ہے اور ایک عمومی حکم جو سب کے لیے بیان کرتی ہے۔ اس کا عمومی ملبوم یہ ہے کہ کافروں کی نگاہ کا افق مادی دنیا کی چادر دیاری سے بالاتر نہیں ہے۔ اس لیے ان کے لیے مادی زندگی بہت دلپذیر خوبصورت اور زیبا ہے اور یہی زندگی ان کے نزدیک تمام قدروں کی قدر و قیمت کا تعین کرنے کے لیے ایک معیار و میزان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی پس ماندہ، پلار اور علیل فکر کے مطابق دولت و ثروت سے ہی افراد کی کوئی حیثیت و شخصیت نہ تھی لہذا وہ ان کا مذاق اڑاتے اور تسخیر کرتے۔ معنوی و انسانی اقدار ان کی نظر میں بیچ تھیں حالانکہ ان دو طرح کی اقدار میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ان کی کوتاہ نظر ان جندیوں اور زبانشوں کو دیکھنے کی قدرت نہ رکھتی تھی۔ ان کے جواب میں قرآن دونوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

۱۔ دوسرے جہان میں جہاں معنوی اور روحانی حقائق اور کمالات اپنی اصلی اور حقیقی صورت اختیار کر لیں گے وہاں مومنین ان سے جندوجات پر فائز ہوں گے کیونکہ یہ زمین کی تہوں میں چل رہے ہوں گے اور وہ آسمان کے اوپر ہوں گے



”وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا فِتْنَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ“

۲۔ علاوہ ازیں مادی فوائد سے لطف اندوز ہونے کی منہ زنی اور ایمانی قدر و قیمت کی علامت نہیں ہے۔
کیونکہ اس جہاں میں روزی کی تقسیم کفر و ایمان اور معنوی و مادی اقدار کی بنیاد پر نہیں ہے۔
”وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ“

آیت کے اس جملے میں ممکن ہے ایک اور معنی کی طرف بھی اشارہ ہو کہ ان محرومیوں کی تکافی خداوند عالم یوں کرتا ہے کہ ان سے محروم افراد گناہ اور حرام سے آکودہ ہونے سے بچے جاتے ہیں یا پھر مخالفوں اور دشمنوں سے پرہیز و احتیاط میں بھی وہ ایمان لے آتے ہیں جس کے نتیجے میں انہیں آخرت کے گھر میں بے حساب رزق بخشا جائے گا۔
یہاں ایک سوال باقی رہ جاتا ہے۔ وہ یہ کہ زمین و زمینیت دیا گیا۔۔۔ یہ لفظ فعلی مجہول ہے، اس سے یہاں کیا مراد ہے اور اس کا فاعل کون ہے۔

کون ہے جو دنیوی زندگی کو کافروں کی نگاہ میں زمینیت دیتا ہے۔ اس سوال کا جواب سورہ آل عمران کی آیت ۱۴ کے ذیل میں ملاحظہ کیجئے گا۔

۲۱۳۔ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيُخْكَرَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمْ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝

ترجمہ

۲۱۳۔ (ابتداء میں) لوگوں کا ایک ہی گروہ تھا (اور ان کے درمیان کوئی تضاد نہ تھا۔ رفتہ رفتہ گروہ اور طبقات پیدا ہوتے گئے) پھر ان میں اختلافات (اور تضادات) وجود میں آئے۔ خدا نے انبیاء کو بھیجا تاکہ وہ لوگوں کو بشارت دیں اور ڈرائیں نیز ان پر آسمانی کتاب بھی نازل کی جو انہیں حق کی



طرف دعوت دیتی تھی، یہ کتاب لوگوں کے اختلافات کا فیصلہ کرنے کے لیے تھی (ایمان والوں نے تو اس سے اختلاف نہیں کیا، صرف ایک گروہ نے حق سے انحراف اور ستمگری کرتے ہوئے اس سے اختلاف کیا جب کہ انہیں کتاب دی گئی تھی اور واضح نشانیاں ان تک پہنچ چکی تھیں۔ جو لوگ ایمان لا چکے تھے خدا نے اختلافی چیز میں اپنے حکم سے ان کی رہبری کی (لیکن بے ایمان لوگ اسی طرح گمراہی اور اختلاف میں باقی رہے) اور خدا جسے چاہتا ہے راہ راست کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

تفسیر

ابتداء میں انسان کی زندگی اور معاشرہ سادہ تھا۔ رفتہ رفتہ جب انسانوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ منافع کا تضاد ابھرا اور اختلافات پیدا ہونے لگے۔ یہ مقام وہ تھا کہ راہنما اور قانون کی ضرورت پیدا ہوئی۔ سب سے پہلے ضروری تھا کہ خدائے تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نمائندے لوگوں کو دوسرے جہاں کی زندگی کی طرف متوجہ کریں جو سیر تکامل اور مغز ارتقاء کا آخری مرحلہ ہے۔ ضروری تھا کہ وہ انہیں متنبہ کریں کہ موت کے بعد ایک اور جہاں ہے جس میں لوگ اپنے کردار کی جزا و سزا سے دوچار ہوں گے۔ انبیاء کرام اس ذریعے سے اور ثواب کی بشارت اور بدکاروں کو مذاب سے ڈرانے کے طریقے سے لوگوں کو احکام الہی کی طرف راغب کرتے تھے (فبعض الله التہیتین مبشرین و منذرین)۔

یہ وہ مقام ہے جہاں انسان محسوس کرتا ہے کہ اسے ایسے صمیم قوانین کی ضرورت ہے جو اس کی سعادت کا سبب بنیں۔ اسی لیے خداوند عالم نے انبیاء کے پاس سعادت بخش قوانین بھیجے تاکہ وہ لوگوں کے اختلافات کو ختم کریں۔ درحقیقت زیر نظر آیت ان مراحل کو بیان کرتی ہے جو انبیاء کی بعثت اور آسمانی احکام کے نزول پر منتهی ہوتے ہیں۔

پہلا مرحلہ :- یہ مرحلہ ابتدائی سادہ زندگی پر مشتمل ہے جب انسان اجتماعی زندگی کا عادی نہ ہوا تھا اور فطرتاً تضاد اور تضاد و وقوع پذیر نہ ہوتا تھا۔ قانون فطرت کے مطابق خدا کی پرستش ہوتی تھی اور اس کے آسان و سادہ فرائض اس کی بارگاہ میں انجام دیئے جاتے تھے۔

دوسرا مرحلہ :- یہ وہ مرحلہ ہے جب انسانی زندگی اجتماعی شکل اختیار کر لیتی ہے اور ایسا ہی ہونا چاہیے تھا کیونکہ انسان تکامل و ارتقاء کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور اس تکامل کے لیے اجتماعی و معاشرتی زندگی ناگزیر ہے۔ تیسرا مرحلہ :- یہ تضاد و تضاد کا مرحلہ ہے اور معاشرتی زندگی میں اس سے بچا نہیں جاسکتا۔ اختلافات پیدا ہوتے ہیں اور نوع انسانی کے لیے انبیاء کے قوانین اور تعصبات کی تشنگی محسوس ہوتی ہے۔

چوتھا مرحلہ :- اس مرحلے میں انبیاء خدا کی طرف سے نجات بشر کے لیے مامور کئے جاتے ہیں۔ افکار اور قلوب کو تادہ کرنے کے لیے سب سے پہلے بشارت و نذارت کا پروگرام پیش کیا جاتا ہے (یہ نیکو کاروں کو جزا کی بشارت دینے اور بدکاروں کو سزا سے ڈرانے کا پروگرام ہے) حبیب ذات اور خود پرستی کے زیر سایہ جب انسان نے بشارت



اور نذات کا پروگرام تسلیم کر لیا اور اس نے محسوس کر لیا کہ انبیاء کے پاس ایسی تعلیم ہے جو انسانی سرفروشت سے براہ راست مربوط ہے تو آسمانی کتب، احکام اور قوانین نازل ہونا شروع ہوئے تاکہ تعذرات اور مختلف کشمکشیں (جو فکری، اجتماعی، اخلاقی اور نظریاتی بنیادوں پر تھیں) ختم ہو جائیں۔

”وما اختلف فيه الا الذين اوتوه من بعد ما جا شہد

البیِّنات بظنیؕ“

یہ جہد دراصل تعلیمات انبیاء کے آغاز کے بعد کے مرحلے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس میں اس امر اہم کا جواب ہے کہ اگر انبیاء فکری، اجتماعی اور عقائد کے اختلافات کے حل کے لیے آتے ہیں تو ان کے آجانے کے بعد بھی کم و بیش اختلافات کیوں باقی رہتے ہیں۔

آیت کہتی ہے کہ موجودہ اختلاف اور پہلے تعذرات میں فرق ہے۔ پہلے اختلافات کا سرچشمہ جہالت، نادانی اور بے خبری تھی اور یہ وجہ بعثت انبیاء سے ختم ہو گئی۔ لیکن بعد ازاں اختلافات کی بنیاد دیگر چیزیں مثلاً ”بعض“ یعنی ظلم و ستم، ہٹ دھرمی وغیرہ بن گئیں جن کی وجہ سے بعض لوگوں نے اختلافی راہ پر اپنے سفر کو جاری رکھا (”من بعد ما جا شہد البیِّنات بظنیؕ بینہم“)

یہاں اگر لوگ دو مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔

مومنین۔۔۔ جو ہدایت اور حق کی راہ پر چل کھڑے ہوئے۔ انہوں نے اپنے اختلافات کو ختم کر دیا۔ **واللہ یہدی**
الذین امنوا۔۔۔ انہوں نے بحکم خدا صراطِ مستقیم کو طے کر لیا۔ لیکن۔۔۔
کفار۔۔۔ جن کے توں اپنے اختلافات میں باقی ہیں۔

واللہ یہدی من یشاء الخ صراطِ مستقیم۔ یہ اس حقیقت کی

طرف اشارہ ہے کہ خدا کی مشیت نیک اعمال اور لوگوں کی پاکیزگی کے مطابق ہے یعنی جوازِ حقیقت تک پہنچنا چاہتے ہیں خدا بھی انہیں راہِ راست کی ہدایت کرتا ہے۔ انکی روشن فکری اور راہِ راست کو پالینے کی توفیق میں اضافہ کرتا ہے اور انہیں انبیاء کی وساطت سے راہِ نجات اور راہِ راست دکھاتا ہے۔

دین اور معاشرہ

مندرجہ بالا آیت سے ضمنی طور پر یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ دین اور انسانی معاشرہ دو ایسی حقیقتیں ہیں جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتیں۔ کوئی معاشرہ مذہب اور قیامت پر ایمان رکھے بغیر صحیح زندگی نہیں گزار سکتا۔ ایسے انسانی قوانین جن کا سرچشمہ ایمان نہیں وہ فقط ذاتی ذمہ داریوں کی نشاندہی تک محدود ہیں۔ وہ انسانی وجود پر گہرا اثر مرتب نہیں کرتے۔ ایسے قوانین اختلافات اور منافع کے تعاد کو ختم نہیں کر سکتے۔ ان آخری صدیوں کی آزمائشوں میں انسانی معاشروں میں یہی حقیقت اچھی طرح ثابت ہو چکی ہے۔ ایمان سے بے بہرہ دنیا جسے اصطلاح میں متمدن کہا جاتا ہے بہت سی



ایسی قیامتوں اور گناہوں کی ترکیب ہو رہی ہے جو محض اہل ایمان رکھنے والے گزشتہ پس ماندہ معاشروں میں دکھائی نہیں دیتے۔

زیر نظر آیت سے ظننا یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حقیقی دین و مذہب کی پیدائش انسانی پیدائش کے ساتھ ساتھ نہیں ہوئی بلکہ معاشرے کے وجود کے ساتھ حقیقی دین و مذہب بھی وجود پذیر ہوا۔ اس بناء پر اس میں کوئی تعجب نہیں کہ سب سے پہلے اوالعزم اور صاحب دین و شریعت پیغمبر حضرت نوح علیہ السلام تھے نہ کہ حضرت آدم علیہ السلام۔

۲۱۴۔ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَثَلُ الْبَاسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَزُلْزِلُوا حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ اٰمَنُوا مَعَهُ مَتَى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَا اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيبٌ ۝

ترجمہ
۲۱۴۔ کیا تم گمان کرتے ہو کہ تم جنت میں جاؤ گے اور تمہیں وہ حوادث پیش نہیں آئیں گے جو گزشتہ لوگوں کو درپیش ہوئے۔ وہی لوگ جنہیں دشواریاں اور تکلیفیں درپیش ہوئیں اور وہ ایسے دکھ درد میں مبتلا ہوئے کہ پیغمبر اور ان کے ساتھ اہل ایمان کہنے لگے خدا کی مدد کہاں ہے (اور سب نے اُس وقت اللہ سے مدد کا تقاضا کیا لیکن ان سے کہہ دیا گیا کہ) آگاہ رہو کہ خدا کی مدد قریب ہی ہے۔

شان نزول

بعض مفسرین کہتے ہیں جنگ احزاب میں جب مسلمانوں پر فدا اور شدید خوف غالب آیا اور وہ محاصرے میں آگئے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اس میں انہیں صبر و استقامت کی دعوت دی گئی اور نصرت و مدد کا وعدہ کیا گیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جنگ احد میں جب مسلمان شکست کھا گئے تو عبداللہ ابن ابی نے ان سے کہا کہ کتب اپنے آپ کو قتل کر دیتے رہو گے اگر غصہ نہ پیغمبر ہوتا تو خدا اس کے اصحاب و انصار کو قید و بند اور قتل میں گرفتار نہ کرتا۔ اس موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔

تفسیر

سخت حوادثِ خدائی سنت ہیں

مندرجہ بالا آیت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مومنین کا ایک گروہ یہ سمجھتا تھا کہ جنت میں داخل ہونے کا



حقیقی عامل اور سبب یہ ہے کہ خدا پر ایمان کا صرف اظہار کر دیا جائے اور اس کے بعد انہیں کسی قسم کی تکلیف، زحمت اور رنج و الم اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ ان کی کوششوں کے بغیر ہی خدا ان کے اسرار کو راہ پر ڈال دے گا اور ان کے دشمنوں کو نابود کر دے گا۔

اس غلط طرز فکر کے مقابلے میں قرآن حقیقی سنت اور خدا کی دائمی روش کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ قرآن کے مطابق تمام مومنین کو راہ ایمان میں پیش رفت کے لیے مشکلات اور کالیف کا استقبال کرنا پڑے گا۔ اس راہ میں خدا کا یہی کنٹرول ہے۔ یہ مشکلات تو دراصل آزمائش اور امتحان ہیں۔ ان کے ذریعے حقیقی اور غیر حقیقی ایمان میں امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ قرآن اس حقیقت کی بھی تصریح کرتا ہے کہ یہ آزمائشیں اور مشکلات عمومی قوانین کے تحت ہیں اسی بناء پر گزشتہ آیتیں بھی ان سے دوچار ہوئیں۔

مشکلات و غلوں کے استعمار سے نجات کے لیے بنی اسرائیل کو خاص طور پر مصر سے نکالنا پڑا۔ وہ دنیا اور لشکر فرعون کے درمیان گھر گئے تھے جس کی وجہ سے وہ بہت سی مشکلات اور مصائب میں گرفتار ہوئے۔ یہاں تک کہ ان میں سے بہت سے تو اپنے ماتہ پاؤں گناہیٹے۔ لیکن سخت محنت میں خدا کا لطف ان کے شامل حال ہوا انہیں دشمنوں پر کامیابی نصیب ہوئی۔ یہ بات بنی اسرائیل سے مخصوص نہیں بلکہ آیت میں الدین غلوا من قبلکم (وہ جو تم سے پہلے گزرے ہیں) کے الفاظ اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس فقرے کو سب کی سر نوشت ایک جیسی تھی۔ گویا یہ ایک سنت الہی ہے جو نکال، ارتقاء اور تربیت کی ایک رمز ہے۔ تمام امتوں کو حوادث کی سخت جھیلوں میں ڈالا جانا چاہیے، انہیں پھسل کر فساد کی طرح جھٹی سے باہر آنا چاہیے اور پھر زیادہ اہم اور سخت تر حوادث سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہنا چاہیے تاکہ زیادہ قابل افراد پہچانے جاسکیں اور نا اہل لوگ الگ ہو جائیں اس طرح تفصیل و تفسیر ہو جائے۔

دوسرا نکتہ جس کی طرف یہاں توجہ دی جانا چاہیے وہ یہ ہے کہ آیت کے مطابق گذشتہ امتوں کو شدائد اور مشکلات اس طرح گھیر لیتی تھیں کہ اہل ایمان اور انبیاء ہم صدمہ جو کر کہتے تھے، خدا کی مدد کہاں ہے؟ واضح ہے کہ ان کی مراد باہر گو قدرت پر اعراض کرنا نہ تھی بلکہ یہ تعبیر خدا ایک قسم کی دعا اور تلقاض ہے۔

۲۱۵۔ یَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلْ مَا أَنْفَقْتُ مِنْ خَيْرٍ
فَلِلَّوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ
السَّبِيلِ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ۝

ترجمہ

۲۱۵۔ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔ کہہ دو کہ ہر خیر و شکی (اور فائدہ بخش مادی و معنوی سرمایہ) جو



تم خرچ کرتے ہو وہ مال باپ، قریبیوں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہونا چاہیئے اور جو کار خیر بھی تم کرتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے اور ضروری نہیں کہ اسے ظاہر کرتے پھر و اور اسے یا اسے بتاتے پھر و۔

شانِ نزول

عروبن جوج ایک بوڑھا رئیس اور دولت مند تھا۔ اُس نے نبی اکرمؐ کی خدمت میں عرض کی کہ کس چیز سے اور کس کس کو صدقہ دوں۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

تفسیر

قرآن مجید میں بہت سی آیت راہِ خدا میں خرچ کرنے کے بارے میں آئی ہیں۔ پروردگارِ عالم مختلف طریقوں سے مسلمانوں کو خرچ کرنے اور محتاج و بے نوالوں کو کی مدد کرنے کا شوق دلاتا ہے لیکن محلِ بحث آیت کی وضع کچھ اور ہی ہے۔ بعض افراد چاہتے تھے کہ انہیں معلوم ہو جائے کہ کس قسم کا مال خرچ کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا کچھ خرچ کریں۔

جواب میں اس سوال کی وضاحت کے علاوہ ایک اور اہم مسئلہ کی طرف بھی اشارہ ہوا ہے اور وہ ہے مواقع اور اشخاص جن پر خرچ کرنا چاہیئے۔ آیت کی شانِ نزول سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں مسئلے (کیا کچھ خرچ کریں اور کن کن پر خرچ کریں) محلِ سوال تھے۔

پہلے معاملے کے ذیل میں خرچ کرنے کے لیے خیر کا لفظ استعمال کر کے سوال کا ایک کامل، جامع اور وسیع جواب دیا گیا ہے۔ یعنی ہر قسم کا کام، سرمایہ اور ملازمت جو خیر ہو اور لوگوں کے لیے سودمند ہو، خرچ کرنے کے قابل ہے۔ اس میں ہر طرح کا مادی و معنوی سرمایہ شامل ہے۔

سوال کے دوسرے رُخ کے ضمن میں یعنی کن کن پر خرچ کیا جائے فرمایا گیا ہے کہ سب سے پہلے نزدیکی رشتے داروں پر اور ان سے بھی پہلے مال باپ پر خرچ کیا جائے۔ اس کے بعد یتیم، مسکین اور اُنہا نے سبیل (وہ مسافر جو دورانِ سفر میں اپنا زادِ راہ خرچ کر بیٹھے ہوں) پر خرچ کیا جائے۔ واضح ہے کہ نزدیکی رشتے داروں پر خرچ کرنا دیگر آثار کے علاوہ ملحدی اور بدشتہ تہوں کے استحکام کا بھی باعث بنتا ہے۔

”وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ“

یہ جملہ تو گویا اس مطلب کی طرف اشارہ ہے کہ خرچ کرنے والے اس بات پر اصرار نہ کریں کہ لوگ ان کا کام جان لیں۔ کیا ہی عمدہ ہے کہ زیادہ خلوص کی بنا پر انہی عنایات اور عطیات کو یہناں رکھیں کیونکہ وہ ذات جو بدلہ اور ثواب دے گی ان سب چیزوں سے آگاہ ہے۔ اُسی کے ہاتھ میں جزا ہے اور اسی کے پاس سب کا حساب ہے۔

۲۱۶۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهُ لَكُمْ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا



شَيْتًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝

ترجمہ

۲۱۶۔ راہِ خدا میں جہاد کرنا تم پر فرض کیا جا چکا ہے جب کہ تم اس سے اکراہ کرتے ہو اور اُسے ناپسند کرتے ہو جب کہ اسی میں تمہاری بھلائی ہوتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تم جسے پسند کرتے ہو اس میں تمہاری بُرائی ہوتی ہے اور خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

تفسیر

گذشتہ آیت انفاق اور خرچ کے بارے میں تھی اور یہ آیت فحشاء اور جان کی قربانی پیش کرنے کے بارے میں ہے۔ فداکاری کے میدان میں یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے دوش بدوش ہیں۔

آیت بیان کرتی ہے کہ دشمن سے جنگ کرنا تمہارے لیے حکماً ضروری ہے۔ اس عمل کا بجالانا تمہارے لیے لکھ دیا گیا ہے اور واجب قرار دے دیا گیا ہے لیکن انسان کو فطری طور پر سختی کے مواقع پر تکلیف ہوتی ہے اور وہ شداہد اور مشکلات کو پسند نہیں کرتا۔ اُس کی رغبت خوشی اور راحت و آرام کی طرف زیادہ ہوتی ہے۔ عسلی ان تکرر ہوا شیتًا و هو خیر لکم یہ جملہ اسی انسانی مزاج کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ دشمن سے جنگ اور نبوکلائی کا نتیجہ موت۔ جہاد کی تکلیف اور مالی نقصان ہوتا ہے۔ جنگ بدمعنی اور بے آزامی کا باعث بنتی ہے اس لیے اصولی طور پر انسان کی نظر میں یہ سخت اور ناپسندیدہ ہے۔ لیکن ہمیشہ کچھ ایسے فداکار ضرور ہوتے ہیں جو مقدس مقاصد کیلئے کسی قسم کی جان کی بازی سے دریغ نہیں کرتے لیکن اکثر لوگ مذکورہ وجوہات کی بنا پر جہاد کو پسند نہیں کرتے پروردگار عالم قسماً و پیمانی اس طرز فکر کی مذمت کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ اُن کے سامنے ایک درِ سخن نہال کھولتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم کاموں کے مصالح سے باخبر نہیں ہو۔ تمہیں یہ کیسے پتہ چلا کہ تمہاری پسندیدہ چیز کے پیچھے شر اور تمہاری ناپسندیدہ چیز کے پیچھے خیر نہیں ہے۔ خدا ہی اسرارِ مخفی سے آشنا ہے۔ البتہ مستم ہے کہ محنتی اور زیرک لوگ اُن کے سلی نظر پر کھنکھنے والے، ان احکام کے بعض اسرار سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ یہ آیت خدا کے تکوینی اور تشرعی قوانین کی ایک بنیاد کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ان قوانین کے پیش نظر یہ آیت انسان میں انضباط اور تسلیم کی روح کی پرورش کرتی ہے۔ آیت کے مطابق انہیں یہ نہیں چاہیئے کہ انسان اپنی تکلیفیں و دریافت کا وار و مدارِ قصادت اور فیصلے پر رکھے۔ یہ مستم ہے کہ انسان کا علم ہر لحاظ سے محدود اور ناچیز ہے۔ انسانی تجربات کے مقابلے میں انسانی علم دریا کے سامنے قطرے کی طرح ہے۔ اس لیے وہ قوانین جن کا سرچشمہ علم الہی ہے اور جو ہر لحاظ سے لامتناہی ہے انسان کو اس سے کبھی روگردانی نہیں کرنی چاہیئے۔ بلکہ انسان کو جان لینا چاہیئے کہ یہ تمام قوانین اُس کے فائدے اور منفعت کے لیے ہیں چاہے وہ تشرعی قوانین و احکام ہوں جیسے جہاد اور زکوٰۃ و طہارۃ و گنہگاروں میں جو بلا اختیار زندگی میں رونما ہوتے ہیں اور ان سے بچنا ممکن نہیں جیسے موت۔ دوستوں اور عزیزوں کی مصیبت یا آئندہ کے اسرار کا انسان سے مخفی ہونا وغیرہ۔



۲۱۷۔ یَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِنْدَ اللَّهِ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّى يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا وَمَنْ يَرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ○

۲۱۸۔ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَةَ اللَّهِ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ○

ترجمہ

۲۱۷۔ ماہ حرام میں جنگ کرنے کے بارے میں تم سے سوال کیا جاتا ہے۔ کہئے کہ اس میں جنگ کرنا بڑا وگناہ ہے۔ لیکن راہِ خدا اور دینِ حق سے لوگوں کو روکنا، اللہ سے کفر اختیار کرنا، مسجد الحرام کی بے حرمتی کرنا اور اس میں رہنے والوں کو نکال دینا خدا کے نزدیک اس سے بھی بڑھ کے بُرا ہے اور فتنہ برپا کرنا اور ایسے نامساعد حالات پیدا کرنا جو لوگوں کو کفر کی طرف راغب کریں اور ایمان سے روکیں، قتل سے بدتر ہے مشرکین تم سے ہمیشہ لڑتے ہی رہتے ہیں یہاں تک کہ ان کے بس میں ہو تو تمہیں دین سے برگشتہ کر دیں لیکن جو شخص دین سے پھر جائے اور حالتِ کفر میں مر جائے اُس کے گزشتہ تمام نیک اعمال دنیا و آخرت میں برباد ہو جائیں گے اور یہی اہلِ دونخ ہیں اور اس میں سدا رہیں گے۔

۲۱۸۔ جو ایمان لے آئے ہیں، جنہوں نے ہجرت کی ہے اور راہِ خدا میں جہاد کیا ہے وہی رحمتِ خداوندی کے امیدوار ہیں اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔



شان نزول

کہتے ہیں یہ آیت عبداللہ بن جحش کے سسرینہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جنگ یدمد سے پہلے پیغمبر اسلامؐ نے عبداللہ بن جحش کو بلایا۔ اسے ایک خط دیا اور مباحرین میں سے آٹھ آدمی اس کے ساتھ گئے۔ اسے حکم دیا کہ دو دن راستہ چلنے کے بعد خط کو کھولے اور اس کے مطابق عمل کرے۔ اس نے دو دن کے سفر کے بعد خط کھولا تو اس میں لکھا تھا۔

جب خط کھولا تو نخلہ امکہ اور خائف کے درمیان ایک جگہ ایک آگے جانا۔ وہاں قریش کے حالات پر نظر رکھنا اور جو کچھ صورت حال ہو ہمیں اس کی اطلاع دینا۔

عبداللہ نے اپنے ساتھیوں سے واقعہ بیان کیا اور مزید کہا کہ پیغمبرؐ نے راہ پر چلنے کے لیے ہمیں مجبور کرنے سے منع کیا ہے اس لیے جو شہادت کے لیے تیار ہے وہ میرے ساتھ آئے۔ دوسرے لوگ واپس چلے جائیں۔ سب اس کے ساتھ چل پڑے۔ جب وہ نخلہ پہنچے تو قریش کے ایک خانے کا سامنا ہوا۔ اس میں عمرو بن حفص بھی تھا۔ ماہ رجب، جو ماہ حرام ہے، کا چونکہ آخری دن تھا اس لیے اُن پر حملہ کرنے کے سلسلے میں انہوں نے آپس میں مشورہ کیا۔

بعض کہنے لگے کہ اگر آج ہم اُن سے دستبردار رہے تو وہ حدود حرم میں داخل ہو جائیں گے اور پھر ہم اُن سے تعرض نہیں کر سکیں گے۔ بالآخر انہوں نے اُن پر بڑی بہادری سے حملہ کر دیا۔ عمرو بن حفص کو قتل کیا اور نخلہ و قیدیوں کے ساتھ پیغمبرؐ کی خدمت میں لے آئے۔

اسخبرؓ نے فرمایا میں نے تمہیں یہ حکم تو نہیں دیا تھا کہ حرام مہینوں میں جنگ کرو۔ آپؐ نے مال غنیمت اور قیدیوں میں کوئی تعارف نہ کیا۔ مجاہدین کو بڑا رنج ہوا۔ دیگر مسلمانوں نے بھی انہیں سرزنش کی۔ مشرکوں نے بھی زبان طعن کھولی اور کہنے لگے کہ تمہارے حرام مہینوں میں جنگ، خون ریزی اور قید و بند کو حلال شمار کیا ہے۔

اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو عبداللہ بن جحش اور اس کے ساتھیوں نے یہ اظہار کیا کہ انہوں نے اس راستے میں جہاد کا ثواب حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے پیغمبرؐ سے پوچھا کہ کیا انہیں مجاہدین کا اجر ملے گا، اس پر دوسری آیت نازل ہوئی۔ (”اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوا وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوا.....“)

تفسیر

جیسا کہ شان نزول سے ظاہر ہے یہ آیت حرام مہینوں میں جہاد کے بارے میں سوالات کا جواب ہے۔ قرآن مجید سے حرام مہینوں میں حرمت جنگ کی خبر دیتا ہے اور اسے بہت بڑا گناہ شمار کرتا ہے (”قتل قتال فیہ کبیر“)

سیرۃ اسدی جنگ کہنے والے اس گروہ کو کہتے ہیں کہ جو محمدؐ کی خدمت میں شریک ہوئے۔ بعض کے نزدیک پانچ سے تین سو افراد تک کے لشکر کو مرید کہتے ہیں۔

توجہ دے کر سیرۃ سریؓ سے ہے جن کا سنی ہے نفیس اور گراں بہا چیز جو کہ جس لشکر کے ذمے یہاں ہو وہ ضرور اہل شہادت و شجاعت کے ہونا چاہیے۔

معرزہ کہتے ہیں سیرۃ سریؓ سے ہے اور اس کا سنی ہے ملت کو چھنا۔ ایسے لشکر جو فرائض کو چھتے تھے اسے اس نے سیرۃ نہ کہتے ہیں۔ حقیقت میں اس

بات کو قبول کرتے ہوئے کہتا ہے کہ سیرۃ سریؓ اُنی دستے کو کہتے ہیں جو مدت کے وقت رہا ہو۔

سیرۃ ابن ہشام، جلد ۲، صفحہ ۲۵۲۔



لیکن قرآن تاکید کرتا ہے کہ وہ مسلمان دستہ جس نے اشتباہ سے حرم میں جگہ کی پراقتضیٰ لاحق ان مشرکین کو نہیں پہنچایا جو ایسے بڑے بڑے گناہوں سے آلودہ ہیں جیسے خدا سے کفر کرنا، راہ راست کی ہدایت سے لوگوں کو روکنا، مکہ میں ٹھہرے ہوئے اور سکونت پذیر افراد کو وہاں سے نکال دینا اور خدا کے حرم امن کے اقوام کو پاؤں تلے روندنا جب کہ وہاں حیوانات اور گھاس تک کو محفوظ رہنا چاہیے۔ علاوہ ازیں مشرکین فتنہ برپا کرتے ہیں یعنی فاسد ماحول پیدا کرنے کے درپے ہیں جس میں کفر اور بت پرستی کی آمیزش ہے وہ حقیقت کے متداعی لوگوں پر دباؤ ڈال کر انہیں دین تو حید کی طرف راغب ہونے سے روکنے کا گناہ کرتے ہیں۔ ان کا یہ عمل ماہ حرام میں جنگ کرنے سے بڑھ کر ہے۔ (”وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ“)

اس کے بعد قرآن کا دسٹے سخن مسلمانوں کی طرف ہے۔ مسلمانوں کو مشرکوں کے پراسٹیکٹا سے بچانے کے لیے قرآن انہیں متنبہ کرتا ہے کہ مشرک تو ہمیشہ اس کے درپے ہیں کہ اگر ہو سکے تو تمہیں دین اسلام سے پھیر لے جائیں۔ اس سلسلے میں ہمیشہ ہی کے طور پر قرآن الادم دیتا ہے کہ جو مسلمان دین حق سے پھر گیا اور حالت کفر میں جا مرا، کفر کے سبب اس کے تمام نیک اعمال کا اجر اس جہان میں اور اس جہان میں باطل ہو جائے گا۔ کفر ان اعمال کو ختم کر دے گا اور انہی خاصیت کو بدل دے گا۔ اس بنا پر ایسا شخص ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عذاب الہی میں مبتلا رہے گا۔

یہ آیت اس نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ ممکن ہے بعض مجاہدین راہ خدا صلیح نہ ہونے کی بنا پر یا کافی احتیاط نہ کرنے کی وجہ سے اشتباہات کے مرتکب ہوں۔ عبداللہ بن حبش کا واقعہ اس کی تفسیر ہے لیکن خدا ان کی بڑی نعمات اور صیغہ مجاہدات کی بناء پر انہیں بخش دے گا۔ (”وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ“)

حبط، احباط اور تکفیر

۱۔ حبط — کا معنی ہے عمل باطل اور بے اثر ہو جانا جیسا کہ قرآن میں کیا ہے۔

”وَحَبْطُ مَا صَنَعُوا فِيْهَا وَبِاطِلُ مَا كَانُوا يَعْمَلُوْنَ“

”انہوں نے جو کچھ تیار کر رکھا تھا وہ باطل اور بے اثر ہو گیا۔“ (ہود۔ ۱۸)

۲۔ احباط — جیسا کہ شکاکین اور علماء عقائد نے کہا ہے، اس کا معنی ہے گذشتہ اعمال کا ثواب بعد کے گناہوں کی وجہ سے جاتا رہنا۔

۳۔ تکفیر — اس کے بعد میں بھی کہا گیا ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ گذشتہ گناہوں کی مزاحمت اعمال کے اثر سے ختم ہو جاتی ہے

کیا حبط صحیح ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ کفر و ارتداد حبط عمل کا سبب ہیں۔ قرآن کی دیگر آیات اور محل بحث آیت بھی اس بات کی گواہ ہیں۔ لہذا اگر کوئی شخص حالت کفر میں دنیا سے چل بسے تو اس کے اعمال ختم ہو جاتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کفر کا گناہ اتنا زیادہ ہے کہ گذشتہ تمام تر ثواب سے بڑھ جاتا ہے۔



اسی طرح اگر ایمان گناہوں کے بعد ہو اور آخر عمر تک باقی رہے تو گزشتہ گناہوں کو ختم کر دیتا ہے لیکن بحث اس بات پر ہے کہ وہ صاحب ایمان افراد جنہوں نے گناہ بھی کئے ہیں اور حکم خدا کی اطاعت بھی کی ہے اور بغیر توبہ کئے دنیا سے چلے گئے ہیں ان کے برے اعمال ان کے نیک اعمال کے ثواب کو ختم کر سکتے ہیں یا نہیں۔

اس ضمن میں متکلمین اور علمائے عقائد کے درمیان اختلاف ہے۔
کچھ کہتے ہیں کہ احباط باطل ہے۔ اپنے اس نظریے پر علماء عقلی اور نقلی دونوں قسم کی دلیلوں سے استدلال کرتے ہیں

عقلی استدلال

جیسا کہ خواجہ نصیر الدین طوسی نے کتاب تجرید العقائد میں کہا ہے کہ احباط ظلم کی ایک قسم ہے کیونکہ کسی انسان کے پاس ثواب کم ہے اور گناہ زیادہ تو احباط کے بعد اس شخص کی طرح ہو جائے گا جس نے بالکل نیک کام نہ کیا ہو اور یہ اس کے لئے ایک قسم کا ظلم شمار ہوگا۔

نقلی استدلال

قرآن مجید کی بہت سی آیات نشانہ دہی کرتی ہیں کہ انسان اس جہان میں اپنے ہر نیک و بد عمل کا نتیجہ دیکھے گا۔ جب کہ مسند احباط اس سے مختلف صورت پیش کرتا ہے۔ سورہ زلزال میں آیا ہے۔

”فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ“
سورۃ زلزال

”یعنی جو شخص جتنی مقدار نیکی یا بدی کی کرے گا، اسے دیکھے گا۔“

دوسرا گروہ معتزلہ کا ہے۔ یہ لوگ احباط کے قائل ہیں۔ انہوں نے آیات قرآن سے استدلال کیا ہے۔ سورہ جن کی آیت ۲۳ میں ہے۔

”وَمَنْ يَعْمَلْ اِثْمًا وَرَسُولًا فَاِنْ لَهٗ نَارُ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا اَبَدًا“

”جو شخص خدا اور رسول کی نافرمانی کرے گا وہ ہمیشہ کے لئے جہنم کی آگ میں محبوس ہوگا۔“

ابو اشم معتزلی نے احباط و تکفیر کو ملا کر موازنہ کیا ہے۔ اس کے نزدیک گناہ اور ثواب کو ملا کر دیکھا جائے گا۔ زیادہ سے کم کو تفریق کرے باقی مقدار دیکھی جائے گی۔ اس سلسلے میں کچھ اور نظریات بھی ہیں جن سے یہاں بحث نہیں ہو سکتی لیکن حق وہی ہے جسے علامہ مجلسی نے بحار الانوار میں اختیار کیا ہے۔ علامہ مجلسی کہتے ہیں۔

ثواب کا سقوط اس گنہگار کے ذریعے جو آخر عمر تک باقی رہے اور اس گنہگار کا سقوط اس ایمان کے دینے سے جو سرت تک ساتھ دے قابلِ اعجاز نہیں ہے۔ بہت سی احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ بہت سے ایسے گناہ ہیں جن سے بہت سی احادیث جاتی رہتی ہیں اور بہت سی احادیث ایسی ہیں جو بہت سی برائیاں کو کف کرتی ہیں اور اس سلسلے میں متواتر خبر و احادیث ہیں مثلاً

توجہ رہے کہ سورہ ہود کی آیت ۱۱۴ بھی اسی مفہوم پر دلالت کرتی ہے۔ وہاں نماز کا حکم دینے کے بعد ایک قانون



کلی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ۔

”اِنَّ الْحَسَنَاتِ يَذْهَبْنَ السَّيِّئَاتِ“

”نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔“

سورہ حجرات میں آیا ہے

”وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْعُتُولِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اِنْ تَعْبَطُوا

اَعْمَالَكُمْ.....“

جیسے ایک دوسرے کو جھڑکانے سے بچانے پر پیغمبر کو اس طرح سے آواز نہ دو ورنہ تمہارے سارے

اعمال ضبط ہو جائیں گے۔ (حجرات - ۲)

پیغمبر اسلام سے منقول ہے کہ آپؐ نے ابو ذر سے فرمایا۔

”اَتَقْنُوْنَ اللّٰهَ حَيْثُ كُنْتُمْ وَخَالِقِ النَّاسِ بِخُلُقِ حَسَنٍ وَّاِذَا عَمَلْتَ سَيِّئَةً

فَاعْمَلْ حَسَنَةً تَمْحُوْهَا“

جہاں کہیں اور میں علی میں جو خصلت سے ڈرو اور لوگوں سے اچھے اخلاق سے پیش آؤ اور جب کبھی کوئی برا کام انجام

دے دے بیٹھ کر بعد ازاں کوئی اچھا کام بجاؤ جو اسے محو کر دے گا۔

نیک اعمال بُرے اعمال کے ذریعے نابود ہو جاتے ہیں۔ اس بارے میں بھی پیشواؒ نے اسلام سے روایات سننے میں

سُنَّہ ”اَيُّكُمْ وَالْحَسَدُ فَاِنَّ الْحَسَدَ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ“ نے

مذہب سے مذہب یوں حد تک نہیں کی اس طرح کہتا ہے جیسے آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہے۔

لیکن یہ تمام گناہوں اور اطاعتوں کے بارے میں کوئی قانون کی بنیاد صرف ان میں سے بعض سے مخصوص ہے

اس طرح سے تمام آیات اور روایات کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

۲۱۹- يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِشْعَرٌ

كَبِيرٌ وَمَنْفَعٌ لِلنَّاسِ وَإِشْعَرُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا

وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ

اللَّهُ لَكُمْ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ۝

ترجمہ

۲۱۹- تم سے شراب اور قمار بازی کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ ان میں بہت بڑا گناہ ہے (مادی

نگاہ سے) لوگوں کے لیے ان میں منافع (بھی) ہیں (لیکن) ان کا گناہ ان کے نفع سے زیادہ ہے



اور تم سے سوال کرتے ہیں کہ کیا کچھ خرچ کریں۔ کہہ دو کہ تمہاری ضرورت سے جو زیادہ ہو، اس طرح خدا تمہارے بیٹے آیات کو واضح کرتا ہے شاید تم فکر کرو۔

شان نزول

اصحاب کا ایک گروہ پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عرض کرنے لگا کہ شراب اور تمہارے بارے میں حکم بیان فرمائیے کیونکہ یہ عقل کو زائل اور مال کو تباہ کرنے والی چیزیں ہیں۔ اس موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔

تفسیر

سیر خر کا معنی ہے "ڈھکنا"۔ برہ چیز جو دوسری کو چھپا دے اور مخفی کرے اسے خمار کہتے ہیں۔ اصطلاح شریعت میں ہر پہنے والی مسکر، مست کرنے والی چیز کو خمر کہتے ہیں، چاہے وہ انگور سے لی جائے یا کشمش اور کھجور سے۔ بلکہ ہر قسم کا الکحل مشروب اس کے مفہوم میں شامل ہے۔ البتہ لفظ خمر کا استعمال مائعات مسکر یعنی پہنے والی نشہ آور چیزوں پر اس کے لغوی معنی کی مناسبت سے ہوتا ہے کیونکہ نشہ آور مائعات عقل پر پردہ ڈال دیتی ہیں اور اچھے بُرے کی تیز ختم کر دیتی ہیں۔

"میر کا مادہ ہے" سیر" اس کا معنی ہے سہل و آسان اور قمار بازی بظاہر لگتا ہے کہ اس کا حقیقی معنی سہل اور آسان ہی ہے اور چونکہ قمار باز شخص چاہتا ہے کہ مال و ثروت آسانی سے حاصل کرے اس بناء پر قمار کو بھی سیر کہا جاتا ہے "قل فیہما اثم کبیر و منافع للناس و اثمہما اکبر من....." خداوند کریم نے آیت کے اس حصے میں حرمت شراب کے حکم کو نرمی اور مدارات کی آمیزش سے بیان فرمایا ہے۔ خدا اپنے پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ ان کے جواب میں کہو یہ دونوں بڑے گناہ ہیں مگر چہ ان میں لوگوں کے لیے منفعت بھی ہے لیکن ان کا فائدہ ان کے نقصان کی نسبت بہت ہی کم ہے اور کوئی عقلمند شخص تنقوس سے نفع کے لیے اتنا بڑا نقصان اٹھانا گوارا نہیں کر سکتا ہے۔

اثم کیا ہے

"اثم" اس حالت کو کہتے ہیں جو انسان کی عقل اور روح میں وجود پذیر ہوتی ہے اور اُسے نیکیوں اور کمالات تک پہنچنے سے روکتی ہے۔ اس نکتے کے پیش نظر آیت کا معنی کچھ یوں بنتا ہے کہ شراب اور قمار کی بدولت انسانی جسم اور روح بہت زیادہ نقصانات اور ضرر کا سامنا کرتے ہیں۔

ان دونوں برائیوں کے نقصانات کی طرف مزید توجہ دلانے کے لیے ہم علماء نفسیات اور ڈاکٹروں کی تانہ ترین تحقیق قدر سے تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

الکحل کے مشروبات کے نقصانات

الکحل کا انسانی عمر پر اثر : مغرب کے ایک مشہور اسکالر کا نظریہ ہے کہ ۲۱ سے ۲۳ سالہ نوجوانوں میں شراب کے مادی ۵



مرنے والوں کے مقابلے میں شراب نہ پینے والوں میں سے دس افراد بھی نہیں مرتے۔

ایک اور مشہور اسکالنے ثابت کیا ہے کہ بیس سالہ نوجوان جن کے بارے میں توقع ہوتی ہے کہ وہ پچاس سال تک زندہ رہیں گے شراب پینے کی وجہ سے ۲۵ سال سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتے۔

بیمہ کمپنیوں کے تجربات سے ثابت ہو چکا ہے کہ شرابیوں کی عمر مردوں کی نسبت ۲۵ سے ۴۰ فیصد کم ہوتی ہے۔
شایات کے ایک ادارے کے مطابق شرابیوں کی اوسط ۲۵ سے ۵۰ سال ہے جبکہ اصول صحت کے تحت یہ اوسط ۶۰ سال سے زیادہ ہے۔

نسل انسانی میں شراب کا اثر : انعقاد نطفہ کے وقت مرد نشے میں ہو تو الکوحل (ALCOALISM) کی ۲۵ بیماریاں بچے کی طرف منتقل ہوتی ہیں۔ عورت اور دو ذول نشے میں ہوں تو الکوحل (ALCOALISM) کی سو فیصد بیماریاں بچے میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اس بناء پر ضروری ہے کہ اولاد کے بارے میں شراب کے اثرات پر زیادہ توجہ دی جائے۔ ہم یہاں کچھ مزید اعداد و شمار پیش کرتے ہیں۔

طبعی وقت سے پہلے پیدا ہونے والے بچوں میں ۴۵ فیصد ماں باپ دونوں کی شراب نوشی کی وجہ سے ہوتے ہیں ۳۱ فیصد باپ کی شراب نوشی کے باعث ہوتے ہیں۔

پیدا نکل کے وقت زندگی کی توانائی سے عاری سونچوں میں ۶ شرابی باپ کی وجہ سے اور ۵ شرابی ماں کی وجہ سے اس طرح ہوتے ہیں۔

شرابی ماں کی وجہ سے ۵۵ فیصد اور شرابی باپ کی وجہ سے ۵۴ فیصد بچے کو تباہ پیدا ہوتے ہیں۔
شرابی ماؤں کی وجہ سے ۵۰ فیصد اور شرابی باپوں کی وجہ سے بھی ۵۰ فیصد بچے کو کافی عقلی اور روحانی توانائی سے محروم ہوتے ہیں۔

اخلاق پر شراب کے اثرات : شرابی شخص گھروالوں سے ہمہ روی اور محبت کے جذبے سے عاری ہوتا ہے بیوی اور اولاد سے شرابی کی محبت کمزور ہوتی ہے۔ بلکہ دیکھا گیا ہے کہ شرابی باپ اپنی اولاد کو قتل کر دیتے ہیں۔
شراب کے اجتماعی نقصانات : ایک انشٹیٹیوٹ کے ڈاکٹر کے مہیا کردہ اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۶۱ میں نیون شہر کے شرابیوں کے اجتماعی جرائم کچھ اس طرح ہیں۔

عام قتل : ۵۰۰ فیصد
مہریت اور زخمی کرنے کے جرائم : ۷۷۰۸ فیصد
جنسی جرائم : ۸۸۰۸ فیصد

ان اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ بڑے جرائم زیادہ تر حالت نشہ میں انجام پاتے ہیں۔

شراب کے اقتصادی نقصانات : روچی امراض کے ایک ڈاکٹر کا کہنا ہے :

اسے اس سے کہنا پڑتا ہے کہ حکمرانوں کے مالیاتی فوائد اور نفع کا حساب تو کرتی ہیں لیکن ان



خرجات کو نظر میں نہیں رکھتیں جو شراب کے برے اثرات کی سبب تمام ہرانتے ہیں۔

روحانی بیماریوں کی بنیادی، متزلزل پذیر معاشرت کے نقصانات، قیمتی اوقات کا ضیاع، حادثات میں ڈیڑھ ٹوٹک کے حادثات، پاک نسروں کی تباہی، بے پرواہی، ثقافت و تمدن کی بے پرواہی، پولیس کی جھٹکیں اور بڑو حفروں، شرابیوں کی آوازوں سے بے پرواہی اور ہسپتالوں، شراب سے مصنفہ جرائد کے بیسے مدافعوں کی مصروفیات، سڑکوں کے بے قید و بندے اور شراب نوشی سے بھرنے والے دیگر نقصانات کو ملحظ نہ جانے تو حکومتوں کو معلوم ہو گا کہ وہ آسانی جو شراب سے ہوتی ہے ان نقصانات کے خاتمہ میں کچھ بھی نہیں۔

علاوہ ازیں شراب واپسی کے افسوسناک نتائج کا موازنہ صرف ڈھروں سے نہیں کیا جاسکتا بلکہ طوفانوں کی گردنوں کی تباہی، قتلوں کی بربادی، صحت پر اثرات اور انسانی معیشتوں کا نقصان۔ یہ سب کچھ بے درمیان میں نہیں دیکھنا چاہئے۔

خلاصہ یہ کہ شراب کے نقصانات اتنے زیادہ ہیں کہ ایک عالم کے بقول اگر حکومتیں یہ ضمانت دیں کہ وہ میٹانوں کا آلودہ بن کر دیں گی تو یہ ضمانت دی جاسکتی ہے کہ ہم آدھے ہسپتالوں اور آدھے پاگل خانوں سے بے نیاز ہو جائیں گے۔ جو کچھ کہا جا چکا ہے اس سے عمل بحث آیت کا معنی ایسی طرح واضح ہو جاتا ہے شراب کی تجارت میں نوع البشر کے بے کوئی فائدہ ہو یا فروع کریں تو پسند ٹھوں کے لیے انسان اس کی وجہ سے اپنے غلوں سے بے خبر ہو جاتا ہے تب بھی اس کا نقصان کہیں زیادہ، بہت دیرین اور اس قدر طویل ہے کہ اس کے فائدے اور نقصانات کا آپس میں موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔

قمار بازی کے برے اثرات

ایسے افراد بہت کم ہیں جو قمار بازی کے زبردست نقصانات سے بے خبر ہوں۔ وضاحت کے لیے اسی منہوس کاروبار اور گھروں کی بربادی کے باعث کام کے چند گوشوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ قمار بازی سیمان انگریزی کا بہت بڑا ذریعہ ہے: تمام علماء نفسیات کا یہ نظریہ ہے کہ روحانی بیماریاں اور اضطراب بہت سی بیماریوں کا باعث ہیں مثلاً دماغ کی کمی، زخم معده، جھڑن و دیوانگی، کم و بیش اعصابی و روحانی بیماریاں وغیرہ۔ یہ بیماریاں زیادہ تر سیمان ہی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ قمار بازی سیمان کا سب سے بڑا عامل ہے۔ یہاں تک کہ امریکہ کا ایک اسکالر کہتا ہے کہ امریکہ میں ہر سال دو ہزار افراد صرف قمار بازی کے سیمان سے مر جاتے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ ایک لاکھ اسی ہزار ایک پوکر باز کا دل اسی طرح ایک منٹ میں سو سے زیادہ مرتبہ دھڑکتا ہے کہیں کبھی قمار بازی سے دل و دماغ پر سکتے بھی طاری ہو جاتا ہے۔ قمار بازی یقینی طور پر جلد بڑھاپا لانے کا باعث بنتی ہے۔

علاوہ ازیں علماء کے بقول جو شخص قمار بازی میں مشغول ہے اس کا دل ہی نشہ کا شکار نہیں ہوتا بلکہ اس کے تمام اعصاب و جسم سمیت حالت سے دوچار ہوتے ہیں۔ اس کے دل کی حرکت بڑھ جاتی ہے۔ شوگر کا مواد اس کے خون میں

منہ گور۔ یہ قمار بازی کی ایک قسم ہے



اخراجات کو نظر میں نہیں رکھتیں جو شراب کے بُرے اثرات کی روک تھام پر اڑتے ہیں۔

روحانی بیماریوں کی زیادتی، تنزل پذیر معاشرے کے نقصانات، قیمتی اوقات کا ضیاع، حالت نشہ میں ڈرائیونگ کے حادثات، پاک منوں کی تباہی، بے رحمی، ثقافت و تمدن کی پس ماندگی پولیس کی رحمتیں اور پکڑ دھکڑ، شرابیوں کی اولاد کے لیے پرورش گاہیں اور ہسپتال، شراب سے متعلق جرائم کے لیے عدالتوں کی صفوفیت، تراسیوں کے لیے قید خانے اور شراب نوشی سے ہونے والے دیگر نقصانات کو چھپا دیا جانے تو حکومتوں کو معلوم ہو گا کہ وہ آمدنی جو شراب سے ہوتی ہے ان نقصانات کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔

علاوہ ازیں شراب نوشی کے اثرات سنگین نتائج کا باعث بن سکتے ہیں اور صرف ڈراموں سے نہیں کیا جاسکتا کیونکہ عزیزوں کی موت، گھروں کی تباہی، تنہائی کی بربادی اور ماحول کی تباہی تو حقیقی مسائل ہیں۔ یہ سب کچھ پیے گئے مد مقابل نہیں دے سکتے۔

خلاصہ یہ کہ شراب کے نقصانات اتنے زیادہ ہیں کہ ایک عالم کے بقول اگر حکومتیں یہ ضمانت دیں کہ وہ میخانوں کا آدھا حصہ بند کر دیں تو یہ ضمانت دی جاسکتی ہے کہ ہم آدھے ہسپتالوں اور آدھے پاگل خانوں سے بے نیاز ہو جائیں گے۔ جو کچھ کہا جا چکا ہے اس سے عملی بحث آیت کا معنی بھی طرح مانع ہو جاتا ہے شراب کی تجارت میں نوع البشر کے لیے کوئی فائدہ ہو یا فتنہ کریں تو چند لمحوں کے لیے انسان اس کی وجہ سے اپنے غموں سے بے خبر ہو جاتا ہے تب ہی اس کا نقصان کہیں زیادہ، بہت وسیع اور اس قدر طویل ہے کہ اس کے فائدے اور نقصانات کا آپس میں موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔

قمار بازی کے بُرے اثرات

ایسے افراد بہت کم ہیں جو قمار بازی کے زبردست نقصانات سے بے خبر ہوں۔ وضاحت کے لیے اس منظر کا دوبارہ اور گھروں کی بربادی کے باعث کام کے چند گوشوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

قمار بازی بیجان انگیزی کا بہت بڑا ذریعہ ہے؛ تمام علماء نفسیات کا یہ نظریہ ہے کہ روحانی بیماریاں اور اضطراب بہت سی بیماریوں کا باعث ہیں مثلاً دماغ کی کمی، زخمِ معده، جنون و دیوانگی، کم و بیش اعصابی و روحانی بیماریاں وغیرہ۔ یہ بیماریاں زیادہ تر بیجان ہی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ قمار بازی بیجان کا سب سے بڑا عامل ہے۔ یہاں تک کہ امریکہ کا ایک اسکالر کہتا ہے کہ امریکہ میں ہر سال دو ہزار افراد صرف قمار بازی کے بیجان سے مر جاتے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ ایک لاکھ اسی ہزار ایک پورکر ہڈ کا دل اور سٹا ایک منٹ میں سو سے زیادہ مرتبہ دھڑکتا ہے۔ کبھی کبھی قمار بازی سے دل دماغ پر سکتے بھی طاری ہو جاتا ہے۔ قمار بازی یقینی طور پر جلد بڑھاپا لانے کا باعث بنتی ہے۔

علاوہ ازیں علماء کے بقول جو شخص قمار بازی میں مشغول ہے اس کا دل ہی نشہ کا شکار نہیں ہوتا بلکہ اس کے تمام اعضاء جسم سخت حالت سے دوچار ہوتے ہیں۔ اس کے دل کی حرکت بڑھ جاتی ہے۔ شوگر کا مواد اس کے خون میں

سہ پورے۔ یہ قمار بازی کی ایک قسم ہے



گرتا ہے، داخلی غدودوں میں خلل واقع ہوتا، چہرے کا رنگ اڑ جاتا ہے اور بھوک ختم ہو جاتی ہے۔ قمار بازی کے ختم ہونے پر جب جواباز سوتا ہے تو اس کے اندر اعصابی جنگ جاری ہوتی ہے اور جسم پر بحران کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ جواری اکثر اوقات اعصاب کی تسکین اور بدن کے آرام کے لیے شراب اور دوسری نشا آور چیزوں کا سہارا لیتا ہے۔ اس طرح شراب اور قمار بازی کے نقصانات جمع ہو کر فتنوں تر ہو جاتے ہیں۔

بعض محققین کہتے ہیں کہ قمار باز ایک بیمار شخص ہے۔ یہ ہمیشہ روح کی نگرانی کا محتاج ہے۔ اسے ہمیشہ بھمانا چاہیئے اور نفسیاتی ذریعوں سے اسے قمار بازی سے روکنے کی کوشش کرنی چاہیئے شاید اس طرح وہ اپنی اصلاح کی طرف مائل ہو سکے۔

قمار بازی کا جرائم سے تعلق : عالمی اعداد و شمار کے ایک بہت بڑے ادارے نے ثابت کیا ہے کہ ۲۰ فیصد جرائم کا تعلق قمار بازی سے ہے اور ۱۰ فیصد دیگر جرائم کے عوامل میں بھی یہ حصہ دار ہے۔

قمار بازی کے اقتصادی نقصانات : ایک سال میں کئی مین بلکہ کئی ارب ڈالر کی دولت دنیا میں اس راستے سے برباد ہوتی ہے۔ انسانی توانائیوں کا اس راستے میں ضیاع اس پر مستزاد ہے بلکہ یہ مل تو دوسری مصروفیات میں سے بھی گن اور لپس حسین لیتا ہے۔ مونٹ کارلو جو دنیا میں قمار بازی کا مشہور مرکز ہے کے بارے میں اخبارات میں چھپا ہے کہ ایک شخص نے ۱۹ گھنٹے میں قمار بازی میں ۵ لاکھ تومان ہارے۔ جب قمار خانے کے دروازے بند ہوئے تو وہ سیدھا جھگ کی طرف گیا اور ایک ہی گولی سے اپنا دماغ پاش پاش کر لیا۔ اس طرح اس نے خود کشی کر لی۔ نامہ نگار مزید لکھتا ہے کہ ”مونٹ کارلو کے جھگ ان پاکیزوں کی کئی خود کشیوں کے شاہد ہیں۔“

قمار بازی کے اجتماعی نقصانات : بہت سے جواباز جیت بھی جاتے ہیں۔ بعض اوقات ایک ہی گھنٹے میں دوسروں کے ہزاروں روپے ان کی جیب میں چلے جاتے ہیں۔ نتیجتاً وہ کوئی پیداواری اور اقتصادی کام کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ اس طرح اجتماعی پیداوار اور اقتصادی حالت منکڑی ہو جاتی ہے۔ صبح غم کیا جانے تو یہ واضح ہو گا کہ قمار باز اور ان کے اہل و عیال معاشرے پر بوجھ ہیں۔ وہ معاشرے کو فائدہ بھرنا نہ پہنچائے بغیر اس کی کمائی کھاتے ہیں اور کبھی ہارنے کی صورت میں جواری چوہی اور ڈاکہ زنی سے اپنی ہار کی تلافی کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ قمار بازی کے نقصانات اتنے زیادہ ہیں کہ بعض غیر مسلمان ملکوں کو بھی اسے قانوناً ممنوع قرار دینا پڑا اگرچہ وہاں بھی علماء وسیع پیمانے پر جوابازی کا کاروبار جاری ہے۔

مثلاً برطانیہ نے ۱۸۵۳ میں، امریکہ نے ۱۸۵۵ میں، روس نے ۱۸۵۴ میں اور جرمنی نے ۱۸۷۳ میں قمار بازی کے ممنوع ہونے کا اعلان کیا۔

اس بحث کے آخر میں بعض محققین کے پیش کردہ ذیل کے اعداد و شمار پر ایک نظر ڈالنا مفید رہے گا۔

(۱) جیب تراشی کی وارداتیں : ۹۰ فیصد

(۲) اخلاقی جرائم : ۱۰ فیصد



(۳) دنگا فساد کے واقعات : ۳۰ فیصد

(۴) جنسی جبرائیم : ۱۵ فیصد

(۵) طلاقیں : ۲۰ فیصد

اور (۶) خودکشی کے واقعات : ۵ فیصد — قمار بازی ہی کی بدولت ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

قمار بازی کی جامع تعریف کرنا چاہیں تو یوں ہوگی :

○ دوسروں کے مال پر دھوکا، فریب اور جھوٹ سے قبضے کے لئے

○ تعزیر کے نام پر

○ اور کبھی بلا مقصد

○ مال، عزت اور آبرو کی قربانی۔

یہاں تک تو ہم نے شراب اور قمار بازی کے ناقابل تلافی نقصانات بیان کیے ہیں اب ایک اور نکتے کی طرف توجہ کرنا بھی ضروری ہے اور وہ یہ کہ خداوندِ عالم نے شراب پر سوز و گداز کیوں رکھی ہے اور اس کے ذکر کے وقت اس کے فوائد نقصانات کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

ہو سکتا ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ ناز و جاہلیت میں (جیسے نئے کی طرح) شراب اور قمار بازی بہت عام تھی اور اگر اس طرف اشارہ نہ ہوتا تو ہو سکتا ہے بعض کوتاہ فہم یہ تصور کرتے کہ منسلک کے ایک ہی پہلو کو مد نظر رکھا گیا ہے۔

علاوہ ازیں انسانی انکار ہمیشہ سود و زیاں کے حور کے گرد چکر لگاتے رہتے ہیں لہذا عظیم اخلاقی برائیوں کے چٹل سے نہایت دلانے کے لئے بھی اس انسانی منطق سے استفادہ کیا گیا ہے۔

ضمناً محل بحث آیت ان ذاکرین کے موقف کا جواب بھی ہے جو شراب کو بعض بیماریوں کے لیے مفید سمجھتے ہیں کیونکہ اس قسم کے اجتماعی فوائد کا اس کے نقصانات سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ اگر وہ ایک بیماری کے لئے مثبت اثر ہو بھی تو بہت سی بیماریوں کا سرچشمہ بھی ہو سکتی ہے، نیز روایات میں یہ جو آیا ہے کہ :

”خدا تعالیٰ نے شراب میں شفا نہیں رکھی“

شاید اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہو۔ ”و یسئلونک ما اذا یفزعون.....“

تفسیر درمنثور میں آیت کے اس حصے کی شان نزول کے بارے میں ابن عباس سے منقول ہے کہ جب خدا نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ دین حق کی ترقی کے لئے خرچ کر دو تو بعض اصحاب و انصار بغیر نے آپ سے پوچھا کہ ہم نہیں جانتے کہ اپنے مال میں سے کتنی مقدار خرچ کریں، کیا مددے کا سارا مال خرچ کریں یا اس کا کچھ حصہ۔

اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور انہیں ”عفو“ کا حکم دیا گیا۔ اب دیکھتے ہیں کہ عفو سے یہاں کیا مراد ہے۔

”عفو“ سے کیا مراد ہے

”عفو“ کے لغت میں کئی معانی بیان کئے گئے ہیں۔



کی اہمیت ۔

اور پھر یہ مضمون ان کے سوال کے بھی منافی نہیں ہے۔ انہوں نے علی امجد کے بارے میں سوال کیا تھا۔ وہ بعض اوقات ایسی چیز کے بارے میں سوال کرتے تھے جس سے زیادہ ضروری چیز کے بارے میں انہیں پوچھنا چاہیے تھا تو قرآن سوال کے حملے سے ان کی آمادگی اور پندیرائی سے استفادہ کرتے ہوئے جواب میں اس چیز کا تذکرہ کرتا ہے جو اہم تر ہوتی ہے یعنی ان کے سوال سے قطع نظر کرتے ہوئے زیادہ اہم بات بیان کرتا ہے۔

یہ نظر نواز انداز قرآن ہی سے مخصوص نہیں کیونکہ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص ہم سے ایک مسئلے کے بارے میں سوال کرتا ہے جب کہ وہ اس سے اہم مسائل بھولے ہوئے ہوتا ہے تو ہم بھلے اس کے کہ آسان اور سادہ سوال کا جواب دیں۔ اس کی ضرورت کے اہم مسائل کو تفصیل سے بیان کر دیتے ہیں۔

دو قابلِ غور نکات آیت کے آخری حصے میں ہے

”كَذٰلِكَ يَمِیْنُ اللّٰهُ لَكُمْ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ“

”خدا اپنی آیات کو اسی طرز بیان کرتا ہے شاید تم غور و فکر کرو“

آیت کی ابتدا میں غور و فکر کی وضاحت یوں کی گئی ہے :

”فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ“

اس تفسیر سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔

پہلی یہ کہ انسان ماسود ہے کہ خدا اور انبیاء کے سامنے سسر تسلیم خم کر دے اس کے باوجود اس کا فرض ہے کہ یہ اطاعت فکر و نظر سے انجام دے۔ نہ یہ کہ اندھا دھند اور بغیر سوچے سمجھے ان کی پیروی کرے۔ دوسرے لفظوں میں جتنا ہو سکے احکام الہی کے اسلوب و رموز سے آگاہی حاصل کرے اور انہیں صحیح شعور سے سمجھا لے۔

اب اس گفتگو کا یہ معنی نہیں ہے کہ احکام الہی کی اطاعت ان کے فلسفے کے سمجھنے سے مشروط ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ ان احکام کی اطاعت کے ساتھ ساتھ ان کی روح اور اسرار کو جاننے کی بھی کوشش کی جانی چاہیے۔

دوسری بات یہ ہے کہ انسان کو یہ نہیں چاہیے کہ وہ فقط عالم مادہ یا فقط عالم معنی ہی میں غور و فکر کرے، بلکہ دونوں پر غور و فکر کرے جسم کی ضروریات اور روح کے تقدسے دونوں ملحوظ نظر میں دونوں کے کامل اور پیش رفت کے وسائل کی تلاش کی جانا چاہیے کیونکہ دنیا و آخرت ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ ایک کی برابری دوسرے کی دیرانی میں حصہ دار ہوتی ہے۔ یہی بات کہ شراب اور قمار بازی کی حرمت کا حکم اور راہ خدا میں خرچ کرنے کی تشویق میں کیا ربط ہے۔ تو ممکن ہے یہ اس لحاظ سے ہو :

۱۔ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے ان احکام کا فلسفہ اور ان کے اسرار انسانی فکر و نظر کو متاثر کرتے ہیں۔



۲۔ اتفاق ٹھوس، مجموعی اور اخروی پہلو رکھتا ہے اور شراب و قمار بازی زیادہ تر شغلی اور مادی پہلو رکھتے ہیں۔ لہذا ان احکام کے ذریعے انسان کو دنیا و آخرت کی فلاح کے لیے خود فکر کی دعوت دی گئی ہے۔

۲۲۔ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ قُلْ إِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ وَإِنْ تُخَالِطُوهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَعْنَتَكُمْ إِنْ اللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ○

ترجمہ

۲۲۔ (تاکہ) دنیا و آخرت میں (فکر کرو) اور تم سے یتیموں کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہہ دو کہ ان کے کام کی اصلاح کرنا بہتر ہے اور اگر اپنی زندگی کو ان کی زندگی میں ملا لو (تو کوئی حرج نہیں، وہ تمہارے دینی بھائی ہیں) اور ان سے ایک بھائی کا سا سلوک کرو (خدا مفسدین کو مصلحین میں سے بھی بناتا ہے اور اگر خدا چاہے تو تمہیں زحمت و تکلیف میں ڈال دے) اور حکم دے دے کہ یتیموں کی سرپرستی کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی اور اموال کا ملنا ان کے مال سے جدا رکھو لیکن خدا ایسا نہیں کرتا، کیونکہ وہ توانا اور حکیم ہے۔

شان نزول

تفسیر قمی میں امام صادقؑ اور تفسیر مجمع البیان میں ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ جب آیت

”وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالْحَقِّ حَسَنًا“

نبی کے مال کے نزدیک مجوز نہ جانا، تحریر کیا۔ اُس کے حق میں جبربر۔ (بخاری و ترمذی - ۱۷۷)

اور آیت

”إِنَّ الْيَتِيمَ كَانَ لَهَمًّا“

فاسرا و سیصلون سعیرا“

جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھا جاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں پسینہ بکھارتے ہیں اور عنقریب اصل جہنم بننے (۱۰۰۔)

نازل ہوئیں کہ جن میں یتیموں کے مال و دولت کے قریب جانے سے منع کیا گیا ہے سوائے اس کے کہ اُن کے لیے مفید ہو اور اُن کا مال کھانے سے روکا گیا ہے تو جن کے گھروں میں یتیم تھے انہوں نے ان کی کفالت سے ہاتھ اٹھالیا اور انہیں اُن کے حال پر چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ کچھ لوگوں نے تو انہیں اپنے گھر ہی سے نکال دیا اور جنہوں نے ایسا نہ کیا اُن کے گھر میں بھی یتیموں



کی کیفیت نکالے جانے سے مختلف نہ تھی۔ ان کے مال سے لکھایا گیا کھانا اپنے کھانے سے نہ ملتا تھا۔ ان کے لیے الگ کھانا پکھانا، تیمم اپنے سرے کے کونے میں الگ سے کھانا کھاتا، اس کا بچا ہوا کھانا پڑا رہتا تاکہ پھر بھوک لگنے پر اُسی کو کھائے اور کھانا خراب ہو جاتا تو پھینک دیا جاتا۔

یہ سب اہتمام اس لیے کیا جاتا کہ میں مال تیمم کھانے کا برم سرزد نہ ہو۔ یہ صورت حال سرپرستیوں اور تیمیوں دونوں کے لیے بہت مشکلات کا باعث تھی۔ ان حالات میں متاثر افراد پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور غصہ کی خدمت میں اپنے احوال پیش کیتے۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔

تفسیر

قرآن مجید تیمیوں کے سرپرستیوں کو حکم دیتا ہے کہ تیمیوں کی سرپرستی سے دست کش ہو جانا اور انہیں ان کے مال پر چھوڑ دینا درست نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ ان کی سرپرستی قبول کر لو اور ان کے کام انجام دو اور جو کام ان کے فائدے میں ہو اور جس میں ان کی اصلاح اور بہتری سمجھو، اسے انجام دو ("فَلِاصْلَاحٍ لِّلْمُحْسِرِ")۔

اور اگر ان کی زندگی تمہاری زندگی سے غلو ہو تو ان سے ایک بھائی کا سا سوک کرو۔ جب تمہارا مقصد ان کی بھلائی ہو تو ان کے مال اور کھانا تمہارے مال اور کھانے سے مل جائے تو کوئی اشکال نہیں و ان تَخَالُطُوهُمْ فَانْخَوَانُكُمْ")۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے کہ غلو تمہاری نیشوں سے واقف ہے۔ بھلائی کا اعتبار سمت فعل کی دلیل نہیں بلکہ حقیقت میں اصلاح طلب ہو، تمہاری نیت تیمیوں کی خدمت کرنا ہو ("وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُنْصِفُ مِنَ الْمَصْلَحِ") آیت کے آخر میں فرماتا ہے، غلو نہ عالم اگر چاہے تو تم پر معاملہ سخت کر سکتا ہے اور تیمیوں کی سرپرستی کو لازمی قرار دینے کے باوجود تمہیں اپنے مال اور کھانے کو ان کے مال اور کھانے سے الگ رکھنے کا حکم دے سکتا ہے لیکن وہ قادر بھی ہے اور حکیم و دانا بھی ہے، کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنے بندوں پر سخت گیری کرے۔ ("وَنُوحِشْهُنَّ لِيُذْخِرْنَ كُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ")۔

۲۱۱۔ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَ وَلَا مَمَّةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ أُولَٰئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ وَاللّٰهُ يَدْعُو إِلَى الْجَنَّةِ



وَالْمَغْضِرَةُ بِأَذْنِهِ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ
يَتَذَكَّرُونَ ۝

ترجمہ

۲۲۱۔ مشرک اور بت پرست عورتیں جب تک ایمان نہ لے آئیں اُن سے نکاح نہ کرو اگرچہ تمہیں کینڑوں
ہی سے رشتہ نزدیک کیوں نہ قائم کرنا پڑے کیونکہ ایماندار کینڑی آزاد بت پرست عورت سے بہتر ہیں
اگرچہ ان کی زیبائی، دولت، شخصیت اور وقعت، تمہیں پہلی معلوم ہوتی ہو اور اپنی عورتیں بت پرست
مردوں سے نہ بیاہو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں اگرچہ تمہیں مجبوراً ایماندار غلاموں سے ہی کیوں
نہ بیاہنا پڑیں کیونکہ ایک صاحب ایسا غلام ایک بت پرست مرد سے بہتر ہے اگرچہ مال و مقام اور
حسن و زیبائی میں وہ تمہیں اچھا لگے۔ وہ تو اُن کو دعوت دیتے ہیں جب کہ خدا جنت اور اپنے حکم کے
ذریعے بخشش کی دعوت دیتا ہے اور اپنی آیات لوگوں کے لیے واضح کرتا ہے کہ شاید وہ یاد رکھیں۔

شان نزول

مرشد جو ایک بہادر انسان تھا پیغمبر کریم نے اسے مدینے سے مکے کی طرف بھیجا اور حکم دیا کہ وہاں پر موجود
مسلمانوں کی ایک جماعت کو ساتھ لے آئے۔ وہ فرماں پیغمبر کی انجام دہی کے لیے تڑپا۔ وہاں اس کی ملاقات ایک
خوبصورت عورت 'عناق' سے ہو گئی۔ اسے وہ زمانہ جاہلیت سے پہچانتا تھا۔ اس عورت نے گذشتہ زمانے کی طرح
اسے گناہ کی دعوت دی لیکن مرشد چونکہ مسلمان ہو چکا تھا، اس کی خواہش کو قبول نہ کر سکا۔ اُس عورت نے نکاح کا
اقاضا کیا تو مرشد نے کہا کہ یہ معاملہ پیغمبر کریم کی اجازت پر موقوف ہے۔ وہ اپنی ڈیوٹی ادا کر کے مدینے چٹ آیا اور وہ واقعہ
آنحضرت کے گوش گزار کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں بیان کیا گیا ہے کہ مشرک اور بت پرست عورتیں مسلمان
مردوں کی ہمسری اور نزدیک کے لائق نہیں۔

تفسیر

لفظ 'نکاح' لغت میں جنسی ملاپ اور عقد ازدواج دونوں معنی میں بیان کیا گیا ہے۔ یہاں عقد ازدواج
ہی مراد ہے۔ اسلام کی نظر میں ازدواجی زندگی کی بہت اہمیت ہے یہی وجہ ہے کہ وراثت کے معاملات اور گھر کے
ترجمتی ماحول کے اولاد پر اثرات کے پیش نظر اسلام نے بیوی یا شوہر کے انتخاب میں مختلف شرائط معین کی ہیں۔
مشرک عورت مسلمان مرد کی کفو اور بیوی بننے کے قابل نہیں اور بالفرض وہ بیوی بن جائے تو بچے اُس کے خیالات اور
صفات بھی وراثت میں حاصل کریں گے اور انہی کی خود میں تربیت پائیں گے (جیسا کہ اکثر ہوتا ہے) تو ظاہر ہے کہ اس کا
نتیجہ برا ہی ہوگا۔ لہذا قرآن اس آیت میں مشرک اور بت پرست عورتوں سے شادی کرنے سے منع کرتا ہے۔ اس سے
فقط نظر ایک پہلو یہ بھی ہے مشرکین اسلام سے بیگانہ ہوتے ہیں اگر وہ شادی کے ذریعے مسلمانوں کے گھروں میں راہ و رسم



پیدا کر لیں تو اسلامی معاشرہ برج و مرج اور داخلی دشمنوں کا شکار ہو جائے گا۔ اس طرح کفر و اسلام کی صفیں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکیں گی۔ قرآن تو مشرک عورتوں کو صاحب ایمان کینزوں کا ہم پلہ بھی قرار نہیں دیتا لیکن قرآن نے ان کے لیے دو دروازہ بند بھی نہیں کیا۔ ان سے جنسی تعلق کے قیام کی صورت وہ یہ بتانا ہے کہ اگر وہ ایمان لے آئیں تو ان سے شادی بیاہ ہو سکتا ہے۔

مشرکین کون ہیں

قرآن میں مشرکین کا لفظ زیادہ تربت پرستوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ لہذا جہاں کہیں یہ لفظ آئے۔ یہ تو مسلم ہے کہ اس کے مفہوم میں بت پرست ضرور شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی بہت سی آیات میں مشرکین کا لفظ اہل کتاب (یہود، نصاریٰ اور مجوس) کے مقابلے میں آیا ہے۔

بعض مفسرین کا اعتقاد ہے کہ مشرک کے مفہوم میں یہود، نصاریٰ اور مجوس سمیت سب کفار شامل ہیں کیونکہ ان میں سے ہر فرقہ خدا کے شریک کا قائل ہے۔ نصاریٰ تثلیث کے قائل ہیں، مجوس تنویت یا دوگانہ پرستی پر اعتقاد رکھتے ہیں، اور یہودی عزیر کو خدا کا بیٹا سمجھتے ہیں۔

یہ عقائد اگرچہ شرک اور میں لیکن اس طرف دیکھتے ہوئے کہ قرآن کی بہت سی آیات میں مشرک، اہل کتاب کے مقابلے میں آیا ہے، قرآنی اصطلاح میں اس کا مفہوم بت پرست ہی نکلتا ہے۔

پیغمبر اسلام سے منقول ایک مشہور حدیث ہے۔ اس میں آپؐ نے اپنی وصیتوں میں فرمایا ہے کہ مشرکین کو حتیٰ طور جزیرۃ العرب سے نکل دو۔ اس میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہے کیونکہ یہ مسلم ہے کہ اہل کتاب جزیرۃ العرب سے نہیں نکلے گئے اور وہ جزیرہ ادا کے ایک مذہبی اقلیت کے طور پر اسلام کی پناہ میں زندگی بسر کرتے رہے۔ اس بناء پر مندرجہ بالا آیت میں اہل کتاب شامل نہیں ہیں۔

”وَلَا تَنْكَحُوا الْمَشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ“

جس طرح مومن مردوں کو مشرک اور بت پرست عورتوں سے شادی کرنے سے منع کیا گیا ہے اس جیسے میں کافر اور مشرک مردوں سے مسلمان عورتیں بیاہنے سے روکا گیا ہے۔ نیز جس طرح مومن کینز کا کافر آزاد عورتوں سے شادی کی نسبت بہتر نہیں چلے کافر عورتیں حسن و جہل اور مال و منال میں بالاتر ہی کیوں نہ ہوں اسی طرح صاحب ایمان غلام، خوبصورت اور بظاہر باحیثیت کافروں سے برتر اور بہتر ہیں لیکن مومن عورتوں کی شادی کافر مردوں سے اس وقت تک منع ہے جب تک وہ کافر ہیں اور اگر وہ ایمان قبول کر لیں تو ان سے شادی کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ یہ باز گشت کا ایک راستہ ہے جس کی طرف آیت کی ابتداء میں بھی اشارہ ہوا ہے۔

”اُولَٰئِكَ يَدْعُونَ إِلَى الْمَآءِ وَالْجَنَّةِ يَدْعُونَ إِلَى الْبَغْيِ وَالْعِصْيَانِ“

”باز نہ“



اس جیلے میں اہل ایمان کی مشرک اور بت پرستوں سے شادی کرنے کی حرمت کی وجہ بیان کی گئی ہے۔ وہ یہ کہ مشرک سے شادی کرنا اس لیے حرام ہے کہ مشرک انسان اپنے ساتھی کو بت پرستی اور ایسی ناپسندیدہ صفات کی دعوت دیتا ہے جن کا سرچشمہ بت پرستی ہے، خصوصاً بت پرست سے یہ معاشرت زنا کے حوالے سے بہت خطرناک ہے اور اس کے اثرات بہت زیادہ اور بہت گہرے ہیں۔ گویا بت پرست سے معاشرت کا انجام غضب خدا کی آگ کے سوا کچھ نہیں۔ خلاصہ یہ کہ بت پرستوں سے آشنا فی خصوصاً شادی بیاہ کے درپے سے خدا سے ناآشنائی کے مترادف ہے اور ان سے نزدیکی خدا سے دوری کا باعث ہے جب کہ مومنین اپنے ایمان اور سرچشمہ ایمان سے بچوٹنے والی بلند صفات کی بدولت اپنے ساتھیوں کو ایمان اور فضیلت کی دعوت دیتے ہیں جس کا انجام جنت، مغفرت اور خدا کی بخشش ہے۔

مومنین کا رابطہ چرک خدا سے بیت گہرے اس لیے آیت میں خطنے مومنین کی بھانے اپنا نام لیا ہے۔ لڑانا ہے:

”وَاللّٰهُ يَدْعُو إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِأَذْنِهِ“

مومن ہے خدا کی دعوت سے مراد بت پرستوں سے شادی کی حرمت کا حکم ہی ہو، جس کا نتیجہ جنت اور خدا کی مغفرت ہے اور اس میں بھی کوئی مانع نہیں کہ آیت دونوں مقامات کی حامل ہو۔

۲۲۲۔ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ قُلْ هُوَ أَذًى فَأَعْتَزِلُوا
النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ وَلَا تَقْرُبُوهُنَّ حَتَّى يَطْهَرْنَ فَإِذَا
طَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ
الطَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ○

۲۲۳۔ نِسَاءُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّى شِئْتُمْ
وَقَدْ مُوا لَا أَنْفُسِكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ مُلَاقُوهُ
وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ○

ترجمہ

۲۲۲۔ اور تم سے خون حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو کہ وہ نقصان دہ اور ناپاکی کی ایک حالت ہے۔ لہذا ماہواری کے دوران میں عورتوں سے کنارہ کشی اختیار کرو اور ان سے ہم بستری نہ کرو۔ جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں ان کے قریب نہ جاؤ اور جب وہ پاکیزہ ہو جائیں تو جس راہ سے خدا نے تمہیں حکم دیا ہے ان سے ملاپ کرو۔ خدا تو یہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اور پاک رہنے والوں کو بھی خدا دوست رکھتا ہے۔



۲۲۲۔ تمہاری عورتیں تمہاری کیستی ہیں۔ جب چاہو تم ان سے ملاپ کرو لیکن کوشش کرو کہ اس طبعی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نیک اولاد کی پرورش کرو، اس طرح نیک تاثیر اپنے لیے آگے بھیجو، خدا سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اس سے طاقت ضرور ہوتا ہے اور مومنین کو رحمت کی بشارت دو۔

شان نزول

عورتیں ہر ملہ میں کم از کم تین اور زیادہ سے زیادہ دس دن نماز، روزہ سے فارغ رہتی ہیں، ان دنوں میں فقہی کتب میں درج مخصوص اوصاف کا خون رحم عورت سے خارج ہوتا ہے، اس حالت میں عورت کو حائض کہتے ہیں اور اس خون کو خون حیض کہا جاتا ہے۔ یہود و نصاریٰ کا موجودہ دین حائض عورتوں سے مباشرت کے بارے میں ایک دوسرے سے متضاد احکام رکھتا ہے۔ یہ صورت ہر شخص کو سوال کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

یہودیوں کا ایک گروہ کہتا ہے کہ ایسی عورتوں کے ساتھ مردوں کا رہنا سہنا ہی باطل حرام ہے۔ یہاں تک کہ ایک دسترخوان پر کھانے اور ایک کمرے میں رہنے تک کی اجازت نہیں ہے، ان کے مطابق جس جگہ حیض والی عورت بیٹھی ہو وہاں مرد کو نہیں بیٹھنا چاہیے اور بیٹھ جلتے تو اپنا لباس دھوئے ورنہ وہ نجس ہے اور اگر اس کے بستر پر سو جائے تو لباس بھی دھوئے اور غسل بھی کرے۔ خلاصہ یہ کہ ان ایام میں عورت کو ایک ناپاک شے اور لازم الاجتناب وجود سمجھا جاتا ہے۔ یہودیوں کے اس گروہ کے برعکس یہاں کہتے ہیں کہ عورت کی حالت حیض اور غیر حیض میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں، حالت حیض میں بھی ان سے ہر طرح کی معاشرت، میل جول یہاں تک جنسی ملاپ پر ہی کوئی تدفین نہیں۔

مشرکین عرب، خصوصاً اہل مدینہ کم و بیش یہودیوں کے خلاق وعات سے مانوس تھے اور حائض عورتوں سے یہودیوں کا سا سلوک رفتار کرتے تھے۔ جاہلی کے دنوں میں ان سے تنگ رہتے تھے۔

اسی دینی اختلاف اور ناقابل مساوی افراد و تفریط کے باعث بعض مسلمانوں نے پیغمبر اکرم سے اس بارے میں سوال کیا اور جواب

تفسیر میں یہ آیت نازل ہوئی۔

ماہواری میں جنسی ملاپ کے نقصانات

”يسئلونك عن المحيض قل هو اذى“

”محیض“ مصدقہ ہے اور یہاں حیض کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس لیے اس کا مفہوم یہ ہوگا ”اے پیغمبر! تم سے حیض اور اس کے احکام کے بارے میں پوچھتے ہیں، ان کے جواب میں کہو ”هو اذى“ یعنی وہ تکلیف دہ اور ناپاک چیز ہے۔ درحقیقت یہ جلد ماہواری میں عورت سے جنسی ملاپ کے اجتنب کے حکم کا فلسفہ بیان کرتا ہے کیونکہ اس حالت میں عورتوں سے جنسی ملاپ تنفر کا باعث ہونے کے علاوہ بہت سے نقصانات کا بھی سبب بنتا ہے ان نقصانات کو آج کی میڈیکل کی دینے بھی ثابت کر دیا ہے، ان میں سے کچھ یہ ہیں۔



- ۱ مرد اور عورت دونوں کا بانجھ ہونا
- ۲ آتشکد اور سوزاک جیسی آئینہ نشی بیماریوں کے جراثیم کا پروان چڑھنا
- ۳ عورت کے تناسلی اعضا کی زیر دست گرمی اور مواد حیض کا مرد کے عضو تناسل میں داخل ہونا جب کہ یہ مواد بدن کے داخلی جراثیموں سے بھرا ہوتا ہے۔

ان کے علاوہ بھی بہت سی بیماریاں اس طرح سے پیدا ہوتی ہیں جن کی تفصیلات میڈیکل کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہیں انہی وجوہ کی بنیاد پر ڈاکٹر خالص عورتوں سے جنسی ملاپ سے منع کرتے ہیں۔
خون حیض کے دنوں میں رحم کی رگیں کھل جاتی ہیں اور ان کا پانی بھی پتلا ہو جاتا ہے۔ اس عمل میں بچہ دانی بھی رحم کی رگوں سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔

تقریباً ماہواری کے آغاز پر ہی عورت کا نطفہ (OVUM) شیپور نالی (FALLOPIAN TUBE) سے گزر کر رحم میں داخل ہوتا ہے تاکہ مرد کا نطفہ داخل ہو تو ان کے ملاپ سے بچہ پیدا ہو سکے۔
مذکورہ خون کا ترشح ابتداء میں غیر منظم اور بے رنگ ہوتا ہے لیکن بہت جلد وہ منظم اور سرخ رنگ ہو جاتا ہے۔ آخر میں یہ پھر کم رنگ اور غیر مرتب ہوتا جاتا ہے۔

اصلی طور پر ماہانہ عادت کے وقت نکلنے والا خون ہر ماہ رحم کی داخلی رگوں میں احتمالی بچے کی غذا کے لیے جمع ہو جاتا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہر ماہ عورت کے رحم میں ایک چھوٹا سا انڈہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ رحم کی داخلی رگیں آمادگی کی حالت میں نطفہ کی غذا کے لیے خون سے پر ہو جاتی ہیں۔ اس وقت جب کہ انڈہ شیپور نالی سے گزر کر رحم میں داخل ہوتا ہے اگر اسپرماٹوزیڈ یعنی مرد کا نطفہ موجود ہو تو بچہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہاں رگوں میں موجود خون اس کی غذا میں صرف ہونے لگ جاتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو رحم کا پانی پتلا ہونے لگتا ہے۔ رحم کی رگیں کھل جاتی ہیں اور وہاں موجود خون، خون حیض کی صورت میں خارج ہو جاتا ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان ایام میں جنسی ملاپ کیوں نقصان دہ اور ممنوع ہے۔ کیونکہ اس خون کے اخراج کی حالت میں عورت کے رحم میں نطفہ قبول کرنے کے لیے کوئی طبعی آمادگی نہیں ہوتی اور اسی بناء پر اس سے تکلیف ہوتی ہے۔

”فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ“

اس آیت کا پہلا حصہ جس میں مائض عورتوں سے علیحدگی اعتزال اور جنسی رابطے سے ممانعت ہے۔ پہلی نظر میں یہودی مذہب کے موجودہ احکام سے شباهت رکھتا ہے لیکن ”فَإِذَا تَطَهَّرْنَ“ فَاَتَوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ امْرُؤٌ مَكْرُوهٌ کے قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ کفارہ کشی سے ملو فقط جنسی ملاپ ہے کیونکہ اس حصے میں خون حیض پاک ہونے کے بعد عورتوں سے جنسی ملاپ کی اجازت دی گئی ہے۔

دیکھا جائے تو اسلام عورتوں کی مابواری کے معاملے میں درمیانی راہ اختیار کرتا ہے۔ اسی طرح ہر مقام پر اسلام کی راہ اور روش اعتدال پر مبنی ہے۔ اسلام افراط و تفریط سے پاک ہے۔ یہاں بھی یہودیوں کی محدودی پر اسلام نے گرفت کی ہے۔



اسلام کے مطابق ماہوری کے عالم میں عورتوں سے معاشرت، میل جول اور نشست و برخاست میں کوئی مضائقہ نہیں۔ فقط جنسی ملاپ کی ممانعت ہے۔ اسلام نے اس موقع پر عیسائیوں کے طرز عمل کو بھی اختیار نہیں کیا جن کے نزدیک حیض اور غیر حیض ہر حالت میں عورتوں سے یکساں قسم کے تعلقات رکھنے کی کھلی چٹھی ہے۔ اس طرح اسلام نے عورت کے احترام، اس کی شخصیت کی حفاظت اور اسے حقیر نہ سمجھنے اور دونوں کی صحت کے ضمن میں نقصان دہ امور سے بچنے کے لئے تقابیر اختیار کی ہیں۔

جنسی ملاپ کی اجازت

”فَاِذَا تَطَهَّرْتَ فَأَتَوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ“

جب وہ پاک ہو جائیں تو جس راہ سے خدا نے حکم دیا ہے، اُن سے مل کر۔

آیت کا یہ حصہ حقیقت میں عورتوں سے جائز مباشرت کی وضاحت کے لیے ہے۔ ”اِذَا تَطَهَّرْتَ“ سے معلوم ہوتا ہے کہ ماہواری سے پاک ہو جانے پر ہی عورتوں سے مباشرت جائز ہے کیونکہ یہ جو خون حیض کو آلودگی قرار دینے کے بعد آیا ہے یعنی جب وہ اس نہاک اور آلودگی سے پاک ہو جائیں تو حکم امتناعی ختم ہو جاتا ہے۔ ”تَطَهَّرْتَ“ کا مفہوم ظاہر عورتوں کا غسل کر لینا نہیں لیا جاسکتا کیونکہ آیت کی ابتداء میں وجوب غسل کے سلسلے میں کوئی بات نہیں کی گئی۔

دوسرے نفلوں میں حَتَّٰثٌ يَطْهَرْنَ جو اس سے پہلے آیا ہے کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ منہریت عورت کی نہاک کے زمانے میں ہے یعنی پاک ہونے کے بعد یہ منہریت برطرف ہو جاتی ہے۔ یہی مفہوم ہمارے بزرگ فقہاء نے فقہی مسائل میں لیا ہے۔ انہوں نے فتویٰ دیا ہے کہ خون سے پاک ہو جانے کے بعد غسل سے پہلے بھی جنسی ملاپ جائز ہے۔

مذہب جلالہ توفیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ لَفْظُ ”تَطَهَّرْتَ“ غسل کرنے پر دلالت نہیں کرتا جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے۔ وجوب غسل تو ایک دوسری دلیل کے ذریعے ثابت ہوا ہے۔

”مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ“ اس بعد ازلے جتنے میں حکم دیا گیا ہے : جس طریق سے خدا نے حکم دیا ہے مباشرت کرو۔ ہو سکتا ہے یہ حصہ آیت کے گزشتہ حصے کی تاکید ہو یعنی صرف عورت کے پاک ہونے کی حالت میں ہماست کرو۔ اس کے علاوہ مذکور۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا زیادہ وسیع اور گہرا مفہوم ہو یعنی پاک ہونے کے بعد بھی مباشرت کا عمل حکم پروردگار کی حدود کے اندر ہونا چاہیئے۔

ہو سکتا ہے اس فرمان میں پروردگار کا کوئی حکم بھی شامل ہو اور قریشی بھی کہیں کہ خدا نے نوح انسان کی بقاء کے لیے دو مخالف صفوں میں ایک دوسرے کے لیے کشش رکھی ہے اس لیے جنسی ملاپ دونوں کے لیے ایک لذت رکھتا ہے لیکن مُتَّكِم ہے کہ درحقیقت مقصد بقاء نسل تھا اور کشش اور لذت تو اس مقصد کے حصول کے لیے مقدمات اور تہید کی حیثیت سے ہے لہذا لذت جنسی کا حصول بقاء نسل کے حوالے سے ہی ہونا چاہیئے۔ اسی بنا پر استمناء یعنی جنسی ملاپ کے علاوہ منی نکالنا اور لواطت یعنی مرد کا مرد سے بدکاری کرنا اور ایسے دیگر افعال جو اس ننگونی حکم سے انحراف قرار پاتے ہیں ممنوع ہیں کیونکہ وہ کسی طرح بھی جنسی



ملاپ کے اصلی مقصد کو یوں نہیں کرتے جب کہ اس کے علاوہ بھی ان اعمال کے شدید نقصانات ہیں۔
”اِنَّ اَفْلٰهٖ يَحِبُّ الشَّوَابِيْنَ وِ يَحِبُّ الْمُسْتَطْمِرِيْنَ“

خدا توبہ کرنے والوں اور پائبانوں کو دوست رکھتا ہے۔

”توبہ“ کا معنی ہے گناہ سے پشیمان اور خدا کی نافرمانی سے پشیمان ہونا۔ توبہ کے تین بنیادی ارکان ہیں۔

۱۔ یہ جاننا کہ میں پہلے خدا کی نافرمانی کر چکا ہوں۔

۲۔ اس عمل پر پشیمان اور تادم ہونا۔

۳۔ آئندہ اُسے ترک کرنے کا عزم بالجزم کرنا اور جو ہو چکا ہے اس کی تلافی اور ازالہ کرنا۔

کسی شخص میں یہ کیفیت پائی جائے تو اسے تائب کہتے ہیں اور اس کے عمل کو توبہ کہا جاتا ہے (توبہ اور اس کی شرائط کے بارے میں مزید تشریح مقلد آیات میں بیان کی جا چکی ہے)۔

اس آیت میں تعبیر سے مراد گناہ سے اکوڑ نہ ہونا اور اپنے آپ کو خدا کی نافرمانی سے بچانا ہے۔ آیت کے آخر میں اس جملے کا استعمال ہو سکتا ہے اس لیے کہ بعض لوگ اپنے کمزور مزاج پر مضطرب نہ کرتے ہوئے ایام حیض میں عورتوں سے عدم مباشرت کے خدائی حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھیں اور آلودہ گناہ ہو جائیں، بعد ازاں اپنے اس عمل پر اُن کی نظر پڑے تو وہ ناراحت اور افسردہ ہوں اور وہ اپنے شیش غضب خدا کا حقدار سمجھیں تو ایسے میں یہ نہ ہو کہ انہیں اپنی بازگشت کا کوئی راستہ ہی سمجھائی نہ دے اور درحمت الہی سے مایوس ہو جائیں، اللہ تعالیٰ متوجہ کرتا ہے کہ اگر وہ توبہ کر لیں تو کسی حد تک لطف خدا سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں۔ البتہ جو لوگ ابتداء ہی سے اپنے نفس پر ضبط برقرار رکھیں اور اُس گناہ سے پاک رہیں تو اُن کے لیے پروردگار کے اس لطف و رحمت کا حصہ زیادہ ہے۔

نوع بشر کی حفاظت کا ذریعہ

”فَاَنذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظَّى“

اس آیت میں عورتوں کو کہتی ہے تشبیہ دی گئی ہے۔ جو سکتا ہے بعض لوگوں کے نزدیک یہ تشبیہ عورتوں کے بارے میں بوجہ عمل ہو اور وہ سوچیں کہ اسلام نے آدمی انسانیت کے لیے یہ لفظ کیوں استعمال کیا ہے حالانکہ اس تشبیہ میں ایک باریک سا نکتہ یہاں ہے۔ درحقیقت قرآن چاہتا ہے کہ اس طرح سے عورت کو متعارف کروا کر انسانی معاشرے میں اُس کے وجود کی ضرورت کو اجاگر کرے اور یہ واضح کرے کہ عورت فقط آتشِ شہوت کو سرد کرنے کا ذریعہ نہیں بلکہ نوع بشر کی بقا کا وسیلہ ہے۔

جیسے انسان اپنی بقاء کے لیے غذا کا محتاج ہے اور یہ احتیاج کا شکاری اور زراعت کے بغیر پوری نہیں ہو سکتی، اس طرح بقاء نوع انسانی عورت کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ بات اُن لوگوں کے لیے ایک تفسیر کی حیثیت رکھتی ہے جو عورت کو ایک کھلونا اور ہوس پرستی کا ہدف سمجھے بیٹھیں۔



”حرف“ مصدر ہے۔ یہ بیچ ڈالنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ بعض اوقات زراعت کی جگہ مزدور کے مفہوم میں بھی بولا جاتا ہے۔

لفظ ”اتی“ اسماء شہ میں سے ہے اور زیادہ تر ”ستی“ کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے اور ”ستی“ کا معنی ہے زندہ، اس صورت میں اسے اپنی زمانہ کہتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ مکان کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ سورہ آل عمران کی آیت ۳ میں ہے۔

”یا مریعہ ائی لث هذا قالت هو من عند الله“

حضرت زکریا جب مریم کے پاس جاتے تو ان کے پاس تید شدہ کھانے دیکھتے تو پہچتے ”ای لث هذا“ یعنی یہ کھانا تمہارے پاس کہاں سے آیا۔

جواب مریم جواب دہیں ”من عند الله“ یعنی خدا کے ہاں سے (مراد تھی جنت سے)۔

لفظ ”اتی“ اگر زمانی ہے تو محدثوں سے مباشرت کے وسیع زمانے کا مفہوم حاصل ہوگا۔ یعنی شب و روز، تمام اوقات میں اس کی اجازت دی گئی ہے اور اگر یہ مکانی ہو تو پھر مراد یہ ہوگی یہ مکان، مقام اور کیفیت تمام امور میں وسعت دی گئی ہے۔

”وَقَدْ مَوَا لَانْفُسَكُمْ“

یہ جملہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جنسی ملاپ کا اصل مقصد صرف حصول لذت اور تکمیل خواہش نہیں بلکہ صاحب ایمان افراد کو چاہیے کہ وہ اس عمل سے لائق اور شائستہ اولاد کے حصول کی خواہش کریں اور پھر اُس کی تربیت کی ذمہ داری پوری کریں اور اس مقدس تربیتی خدمت کو ایک سنوئی سرپائے کے طور پر اپنے گل کے پئے آگے بھیجیں، اس لیے قرآن مجید کہتا ہے کہ بیوی کے انتخاب میں ایسے اصول پیش نظر رکھیں جن کا نتیجہ اچھی اولاد کی پرورش اور عظیم اجتماعی و انسانی سرائے کا حصول ہو۔ غیر اکریم سے ایک حدیث منقول ہے جس میں آپؐ نے ارشاد فرمایا ہے۔

”اذا مات الانسان انقطع عمله الا عن ثلاث: صدقة تجارية

وعلم ينتفع به وولد صالح يدعوله“

جب انسان مر جاتا ہے اُس کا دفتر عمل بھی بند ہو جاتا ہے۔ مرنے کے بعد انسان اپنے لیے کوئی بچت بنانا نہیں کر سکتا البتہ تین چیزیں ایسی ہیں جو موت کے بعد بھی اُس کے لیے نفع بخش ہوں گی۔

۱۔ صدقہ جاریہ ۲۔ آثار علمی اور ۳۔ نیک اولاد کی تربیت

صدقہ جاریہ سے مراد ایسے آثار خیر ہیں جو اجتماعی فوائد کے لیے استعمال ہوتے رہتے ہیں جیسے مسجد، مدرسہ، ہسپتال، لائبریری یا ایسی دیگر چیزیں۔ آثار علمی سے مراد کتاب کی تالیف اور شاگردوں کی تربیت۔ نیک اولاد جو اپنے مال باپ کے لیے عملی یا مذہبی طور پر طلب بخشش کرے۔



”وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ مُلَاقُوهُ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ“

زیر نظر موضوع — جنسی عاپ — چونکہ بہت ہی اہم ہے اور انسانی عمر میں سے سب سے زیادہ پرکشش غریزہ جنسی ہی ہے اس لیے اس جملے کے ذریعے خدا تعالیٰ انسان کو جنسی عاپ کے معاملے میں وقت و فکر کی دعوت دیتا ہے اور اپنے احکام کی طرف متوجہ کرتا ہے اور فرماتا ہے ”وَاتَّقُوا اللَّهَ“ یعنی اللہ کی نافرمانی سے ڈرو۔
اس کے بعد متوجہ کرتا ہے کہ تمہیں قیامت کے دن پرسدھ گھر سے ملاقات اور اپنے نچا اٹل کے نتائج کی طرف جانا ہوگا
”وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ مُلَاقُوهُ“

آخر میں ایمانداروں کو بشارت دیتا ہے کیونکہ صاحبانِ ایمان اس کے احکام کے سامنے تسلیم خم کئے ہوئے ہیں
کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ احکام ان کی مادی اور روحانی زندگی کے لیے مفید ہیں ”وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ“

۲۲۴۔ وَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ عُرْضَةً لِأَيْمَانِكُمْ أَنْ تَبَرُّوا وَتَتَّقُوا
وَتُصْلِحُوا بَيْنَ النَّاسِ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ○

۲۲۵۔ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ وَلَكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ
بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ○

ترجمہ — ۲۲۴۔ خدا کو اپنی قسموں میں نہ لاؤ۔ نیکی کرنے، تقویٰ اختیار کرنے اور لوگوں میں صلح صفائی کے عمل میں قسمیں نہ کھاتے رہو اور خدا سننے والا جانتے والا ہے۔

۲۲۵۔ بے توجہ قسمیں کھانے پر تو خدا تمہارا مواخذہ نہیں کرے گا البتہ جو کچھ تم دل و دماغ سے کرتے ہو (اور وہ قسمیں جو تم ارادہ اختیار سے کھاتے ہو) اس پر ضرور باز پرس ہوگی اور خدا بخشنے والا صاحبِ علم ہے۔

شان نزول — پیغمبر اکرم کے ایک صحابی عبداللہ بن رواحہ کے داماد اور بیٹی میں اختلاف ہو گیا تو اس نے قسم کھائی کہ ان میں صلح کے لیے وہ دخل اندازی نہیں کرے گا اور اس بارے میں کوئی قدم نہیں اٹھائے گا۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور ایسی قسموں کو ممنوع اور بے بنیاد قرار دے دیا۔

تفسیر — ”ایمان“ ”یعین“ کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے ”قسم“

”عروضہ“ کا معنی ہے کسی چیز کا معرض قرار دینا۔ مثلاً کوئی جنس بازار میں بیچنے کے لیے لاتے ہیں اور اسے معاملے کے معرض میں قرار دیتے ہیں یعنی اسے معاملے کے بیچ میں لاتے ہیں تو اسے عرضہ کہتے ہیں۔ بعض اوقات



موانع اور رکاوٹوں کو بھی عرض کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ معرض انسان میں واقع ہوتے ہیں اور انسان کے راستے میں حائل ہوتے ہیں۔ ”عرضہ“ کے مذکورہ مفہوم کو نظروں سے گزرتے ہوئے آیت کی تفسیر کچھ اس طرح ہوگی: خدا کو اپنی قسموں کے معرض میں نہ لاؤ اور ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے قسم نہ کھاؤ۔ خدا کے نام کو معمولی نہ بنا دو۔ اہم مقاصد کے علاوہ یوں قسم کھانا غیر مناسب اور غیر مطلوب کام ہے۔ یہ بات بہت سی احادیث میں بھی بیان کی گئی۔ ان میں سے امام صادق علیہ السلام کا ایک فرمان ملاحظہ کیجئے، آپؑ نے فرمایا:

”وَلَا تَحْلِفُوا بِاللّٰهِ صَادِقِينَ وَلَا كَاذِبِينَ فَإِنَّهُ سَبْحَانَهُ يَقُولُ لَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عَرْضَةً لَا يَمَانُكُمْ“

خدا کی قسم کہیں نہ کھانا۔ چاہے تم سچے ہو یا جھوٹے کیونکہ خدا فرماتا ہے کہ خدا اپنی قسموں میں نہ لاؤ۔

اس صورت میں شان نزول کے ساتھ اس کی مناسبت یوں ہوگی کہ بچے کاموں میں بھی قسم کھانا پسندیدہ عمل نہیں ہے چہ جائیکہ انسان کسی اچھے کام مثلاً لوگوں کے درمیان صلح صفائی وغیرہ ترک کرنے کے معاملے میں قسم کھائے۔ اس تفسیر کے مطابق ”ان متبرؤا و تشقوا و تصلحوا بین الناس“ اس طرف اشارہ ہے کہ نیک کاموں اور لوگوں کے درمیان مصالحت کلانے میں بھی قسم نہ کھاؤ۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”عرضہ“ آیت میں رکاوٹ اور مانع کے معنی میں ہو یعنی خدا کے نام کی قسم کو نیک عمل اور لوگوں کے درمیان صلح کرنے میں رکاوٹ نہ بنائو اور ایسی قسم کی کوئی قیمت اور اختیار نہیں۔ شان نزول سے اس تفسیر کی مناسبت مکمل طور پر واضح ہے۔

”لَا يَتَوَخَّذُكُمْ اللّٰهُ بِالتَّغْوٰفِ اِيْمَانُكُمْ وَلٰكِنْ يَتَوَخَّذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ“

اس آیت میں اللہ تعالیٰ دو طرح کی قسموں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

پہلی قسم۔ لغو قسموں کی ہے، جن کا کوئی اثر نہیں اور جن کی پرواہ نہیں کرنا چاہیے۔ یہ وہ قسمیں ہیں جو لوگ بغیر توجہ کے کھاتے ہیں۔ بعض لوگ تکیہ کام اور عداوت کے طور پر قسمیں کھاتے ہیں۔ ہر کام میں ”لا والله“ اور ”بلی والله“ یعنی نہ سبوتاؤ اور ہاں بخدا کہتے ہیں۔ ایسی قسمیں لغو ہیں، ”لغو“ لغت میں ان تمام کاموں اور باتوں کو کہتے ہیں جن کا حدف اور مقصد معین نہ ہو یا جو قصہ و اداہ سے سرزد نہ ہوں۔

اس لیے وہ قسمیں لغو کہلائیں گی جو انسان غضب اور غصے کی حالت میں کھاتا ہے (جب کہ حالت غضب میں وہ عام حالت میں نہ رہے)۔

مندرجہ بالا آیت کے مطابق ایسی قسمیں جو قصہ و اداہ سے انجام پذیر نہ ہو ان میں مؤاخذہ نہیں ہے اور نہ وہ کوئی اثر رکھتی ہیں۔ البتہ یہ بات اہم ہے کہ انسان کی تربیت اس طرح سے ہونا چاہیے کہ وہ ایسی قسموں سے بھی بے کٹاؤ کشش رہے۔



دوسری قسم۔ ان قسموں کی ہے جو قصد و ارادہ کے ماتحت ہوں اور قرآن کی تعبیر کے مطابق اس میں کسب قیسی موثر ہے۔ ایسی قسم معتبر ہے اور اس کی پابندی کرنا چاہیئے اور اس کی مخالفت نہ فقط گناہ ہے بلکہ اس کا کفارہ بھی دینا پڑتا ہے۔ مگر اس کی کچھ شرائط ہیں جن کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے۔

قسمیں — جو قابل اعتبار ہیں

اسلام کی نظر میں قسم کھانا اصولی طور پر اچھا نہیں ہے جیسا کہ اوپر بھی بیان کیا جا چکا ہے لیکن یہ فعل حرام بھی نہیں ہے بلکہ بعض اوقات اہم مقاصد کے لیے قسم کھانا مستحب یا واجب بھی ہو جاتا ہے۔

بعض قسمیں تو اسلام کی نگاہ میں بالکل لغو اور بجا اعتبار میں مثلاً وہ قسم جو غیر خدا کے نام کی ہو۔ ایسی قسمیں جن میں خدا کا نام نہیں ہے بالکل بے اثر ہیں اور ان کے مطابق عمل کرنا ضروری نہیں ہے۔ اسی طرح حرام یا مکروہ فعل انجام دینے کے لیے کھائی جانے والی قسمیں بھی بے اثر ہیں۔ مثلاً کوئی شخص قسم کھائے کہ وہ کسی کا قرض ادا نہیں کرے گا یا جہاد سے بھاگ جائے گا وغیرہ وغیرہ۔ اگر کوئی ایسی قسم کھائے تو اس کی پرفاہ نہ کرے اور اپنی ذمہ داری پوری کرے اور اس کے ذمہ ایسی قسم کا کوئی کفارہ بھی نہیں "لَا يُوَاحِدُكُمْ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فَإِذَا نَكَمُ" کی تفسیر میں ایک ہی مفہوم مضمر ہے۔

ایسی قسمیں جو خدا کے نام پر کھائی جائیں اور ان کا مقصد کوئی اچھا کام ہو یا کم از کم فعل مباح ہو تو اسے پورا کرنا ضروری ہے اور اس کی مخالفت پر کفارہ دینا پڑے گا۔ سورہ مائدہ آیہ ۸۹ کے مطابق اس کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا یا انہیں لباس پہنانا یا ایک غلام آزاد کرنا ہے۔

۲۲۹۔ لِّلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِن نِّسَائِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ فَإِنْ فَاءُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○

۲۲۷۔ وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ○

ترجمہ — ۲۲۶۔ جو لوگ اپنی عورتوں سے تعلق نہ رکھنے کی قسم کھاتے ہیں (یعنی ان سے جنسی ملاپ نہ کرنے کی سوگند کھاتے ہیں) وہ چار ماہ تک انتظار کا حق رکھتے ہیں (اور ان چار ماہ کے دوران میں اپنی بیوی کے ساتھ زندگی گزارنے یا اسے طلاق دینے کے بارے میں اپنا ارادہ اور کیفیت واضح کر لیں، اب اگر اس واقعہ میں رجوع کر لیں (تو کوئی حرج نہیں کہ خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

۲۲۷۔ اور اگر علیحدگی کا مستحکم ارادہ کر لیں (وہ بھی اس کی پوری شرائط کے ساتھ تو بھی حرج نہیں)

تفسیر خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔

زمانہ جاہلیت کے ایک طرز عمل کا خاتمہ

”ایلا“ وہ رسم ہے جو زمانہ جاہلیت میں میاں بیوی کے درمیان جہلی کے سلسلے میں عام تھی۔ ایلا کا مفہوم ہے کہ میاں بیوی والے تعلقات ترک کرنے کی قسم کھانا، حکم طلاق نازل ہونے سے پہلے نو مسلموں میں بھی یہ رسم باقی تھی۔ زمانہ جاہلیت میں جب کوئی مرد اپنی بیوی سے مستغز ہو جاتا تو بعض اوقات قسم کھا لیتا کہ وہ اس سے بے ستری نہیں کریگا اس طرح وہ اپنی بیوی کو اپنے اس غیر انسانی سلوک سے ایک شدید عذاب میں مبتلا کر دیتا۔ نہ رسمی طور پر طلاق دیتا کہ وہ آزادی سے اپنے نئے کسی دوسرے شوہر کا انتخاب کر کے اپنی خواہشات پوری کر سکے نہ اس قسم کے بعد وہ خود تیار ہوتا کہ اس سے صلح کر کے ایک شوہر کی طرح زندگی بسر کرے۔

زیر نظر آیت میں اس سلسلے میں اسلام کا معین کردہ طریق کار بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ شوہر کو چار ماہ کی مہلت دی جاتی ہے کہ وہ اپنی بیوی کو اس مصیبت اور عذاب سے نہایت دے۔ اس عرصے میں وہ اپنی قسم کو ترک کر دے اور اپنی بیوی کے ساتھ زندگی بسر کرے یا اسے طلاق دے کر آزاد کر دے۔

پہلی راہ کا انتخاب یعنی گھر کے ماحول کو خرابی سے پہنچا بلاشبہ عقل و دانش کا تقاضا بھی ہے اور رضائے پروردگار کے حصول کا ذریعہ بھی، اسی لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے۔

”فَإِنْ فَاءَ وَفَارَ اللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ“

مگر اپنے ارادے کو ترک کر دیں تو خدا بخشنے والا مہربان ہے

(فَإِنْ اللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ) — یہ جملہ ولادت کرتا ہے کہ اس قسم کو ترک کرنا کوئی گناہ نہیں، اگرچہ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قسم کھانا خود بھی ایک پسندیدہ عمل نہیں ہے۔

اگر مرد علیحدگی کا ارادہ کرے اور طلاق دے دے تو اس صورت میں بخشش و مغفرت مستمم نہیں ہے۔ خدا جو تمام اسرار سے آگاہ ہے، جانتا ہے کہ ہوس پرستی نے شوہر کو قانون طلاق سے غلامانہ اٹھانے پر ابھارا ہے یا اس کے حالات کا یہی تقاضا تھا۔ ظاہری طلاق جاری کرنے کے باوجود اس کا سبب اور محرک سب کچھ خدا کے علم میں ہے اسی لیے آیت کے آخر میں فرماتا ہے۔

”وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ“

اور اگر وہ طلاق ہی کا ارادہ کر لیں تو اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

توجہ رہے کہ اسلام نے ”ایلا“ کو باطل تو ختم نہیں کیا البتہ اس کے برے اثر کو ختم کر دیا ہے کیونکہ وہ کسی کو اجازت نہیں دیتا کہ ”ایلا“ یا بیوی سے مباشرت ترک کرنے کی قسم کھانے سے وہ اپنی بیوی سے جدا ہو جائے۔ اسلام نے ایلا کرنے والے کے لئے مدت کا تعین اس لیے نہیں کیا کہ واقعاً قسم کھانے سے ازدواجی حقوق



میں سے کوئی حق باطل ہو جاتا ہے۔ بلکہ یہ اس لیے ہے کہ واجب شرعی ہونے کے لحاظ سے مباشرت چار ماہ میں ایک مرتبہ ضروری ہے، البتہ یہ بھی اس صورت میں ہے کہ عورت طویل مدت کی وجہ سے گناہ کا شکار نہ ہو ورنہ اس صورت کے علاوہ خصوصاً جوان عورتوں کے بارے میں کہ جہاں خلوص ہو کہ وہ گناہ میں مبتلا ہو جائیں گی، ضروری ہے کہ عدم مباشرت کی مدت کم کر دی جائے تاکہ اس کی جنسی ضرورت پوری ہو سکے۔

حکم اسلام اور دنیا کے مغرب کا ایک تقابل

”ایلاء“ کی رسم پر اسلام کی گرفت اور زمانہ جاہلیت کی گزشتہ تاریخ میں ایلاء کی طرح سے بدنی عیحدگی (یورپی مملکت میں جس کی تائید کی جا چکی ہے، پر نظر کی جانے تو اسلام اور قرآن میں عہدت کے حقوق کی کیفیت سے کافی آگاہی ہو سکتی ہے۔

وضاحت کچھ یوں ہے کہ فرانس کے عظیم انقلاب کے بعد اہل فرانس کو طلاق کے لیے اس صورت کی بھی اجازت دی گئی تھی کہ وہ ایک دوسرے سے بدنی جدائی اختیار کر لیں اس قانون کے مطابق جو عورت مرد ایک دوسرے سے مصالحت نہیں کر سکتے تھے اُن کے لیے ممکن تھا کہ وقتی طور پر ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں اور علیحدہ گھروں میں زندگی بسر کریں (البتہ روابط اور حقوق برقرار رہتے تھے صرف شوہر کے ذمے اخراجات نہ رہتے اور عزت و پذیرائی عورت کے ذمہ نہ رہتی) لیکن اس قانون کی مدد سے مرد دوسری بیوی نہ کر سکتا تھا اور عورت دوسرا شوہر کرنے کی مجاز نہ تھی۔ اس جدائی کی مدت زیادہ سے زیادہ تین سال تھی۔ تین سال کے بعد میاں بیوی مجبور تھے کہ مل جل کر زندگی بسر کریں اور علیحدگی ترک کر دیں۔ اسی طرح سے زمانہ جاہلیت کا ایک طرز عمل اس معاشرے کا حصہ بن گیا۔

دنیا کے مغرب نے تو اس عیحدگی کی اجازت تین سال تک کے لیے دی ہے لیکن اسلام چار ماہ سے زیادہ جدائی کی اس کیفیت کو رد نہیں جانتا، جب کہ قسم نہ بھی کھائی جائے تب بھی مباشرت میں اس مدت تک کی تاخیر مباح ہے۔ اگر اس مدت کے اختتام پر بھی مرد ٹال مٹول سے کام لے اور اپنے پروگرام کو واضح نہ کرے تو حکومت اسلامی اسے طلب کر سکتی ہے اور مخالفت کی صورت میں اسے مجبور کر سکتی ہے کہ وہ معاملے کو طے کرے۔

۲۲۸۔ وَالْمُطَلَقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ شُرُوءٍ
وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ
إِنْ كُنَّ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَبَعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ
بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي



عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلزَّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ
وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ

ترجمہ

۲۲۸۔ طلاق یافتہ عورتیں تین مرتبہ مہواری دیکھنے (اور پاک ہونے) کا انتظار کریں (اور اس طرح عدت پوری کریں) اور اگر خدا اور مدد جزا پر ایمان رکھتی ہیں تو ان کے لیے حلال نہیں کہ جو کچھ خدا نے ان کے رحم میں پیدا کیا ہے اُسے چھپائیں اور ان کے شوہر اس مدت میں ان کی طرف رجوع کرنے (اور ازواجی عہد و پیمان کی نئے سرے سے بحالی کے دوسروں سے زیادہ حق دار ہیں مگر واقعاً وہ صلح چاہتے ہیں اور جیسے عورتوں کے کندھوں پر فرائض عائد ہیں ایسے ہی ان کے لیے شافعیہ حقوق مقرر کئے گئے ہیں اور مردان پر برتری رکھتے ہیں۔ اور خدا توانا اور حکیم ہے۔

تفسیر اکثر کمرلو محاملات کی خرابی معاشرتی ڈھانچے کے نیٹے ناقابل تلافی نقصانات کا باعث بنتی ہے۔ اس لیے اسلام نے ایسے قوانین اور احکام وضع کئے ہیں کہ اسکان کی آخری حد تک کمرلو رشتے ٹوٹنے سے بچ جائیں۔ ایک طرف اسلام نے طلاق کو مباح اور حلال چیزوں میں سب سے زیادہ قابل نفرت قرار دیا ہے اور دوسری طرف کمرلو اختلافات کے لیے خاندانی عدالت کا تصور دیا ہے۔ یہ عدالت رشتہ داروں پر ہی مشتمل ہوتی ہے تاکہ طرفین کے قریبی رشتہ داروں کے ذریعے صلح و آشتی کی کوئی صورت نکل آئے۔ طلاق کے معاملے کو تاخیر و التواء میں ڈالنے اور اس نیپے کو متزلزل کرنے کے لیے "عدت" مقرر کی گئی ہے جس کی مدت تین قرو ہے جس کا ذکر زیر نظر آیت میں کیا گیا ہے۔

قروء سے کیا مراد ہے

"قروء کا واحد ہے قروء" یہ لفظ "مہواری کی عادت" اور اس سے پاک ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اگرچہ بہت سی روایات میں تصریح کی گئی ہے کہ "ثلاثہ قروء" عدت کی حد ہے اور اس کا مفہوم ہے عورت کا خون حیض سے تین مرتبہ پاک ہونا۔ ان روایات سے قطع نظر خود اس آیت کا یہ مفہوم دو طرح سے معلوم ہوتا ہے۔
۱۔ "قروء" کی دو جمع میں "قروء" اور "اقراء" وہ قروء جس کی تین قروء سے پاک ہونے کے معنی میں ہے اور جس کی جمع "اقراء" ہے اس کا مطلب ہے "حیض"۔

اس لیے زیر بحث آیت میں چونکہ قروء آیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مراد عدت کے پاک ہونے کے دن ہیں نہ کہ حیض کے ایام۔



۲۔ لغت میں "قدو" اصل معنی "مہر" اور بمعنی پاکی سے ہی زیادہ مناسب رکتاب ہے کیونکہ یہی وہ موقع ہے جب خون رحم میں جمع ہو جاتا ہے جبکہ عادت کے دنوں میں تو پراگندہ ہو کر باہر نکل آتا ہے۔

عدت — صلح اور بازگشت کا ذریعہ ہے

بعض اوقات مختلف عوامل کی وجہ سے نفسیاتی طور پر حالات ایسے پیدا ہو جاتے ہیں کہ ایک معمولی سا اختلاف اور چھوٹی سی وجہ نزاع جذبہ انتقام بن کر بڑک اٹھتی ہے اور عقل و وجدان کی روشنی بجھ جاتی ہے۔ گھریلو جذباتیں زیادہ تر ایسے ہی حالات کا نتیجہ بنتی ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس کشمکش کے تھوڑی مدت بعد ہی عورت اور مرد اپنے کینے پر پشیمان ہو جاتے ہیں خصوصاً جب وہ گھریلو نظام کی بہتری اور گوناگوں پریشانیوں کا شکار ہوتے ہیں تو عداوت محسوس کرتے ہیں۔ ایسے ہی موقع کے لیے زیر بحث آیت کہتی ہے کہ عورت کو ایک مدت تک عدت میں رہنا چاہیے اور صبر کرنا چاہیے تاکہ یہ تیز لہریں گزر جائیں اور نزاع و کشمکش کے یہاں باطل ان کی زندگی کے فلک سے چھٹ جائیں۔ اس سلسلے میں وہ حکم خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے جو اسلام نے زمانہ عدت میں عورت کو گھر سے باہر جانے پر پابندی کی صورت میں دیا ہے۔ ایسے میں جذبہ فکر و انگیزہ ہوتا ہے اور یہ جذبہ شوہر سے عورت کے رابطہ کی درستی اور اصلاح میں بہت مؤثر ثابت ہوتا ہے۔ اسی لیے سورہ طلاق کی پہلی آیت میں ہے۔

”لَا تَخْرُجُوهُنَّ مِنْ بَيْوتِهِنَّ لَا تَدْرِي لَعَلَّ اٰیٰتٍ يٰحْدِثُ
بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا“

انہیں ان کے گھروں سے نہ نکالو تمہیں کیا معلوم کہ شاید خدا کوئی کٹانٹش پیدا کر دے اور ان میں صلح ہو جائے۔

طلاق سے پہلے کی زندگی کی گزشتہ جذبات اور شیریں لمحات کی یاد اس بات کے لیے کافی ہے کہ دلوں میں غلوں و عبت لوٹ آئے اور کمزور پڑ جانے والا دائرہ محبت قوی ہو جائے۔

عدت — حفاظتِ نسل کا ذریعہ ہے

عدت کا ایک اور فلسفہ یہ ہے کہ اگر عورت حاملہ ہے تو یہ کیفیت واضح ہو جائے۔ یہ درست ہے کہ ایک مرتبہ ماہواری دیکھنے ہی سے عموماً عدت کے حاملہ نہ ہونے کا یقین ہو جاتا ہے لیکن بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ حاملہ ہونے کے باوجود ابتدائے حمل میں عورتوں کو خون جھین آنے لگتا ہے۔ اس لیے اس معاملے کی پوری وضاحت کے لیے حکم دیا گیا ہے کہ عدت تین مرتبہ ماہواری دیکھے اور پاک ہو جائے تاکہ حتمی طور پر پہلے شوہر سے اس کا حاملہ نہ ہونا واضح ہو جائے اور پھر وہ شے سرے سے کہیں شادی کر سکے۔

”وَلَا يَحِلُّ لِهِنَّ اَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْ اَرْحَامِهِنَّ“



قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ عدت کے دنوں کی ابتداء اور انتہا کس طرح معلوم کی جائے۔ اسلام نے اس معاملے میں خود عورت کی بات کو مستند قرار دیا ہے۔ اسی لیے مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں امام ملاق عیہ السلام فرماتے ہیں :

”قد فتوا من الله الحی النفس، ثلاثۃ اشیا، حیض و نفوس و الحمل“

یعنی تین باتیں عورت پر چھڑدی گئی ہیں ایک ماہواری دوسرا پختہ ہونے کی تیسرا حمل

یہ بات مندرجہ بالا آیت سے بھی ظاہر ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ عورت کے لیے جائز نہیں کہ اس حق سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے خلاف واقعہ بات کہے یعنی عورت کی بات مستند اور قابل قبول ہے۔

”ان یمکت من ما خلق الله“ — یہ جملہ دو مفہم دیتا ہے ایک بچے کے حمل کو چھپانا اور دوسرا ماہواری کی عادت کو پوشیدہ رکھنا یعنی اگر عورت حاملہ ہے تو اسے اپنا حمل چھپاتے ہوئے عدت کی مدت کم کرنے کے لیے یہ دعویٰ نہیں کرتا چاہیے کہ وہ ماہواری کے ایام میں ہے (کیونکہ حاملہ عورت کی عدت تو وضع حمل ہی ہے) اور اس طرح پاک ہونے یا ماہواری کی عادت میں ہونے کے بارے میں بھی غلط بیانی سے کام نہیں لینا چاہیے۔

”وبعولتھن احق بردهن فی ذلک ان ارادوا اصلاحا“

جب عورت طلاق رجعی کی عدت میں ہو تو شوہر کو رجوع کرنے کا حق ہے تاکہ اگر وہ چاہے تو بلا تکلف اپنی بیوی کے ساتھ اپنی زندگی جاری رکھ سکتا ہے البتہ آیت نے ”ان ارادوا اصلاحا“ کی قید لگائی ہے اور اس سے یہ حقیقت بیان کی ہے کہ حکم یک طرفہ نہ ہو یعنی ایسا نہ ہو کہ مرد آزادانہ بد شرط حق رجوع رکھتا ہو اور چاہے زمانہ جاہلیت کی طرح اپنی طاقت سے غلط فائدہ اٹھاتا رہے اور عورت پر سختی اور تکلیف روا رکھے لہذا یہ حق اسے اس صورت میں ہے کہ وہ ذاتاً اپنے طرز و طریقے سے پشیمان ہو اور وہ ذاتاً اپنی زندگی کا شے نہ رہے سے آغاز چاہتا ہو تب وہ اصطلاح کے مطابق رجوع کا حق رکھتا ہے، مقصد یہ ہے کہ وہ عورت کو ضرر، دکھ اور تکلیف نہ پہنچانا چاہتا ہو۔

ضمنی طور پر یہ بھی ملحوظ نظر رہنا چاہیے کہ آیت کے آخر میں جو مسند رجوع بیان ہوا ہے آیت کے شروع میں بیان ہونے والے حکم عدت ہی سے مربوط ہے اگرچہ ابتداء میں یہ ایک کئی حکم نظر آتا ہے۔ اس لیے آیت صرف طلاق رجعی کے بارے میں سمجھی جائے گی اور اس کے علاوہ طلاق کے کسی طریقے کے بارے میں یہ خاموشی ہے لہذا یہ امر اس بات کے منافی نہیں کہ عدت اور مدت انتظار کے بارے میں جو کچھ یہاں بیان کیا گیا ہے طلاق کی کچھ اقسام اس سے مختلف بھی ہیں۔

”ولهن مثل الذی علیهن بالصعروف وللمرجال علیهن درجۃ“

گذشتہ مسائل کے بعد یہ جملہ عورت اور مرد کے باہمی احترام کے بارے میں ہے جسے طلاق اور عدت کے مسئلے سے بالاتر قرار دیا گیا ہے۔ اس میں شخصی اور اجتماعی حقوق کی طرف راہنمائی ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ جیسے مرد کے حقوق وضع کئے گئے ہیں تاکہ عورت ان حقوق کا احترام کرے اسی طرح عورت کے مختلف حقوق بھی مرد کے ذمہ ہیں جن کی ادائیگی کا وہ ذمہ دار ہے۔ ”بالصعروف“ کا لفظ اس مسئلہ آیات میں بارہ مرتبہ آیا ہے یہ سب اس لیے ہے کہ کوئی اپنے حقوق سے



نقطہ فائدہ: شہادت۔ عورت اور مرد دونوں کو مصلحت اندیش ہونا چاہیئے اور باہمی حقوق مناسب طریقے سے ادا کرنے چاہئیں۔

حقوق و فرائض

قرآن یہاں پر ایک بنیادی بات بیان کر رہا ہے اور وہ یہ کہ ہر فرض اور ذمہ داری کے پہلو میں ایک حق بھی ہے یعنی ذمہ داری اور فرض کسی حق سے جدا نہیں ہوتے۔ مثلاً مال باپ پر اولاد کے بارے میں کچھ فرائض اور ذمہ داریاں عائد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اولاد کے ذمے ان کے کچھ حقوق بھی ہوں گے اس طرح قاضی کی ذمہ داری ہے کہ وہ عدل و انصاف کو عام کرنے کی کوشش کرے۔ اس کے بدلے قاضی کے لیے بہت سے حقوق بھی مقرر کئے گئے ہیں۔ اس طرح انبیاء اور امتوں کا معاملہ بھی ہے زیر نظر آیت میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ جیسے عورتوں کے فرائض اور ذمہ داریاں ہیں اس طرح ان کے لیے کچھ حقوق بھی مقرر کئے گئے ہیں اور ان حقوق و فرائض میں مساوات کی وجہ سے ان میں "عدالت کا اجر" بھی ملتا ہے۔

اسی طرح اگر کسی کے لیے کوئی حق مقرر کیا گیا ہے اس کے مقابلے میں اس پر فرائض بھی عائد کئے گئے ہوں گے لہذا کوئی ایسا شخص میسر نہیں آسکتا کہ اس کا کوئی حق ہو اور اس کے کندھے پر کوئی فرض اور ذمہ داری نہ ہو۔

”وَاللّٰهُ جَعَلَ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا“

یہ جو کہ شہ قانون کی تکمیل کرتا ہے اس کی وضاحت یہ ہے کہ گذشتہ جگہ میں محنت کے بارے میں قانون عدالت مرد کی طرح ہدایت دینے کی یہ ضروری ہے کہ مرد اور عورت تمام فرائض اور ذمہ داریوں میں اور پھر ان کے پس منظر میں تمام حقوق میں سونپید برابر اور ہم دوش ہوں۔

عورت اور مرد کی جسمانی و روحانی قوت و استعداد میں جو وسیع فرق ہے اسے مد نظر رکھتے ہوئے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے چونکہ عورت کے ذہن کا احساس فرائض اور معاشرے کے لیے کمزور و مند نسلیں کی پرورش ہے لہذا اس میں احساسات و جذبات زیادہ پائے جاتے ہیں۔ عورت میں احساسات کی اسی برتری کے پیش نظر ضروری ہے کہ بعض اجتماعی فرائض جن میں زیادہ فکری اور نظری قوت درکار ہے ان میں مرد جلد مرتبہ کے حامل ہوں۔ کیونکہ ان امور کو جذبات سے بالاتر ہونا چاہیئے۔ حکومت، اقتصاد، گھریلو معاملات کی سرپرستی ایسے امور ہی کی مثالیں ہیں۔ البتہ ان امور کی وجہ سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں کہ بعض خواتین اپنے علم و تقویٰ کے سبب کسی مرحلے میں بہت سے مردوں سے جلد تر ہوں۔

اگر اس پر دو کلام پر عمل نہ کیا جائے یعنی ہم تمام حقوق اور عبادت کے بارے میں ایک ہی قسم کا حکم لاگو کرنے لگیں تو یہ "السترجال قواہمون علی النساء" کے کلی قانون کی بھی خلاف ورزی ہوگی عدالت کے اس حکم کو "وللہن مثل الذی علیہن" کے بھی خلاف ہوگا کیونکہ ہر شخص کو اپنا حق ملنا چاہیئے نہ کہ انہیں یہ ہے کہ عورت اور مرد میں سے ہر ایک اپنی مخصوص استعداد، صلاحیتوں، غرائز اور ساخت کے مطابق اپنی ذمہ داری انجام دے۔ جو کام مرد سے نہیں ہو سکتے عورت اس کی مدد کرے اور جو کام عورت سے نہیں ہو سکتے مرد اس کی مدد کے لیے آٹھ کھڑا ہو۔ قانون نظم کا تقاضا ہے کہ احساسات و نرم مزاجی کے



حامل افراد زیادہ مگر و نظر کھنڈے اے افراد کی سرپرستی میں ہوں لہذا اگر کسی سرپرستی مرد کے ذمے ہے اور عورت کے ذمے ہے کہ
مگر کا نظارہ چلانے میں اس کی معاون ہو۔

عورت اور اس کے حقوق کی تاریخ

پوری تاریخ انسانی میں عورت ایک عجیب و غریب انسان رکھتی ہے۔ عورت کی یہ داستان آج انسانی سوسائٹی کی شناخت
کی اہم ترین بحث شمار ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر عورت کی زندگی کو دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔
پہلا دور ۱۔ ماقبل تاریخ کا ہے جس کے متعلق آج بارے پاس کوئی یقینی اطلاع نہیں کہ اس زمانے میں عورت کے حالات کیا
تھے جو سکتا ہے کہ اس دور میں عورت زیادہ تر طبیعی اور فطری حقوق سے بہرہ ور ہو۔

دوسرا دور ۲۔ آغاز تاریخ سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور کے بعض معاشروں میں عورت تمام اقتصادی، سیاسی اور اجتماعی حقوق
میں ایک غیر مستقل شخصیت کے حوالے سے پہچانی جاتی تھی۔ یہی کیفیت بعض سماج میں آخری صدیوں تک جاری رہی۔
عورت کے بارے میں یہ طرز فکر فرانس کے قانون مدنی جسے ترقی یافتہ کہا جاتا ہے تک میں نظر آتا ہے۔ منونے کے طور
پر شوہر اور بیوی کے مالی روابط کے سلسلے میں بعض ضوابط کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے :

آرٹیکل نمبر ۲۱۵ اور ۲۱۴ سے ظاہر ہوتا ہے کہ شوہر دار عورت اپنے شوہر کی اجازت اور دستخط کے بغیر کوئی مالی امور انجام نہیں
دے سکتی اور اس کا ہر قسم کا لین دین شوہر کی اجازت کا محتاج ہے۔ البتہ یہ اس صورت میں ہے کہ شوہر اپنے اختیار سے غلامانہ
نہ اٹھائے اور کسی معقول سبب کے بغیر اجازت دینے سے انکار نہ کرے۔

آرٹیکل نمبر ۱۴۴ کے مطابق شوہر حق رکھتا ہے کہ وہ اکیلا اس مال میں جو عورت اور مرد کے درمیان مشترک ہے جیسا چاہے
تعریف کرے اور اس میں عورت کی اجازت کی بھی ضرورت نہیں البتہ جو کام انتظام و اہتمام کی حدود سے خارج ہے اس میں عورت
کی موافقت ضروری ہے بلکہ

وہ سرزمین جہاں سے اسلام کا آغاز ہوا یعنی تہذیب میں بھی پیغمبر اسلام کے ظہور سے پہلے عورت کے ساتھ ایک محکم اور غیر مستقل
انسان کا سلوک رواج تھا۔ ان کا طرز عمل نیم وحشی انسانوں کا ساتھ کیونکہ عورت سے رُواکن مقاصد حاصل کیے جاتے تھے۔ عورت
اس ماحول میں اس قدر بے ارادہ و بے اختیار تھی کہ بعض اوقات اپنے شوہر کے اختراجات کے لیے گرائے پر پیش کی جاتی تھی۔
تمدن سے عرویت اور فقر و فاقہ کی ابتداء نے انہیں عجیب و غریب سختی اور خشونت میں مبتلا کر رکھا تھا جس کے زیر اثر
وہ عورت کو زندہ کاٹنے کے مشہور جرم کا ارتکاب کرتے تھے۔

عورت کی زندگی میں نیا مرحلہ

ظہور اسلام اور اس کی مخصوص تعلیمات کے ساتھ عورت کی زندگی ایک نئے مرحلے میں داخل ہوئی جو پہلے دہراصل سے
بہت مختلف تھا۔ یہ وہ دور تھا جس میں عورت مستقل اور تمام افرادی، اجتماعی اور انسانی حقوق سے بہرہ ور ہوئی۔ عورت



کے بارے میں اسلام کی بنیادی تعلیمات وہی ہیں جن کا تذکرہ زیر بحث آیات میں ہے۔ ”ولیس من مثل الذی علیہ ہن بالحدود“۔ یعنی عورت کے معاشرے میں جس قدر فرائض اہم ہیں اسی قدر قابل توجہ حقوق کی بھی مالک ہے۔

اسلام عورت کو مرد کی طرح کامل انسانی روح والا مادہ و اختیار کی حامل سمجھتا ہے اور اسے سیر تکامل اور ارتقاء کے عالم میں دیکھتا ہے جو کہ مقصد خلقت ہے اسی لیے اسلام دونوں کو ایک ہی صف میں قرار دیتا ہے اور دونوں کو ”یا ایہا الناس“ اور ”یا ایہا الذین آمنوا“ میں مخاطب کرتا ہے۔ اسلام نے دونوں کے لیے تربیتی، اخلاقی اور عملی پروگرام لازمی قرار دیے ہیں۔ ارشاد الہی ہے:

”ومن عمل صالحا من ذکر او انثیٰ و هو مؤمنٌ فالہنک یدخلون الجنة“۔

یعنی جو بھی مرد یا عورت عمل صالح انجام دے وہ مومن ہے اور ایسے ہی لوگ جنت میں جائیں گے۔ (سورہ - ۴۰)

ایسی سادہ سادہ ہر دو اصناف حاصل کر سکتی ہیں۔ قرآن مجید کہتا ہے:

”من عمل صالحا من ذکر او انثیٰ و هو مؤمنٌ فلنحییہنہ حیوة طیبہ“ و لنجزيہنہم اجرہن باحسن ما کانتوا یعملون“

مرد اور عورت میں جو بھی نیک کام کرے گا اور وہ ایمان دار بھی ہوگا تو ہم اسے پاک و پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور جو کچھ وہ کرتے رہے ہوں گے اس کا اچھے سے اچھا اجر و ثواب عطا کریں گے۔ (نمل - ۶۱)

یہ آیات مزاحمت کرتی ہیں کہ مرد اور عورت میں سے ہر ایک اسلام کے پروگراموں پر عمل درآمد کے ذریعے مثنوی اور مادی تکامل کی منزل پالیتا ہے اور ایک طیب و پاکیزہ زندگی میں قدم رکھتا ہے جو کہ آرام و سکون کی منزل ہے۔

اسلام عورت کو مرد کی طرح مکمل طور پر آزاد سمجھتا ہے۔ ارشاد الہی ہے:

”کل نفس بما کسبت رہینہ“

ہر کوئی اپنے اعمال کے بدلے رہن ہے۔ (نحر - ۳۸)

سورہ بقرہ میں ارشاد ہے:

”من عمل صالحا فلنفسہ و من اساء فعليہا“

جو بھی اچھا کام کرے تویر اس کے اپنے فائدے میں ہے اور جو بُرا کام کرے وہ بھی اس

کا نتیجہ خود بخود ملے گا۔ (بقرہ - ۲۷)



یہ آیات جاتفریق مرد اور عورت سب کے بیٹے ہیں۔ اسی لیے سزاؤں کے بارے میں ایک آیت میں ہے۔
 "الزانیۃ والزانی فاجلدوا کل واحد منهما مائة جلدة"

زانیہ اور زانی میں سے ہر ایک کو سو سو تھپڑ مارو۔ (نور - ۱)

ایسی دیگر آیات میں بھی دونوں کے لیے ایک جیسے گناہ پر ایک جیسی سزا کا حکم دیا گیا ہے۔

ارادہ و اختیار سے استقلال پیدا ہوتا ہے۔ یہی استقلال اسلام اقتصادی حقوق میں لیتا ہے۔ اسلام بغیر اس ارادہ کے ہر قسم کے مالی رابطے عورت کے لیے روا جانتا ہے اور عورت کو اس کی درآمد اور سرمائے کا مالک شمار کرتا ہے۔ سورہ نساء میں ہے۔

"للرجال نصیب مما کتسبوا وللنساء نصیب مما کتسبن"

مرد جو کمائیں وہ ان کا حصہ ہے اور عورتیں جو کمائیں وہ ان کا حصہ ہے۔ (نساء - ۱۲۲)

لفظ میں اکتساب کا معنی کسب کے برعکس ہے۔ اکتساب کا نتیجہ کسب کرنے اور حاصل کرنے والے سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی طرح قانون کی ہے کہ:

"الناس مستطون علی أموالهم"

یہنا۔۔۔ تم لوگ اپنے مال پر مستطون ہیں۔

اس قانون کو فکرمیں رکھتے ہوئے یہ مسلمہ ہوتا ہے کہ کس طرح اسلام عورت کے اقتصادی استقلال کا احترام کرتا ہے اور عورت و مرد میں اُس نے کوئی فرق نہیں رکھا۔

خلاصہ یہ کہ اسلام کی فکرمیں عورت معاشرے کا ایک بنیادی رکن ہے اور اسے ایک بے ارادہ، محکوم اور قسیم ونگران کا محتاج وجود برگز نہیں سمجھنا چاہیے۔

مساوات کے مفہوم میں اشتباہ نہ ہو

اسلام نے مساوات کی طرف خاص توجہ دی ہے اور ہمیں بھی متوجہ ہونا چاہیے لیکن خیال رہے کہ بعض لوگ بے سوچے سمجھے جذبات کی رو میں بہہ کر افراط و تفریط کا شکار ہو جاتے ہیں اور مرد اور عورت کے روحانی و جسمانی فرق اور ان کی ذمہ داریوں کے اختلاف تک سے انکار کر بیٹھتے ہیں۔

ہم جس چیز کا چاہے انکار کریں تاہم اس حقیقت کا انکار نہیں کر سکتے کہ ان دو صنفوں میں ج. مانی و روحانی طور پر بہت فرق ہے۔ مختلف کتب میں اس کی تفصیلات موجود ہیں اور یہاں ہمیں اس کی تکرار کی ضرورت نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ عورت وجود انسانی کی پیدائش کا طرف ہے۔ نوجوانوں کا رشد و اس کے مامن میں انجام پاتا ہے۔ جیسے وہ جسمانی طور پر آنے والی نسلوں کی پیدائش، تربیت اور پرورش کے لیے پیدا کی گئی ہے اسی طرح روحانی طور پر بھی اسے عواطف، احساسات اور جذبات

سے مزین و رعب دیکھئے۔ لہذا یہ عقول و احوال جو ہیں ان کے لیے مساوات کا ایک واسطہ ہے۔ (معاذ اللہ)



کا زیادہ حصہ دیا ہے۔

ان وسیع اختلافات کی موجودگی میں کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ مرد اور عورت کو تمام حالات میں ہم قدم ہونا چاہیے اور تمام کاموں میں انہیں سوائید مساوی ہونا چاہیے۔

کیا عدالت اور مساوات کے حامیوں کو معاشرے کے تقاضوں کے حوالے سے بات کرنا چاہیے، کیا یہ عدالت نہیں کہ ہر شخص اپنی ذمہ داری ادا کرے اور اپنے وجود کی نعمتوں اور خوبیوں سے بہرہ مند ہو؟ اس لیے، کیا عورت کا ایسے کاموں میں ذخیل ہونا جو اس کی روح اور جسم سے مناسبت نہیں رکھتے، خلاف عدالت نہیں؟

یہی وہ مقام ہے جہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام جو عدالت کا ہی طرفدار ہے مرد کو کئی ایک اجتماعی کاموں میں سختی یا زیادہ وقت نظر کی ضرورت ہے مثلاً گھر کے معاملات کی سرپرستی وغیرہ میں مقدمہ لگتا ہے اور معاشرت و ملک کا مقام عورت کے سپرد کر دیتا ہے ایک گھر اور ایک معاشرے کو منظم کی ضرورت ہے اور نظم و ضبط کا آخری مرحلہ ایک ہی شخص تک انجام پذیر ہونا چاہیے ورنہ کشاکش اور ہرج مرج پیدا ہوگا۔

اگر تمام تعصبات سے بے نیاز ہو کر غور کیا جائے تو یہ واضح ہوگا کہ مرد کی ساخت کے پیش نظر ضروری ہے کہ گھر کی سرپرستی اس کے ذمے رکھی جائے اور عورت اس کی معاون ہو۔ اگرچہ کچھ لوگ ان حقائق سے چشم پوشی اختیار کرنے پر مصر ہیں۔

آج کی دنیا میں بھی بلکہ ان اقوام میں بھی جو عورتوں کو مکمل آزادی و مساوات دینے کا دعویٰ کرتے ہیں، خارجی حالات زندگی نشاندہی کرتے ہیں کہ عملی طور پر وہی بات سب سے جو ہم بیان کر چکے ہیں اگرچہ باتوں میں اس کے برخلاف کہتے ہیں۔

۲۲۹۔ الطَّلَاقُ مَزَّتَانِ فَاِمْسَاكِ بِمَعْرِوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٍ بِاِحْسَانٍ
وَلَا يَحِلُّ لَكُمُ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّا اَتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا اِلَّا
اَنْ يَخَافَا اِلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاِنْ خِفْتُمْ اِلَّا يُقِيْمَا
حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهٖ تِلْكَ
حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَتَذَوُّوْهَا وَّمَنْ يَتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ
هُمُ الظَّالِمُوْنَ ○

ترجمہ

۲۲۹۔ طلاق (جس میں رجوع ہے) دو مرتبہ ہے (اور ہر مرتبہ) مناسب طریقے سے اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھے (اور صلح کرے) یا نیکی کے ساتھ اسے چھوڑ دے (اور اس سے الگ ہو جائے) اور تمہارے لیے حلال نہیں کہ انہیں جو چیز دی ہے وہاں سے واپس لو۔ مگر یہ کہ دونوں (میاں بیوی) اس سے ڈریں کہ وہ حدودِ الہی



کی پاسداری نہیں کر سکیں گے اگر انہیں خوف ہے کہ وہ حدودِ الہی کا لحاظ نہ کر سکیں گے تو پھر ان کے لیے کوئی خرچ نہیں کہ عورت فدیہ اور عوض دے دے اور طلاق سے لے کر یہ حدود اور خدائی سرحدیں میں، ان سے تجاوز نہ کرو اور جو شخص ان سے تجاوز کرے وہ ظالم ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیت کی تفسیر میں کہا جا چکا ہے کہ عدت اور رجوع کا قانون نازدانوں کی اصلاح اور جدائی کو روکنے کے لیے ہے لیکن اسلام لانے والے نئے مسلمان اس سے غلط فائدہ اٹھاتے تھے اور بیوی کو تکلیف اور تنہا پہنچانے کے لیے بے درپے طلاق دیتے اور عدت ختم ہونے سے قبل رجوع کر لیتے، اس طرح وہ عورت پر سختی کرتے اور اسے معیبت میں مبتلا کر لیتے۔

زیر بحث آیت اس غیر فہلانی فعل کو روکتی ہے۔ ارشاد ہے کہ دو مرتبہ طلاق اور رجوع صحیح ہے لیکن اگر تیسری مرتبہ طلاق انجام پذیر ہوئی تو پھر رجوع کا حق نہیں ہے۔ اور آخری طلاق یہی تیسری طلاق ہے۔ البتہ ”الطلاق مسرتان“ سے مراد ہے وہ طلاق جس میں رجوع ممکن ہے اور جس کے بارے میں ”امساك بمعروف“ صادق آتا ہے جو دوسرے زیادہ نہیں اور تیسری طلاق میں رجوع نہیں ہے، جیسا کہ آیت گواہی دیتی ہے۔

”امساك“ کا معنی ہے، روکے رکھنا اور ”تسرمیج“ کا معنی ہے چھوڑ دینا۔ جب کشمکش، طلاق اور پھر صلح اور رجوع کی نوبت دو مرتبہ ہو کر رہے تو پھر مرد کو چاہیے کہ معاملے کو ایک طرف کرے۔ یہاں دو نکات قابل توجہ ہیں:-

۱۔ جس طرح رجوع کرنے اور عدت کو روک رکھنے میں ”معروف“ کی شرط ہے، یعنی رجوع اور روکے رکھنا صلح و صفائی اور خلوص و محبت کی بنیاد پر ہو اسی طرح جدائی بھی ”احسان“ کے ساتھ مقید ہے۔ یعنی عظیمہ کی اور جدائی ہر طرح کے ناپسندیدہ امر سے پاک ہو مثلاً انتقام، بغض، غضب اور کینہ سے مبرا ہو اور کہا جاسکتا ہے کہ آیت کا یہ حقد احسان ہی کی وضاحت کے لیے ہے۔

”لَا يَحِلُّ لَكَ أَنْ تَأْخُذَ بَإِمْرَئٍ مِمَّا مَلَكَتْ يَمِينُكَ شَيْئًا“

۲۔ ”الطلاق مسرتان“ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یا تین طلاقیں ایک ہی مجلس میں انجام نہیں پاسکتیں اور چاہیے کہ وہ متعدد مواقع پر واقع ہوں۔ خصوصاً جب تعدد طلاق کا مقصد یہ ہے کہ رجوع کا زیادہ موقع مل سکے اور شاید پہلی کشمکش کے بعد صلح و صفائی برقرار ہو جائے اور اگر پہلی مرتبہ صلح و آشتی نہ ہو سکے تو شاید دوسری مرتبہ ہو جائے۔ لیکن ایک ہی موقع پر متعدد طلاقوں سے یہ راستہ بالکل مسدود ہو جاتا ہے اور میاں بیوی ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں اور اس طرح تعدد طلاق عملی طور پر بے اثر ہو کر رہ جاتا ہے۔

مکتب تشیع میں یہ مسئلہ متفق علیہ ہے لیکن اہل سنت کے درمیان اس مسئلے میں اختلاف نظر ہے۔ البتہ زیادہ تر کا عقیدہ یہی ہے کہ تین طلاقیں ایک ہی مجلس میں دی جاسکتی ہیں۔



آفتاب المصباح کے موافق مسند احمد ابن حنبل اور صحیح مسلم جیسی اہل سنت کی بنیادی کتب اسے نقل کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرم کے زمانے سے لے کر حضرت عمر کی خلافت کے دو سال تک ایک مجلس کی تین عداوتیں ایک ہی طلاق شمار ہوتی تھیں اور یہ مسئلہ سب اصحاب پیغمبر نے نزدیک متفق علیہ تھا لیکن اس وقت خلیفہ دوم نے حکم دیا کہ ایک ہی مجلس میں تین عداوتیں واقع ہو جاتی ہیں

اہل سنت کے مفتی اعظم نے شیعہ نظریہ تسلیم کر لیا

خلیفہ دوم کے حکم کے باوجود یہ مسئلہ اہل سنت کے ہاں متفق علیہ نہیں رہا۔ اہل سنت کے بہت سے علما نے دیگر علماء سے اختلاف کرتے ہوئے شیعہ نقطہ نظر کو انتخاب کیا ہے۔ ان میں سے جامعہ الازہر کے سابق رئیس اور اہل سنت کے مفتی اعظم شیخ محمد دستگوت لکھتے ہیں۔

میں ایک بار ایک مشرق کے تاج میں مذاہب کی تحقیق اور ان کے درمیان ہوازن و تقابیر میں مدد دے رہا تھا۔ کئی مرتبہ ایسا ہوتا کہ میں کئی ایک مسائل میں مختلف مذاہب کی آراء و نظریات کی طرف رجوع کرتا۔ بہت سے مقامات پر میں نے شیعہ مذہب کے استدلال کو محکم اور استوار دیکھا تو ان کے سامنے جتنا ادا میں نے ان میں شیعہ نظریہ کو انتخاب کر لیا۔

اس سلسلے میں چند مثالوں کے ذیل میں وہ مزید لکھتے ہیں:

ایک ہی مجلس کی تین عداوتیں اہل سنت کے چاروں مذاہب میں تین ہی شمار ہوتی ہیں، لیکن شیعہ امامیہ عقیدے کے مطابق وہ ایک سے زیادہ عداوتیں شمار نہیں ہوتیں، اور چونکہ دو تعانوں کی نظر اور ظاہر آیات قرآن کی نظر سے اہل تشیع کی رائے حق ہے، اس لیے اہل سنت کا نظریہ فتوے کی حیثیت سے اپنی تردیدیت لکھ بیٹھا ہے۔

”ولا یحلی نکم ان تاخذوا منہا اثیموہن شینا“

گزشتہ جملے میں کہا جا چکا ہے کہ عینہ کی احسان کی بنیاد پر ہونا چاہیے، زیر نظریہ تبدل گزشتہ جملے کی وضاحت بھی بجا اور ایک مستقل حکم بھی نیز یہ ان مواقع کے لیے ایک نمونہ بھی ہے جو احسان کی بنیاد پر عینہ کی کی تشریح کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شوہر جو چیز حق مہر کے طور پر عورت کو دے چکا ہے وہ واپس نہیں لے سکتا۔ سورہ نسا آیات ۲۰، ۲۱ میں حکم زیادہ تشریح کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

”الا ان یخافا الا یقبیا حدود اللہ فان خفتہ الا یقبیا حدود اللہ فلا جناح علیہما فیما افتدت بہ“

اللہ فلا جناح علیہما فیما افتدت بہ“

صرف ایک صورت میں حق مہر واپس لینے میں کوئی حرج نہیں اور وہ یہ کہ جب عورت خود ذرا حاجی زندگی کو جاری رکھنا نہ چاہتی ہو۔ اب اگر اس کے عدم میلان اور نفرت کی وجہ سے اندیشہ ہو کہ عورت اور مرد حدود الہی کی حفاظت نہ کر سکیں گے تو اس صورت میں کوئی حرج نہیں کہ حق مہر دعویٰ کے طور پر شوہر کو دے دیا جائے تاکہ وہ عورت کو طلاق دے دے دے سکے

۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵۔ ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۳۲۔ ۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۶۔ ۳۷۔ ۳۸۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱۔ ۴۲۔ ۴۳۔ ۴۴۔ ۴۵۔ ۴۶۔ ۴۷۔ ۴۸۔ ۴۹۔ ۵۰۔ ۵۱۔ ۵۲۔ ۵۳۔ ۵۴۔ ۵۵۔ ۵۶۔ ۵۷۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ۶۰۔ ۶۱۔ ۶۲۔ ۶۳۔ ۶۴۔ ۶۵۔ ۶۶۔ ۶۷۔ ۶۸۔ ۶۹۔ ۷۰۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۷۳۔ ۷۴۔ ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۷۸۔ ۷۹۔ ۸۰۔ ۸۱۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔ ۸۷۔ ۸۸۔ ۸۹۔ ۹۰۔ ۹۱۔ ۹۲۔ ۹۳۔ ۹۴۔ ۹۵۔ ۹۶۔ ۹۷۔ ۹۸۔ ۹۹۔ ۱۰۰۔



”ثَلَاثَ حُدُودٍ لِلَّهِ فَلَا تَعْدُوَهَا وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ

فَاُولَٰئِكَ هُم لَعَنَ اللَّهُ

”ثَلَاثَ“ ان احکام کی طرف اشارہ ہے جو گزشتہ جملوں میں بیان کیے جا چکے ہیں۔ حقیقت میں یہ احکام اجتماعی، اخلاقی اور فقیہی نکات کا مجموعہ ہیں جنہیں پروردگار نے اجتماعی روابط کے استحکام کے لیے وضع اور بیان فرمایا ہے۔ زیر نظر جیسے میں کہا گیا ہے کہ اگر بعض لوگ انفرادی شکایات اور ناجائز میلانات کی وجہ سے حدودِ الہی سے بے پرواہ ہو جائیں تو ان کا شدید تنگدلی اور ظالموں میں ہو گا۔

یہ اشخاص کس پر ظلم کرتے ہیں؟ اس کی وضاحت اس آیت میں موجود نہیں البتہ سورہ طلاق کی پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے:

”مَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَتَعَدَّ اللَّهُ عَلَيْهِ عَنَابَهُ“

جو شخص حدودِ خدا سے تجاوز کرتا ہے وہ اپنے ہی نفس پر ظلم کرتا ہے

اور واقعی ایسا ہی ہے کیونکہ قانونِ خداوندی کی سرحدوں سے تجاوز کرنے کا نقصان سب سے پہلے تجاوز کرنے والوں ہی کو پہنچتا ہے۔ کیونکہ اسی قانون کے سامنے ہیں ان کے حقوق کی بھی حفاظت ہونا تھی۔ اب اگر قانون شکن اور سرحد سے تجاوز کرنا رواج ہو جائے تو اس کا نقصان ان لوگوں کے دامن کو بھی آئے گا جنہوں نے اس کام میں پیش قدمی کی ہے۔

خدا کی سرحدیں

اس آیت اور قرآن مجید کی دیگر بہت سی آیات میں قوانینِ الہی کے بارے میں ایک لطیف تعبیر نظر آتی ہے اور وہ ہے حدودِ سرحد۔ اس طرح قوانین کی نافرمانی اور مخالفت سرحد سے پہلے شمار ہوتا ہے۔ حقیقت میں انسان جو کام انجام دیتا ہے اس میں ان مقامات منقسم کا ایک سلسلہ موجود ہوتا ہے۔ جہاں داخل ہونا بہت زیادہ خطرناک ہے۔ قوانین و احکام الہی ان مقامات کی نشاندہی کرتے ہیں اور ان مقامات کی پہچان کئے ان قوانین میں بہت سی علامات بیان کی گئی ہیں۔ سورہ بقرہ کی آیت ۱۸۷ میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

”ثَلَاثَ حُدُودٍ لِلَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا“

یہ خدا کی سرحدیں ہیں ان کے قریب نہ جاؤ۔

کیونکہ ان سرحدوں کے قریب جانے والا کرنے کے بھی نزدیک ہو جاتا ہے۔ اہل بیتؑ کے طریقوں سے مروی احادیث میں ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے مشتبہ مقامات پر جانے سے منع فرمایا ہے اور ارشاد فرمایا ہے کہ ایسا کرنا سرحد کے قریب جانے کے مترادف ہے کہ سرحد کے قریب پہنچ کر ہٹان قدم اس طرف رکھ لے۔ اور ہلاکت و نابودی کا شکار ہو جائے۔

۲۳۰۔ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا



إِنْ ظَنَّا أَنْ يَفْعِلَا مَا حُدُّودَ اللَّهِ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يُبَيِّنُهَا
لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ○

ترجمہ

۲۲۰۔ اگر (دوسرے طلاق دینے اور پھر رجوع کر لینے کے بعد پھر) اسے طلاق دے تو اس کے بعد وہ عورت اس پر حلال نہیں ہوگی مگر یہ کہ اس کے علاوہ کسی شوہر سے شادی کرے اور وہ اس سے جنسی ملاپ کرے۔ بعد ازاں وہ دوسرا شوہر بھی اسے طلاق دے دے تو کوئی حرج نہیں کہ وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف رجوع کریں اور عورت اپنے پہلے شوہر سے پھر سے شادی کرے، جب کہ انہیں اُمید ہو کہ وہ حدودِ الہی کا احترام کریں گے اور یہ اللہ کی حدود میں جنہیں خدا آگاہ لوگوں سے بیان کرتا ہے۔

شانِ نزول

ایک عورت پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ کہنے لگی: میں اپنے چچا زاد رفاہ کی بیوی تھی۔ اس نے مجھے تین مرتبہ طلاق دی تو میں نے ایک اور شخص عبدالرحمن سے شادی کر لی۔ اتفاقاً اس نے بھی مجھے طلاق دے دی لیکن اس دوران میں اس نے مجھ سے ہم بستری نہیں کی۔ کیا اب میں پہلے شوہر کی طرف لوٹ سکتی ہوں؟

آنحضرتؐ نے نفی میں جواب دیا اور فرمایا کہ پہلے شوہر سے تیری شادی اسی صورت میں صحیح ہے جب نئے شوہر نے تجھ سے مباشرت کی ہو۔

اس واقعے کے بعد مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی

تفسیر

گذشتہ آیت میں اجمالی طور پر یہ نکتہ بیان کیا جا چکا ہے کہ دوسری طلاق کے بعد عورت اور مرد الفت و صلح کی راہ اپنائیں یا ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔

یہ آیت حقیقت میں ایک تبصرو ہے جو گذشتہ آیت سے منسلک ہے۔ آیت کہتی ہے کہ جدائی کا حکم ہمیشہ کے لیے ہے لیکن عورت دوسری شادی کرے، اور دوسرے شوہر سے مباشرت کے بعد طلاق لے لے تو اس صورت میں چاہے تو پہلے شوہر سے صلح کر سکتی ہے اور امید رکھے کہ اگر وہ حالات کو سازگار رکھیں اور حدودِ الہی کا احترام کریں تو کوئی حرج نہیں۔

اسلام کے عظیم رہبروں سے جو روایات پہنچی ہیں ان میں فرمایا گیا ہے کہ یہ دوسرا نکاح دائمی ہو اور نکاح کے بعد میاں بیوی کے تعلقات بھی علیٰ طور پر انجام پائیں۔ روایات سے قلع نظر یہ دونوں شرطیں خود آیت سے بھی ظاہر ہوتی ہیں کیونکہ نفخہ نکاح جنسی عمل کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور عینہ عقد کے اجراء کے لیے بھی جیسا کہ آیت کی شانِ نزول میں اس کی صراحت ہو چکی ہے۔

نیز "فان طلقھا" سے دوسری شرط یعنی نکاح کا دائمی ہونا بھی معلوم ہو جاتا ہے کیونکہ نکاح موقت تو طلاق کا مستلزم نہیں ہوتا۔



بے راہ روی سے روکنے کا ایک عامل

بعض حید باز محلل کے اس حکم کو غلط مقاصد کے لیے دستاویز بناتے ہیں اور کچھ بے خبر لوگوں کی جہالت اور جذبات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس بارے میں اسلام پر نامزدانہ حملے کرتے ہیں لیکن احکام طلاق میں غور کرنے اور ان کے نفعیہ کی طرف متوجہ ہونے سے حقیقت کے منکاشی اس قانون کے ایک عجیب نقش سے آشنا ہوتے ہیں۔

اس کی وضاحت کچھ یوں ہے کہ گذشتہ آیات کی تفسیر میں کہا جا چکا ہے طلاق بھی مخصوص حالات میں شادی کی طرح ایک حیاتی عمل اور ضروری امر شمار ہوتی ہے۔ اسی لیے اس میں سے جائز قرار دیا ہے۔ لیکن خاندانوں میں جدائیاں عموماً فردا فردا ماحول دونوں کے لیے ناقابل تلافی نقصان کا باعث ہوا کرتی ہیں۔ لہذا مختلف طریقوں کے ذریعے طلاق کے عمل سے حتی الامکان بچنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

عمل کا عمل یا شادی کرنا ان طریقوں میں سے ایک ہے کیونکہ تین طلاقوں کے بعد عورت کا رسمی طور پر نکاح کرنا طلاق کے عمل کو جاری رکھنے کی راہ میں ایک بہت بڑا بند اور رکاوٹ ہے۔ جو شخص اپنی بیوی کو تین طلاقیں دینا چاہے گا جب اس کے ذہن میں یہ خیال آئے گا کہ اس طرح اس کی بیوی ہمیشہ کے لیے اس سے جدا ہو جائے گی تو اس کا ارادہ ضرور متزلزل ہوگا اور جب تک وہ مجبور نہ ہوگا اس قسم کا کام نہیں کرے گا۔ حقیقت میں محلل کا طریقہ جسے زیادہ صحیح لفظوں میں عورت کا دوسرے شوہر سے نیا نکاح کہا جاسکتا ہے، طلاق کے عمل میں ایک رکاوٹ ہے اور یہ جوکس پرست اور فریب کار مردوں کے لیے رکھا گیا ہے تاکہ وہ عورت کو اپنی سرکش جوکس کا کھلونا نہ بنائیں اور قانون طلاق و رجوع سے لاکھڑا فائدہ نہ اٹھاتے رہیں۔

دوسرے نکاح کی شرائط مثلاً اس کا دائمی ہونا یہ واضح کرتا ہے کہ اس سے رشتے کا مقصد یہ نہیں کہ اس کے ذریعہ پہلے شوہر اور بیوی کے پھر سے ملنے کا ذریعہ بن جائے۔ لہذا اس قانون سے غلط فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا اور نکاح موقت کے ذریعے رکاوٹ دور نہیں کی جاسکتی۔

بعض مفسرین نے ایک روایت نقل کی ہے جو اس مفہوم کو بہت ہی واضح کر دیتی ہے۔ اس روایت کے مطابق جو لوگ اس مسئلے کی انحرافی صورت پر عمل کرتے ہیں یعنی شادی اس مقصد کے لیے کرتے ہیں کہ عورت پہلے شوہر کے پاس واپس جاسکے وہ حق خدا سے دور ہیں۔

”لَعَنَ اللّٰهُ الْمُحْلِلَ وَالْمُحْتَلَّ لَهَا“

خدا کی لعنت ہر محلل پر اور اس پر جس کے لیے یہ عمل بنا ہے۔

اس بناء پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مقصد یہ تھا کہ تین طلاقوں کے بعد مرد اور عورت ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں اور پھر اپنی مرضی سے نئی زندگی کی تشکیل کریں اور شادی جو بذات خود ایک مقدس امر ہے پہلے شوہر کے شیطانی رجائات کا کھلونا نہ بن جائے۔

اب یہ چونکہ اسلام ہمیشہ عاقلانہ خواہشات کا احترام کرتا ہے اور اصلاح کے ہر درجے سے استفادہ کرتا ہے۔ لہذا ارشاد



ہوتا ہے، اگر یہ نیا رشتہ بھی ٹوٹ جائے اور سابق میاں بیوی دوبارہ ایک دوسرے سے تعلق پیدا کریں اور حتیٰ طور پر کچھ عیال بھی
کی انجام دہی کا پختہ ارادہ کر لیں تو پھر رجوع کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں اور یہ نیا نکاح تحریم کے حکم کو ختم کر دے گا۔ اسی لیے اسے
محل کا نام دیا گیا ہے۔

یہاں سے واضح ہوتا ہے کہ محل ایک نیا ہی مسئلہ اور حکم کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ یہاں سے نکاح کے بارے میں گفتگو کی گئی
ہے۔ آیت کے علاوہ روایات سے بھی واضح طور پر یہی معنی نکلتا ہے۔ ایک سرسری مطالعے سے یہ نکتہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ یہاں پر
بحث ایک حقیقی اور حتمی ازدواج کے بارے میں ہے لیکن اگر کوئی شخص پسے ہی سے دائمی نکاح کا مقصد نہ رکھتا ہو اور صرف
ظاہری طور پر ایسا کرے تاکہ محل کی صورت پیدا ہو جائے تو یہ نکاح بے اثر ہے کیونکہ اس صورت میں دوسرا نکاح بھی باطل ہوگا اور
پہلا شہر بھی پھر سے عورت کے لیے حلال نہیں ہوگا۔ جو مسکت ہے مذکورہ حدیث "لَعَنَ اللّٰهُ الْمُحِلَّ
وَالْمُحِلَّ لَهُ" اسی قسم کے محل کی طرف اشارہ ہو۔

۲۲۱۔ وَإِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ فَلْيُنَّ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ
بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ
ضِرَارًا لِّتَمْتَدُّوا أَوْ مَنْ يَفْعَلُ ذَلِكَ فَعَدَّ ظَلَمَ نَفْسِهِ
وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللّٰهِ هُزُوعًا وَادْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ
وَمَا أَنزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهِ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝

ترجمہ

۲۲۱۔ جب عورتوں کو طلاق دو اور وہ عدت کے آخری دنوں کو پہنچ جائیں تو یا انہیں صحیح طریقے سے اپنے
ہاں رکھ لو اور (ان سے صلح کر لو) اور یا انہیں پسندیدہ طریقے سے چھوڑ دو اور انہیں کسی طرح بھی نقصان
پہنچانے اور ان سے زیادتی کرنے کے لیے ان سے صلح نہ کرو اور جو ایسا کرے گا اس نے گویا اپنے ہی اور ظلم
کیا (اور ان اعمال اور قوانین سے غلط فائدہ اٹھا کر) آیات خدا کا مذاق اڑاؤ اور اپنے اوپر نازل ہونے والی
نعمت الہی، کتاب آسمانی اور علم و دانش کو یاد کرو اور انہیں ان کے ذریعے جو وعظ و نصیحت کی گئی ہے اسے
یاد کرو اور خدا سے ڈرو اور جان لو کہ خدا ہر چیز سے آگاہ ہے (اور وہ ان لوگوں کی نیتوں سے باخبر ہے جو
جو قوانین الہی سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں)۔

گذشتہ آیات کے بعد اس آیت میں اسلام طلاق کے بارے میں وضع کردہ حد بندیوں کو بیان کرتا ہے تاکہ حقوق اور عورت کے احترام سے چشم پوشی نہ کی جاسکے۔

آیت کہتی ہے کہ جب تک عدت کی مدت ختم نہ ہو اگرچہ اس کا آخری دن باقی ہو مرد کو اجازت ہے کہ وہ اپنی بیوی سے صلح کرے اور دونوں خلوص و محبت سے زندگی بسر کرنے لگیں۔ "فامسکوهن بمعروف" اگر حالات نامساعد ہیں تو اسے چھوڑ دے۔ "اوسترحوهن بمعروف" لیکن توجہ رہے کہ رجوع یا عیلمگی ہر صورت میں اسان اور نیکی ملحوظ رہے اور جذبات انتقام سے یہ کام انجام نہیں پانا چاہیے۔

"ولا تمسکوهن ضرراً انتعتدا ومن یفعل ذلک فقد ظلم نفسه۔"

یہ جملہ معروف کی تفسیر ہے۔ یعنی رجوع صدق و صفا اور خلوص و محبت کی بنا پر ہو۔ چونکہ زمانہ جاہلیت میں طلاق اور رجوع کو انتقام لینے کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ لہذا آیت قطعی طبع میں کہتی ہے کہ عورت کو آزار و تعدی کے مقصد سے زنجیت کی قید میں نہ رکھا جائے کیونکہ ایسا کرنا اسی پر نہیں بلکہ خود تمہارے نفس پر بھی ظلم ہے۔ آیت دیکھتے ہیں کہ بیوی پر ظلم کرنا کس طرح اپنے نفس پر ظلم کرنے کے مترادف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہیں۔

۱۔ حق کشی کی بنیاد پر کیے جانے والے رجوع میں کوئی سکون و آرام میسر نہیں آ سکتا۔

۲۔ قرآن کی نگاہ میں مرد اور عورت نظام خلقت میں ایک پیکر کے دو جز ہیں اس بناء پر عورت پر ظلم کرنا اپنے ہی حقوق پامال کرنے کے مترادف ہے۔

۳۔ جو شخص کسی پر ظلم کرتا ہے دراصل وہ خدا کے عذاب کی طرف بڑھ رہا ہوتا ہے اور حقیقت میں اس طرح وہ اپنے پر ہی ظلم کر رہا ہوتا ہے۔

خدا کے قوانین کا مذاق نہ اڑاؤ

"ولا تتخذوا آیات اللہ ہزواً واذکروا نعمت اللہ علیکم

وما انزل علیکم من الكتاب والحد حکمة یعظکم بہ"

"ہزو" اور "ہزوہ" کا معنی تمسخر کرنا ہے۔

عموماً ہزاروں لوگ شرعی احکام کی خلاف ورزیاں کرتے ہوئے ویدانی دباؤ سے بچنے کے لئے اور (اپنے خیال میں) عذاب الہی سے فرار کے لئے شرعی جیسے بہانے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور آیات و احکام کے خواہر کو اپنے لئے دستاویز بنا لیتے ہیں۔ اس روش کو قرآن آیات بقرآن اور احکام الہی سے استہزاء اور تمسخر قرار دیتا ہے یہ



بات باعث انفسوں سے نہ بہت سے احکام کے بارے میں ایسا انحراف عموماً نظر سے گزرتا رہتا ہے۔ طلاق کے معاملے میں بھی اس کی مثال ملتی ہے۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے مرد کے لیے حق رجوع ازدواج اور شادی کو زیادہ سے زیادہ پابند بنانے کے لیے ہے لیکن بعض لوگ اس مقصد کے برعکس اقدام کرتے ہیں یعنی رجوع حق کی اجازت کو عورت سے انتقام لینے اور اسے آزاد پہنچانے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور اس طرح قانون پر عمل کرنے کے پردے میں اپنے حقیقی غلامانہ چہرے کو چھپاتے ہیں اسی کو قرآن اور قانون کا متضاد مانا جکتے ہیں۔ محل بحث آیت کہتی ہے: آیات خدا کو کھلوانا نہ بناؤ اور خدا کی عظیم نعمت دین اور آسمانی کتاب کو یاد رکھو جو تمہاری سعادت کے لیے آئے ہیں۔

دین اور اس کے تمام قوانین و احکام کا سرچشمہ بیانِ ثابت کا نظام ہے جسے نوح الہی کے حقیقی مصالح کی روشنی میں میں بنایا گیا ہے اس لیے مصالح سے چشم پوشی اختیار کرتے ہوئے بعض احکام کے ظاہری طریقوں کو اپنا کر بے روح سلجھے نہ بناؤ۔ کہیں یہ طرز عمل خود متبدلے فوائد کو بھی خطرے میں ڈال دے گا اور آیات خدا کے سامنے منہ پیرھا کرنے کا جرم بھی شمار نہ کر لیا جائے۔
”وَأَشْعُوا لِلَّهِ وَعَلِمُوا أَنَّ اللَّهَ بِحُكْمِ شَيْءٍ عَالِمٌ“

آیت کے آخر میں عورت کے حقوق کی حفاظت کے لیے احکام الہی سے غلط فائدہ اٹھانے والوں کی گرفت کی گئی ہے اور ایسے لوگوں سے کہا گیا ہے کہ خدا سے ڈرو اور جان لو کہ وہ تمہارے کاموں اور اس جہان کے تمام ارادے سے آگاہ ہے۔
۲۳۲۔ وَإِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلِّغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ ذَلِكَ يُوعَظُ بِهِ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْأَخِيرِ ذَلِكَمَ أَزْكٰى لَكُمْ وَأَطْهَرُ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ○

ترجمہ

۲۳۲۔ اور جب عورتوں کو طلاق دے دو اور ان کی عدت تمام ہو جائے تو اگر پسندیدہ طریقے اور باہمی رضا مندی سے وہ اپنے اپنے پہلے شوہروں سے شادی کرنا چاہیں تو انہیں اس سے نہ روکو۔ اس حکم سے تم سے بس وہ لوگ نصیحت حاصل کرتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں جو خدا اور روزِ جزا پر ایمان رکھتے ہیں یہ (احکام) تمہارے (خانوادوں کے) نشوونما کے لیے زیادہ موثر اور آلودگیوں کو دھونے کے لیے زیادہ مفید ہیں اور خدا جانتا ہے لیکن تم نہیں جانتے۔

شان نزول

معتقل بن یزید بن عقیل کا ایک صحابی تھا۔ اس کی ایک بہن جسدِ بختی۔ عاصم بن عدی اس کی بہن کا چھٹا شوہر تھا۔ وہ عاصم سے اپنی بہن کی دوبارہ شادی کی مخالفت کرتا تھا کیونکہ عاصم نے قبل ازیں اسے طلاق دے دی تھی۔ اس بناء پر آیت نازل ہوئی جس میں اس قسم کی مخالفت سے منع کیا گیا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جابر بن عبد اللہ نے اپنی چھاپڑاؤں کی پہلے شوہر سے دوبارہ شادی کی مخالفت کی تھی شاید زمانہ جاہلیت میں اکثر اوقات قریشی رشتہ داروں کو یہ حق دیا جاتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ بعدی فقہ میں بھائی اور چھاپڑاؤں کی بہن یا چچا کی بیٹی پر لیاہتی نہیں رکھتے لیکن مستحبہ بالآیت جیسا کہ ذکر آئے گا، ایک کلی مفہوم کی حامل ہے اور اس کے مطابق ولی یا غیر ولی کوئی شخص بھی یعنی باپ۔ ماں چھاپڑاؤں جانی اور دوسرے لوگوں میں سے کوئی یہ حق نہیں رکھتا کہ وہ ویسی شادی کی مخالفت کرے۔

تفسیر ایک اور زنجیر ٹوٹ گئی

جیسا کہ گذشتہ مباحث میں گزر چکا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں عورتیں پابندیوں اور زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھیں۔ ان کے ارادے، فکر و نظر اور میلان و رغبت کی کوئی حیثیت نہ تھی اور وہ خود سرزدوں کے ارادہ و میلان کے تابع تھیں۔ اس کیفیت کا ایک نثری انتخاب شوہر کا مستحب بھی تھا جس میں عورتوں کی خواہش و رغبت کا کوئی دخل نہ تھا۔ اس روش میں معاشرہ بالکل جاہل تھا کہ اگر عورت رسمی نکاح بھی کر لیتی اور اس کے بعد اس شوہر سے میل جول ہو جاتی تو متھے سرے سے اس سے وابستگی بھی دلی دیا اولیاء کے ارادے پر موقوف تھی بعض اوقات اگر عورتیں اپنی سابقہ ازدواجی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے تو ان کے اولیاء اپنے منافع کی خاطر یا خیالات و سوچوں کی بناء پر اس تعلق میں حائل ہو جاتے۔

قرآن صراحت سے اس روش کو مذموم قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اولیاء اور دیگر افراد ہرگز ایسا کوئی حق نہیں رکھتے کیونکہ جب عورتیں جو شادی کے واسطے اور بنیادی رکن ہیں وہ ایک دوسرے سے موافقت رکھتی ہیں اور چاہتے ہیں کہ طہیدگی کے بعد پھر شادی کریں تو دوسروں کی مخالفت کوئی معنی نہیں رکھتی۔

گذشتہ آیت میں "تزوج اجل" کا معنی ہے عورت کے آخری دنوں تک پہنچنا لیکن اس آیت میں متھے سرے سے ازدواج کے قرینے سے "تزوج اجل" سے مراد آخری دن کا گزر جانا ہے۔ اصطلاح کے مطابق گذشتہ آیت میں غایت "منفیا" کا جزاء تھی اور یہاں "منفیا" سے خلع ہے۔

اس بناء پر آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ عورتیں یعنی جنہوں نے ایک دفعہ شادی کر لی ہے وہ دوبارہ شادی کے لیے اولیاء کی تائید حاصل کرنے کی باطل مستحاج نہیں ہیں یہاں تک کہ ان کی مخالفت بھی بے اثر ہے لیکن کیا باکرہ لڑکیوں کی اجازت کی مستحاج ہیں یا نہیں۔ اس بارے میں آیت خاموش ہے۔ اس کی تشریح کتب فقہ میں موجود ہے۔ آیت کا آخری حصہ کہتا ہے



کہ احکام کا یہ سلسلہ جو تبار سے نفع کے لیے بیان ہوا ہے ایسے لوگوں کے بارے میں ہے جو کائنات کے پیدا کرنے والے اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہیں۔ جب تک انسان خدا پرستی اختیار کر کے خود پرستی سے نجات حاصل نہ کرے اپنے میلانات پر ہرگز کنٹرول نہیں کر سکتا اور کچھ ردی سے باہل نہیں بچ سکتا۔

”ذَلِكَ اِذْ كُنَّا نَكْمُو وَاٰطَمٰهُمۡ وَانۡتَدٰى يٰعٰلَمُ لَا تَعْلَمُوْنَ“

یہ جملہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان احکام پر عمل کرنے کا نتیجہ سو فیصد تبار کے حق میں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ اطلاعات کی کمی کی وجہ سے تمہیں احکام کے فائدے سے واقفیت حاصل نہ ہو لیکن وہ خدا جو تمام اسرار سے آگاہ ہے اس نے یہ احکام تبار کے مضاف کے تحفظ، خاندانوں کی عبادت اور پاکیزگی کے لیے جاری کیے ہیں۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ خداوند عالم نے اس جملے میں ان احکام پر عمل کرنے کا نتیجہ ترکیبی بھی اور عبادت بھی قرار دیا ہے ”اِذْ كُنَّا نَكْمُو وَاٰطَمٰهُمۡ“ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ان احکام پر عمل کرنا ایک تو ان مختلف آلودگیوں اور ناپاکیوں کو دور کرتا ہے جو غلط کاموں کے سبب خاندانوں کے دامن گیر ہو جاتی ہیں اور دوسرا اس کا حاصل یہ ہے کہ انہیں نشوونما تکامل اور خیر و برکت نصیب ہوتی ہے۔ یاد رہے کہ ترکیب کا اصلی لغوی معنی نمونہ پانا اور برتنا ہی ہے۔

۲۲۳۔ وَالْوٰلِدٰتُ يُرۡضِعْنَ اَوۡلَادَهُنَّ حَوْلَیۡنَ کَامِلَیۡنَ لِمَنۡ اَرَادَ اَنۡ یَّتِمَّ الرِّضَاعَۃَ وَ عَلٰی الْمَوۡلُوۡدِ لَهٗ رِزۡقُہُنَّ وَ کِسُوۡتُہُنَّ بِالْمَعۡرُوۡفِ لَا تُکَلِّفُ نَفۡسٌ اِلَّا وُسۡمًا لَا تُضَارَّ وَالِدَۃٌ بِوَلَدِہَا وَلَا مَوۡلُوۡدٌ لِّہٖ بِوَلَدِہٖ وَ عَلٰی الْوَارِثِ مِثۡلُ ذٰلِکَ فَاِنۡ اَرَادَا فِصَالًا عَنِ تَرَاضٍ مِّنۡہُمَا وَ تَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡہِمَا وَاِنۡ اَرَدۡتُمَا اَنۡ تَسۡرِضِعُوۡا اَوۡلَادَکُمۡ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ اِذَا سَلَعْتُمَا مَا اتٰیۡتُمۡ بِالْمَعۡرُوۡفِ وَ اَتَّمَمۡتُمَا اِلَیۡہِ مَا تَعۡمَلُوۡنَ بِصِیۡرَۃٍ ۝

ترجمہ ۲۲۳۔ مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دو دھ پلاتی ہیں ایہ اس کے لیے ہے جو دو دھ پلانے کے دور کی تکمیل کرنا چاہے اور اس باب کے لیے جس کے ماں بچہ پیدا ہوا ہے ضروری ہے وہ ان مائوں کو دو دھ پلانے کی مدت میں مناسب طریقے سے خوراک اور لباس دے اگرچہ وہ طلاق سے پہنچی ہوں۔



کسی شخص کی ذمہ داری اس کی قوت و طاقت سے زیادہ نہیں ہے نہ ماں بچے کو اس کے باپ سے اختلاف کی وجہ سے ضرر پہنچانے کا حق رکھتی ہے اور نہ باپ اور اس کے وارث پر ایسا کرنا لازم ہے اگر وہ دودھ پلانے کی مدت میں ماں کے اختراجات مہیا کرے، اور اگر وہ دونوں باہمی رضامندی اور مشورے سے بچے کا دودھ زیادہ جلد ہی چھڑوا دیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں ہے اور اگر طاقت نہ رکھنے یا ماں کے موافق نہ ہونے سے اپنے بچوں کے لیے کوئی آیا لے آؤ تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ بشرطیکہ ماں کا گزشتہ حق شائستہ اور مناسب طریقے سے ادا کرو اور خدا سے ڈرو اور جان لو کہ جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اُسے دیکھنے والا ہے۔

تفسیر

لغت عرب میں "والدہ" ماں کو کہا جاتا ہے لیکن لفظ "ام" بہت وسیع معنی کا حامل ہے۔ یہ لفظ کبھی ماں کے لیے اور کبھی بہن کی جڑ اور بنیاد کے لیے بولا جاتا ہے۔
اس آیت میں قرآن نومولود بچوں کو دودھ پلانے کے لیے مختلف طریقے اور اس سلسلے میں مختلف حقوق بیان کرتا ہے ان کا قطعاً ماں، بیٹا اور باپ سے ہے۔ اس آیت سے مجموعی طور پر سات احکام حاصل ہوتے ہیں۔

نوزائیدہ بچوں کو دودھ پلانے کے بارے میں سات احکام

۱۔ دودھ پلانے کے دو سالوں میں دودھ پلانے کا حق ماں سے نہیں ہے اور وہی اس مدت میں بچے کو دودھ پلا سکتی ہے اور وہی دیکھ بھال بھی کرے گی۔ اگرچہ چھوٹے بچوں کی ولایت باپ کے ذمہ ہے لیکن نوزائیدہ بچے کو ماں کی دیکھ بھال اور سرپرستی میں دے دیا گیا ہے کیونکہ نومولود کے جسم و روح کی غذا کے طور پر ماں کا دودھ اور شفقت مادری درکار ہے۔ بچے اور ماں کا یہ انٹلر رشتہ ہے ایک بہو یہ ہے کہ ماں کے جذبات کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے کیونکہ ایسے حساس لمحات میں ماں اپنی گود کو خالی نہیں دیکھ سکتی اور وہ بچے کی حالت دیکھ کے آرام سے نہیں رہ سکتی۔ اس لیے اس طرح سے دیکھ بھال اور دودھ پلانے کا حق ماں کو دیا گیا ہے۔ یہ حکم دو سپردوں کا حامل ہے، اس میں بچے اور ماں دونوں کی حالت کو ملحوظ رکھا گیا ہے "والوالدات یرضعن اولادھن حنیناً کاملیلین"۔

۲۔ ضروری نہیں کہ بچے کو دودھ پلانے کی مدت پورے دو سال ہی ہو۔ دو سال تو اس صورت میں ہے اگرچہ وہ دودھ پلانے کے اس دور کو مکمل کرنا چاہیں (لحمٰن اراد ان یمتہ الرضیعۃ)۔

لیکن مائیں حق رکھتی ہیں کہ نومولود کی حالت و کیفیت اور سلامتی کو مد نظر رکھتے ہوئے اس میں کمی کر دیں۔ اہل بیت علیہم السلام سے جو روایات ہم تک پہنچی ہیں ان میں دودھ پلانے کا مکمل دور دو سال بیان فرمایا گیا ہے اور نامکمل دور ۲ ماہ بتایا گیا ہے۔ بعید نہیں کہ یہ معنی زیر نظر آیت اور سورہ احقاف کی آیہ ۵۸ کو ایک دوسرے میں ضم کرنے سے پیدا ہوتا ہو۔ کیونکہ سورہ احقاف میں ہے: "وَحَمَلُهُ وَفَصْلَانِ شَلْشَوْنٍ شَهْرًا"۔

پور اس کا مکمل اور دودھ پلانے کی مدت ۳۰ ماہ ہے۔



ہم جانتے ہیں کہ حمل کی مدت عموماً ۹ ماہ ہوتی ہے۔ اس لیے باقی ۳ ماہ دودھ پلانے کی عام مدت ہوگی اور چونکہ سورہ احقاف کی مذکورہ آیت میں بھی سند و جواب کی صورت میں نہیں آیا لہذا مائیں حق رکھتی ہیں کہ بچے کی سلامتی کو نظر میں رکھتے ہوئے چاہیں تو دودھ پلانے کی مدت ۳ ماہ سے بھی کم کر دیں۔

”وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِتَابَتُهُنَّ“ :

۳۔

یہاں لفظ ”الابت“ جس کا معنی باپ ہے استعمال نہیں ہوا بلکہ ”المولود لہ“ کی تعبیر استعمال کی گئی ہے جس کا معنی ہے ”وہ شخص جس کا بچہ پیدا ہوا ہے“۔ یہ بات یہاں قابل توجہ ہے۔ یہ تعبیر گویا اس لیے استعمال کی گئی ہے کہ اس ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے پدری جذبات کو زیادہ سے زیادہ تحریک دی جائے یعنی اگر بچے اور اس کی ماں کے اخراجات مرد کے ذمے رکھے گئے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس کا بیٹا ہے اور اس کے دل کا میوہ ہے نہ کہ ایک اجنبی فرد۔

اس مقام پر معروف ”کی شرط اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ ماں کی غذا اور لباس رائج معیار کے مطابق اور شایان شان ہو۔ اس سلسلے میں سختی درست ہے نہ فضول خرچی۔

اس کے بعد اس سلسلے میں ہر قسم کے ابہام کو دور کرنے کے لیے مزید وضاحت فرماتی گئی ہے کہ برابر باپ اپنی طاقت کے مطابق ذمہ دار ہے کیونکہ خداوند عالم کسی کی توانائی سے زیادہ اس پر ذمہ داری نہیں ڈالتا ”لَا تَكْلَفُ نَفْسٌ آخَرًا شَيْئًا“

۴۔ خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ ماں باپ اپنے بچے کی تقدیر اپنے اختلافات کی بھینٹ نہ چڑھا دیں اور ان اختلافات کے ذریعے فوڑا میسہ بچے کی روح رواں پر ناقابل تلافی ضربیں نہ لگا دیں ”لَا تَضَارُّ وَالِدَةُ بَوْلِدِهَا وَلَا مَوْلُودُ لَهَا بَوْلِدِهَا“

دودھ پلانے کے دوران میں بچوں کی دیگر بھول کا حق ماؤں کو حاصل ہے۔ مردوں کو چاہیے کہ ان سے یہ حق چھین کر پامال نہ کر دیں اور مائیں بھی جنہیں یہ حق دیا گیا ہے اس سے غلط فائدہ نہ اٹھائیں اور مختلف مہجوم بہانوں سے دودھ پلانے سے پہلو ہتی نہ کریں اور یونہی مرد کو بچے کی ملاقات سے محروم نہ کر دیں۔

اس جیسے کے مفہوم کے بارے میں اور تفسیریں بھی کی گئی ہیں لیکن جو کچھ یہاں بیان کیا گیا ہے وہ گزشتہ جملوں سے زیادہ مثبت و کفایت ہے۔

۵۔ باپ کی موت کے بعد وارثوں کو چاہیے کہ وہ اس ذمہ داری کو اپنے ذمہ لیں اور بچے کو دودھ پلانے کے دوران میں ماں کی ضرورت کو پورا کریں۔

۶۔ بچے کو دودھ چھڑوانے کا اختیار ماں باپ کو دیا گیا ہے۔ گزشتہ آیت میں اگرچہ بچے کو دودھ پلانے کی مدت کا تعین ہو چکا ہے لیکن ماں باپ بچے کی حساسی کیفیت کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک دوسرے کے صلاح و مشورہ اور باہمی رضامندی سے مناسب موقع پر بچے کا دودھ چھڑوا سکتے ہیں ”فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ“



فلا جناح علیہما۔ یعنی اگر ماں باپ باہمی رضامندی اور مشورے سے بچے کا دودھ چھڑوانا چاہیں کوئی حرج نہیں
 ماں تو زائیدہ بچے کو دودھ پلانے پر مجبور نہیں ہے اور وہ جب چاہے دودھ پلانے سے انکار کر سکتی ہے لیکن
 کیا خوب ہے کہ بچے کے رشد و کمال کے لیے وہ اپنی بعض خواہشات کو قربان کر دے اور اس سلسلے میں شوہر کی ہمکاری
 اور موافقت سے ہاتھ نہ اٹھائے اور سراضی اور "تشاور" یعنی ایک دوسرے کو راضی رکھنے اور آپس میں
 مشورہ کرنے کے حکم کو عملی جامہ پہنائے۔

ماں کے دودھ پلانے اور دیکھ بھال کرنے کے حق کو برگز نہیں روکا جاسکتا۔ لیکن اگر ماں خود انکار کر دے یا اس
 میں کوئی رکاوٹ حائل ہو جائے تو اس صورت کے لیے ارشاد فرماتا ہے:

"وَإِنْ أَرَدْتُمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ
 إِذَا سَلَّمْتُمْ مَا اتَّيْتُمْ بِالْمَعْرُوفِ۔"

تمہیں حق پہنچتا ہے کہ بچے کی دیکھ بھال اور اسے دودھ پلانے کا کام کسی مناسب
 آیا کے سپرد کر دیا پھر کچھ مدت کے لیے دودھ پلانے کا کام اسے سونپ دو تاکہ
 ماں کے لیے مدد و اعانت ہو سکے۔

(اذا سلمتم ما اتيتم بالمعروف)۔ اس جملے کا معنی ہے کہ ماں کی بجائے دودھ
 پلانے کے لیے دوسری عورت کا انتخاب عرین کی رضامندی اور مشورے کے ساتھ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں لیکن
 شرط یہ ہے کہ ماں کے گذشتہ حقوق اور جتنا دودھ اس نے پلایا ہے اس کا حق پامل نہ ہو جائے بلکہ جو مروج طریقہ ہے
 اس کے مطابق ہر حق ادا کیا جائے۔

"وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ۔"

بعض اوقات عورت اور مرد کے مابین اختلافات امتناعی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں
 ان کی اپنی یا بے چارے بچوں کی زندگی خطرے سے دوچار ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف
 کوئی سازش کر رہے ہوں لہذا ان تمام احکام کے آخر میں فرماتا ہے: خدا سے ڈرو اور پرہیزگاری اختیار کرو اور
 جان لو کہ خدا تمہارے تمام اعمال کو دیکھتا ہے اور وہ بینا ہے۔

۱۳۴۔ وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيُزَوَّجُوا جَا يَتَرَبَّصْنَ
 بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ
 فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ
 وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ○



ترجمہ

۲۳۴ — اور تم سے جو لوگ وفات پا جاتے ہیں اور اپنی بیویاں پیچھے چھوڑ جاتے ہیں تو ان بیویوں کو چار مہینے اور دس دن انتظار کرنا چاہیے اور عدت گزارنا چاہیے اور جب وہ یہ مدت پوری کر چکیں تو تم پر اس کا کوئی گناہ نہیں وہ اپنے بارے میں جو چاہیں مناسب طور پر انجام دیں اور اپنی خواہش کے مطابق کسی سے نکاح کر لیں اور تم جو کچھ عمل کرتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے۔

تفسیر

شوہر کی وفات کے بعد دوسری شادی عورت کے لیے بنیادی اور مشکل مسائل میں سے ہے۔ بے شوہر کی وفات کے بعد فوری طور پر دوسری شادی کرنا سابق شوہر کی محبت و دوستی اور احترام کے منافی ہے۔ نیز یہ یقین پیدا کرنا بھی ضروری ہے کہ عورت کا رحم پہلے شوہر کے نطفے سے خالی ہے۔ علاوہ انہیں فوری طور پر دوسری شادی کرنے والے کے لواحقین کے جذبات کے خروج جوئے کا سبب بھی ہے لہذا مندرجہ بالا آیت میں عورتوں کے لیے یہ شرط عائد کی گئی ہے کہ نئے نکاح کے لیے چار مہینے اور دس دن کی عدت گزاریں۔

شوہر کے مرنے کے بعد بھی ازدواجی زندگی کے حرم کا احترام ایک فطری امر ہے۔ اس لیے مختلف قبائل میں اس مقصد کے لیے طرح طرح کے آداب و رسوم رہے ہیں مگر یہ بعض اوقات یہ بات زیادتی اور افراط کی شکل اختیار کر جاتی ہے اور عملی طور پر عورتیں تید و بند میں ڈال دی جاتی ہیں۔ بعض اوقات تو ایسی عورتوں پر بہت زیادہ ظلم روا رکھا جاتا رہا ہے۔ بعض لوگ شوہر کے انتقال کے بعد عورت کو جلاوتیے سے یا مرد کے ساتھ ہی زندہ دفن کر دیتے تھے۔

لوگوں میں یہ رسم بھی رہی ہے کہ عورت کو نئی شادی سے یکسر محروم کر کے گوشہ نشینی پر مجبور کر دیا جاتا۔ بعض قبائل میں یہ رواج تھا کہ شوہر کے انتقال کے بعد عورت ایک مدت تک سیاہ اور بوسیدہ خیمہ قبر شوہر پر لگا دیتی اور اس میں بیٹھے پرانے اور کثیف لباس میں وقت گزرتی، ہر طرح کی آرائش و زیور یہاں تک کہ بنانے دھونے سے بھی دور رہتی اور یونہی اس کے شب و روز گزار جاتے۔

زیر نظر آیت نے ان تمام خرافات پر خط بطلان کھینچ دیا ہے اور نشانہ طور پر حرم زوجیت کی بنیاد کی حفاظت کے لیے ”عدت“ مقرر کر دی ہے۔

”وَالَّذِينَ يَتوفون منکم و یذرون ازواجاً یتربصن بانفسھن

اربعۃ اشھر و عشرًا“

لفظ ”توف“ قرآن میں بہت سے مواقع پر استعمال ہوا ہے اس کا معنی ہے ”گرفت میں لینا“ لفظ ”تذ“ ماضی کا صیغہ نہیں ہے اور اس کا معنی ہے ”چھوڑنا“۔ آیت کہتی ہے: جن عورتوں کے شوہر چل جاتے ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ چار مہینے اور دس دن عدت میں رہیں اور اس عرصے میں نئی شادی سے اجتناب کریں۔

مہربان اسلام سے ہم کس پہنچنے والی روایات کے مطابق عورتوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس مدت میں حالتِ سوگاری میں رہیں یعنی آرائش و زیبائش برکزد کریں اور ساوگی میں رہیں۔ عدت مقرر کرنے کا فلسفہ بھی اس بات کو ضروری قرار دیتا ہے۔ اسلام نے عورتوں کو زمانہ جاہلیت کے آداب و رسوم سے اس حد تک نجات بخشی کہ بعض لوگوں نے خیال کیا کہ شاید وہ اس مدت کے دوران میں بھی شادی کر سکتی ہیں۔ جن عورتوں کا یہ خیال تھا انہیں میں سے ایک عورت پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ وہ نئی شادی کے لیے اجازت کی طلب گار تھی۔ اس نے پیغمبر اکرمؐ سے سوال کیا:

”کیا آپ اجازت دیتے ہیں کہ میں سسرال کا دل اور اپنے آپ کو آزاد ستھویر کر دوں؟“

آنحضرتؐ نے فرمایا: تم عورتیں بھی عجیب و غریب مخلوق ہو۔ اسلام سے پہلے تو وفاتِ شوہر کے بعد مدتِ عدت سخت ترین حالات میں بھی پورا کرتی تھیں یہاں تک کہ بعض اوقات مرتے دم تک یہ مدت متبار سے ساتھ چلتی تھیں۔ اب جب کہ خاندان کے احترام اور حقِ زوجیت کو ملحوظِ نظر رکھتے ہوئے حکم دیا گیا ہے کہ عورتی سی مدت صبر کر لو تو اب اسے بھی برداشت نہیں کرتی ہو۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اسلام میں اس بات کی تصریح کی جا چکی ہے کہ اگر عورت کے حاملہ ہونے کا کوئی احتمال نہ بھی ہو پھر بھی اسے شوہر کی وفات کے بعد مدتِ پوری کرنا چاہیے۔ اسی لیے عورت کے لیے عدت کی ابتداء شوہر کی وفات سے نہیں ہوتی بلکہ یہ مدت اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب عورت کو شوہر کے انتقال کی خبر ملے۔ چاہے یہ خبر کئی ماہ کے بعد ہی کیوں نہ ملے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس حکم کی تشریح ہر چیز سے پہلے زوجیت کے احترام و حریم کی حفاظت کے لیے ہے اگرچہ احتمالی طور پر عورت کا حاملہ ہونا بھی اس قانون میں مستم طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔

”فَاِذَا بَلَغَتِ ابْنُ مَرْثَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ فِيمَا فَعَلْتَ فِيهَا مِنْ نَفْسِهِمْ“

بالسبع و الف

”بلوغِ اجل کا مضموم ہے بہت کا الجھم کو پہنچنا، آیت کے اس حصے کے مطابق اس مدتِ عدت کے خاتمے پر عورتیں اپنی خواہش کے مطابق شادی کر سکتی ہیں۔“

بعض اوقات اولیاءِ خرافات اور موبہم افکار کی بناء پر عورت کے نکاحِ ثانی میں حائل ہوتے ہیں اس لیے آیت انہیں مخاطب کر کے کہتی ہے: اس سلسلے میں اب تہداری کوئی ذمہ داری نہیں، تم انہیں چھوڑ دو کہ وہ اپنی پسند کے مردوں سے رشتہ نکاحِ صحیح بنیاد پر قائم کر لیں۔

”وَاقْتُلُوا نَفْسَكُمْ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ“

اور اولاد کے امور کے بارے میں دخل اندازی نہ کریں کیونکہ پروردگار تمام چیزوں سے باخبر ہے اور وہ ہر شخص کو اس کے اچھے اور بُرے اعمال کی جزا دے گا۔

۲۳۵- وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَضْتُمْ بِهِ مِنْ خُطْبَةِ النِّسَاءِ اَوْ اَكْنَفْتُمْ فِيْ اَنْفُسِكُمْ عَلِمَ اللّٰهُ اَنْتُمْ



سَتَذَكَّرُوْنَهُمْ وَلٰكِنْ لَا تُوَاعِدُوْهُمْ سِرًّا اِلَّا اَنْ تَقُوْلُوْا
قَوْلًا مَّقْرُوفًا وَلَا تَفْرِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتَابُ
اَجَلَهُ وَاَعْلَمُوْا اَنْ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ
وَاَعْلَمُوْا اَنْ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

ترجمہ

۲۲۵۔ اور اس بات کا تم پر کوئی گناہ نہیں اور اس میں کوئی حرج نہیں کہ اشارے کناٹے سے تم ان عورتوں سے، خواستگاری کرو جن کے شوہر وفات پا چکے ہیں یا بلا اعتبار دل میں اس کے لیے پختہ ارادہ کر لو۔ خدا جانتا تھا کہ تم ان کی یاد میں گرفتار ہو جاؤ گے (اور وہ معقول طریقے سے ظاہر ہونے والی تمہاری فطری خواہش کا مخالف نہیں) لیکن ان سے پوشیدہ طور پر مباشرت کا وعدہ نہ کرو بلکہ اگر (کناٹے کے طور پر) پسندیدہ طریقے سے اظہار کرو (لیکن ہر حالت میں) ان کی عدت ختم ہونے تک شادی کا اقدام نہ کرو اور جان لو کہ جو کہ تمہارے دل میں ہے خدا اسے جانتا ہے، اس کی مخالفت سے ڈرو اور جان لو کہ خدا بخشنے والا اور بڑبار ہے (اور بندوں کو سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا)۔

تفسیر

کیا دورانِ عدت عورتوں سے خواستگاری کی جاسکتی ہے؟

قرآن یہ چاہتا ہے کہ سابق زوجیت کا احترام بھی زائل نہ ہو اور نہ ہی عورت اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے سے محروم رہے۔ اس بناء پر اس سسٹم میں مندرجہ بالا آیت میں ایک قابلِ توجہ حکم دیا ہے جو عاوانہ بھی ہے اور اس میں طرفین کا مکمل احترام بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ آیت کہتی ہے کہ اگر کوئی شخص دورانِ عدت عورت سے خواستگاری کرنا چاہے تو اس میں کوئی حرج نہیں لیکن وہ پوشیدہ طور پر اور اشارہ و کناٹے کی صورت میں ہونہ کہ آشکار اور صریح (و لا جناح علیکم فیما عرضتم بہ من خطبة النساء)۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے کہ بغیر اظہار کے جس میں مراعت ہونہ کناٹہ ان سے عدتِ وفات کے بعد نکاح کرنے کے ارادے میں بھی کوئی گناہ نہیں (اَوْ اٰکثَرْتُمْ فِیْ اَنْفُسِکُمْ)۔

عَلِمَ اللّٰهُ اَنْتُمْ سَتَذَكَّرُوْنَهُمْ

آیت کے اس حصے کے مطابق یہ حکم اس بناء پر ہے کہ ان کے شوہروں کے (اس دنیا سے) چل بنے کے بعد یہ فطری امر ہے کہ بعض افراد ان سے شادی کرنے کی فکر میں پڑ جاتے ہیں اور چونکہ اسلام فطری اور معقول خواہشات کی مخالفت نہیں کرتا

بہذا اس فکر کو وہ گناہ شد نہیں کرتا۔

”وَلَكِنْ لَا تَوَاعِدُوهُنَّ مَسْرًا إِلَّا أَنْ تَقُولُوا قَوْلًا مَعْرُوفًا“

آیت کے اس حصے میں سمجھایا گیا ہے کہ کھلے بندوں خواستگاری ہی سے رکنا کافی نہیں بلکہ مخفی طور پر عدت کے دوران میں عورت سے بالخصوص خواستگاری نہیں کرنا چاہیے البتہ اس سلسلے میں گفتگو واقعاً اس طرح ہو کہ معاشرتی آداب اور نوت شدہ شوہر کے احترام سے ہم آہنگ ہو۔ قرآن کی اصطلاح میں ”معروف“ یعنی پسندیدہ ہو۔ اس سے مراد یہ ہے کہ پردے اور کٹانے سے ہو۔

اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں ربیران اسلام نے سربت خواستگاری اور قول معروف کی وضاحت کے لیے کئی ایک مثالیں ارشاد فرمائی ہیں۔ ہم بطور نمونہ درج کرتے ہیں۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں

قول معروف یہ ہے کہ شہزادہ جس عورت کو نگاہ میں رکھے ہونے سے اس سے بچے کہ میں عورتوں کا احترام کرتا ہوں۔ تم سے دلی عداوت رکھتا ہوں اس بے کسی اور کو بچہ پر ترجیح نہ دیتا ہے

”وَلَا تَعْزِمُوا عَقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ.....“

آیت کے اس حصے میں مزاحمت سے فرمایا گیا ہے کہ جب تک عدت ختم نہ ہو نکاح نہ کیا جائے۔ اس کے بعد مزید ارشاد فرمایا گیا ہے کہ خدا تمہارے مخفی جمیدوں سے آگاہ ہے لہذا اس کے فرمان کی مخالفت سے ڈرتے رہو۔ لیکن خدا یہ بھی نہیں چاہتا کہ جو بندے کہیں کچھ اس کی مخالفت کر بیٹھیں وہ بالکل اس کی رحمت سے مایوس ہو جائیں۔ لہذا فرماتا ہے: جان لو کہ خدا بخشنے والا ہے اور وہ بندوں کو سزا دینے میں جلد بازی سے کام نہیں لیتا۔

”وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ وَاعْلَمُوا

أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ“

۲۳۶۔ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمْسُوهُنَّ

أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً ۖ وَ مِمَّا مَوْهُنٌ عَلَى الْمَوْسِعِ وَتَدْرُءُ

وَعَلَى الْمُقْتِرِ فَدَرَةٌ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ○

ترجمہ

۲۳۶۔ اگر مباشرت اور تعین مہر سے قبل (بوجہ) عورتوں کو طلاق دے دو تو تم پر کوئی گناہ نہیں (اس موقع پر انہیں) مناسب ہدیہ کی صورت میں (بہرہ مندر کرو۔ جو شخص طاعت رکھتا ہے وہ اس کے

لہ نَوَازِ الشُّكْلَيْنِ ۛ ۱۔ اس آیت کی ذیل میں۔



مطابق اور جو تنگ دست ہے وہ اپنے حسبِ حال شائستہ بدیہ (جو لینے والے اور دینے والے دونوں کے شایانِ شان ہو) دے اور یہ نیکو کاروں کے لیے ضروری ہے۔

تفسیر
گفت میں "میں" کا معنی ہے "چھوٹا"۔ یہاں مباشرت کے عمل سے کنایہ ہے۔ زیرِ نظر آیت دو نکات پر مشتمل ہے
۱۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ مباشرت اور تعیین حق مہر سے قبل طلاق دینا صحیح نہیں۔ آیت نے اُن کے خیال کی تردید کی ہے اور فرمایا ہے کہ اس میں کسی قسم کا کوئی حرج نہیں ہے۔

"لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمْسُوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا

لَهُنَّ فِتْرَةٌ يَصْنَعُ"

البتہ اس کی صورت یہ ہے کہ طہین عقد کے بعد مباشرت سے قبل کئی ایک وجوہ کی بنیاد پر یہ سمجھیں کہ وہ ایک ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ اس موقع پر طہین طلاق کے ذریعے ایک دوسرے سے جدا ہو سکتے ہیں۔

۲۔ مباشرت سے قبل طلاق کی صورت میں اگر حق مہر معین شدہ نہ ہو تو ایسا بدیہ جو کہ عورت کے شایانِ شان ہو اُسے ادا کیا جائے (مشموعہ)۔

حق مہر معین ہو چکا ہو تو اس صورت میں کیا کرنا چاہیے، اس کی وضاحت اگلی آیت میں آئے گی۔ اس بیان کے مطابق لفظ "او" و "واؤ" کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

بدیہ دینے کے بارے میں لوگوں کی فاقہ اور استطاعت کو مد نظر رکھتے ہوئے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے:

"عَلَى الْمُوسِعِ فِتْرَةٌ وَعَلَى الْمُقْتِرِ لِمَقْتَرِهِ"

"موسع" کا معنی ہے "توڑ" اور "مقتِر" کا معنی ہے "تنگدست"۔ اس لیے آیت کا مفہوم یہ ہو گا کہ صاحبِ ثروت اپنی حیثیت کے مطابق اور تنگدست اپنی استطاعت کے مطابق بدیہ ادا کرے۔

مَتَا حَا بِالْعَمْرِ وَفَتْ "یعنی یہ بدیہ شائستہ طور پر ہو، اسراف و بخل دونوں سے پاک ہو۔ دینے والے اور لینے والے ہر دوسرے کے حسبِ حال ہو۔

یہ حدیث اہم تاثیر کا حامل ہے۔ جذبات متفہم کو ختم کرنے اور عورت کو کئی ایک مشکلات سے بچانے کے لیے یہ اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ یہ مشکلات اس رشتہ ازدواج کے ٹوٹنے سے پیدا ہو سکتی ہیں (البتہ آیت میں اس عمل کو نیکی اور احسان کے جذبے سے وابستہ کر دیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے "حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ") یعنی نیک لوگوں کے لیے یہ عمل ضروری ہے۔ یعنی اسے نیکی اور صلح و مصفا کے جذبے سے سرشار ہونا چاہیے۔

یہ بات بن کہے بھی واضح ہے کہ محسنین کی تفسیر کا یہ مقصد نہیں کہ مذکورہ ہر حکم الزامی و ضروری نہیں بلکہ اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے لوگوں کے جذبات و احساسات کو تحریک دینے کے لیے یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے ورنہ جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے یہ حکم بکالانا لازمی اور ضروری ہے۔

نہ قسرت کا مادہ بخل کے معنی میں ہی استعمال ہوتا ہے جیسے "وكان الاقسان قسورا"۔ لیکن یہی زیرِ نظر آیت میں یہ معنی ملا نہیں۔

دوسرا اہم نکتہ جو اس آیت سے سامنے آتا ہے یہ ہے کہ مرد کی طرف سے عورت کو دیے جانے والے اس ہدیے کو "متاع" کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔ لغت میں متاع کا معنی ہے وہ چیزیں جن سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے اور ان سے متمتع ہوتا ہے۔ یہ لفظ زیادہ تر نقدی کے علاوہ چیزوں پر یوں لایا جاتا ہے کیونکہ روپے پیسے سے براہ راست فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا بلکہ ضروری ہے کہ وہ متاع میں تبدیل ہو۔ اسی بنا پر قرآن ہدیے کو متاع سے تعبیر کرتا ہے۔

یہ بات نفسیاتی طور پر خاص اثر رکھتی ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ وہ ہدیہ جو قابل استعمال اجناس کی صورت میں ہو مثلاً خوراک، لباس وغیرہ کتنا ہی کم قیمت کیوں نہ ہو دل و دماغ پر ایسا اثر ڈالتا ہے کہ اگر انہیں نقدی میں تبدیل کر دیا جائے تو وہ ہرگز نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ائمہ اطہار علیہم السلام سے پہنچنے والی روایات میں زیادہ تر لباس، غذائی اجناس اور زرعی زمین جیسی چیزوں کا ہدیے کے نمونوں کے طور پر ذکر آیا ہے۔

صنعتی آیت سے یہ بھی اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ نکاح دائمی میں پیسے سے حق مہر کا معین ہونا ضروری نہیں اور طرفین میں بعد ازاں بھی اس پر اتفاق ہو سکتا ہے۔

آیت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مہر معین ہونے اور باشرت سے پہلے طلاق ہو جائے تو حق مہر واجب نہیں ہوگا اور مذکورہ ہدیہ حق مہر کا قائم مقام ہو جائے گا۔

۲۳۷۔ وَإِنْ طَلَقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمْسُوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُوَا أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّعْمَلِ وَلَا تَتَسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝

ترجمہ ۲۳۷۔ اور اگر عورتوں کو چھوٹنے (اور ان سے سمبستری کرنے) سے قبل طلاق دے دو جب کہ حق مہر معین ہو چکا ہو تو (ضروری ہے کہ) معین شدہ کا نصف (انہیں دے دو) مگر یہ کہ وہ (اپنا حق) بخش دیں یا (اگر وہ صغیر اور سفید ہیں تو ان کا حق) جس کے ہاتھ میں نکاح کی گڑ ہے اسے بخش دے اور اگر تم درگزر کرو (اور مقام مہر انہیں ادا کر دو) تو پر سبز گاری کے زیادہ نزدیک ہے۔ نیز درگزر اور پر سبز گاری کو اپنے درمیان سے فراموش نہ کر دو کیونکہ تم جو کچھ انجام دیتے ہو خداوند عالم اس سے بینا ہے۔

۱۔ لیکن اگر تقدیر نامی میں مہر معین نہ کیا گیا ہو تو مہر ساقط نہیں ہو جاتا بلکہ مہر بش (دو مہر جو اس جیسی عورتوں کو دیا جاتا ہے) ہی مقرر ہونا چاہئے گا۔ مباشرت سے پہلے طلاق کی صورت میں اگر مہر معین نہ ہو تو صرف بچہ واجب ہوگا جس کی طرف اشلہ کیا جا چکا ہے۔

تفسیر

اس آیت میں بھی طلاق کے بارے میں حکم بیان کیا گیا ہے۔ گذشتہ صورت کی طرح اگر مباشرت کا عمل نہیں ہوا لیکن حتیٰ مہر معین ہو چکا ہے تو اس سلسلے میں آیت پہلے قانون اسلام کی نگاہ میں جو حکم ہے اسے بیان کرتی ہے اور وہ یہ کہ مرد کو چاہیے کہ مقرر شدہ حق مہر سے آدھا ادا کرے ("فمنصف ما هنر منبتہ")۔ قانونی حکم جو اجتماعی نظام کی حقیقی بنیاد ہے اسے بیان کرنے کے بعد اخلاقی پہلو بیان کئے گئے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: آدمے حق مہر کی ادائیگی کا حکم تو عفو اور بخشش سے صرف نظر کرتے ہوئے ہے لیکن اگر عورت اپنے مسلح حق سے درگزر کرے تو پھر شوہر پر کچھ واجب نہیں ہے۔ اسی طرح اگر جس کے ہاتھ میں نکاح کا معاملہ ہے وہ حق مہر سے چشم پوشی کرنے تو شوہر پر کوئی چیز واجب نہیں ہوگی۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ "التذی بیدہ عقدہ النکاح" (یعنی جس کے ہاتھ میں نکاح کی گڑھ ہے) اس سے کون شخص مراد ہے۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے مراد شوہر ہے۔ لیکن آیت پر غور و خوض کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس سے عورت کے اولیاء مراد ہیں۔

ابتداء سے روئے سخن کیونکہ شوہروں کی طرف سے اس پر فرمایا ہے "وان طلقتموهن" (اگر تم انہیں طلاق دے دو) اور آیت کے آخر میں بھی روئے سخن شوہروں کی طرف ہے "وان تعفوا اقرب للثقوی" (اگر تم معاف کر دو تو یہ پرہیزگاری کے زیادہ نزدیک ہے) اس لئے او یعضو الذی بیدہ عقدہ النکاح" کا جملہ جو فعل غائب کی شکل میں ہے یقیناً شوہروں سے مربوط نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس سے مقصود عورت کے اولیاء ہی ہیں۔ وہی حق مہر کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ مثلاً اگر بیوی نادان یا بے عقل ہو تو اس صورت میں اولیاء حق مہر بخشنے یا لینے کے بارے میں اس کے منافع کو پیش نظر رکھتے ہوئے فیصلہ کر سکتے ہیں۔ مفسرین چٹراؤں سے مروی روایات میں بھی آیت کا یہی مفہوم بیان کیا گیا ہے۔ شیخ مفسرین نے بھی آیت کے معنوں اور روایات اہل بیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اسی نظریے کو انتخاب کیا ہے اور ان کے نزدیک بھی اس عبارت سے بیوی کے اولیاء مراد ہیں۔

"وان تعفوا اقرب للثقوی"۔ یہ جملہ مرد اور اس کے انسانی فرائض کے بارے میں ایک اہم حکم بیان کرتا ہے اور وہ یہ کہ بہتر ہے مرد درگزر کی راہ اپنائے اور اگر تمام حق مہر ادا کر چکا ہے تو اس میں سے کچھ واپس نہ لے لے اور اگر ادا نہیں کیا تو سارے کا سارا ادا کر دے اور اپنے آدمے حق سے صرف نظر کرے۔ آیت کے اس حصے میں بتایا گیا ہے کہ اگر مرد عفو اور درگزر سے کام لے تو یہ پرہیزگاری کے نزدیک ہے۔

عقد کے بعد اور زنجستی سے قبل شوہر سے جدا ہو جانے والی لڑکی اور عورت بہت سی معاشرتی اور نفسیاتی مشکلات سے دوچار ہو جاتی ہے اور مستم ہے کہ مرد اگر درگزر سے کام لے اور تمام حق مہر ادا کر دے تو یہ اس کے زخموں کے لیے ایک طرح کا مرہم ہو سکتا ہے۔



”وَلَا تَنسَوِ الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ أَنْتُمْ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ“

اسلام چاہتا ہے کہ جہاد کی اور عبادت کی کام دینی ”معروف“ اور ”احسان“ کی بنیاد پر انجام پذیر ہو۔ یعنی اتقان ہی سے خالی نہ ہو بلکہ درود اور عبادت دونوں عظمت و بزرگی کی روح کو بھی فراموش نہ کریں۔ فرماتا ہے: اپنے درمیان سے کیسی نیکی، عظمت اور احسان کو فراموش نہ کرو۔ کیونکہ خدا تمہارے اعمال کو دیکھنے والا ہے۔

۲۳۸۔ حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ ○

۲۳۹۔ فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَأَذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ○

ترجمہ

۲۳۸۔ تمام نمازوں کی انجام دہی اور خصوصاً نماز وسطیٰ (نماز ظہر) کی ادائیگی میں کوشاں رہو اور خضوع و اطاعت کے ساتھ خدا کے لیے قیام کرو۔

۲۳۹۔ اور اگر (جنگ یا کسی اور خطرے کی وجہ سے) تمہیں خوف ہو تو نماز کو پیادہ یا سواری کی حالت میں انجام دو لیکن جب حالت امن لوٹ آئے تو خدا کو یاد کرو (اور نماز کو معمول کے مطابق ادا کرو) جیسا کہ اُس نے تمہیں ان چیزوں کی تعلیم دی ہے جنہیں تم نہیں جانتے تھے۔

شان نزول

بعض منافقین نے گرمی کا بہانہ تراشا اور مسلمانوں کی مسجودوں میں تفرقہ ڈالنے کے لیے وہ نماز باجماعت میں شرکت نہیں کرتے تھے۔ ان کے دیکھا دیکھی اور لوگوں نے بھی جماعت میں شرکت ترک کر دی۔ اس طرح مسلمانوں کی جماعت میں کمی آگئی۔ اس پر پیغمبر اکرمؐ بہت پریشان تھے۔ آپؐ نے انہیں سخت سزا کی دھمکی دی۔ زید بن ثابتؓ سے منقول ہے کہ پیغمبر اسلامؐ سخت ترین گرمی میں بھی دوپہر ہوتے ہی نماز ظہر جماعت کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ یہ عمل آپؐ کے اصحاب کے لیے بہت گراں تھا۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں نماز کی اہمیت بالعموم اور نماز ظہر کی اہمیت بالخصوص بیان ہوئی۔

تفسیر

نماز انسان کو خالق کائنات سے مربوط کرنے کا ایک ذریعہ ہے اور مگر وہ اپنی صحیح شرائط کے ساتھ انجام پا جائے تو دل کو عشق خدا سے معمور کر دیتی ہے اور اس کے ذریعے انسان بہتر طور پر گناہوں، آلودگیوں اور پروردگار کی نافرمانیوں سے محفوظ ہو سکتا ہے۔ ہذا یہ آیت تاکید کرتی ہے کہ مسلمان اس فریضہ کو قائم کرنے میں کوشاں رہیں اور خشوع و خضوع اور اپنی توجہ سے سجالاتیں خصوصاً نماز وسطیٰ کی حفاظت کریں۔

صلوٰۃ وسطیٰ کون سی نماز ہے

صلوٰۃ وسطیٰ کے بارے میں مفسرین نے مختلف آراء پیش کی ہیں لیکن ہمارے پیش نظر جو قرآن میں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سے مراد نماز ظہر ہی ہے۔ کیونکہ علاوہ اس کے کہ نماز ظہر دن کے وسط اور درمیان میں بجالائی جاتی ہے۔ آیت کی شان نزول بھی گواہی دیتی ہے کہ نماز ظہر کی تاکید اس لیے ہے کہ لوگ گرمی کی وجہ سے اس میں کوتاہی کرتے تھے۔ اس سے قطع نظر کئی ایک روایات میں تصریح کی گئی ہے کہ نماز وسطیٰ سے مراد نماز ظہر ہی ہے سہ

”وَقُومُوا لِلّٰهِ قَانِتِينَ“ : قنوت کے دو معانی ہیں۔

۱۔ پروسی اور اطاعت کرنا۔

۲۔ خشوع و خضوع۔

یہ بھی ممکن ہے کہ بعض اوقات دونوں معانی مراد ہوں جیسا کہ امام مسروق علیہ السلام نے اس جملے کی تفسیر میں دونوں معانی بیان فرمائے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے :

”وَقُومُوا لِلّٰهِ قَانِتِينَ“ — کا مفہوم ہے کہ نماز کو خضوع اور پرہیزگار

کی طرف توجہ کرتے ہوئے بجاؤ۔

ایک اور حدیث میں ہے :

”وَقُومُوا لِلّٰهِ قَانِتِينَ“ یعنی ”مصلعین“ (اطاعت کرتے ہوئے)

فان خفتکم فارجعوا اور کبائنا۔ ”رجعوا“ یہاں ”رجل“ کی جمع ہے جس کا معنی ہے پاپاؤ اور ”کبان“ ”راکب“ کی جمع ہے جس کا معنی ہے سوار۔ یعنی میدان جنگ یا ایسے کسی اور موقع پر خوف کے عالم میں تم پھیل چکے ہو یا ساری حرکت کی حالت میں بھی نماز ادا کر سکتے ہو۔

اس آیت میں تاکید کی گئی ہے کہ سخت ترین حالات حتیٰ کہ جنگ میں نماز کو ترک نہیں کرنا چاہیے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ خطرے کی حالت میں نماز کی بہت سی شرائط ماقبلاً ہو جاتی ہیں مثلاً قیام و ہوتا۔ متعارف اور معمول کے طریقے سے رکوع و سجود بجالانا اور اس قسم کی دیگر چیزیں۔ ایسی حالت میں رکوع و سجود کو اشارے سے بھی بجالایا جاسکتا ہے۔ منقول ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے حکم دیا تھا کہ جب تک جنگ ہوتی رہے ایسا عذر اور اسانے سے نماز پڑھتے رہو۔ سہ

ایک اور حدیث میں ہے :

”ان النبی ﷺ صلی یوم الاحزاب ایما“۔

پیغمبر اکرم نے جنگ احزاب میں شہداء سے نماز پڑھی تھی۔

سہ اس بارے میں مزید تفصیلات کتب فقہ میں ملاحظہ فرمائیے۔ سہ تفسیر نور الثقلین۔



ہام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے پوچھا گیا۔

اگر کوئی شخص کسی درندے کی گرفت میں آجائے اور بالکل حرکت نہ کر سکتا

ہو۔ سب کا وقت بھی تنگ ہو تو اس کی ذمہ داری کیا ہے۔

آپؑ نے فرمایا:۔

جس حالت میں ہے اسی حالت میں نماز پڑھے چاہے تہ کی طرف پشت ہی کیوں نہ ہو۔ سہ

اسے نماز خوف کہتے ہیں۔ فقہ میں اس کے بارے میں فقہاء نے مفصل بحث کی ہے۔

آیت کہتی ہے کہ نماز کا پورا اہرام اور دل بر حالت میں خدا سے مبرا رہا ہے مگر ہر حالت میں خدا سے دل بستگی رہے اور انہی

سے انسان کی اُمید بندھی رہے تاکہ میدان جنگ تک میں نماز اور خدا کی طرف توجہ ترک نہ ہونے پائے۔

ہو سکتا ہے کہ لوگ تصور کریں کہ نماز کے بارے میں اس قدر تاکید اور اصرار ایک طرح کی سخت گیری ہے اور ایسے

حالات میں یہ انسان کو اپنے اہم دماغی ذرائع سے غافل کر سکتی ہے۔ دراصل یہ بہت بڑا اشتباہ ہے کیونکہ عموماً ان حالات میں

انسان ہر چیز سے زیادہ روحانی تقویت کا محتاج ہوتا ہے اور اگر خوف و ہراس، وحشت اور روحانی کمزوری اس پر غالب آ

جائے تو اس کی شکست تقریباً یقینی ہوتی ہے۔ لہذا نماز اور خدا سے رشتہ جوڑنے سے بہتر عمل کونسا ہو سکتا ہے۔

کیونکہ تمام جہان ہمیشہ پر خدا ہی کا حکم کارفرما ہے اور تمام چیزیں اس کے ارادے کے سامنے سہل، معمولی اور آسان ہیں۔ وہ

طاقت رکھتا ہے کہ مجاہد سپاہیوں اور خطرے میں گھرے ہوئے لوگوں کی روح کو تقویت بخشن دے۔

صدر اقل کے بہت سے مجاہدات میں پیش آنے والے شواہد سے قطع نظر یہودیوں سے مسلمانوں کی حالیہ چومتی

جنگ جو اس سال ۱۴۳۱ھ کے ماہ رمضان میں ہوئی کی خبروں پر نظر کریں تو معلوم ہوگا کہ نماز اور احکام اسلام کی طرف توجہ

نے مسلمانوں کو بہت روحانی تقویت بخشی جو دشمنوں پر کامیابی کے لیے بہت مؤثر رہی۔

”فَاِذَا اٰمَنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَالِكٌ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ“

آیت کا یہ حصہ نشاندہی کرتا ہے کہ پیدل چلتے ہوئے اور سواری پر نماز کی ادائیگی حالت خوف و خطر سے مخصوص

ہے اور جب امن و امان قائم ہو جائے اور راحت و آرام میسر آجائے تو پھر عام حالت کی طرح نماز ادا کرنا چاہیئے ”فَاِذَا

اٰمَنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ“۔

اس کے بعد مزید ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تم بہت سی چیزوں کو نہیں جانتے تھے اور خدا نے تمہیں ان کی تعلیم دی

ہے۔ امن اور خوف میں نماز پڑھنے کا طریقہ بھی اس نے تمہیں سکھایا ہے۔ واضح ہے کہ اس تعلیم کا شکر ادا یہی ہے

کہ اس کے مطابق عمل کیا جائے اور جیسا حکم دیا جائے ویسا عمل کیا جائے ”کَمَا عَلَّمَكُمْ مَالِكٌ

تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ“۔

۲۴۔ وَالَّذِيْنَ يَتُوفُّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا وَصِيَّةً لَّا زَوَاجَهُمْ



مَتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرِ اخْرَاجٍ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ
عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَعْرُوفٍ وَاللَّهُ
عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝

ترجمہ

۲۴۰۔ اور تم میں سے جو لوگ آستانہ موت تک جا پہنچتے ہیں اور اپنی بیویاں پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ ان کے لیے وصیت کرنی چاہیے کہ ایک سال تک انہیں زندگی کے اخراجات سے بہرہ مند کریں بشرطیکہ وہ شوہر کے گھر سے باہر نہ نکلیں اور نئی شادی کے لیے اقدام نہ کریں، اور اگر وہ باہر چلی جائیں تو مصارفِ حیات لینے کا حق نہیں رکھتیں لیکن ان پر اس بار سے میں کوئی گناہ ابھی نہیں کر رہا اپنے لیے کوئی شائستہ اقدام کریں اور خدا توانا و حکیم ہے۔

تفسیر

آیت کے پہلے حصے میں حکم دیا گیا ہے کہ وہ لوگ جو موت کے آستانے تک جا پہنچیں اور اپنی بیویاں پیچھے چھوڑ جائیں تو انہیں وصیت کرنا چاہیے کہ ان کے پس ماندگان ایک سال تک ان کے مال سے ان کی بیویوں کے اخراجات ادا کریں۔ اس لیے لفظ ”یتوفون“ مرنے کے معنی میں نہیں بلکہ ذکرِ وصیت کے قرینہ سے موت کے آستانے پر جا پہنچنا مراد ہے البتہ اس شرط کے ساتھ کہ عورت بھی شوہر کی موت کے بعد ایک سال تک اس کے گھر میں رہے اور اس سے باہر نہ نکلے ”غیر اخراج“

”فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ“

یہ جملہ دو معانی پر منطبق ہو سکتا ہے۔

۱۔ عورت کا حق ہے کہ مرد کے وارث ایک سال تک اس کے مصارف ادا کریں لیکن اگر عورت اپنی خوشی سے ایک سال کا خرچ نہ لے اور شوہر کے گھر میں بھی نہ رہے تو پھر کوئی اس کا جواب دہ نہیں ہے اور اگر عورت دوسری شادی کرے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ اس تفسیر کے مطابق آیت میں اجازت دی گئی ہے کہ عورت پہلے سال کے دوران میں نان نفقہ سے صرف نظر کر کے سابق شوہر کے گھر سے چلی جائے۔

۲۔ اگر عورت ایک سال تک صبر کرے اور یہ مدت پوری کرنے کے بعد شوہر کے گھر سے نکلے اور پھر نئی شادی کرے تو کوئی حرج نہیں۔

دوسرے معنی کے مطابق ایک سال تک کی مدت گزارنا عورت پر لازمی ہے دوسرے لفظوں میں ایک سال تک مکمل عدت گزارنا عورت کے لیے حکم کی حیثیت رکھتا ہے نہ کہ یہ اس کا حق ہے جیسا کہ پہلے مفہوم میں ظاہر



ہوتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان میں سے کونسی تفسیر آیت کے مفہوم سے میل کھاتی ہے اور مناسب ہے۔

کیا یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے؟

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ آیت اسی سورہ کی آیت ۲۳۴ کے ذریعے منسوخ ہو گئی ہے۔ اس میں عدتِ وفات چار ماہ اور دس دن معین کی گئی ہے۔ مگر چہ وہ آیت تنظیم اور ترتیب کے اعتبار سے پہلے آئی ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ سورتوں کی آیات کی تنظیم تاریخ نزول کے مطابق نہیں ہے۔ بلکہ بعض اوقات وہ آیات جو بعد میں نازل ہوئی ہیں سورہ کے آخر میں ہیں اور ایسا آیات کی مناسبت کے اعتبار سے کیا گیا ہے اور یہ فرمانِ پیغمبر کے مطابق ہی ہے اس کی وضاحت یہ ہے کہ جیسا آیت ۲۳۴ کی تفسیر میں گزر چکا ہے زمانہ جاہلیت میں عدتِ وفات ایک سال بھی جاتی تھی اور اس مدت میں عورت کے لیے خرافات پر مبنی اور تکلیف دہ رسوم رائج تھیں۔ اسلام نے جاہلیت کی اس رسم کو ختم کر دیا۔ پہلے مدت کو ایک سال کے لیے قرار دیا بعد ازاں اس ایک سال کی مدت کو ختم کر کے چار مہینے اور دس دن کی مدت معین کی اور اس عمرے میں عورت کو صرف زیب و زینت سے منع کیا گیا۔

لیکن آیت کی منسوخی کے بارے میں یہ دلائل قابل قبول نہیں کیونکہ نسخ تو اس وقت ہو سکتا ہے جب ہم آیت کے دوسرے معنی مراد لیں یعنی اس آیت کا مفہوم یہ سمجھیں کہ ایک سال تک گھر سے نہ نکلنا عورت کے ذمے فرض ہے۔ یہ عورت کا حق نہیں ہے۔ اگر یہ مفہوم مراد لیا جائے جب کہ وہ آیت سے بہت زیادہ مناسبت بھی رکھتا ہے تو پھر نسخ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کیونکہ اس آیت میں اخراجات کے حصول اور مکان سے فائدہ اٹھانے کو ایک سال تک کی عدت سے مشروط کر دیا ہے۔ اس میں عورت کو حق دیا گیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو چار ماہ اور دس دن بعد شوہر کے گھر سے چلی جائے اور نئی شادی کرے لہذا اس صورت میں فطری طور پر اس کی زندگی کے مصارف پہلے شوہر کے مال سے منقطع ہو جائیں گے۔

اصطلاح کی رو سے چار ماہ دس دن کی عدت رکھنا عورت کے لیے ایک حکمِ لازمی ہے اور اس میں عورت کا انتخاب کوئی اثر نہیں رکھتا البتہ ایک سال تک اسے جاری رکھنا یہ عورت کا حق ہے اور وہ اس حق سے استفادہ کر سکتی ہے اور یہ عدت اختیار کر کے اپنے لیے اخراجات حاصل کر سکتی ہے اور اسے یہ بھی حق پہنچتا ہے کہ ان سے صرف نظر کر کے شوہر کے گھر سے چلی جائے اور نئی شادی کرے۔

”مَنْ مَّعَرُوفٍ“ یہ تعبیر اس بات کی طرف کو اشارہ ہے کہ عورتیں مجاز ہیں کہ ہر شائستہ اور مناسب اقدام کر سکیں، یہاں اس سے مراد شادی کرنا ہے، اور اس سلسلے میں انہیں مکمل آزادی حاصل ہے۔

”وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيْمٌ“ آیت کے آخر میں اس بناء پر کہ ایسی عورتیں اپنی آئندہ کی زندگی سے پریشان نہ ہوں، ان کی دلجوئی کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے: خدا قادر ہے کہ پہلے شوہر کی وفات کے بعد ان کے لیے کوئی اور راہ کھول دے اور انہیں کوئی مصیبت پہنچی ہے تو اس میں کوئی حکمت تھی۔ خلاصہ یہ کہ اگر خداوند



عالم حکمت کی وجہ سے ایک دروازہ بند کرتا ہے تو اپنے لطف و کرم سے دوسرا کھول دیتا ہے اور پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

- ۲۴۱۔ وَلِلْمُطَلَّاتِ مَتَاعٌ بِالْعَمَرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ○
 ۲۴۲۔ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ○

ترجمہ (شوہر کی طرف سے) تمام مطلقہ عورتوں کو بدیہ دیا جانا مناسب ہے۔ یہ پرہیزگار مردوں پر حق ہے۔
 ۲۴۲۔ اِس طرح خدا اپنی آیات تمہارے سامنے بیان کرتا ہے کہ شاید تم غور و فکر کرو۔

تفسیر

جیسا کہ پہلے اشارہ ہو چکا ہے ایسے مواقع پر متاع سے مراد بدیہ ہے جو مرد عورت کو طلاق کے بعد دیتا ہے۔ یہ آیت احکام طلاق کا خاتمہ ہے ہمیں بھی جذبات انتقام کو زیادہ سے زیادہ ختم کرنے کے لیے اور بغض و کینہ کے خاتمے کے لیے مطلقہ عورتوں کے بارے میں پھر سفارش کی گئی ہے۔ آیت کہتی ہے کہ مردوں کے فرائض میں داخل ہے کہ جب اپنی بیوی کو طلاق دیں تو انہیں بدیہ پیش کریں اور یہ فریضہ تمام پرہیزگار مردوں پر عائد کیا گیا ہے۔ البتہ اس آیت کا ظاہری مفہوم سب عورتوں کے بارے میں ہے لیکن جیسا کہ آیت ۲۳۶ میں کہا جا چکا ہے کہ بدیہ دینا صرف اِس صورت میں واجب ہے کہ حق بہر معین نہ ہوا ہو اور زنجعتی بھی نہ ہوئی ہو۔ اِس بناء پر یہ حکم باقی صورتوں کے لیے مستحب ہوگا۔ دراصل اسلام کا یہ حکم انسانی پہلو کا حامل ہے۔

كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ۔

آیات اور اسلامی روایات کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ عقل کا ذکر زیادہ تر ایسے مواقع پر آتا ہے جہاں فہم و ادراک کا تعلق عواطف و احساسات سے بھی ہوا اور اس کے بعد عقل کا موقع ہو مثلاً قرآن خدا شناسی کے بہت سے مباحث میں اس عجیب و غریب جہان کے نظام کو بیان کرتا ہے اور اس کے بعد کہتا ہے کہ ہم ان آیات اور نشانیوں کو اس لیے بیان کرتے ہیں کہ ”لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ“ (شاید تم تعقل و فکر کرو تو اس سے مقصود یہ نہیں کہ فقط نظام طبیعت کی معلومات کو دماغ میں جگہ دو۔ کیونکہ طبیعی و مادی علوم کے ساتھ دلی اور احساس کا تعلق پیدا نہ ہوا اور خالق کائنات کی محبت، دوستی اور آشنائی میں یہ کام نہ آئیں تو پھر مسائل توحید اور خدا شناسی سے ان کا کوئی ربط نہ ہوگا۔

اِس طرح عملی پہلو رکھنے والی معلومات بھی ہیں۔ ان پر بھی تعقل کا اطلاق اسی صورت میں ہوگا جب وہ عملی پہلو

کی حامل ہوں گی۔

تفسیر المیزان میں ہے کہ تعقل وہاں بولا جاتا ہے جب ان فہم وادراک کے بعد انسان مرحلہ عمل میں داخل ہو۔
وَقَالُوا "لَوْ كُنَّا فَسْخَعًا أَوْ نَعْمَلًا مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ"

اور درختی کہیں گے کہ اگر ہمارے سننے والے کان ہوتے اور تعقل کرتے

تو اہل جہنم کی صف میں نہ ہوتے۔ (حک - ۱۰)

"اَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْاَرْضِ فَتَكُونُ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا"

کیا انہوں نے زمین میں سیر و سیاحت نہیں کی تاکہ اس کے ذریعے

ان کے دل سمجھ لیتے۔

(ج - ۱۴)

ایسی آیات گواہ ہیں کہ اگر مجرم قیامت کے دن دنیا میں تعقل کرنے کی آرزو کریں گے تو اس سے مراد وہ تعقل ہے جس میں عمل شامل ہے۔ اس طرح جب خدا کہتا ہے کہ لوگ سیر و سیاحت کریں اور خود فکر کے ذریعے اور دنیا کی کیفیت و وضیعت کے مطالعے سے کچھ چیزیں سمجھیں تو اس سے مراد بھی ایسا فہم و ادراک ہے جس کی مدد سے اپنا راستہ بدل لیں اور سیدھی راہ پر گامزن ہوں۔

۲۴۳- اَلَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اَلَّذُو

حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوتُوا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ اِنَّ اللّٰهَ

لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنْ اَكْثَرَالنَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝

ترجمہ

۲۴۳- کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو موت کے خوف سے اپنے گھروں سے بھاگ کھڑے

ہوئے اور وہ بناروں افراد تھے جنہوں نے طاعون کی بیماری کا بہانہ کر کے میدان جہاد میں شرکت سے پیو ہتی کی (خدا نے ان سے کہا کہ مر جاؤ) اور جس بیماری کا انہوں نے بہانہ کیا تھا اسی سے وہ مر گئے، خدا نے پھر انہیں زندہ کیا اور ان کی اس زندگی کے واقعے کو آنے والوں کے لیے عبرت قرار دیا، خدا تو اپنے بندوں پر احسان کرتا ہے لیکن زیادہ تر لوگ شکر بجا نہیں لاتے۔

شان نزول

شام کے ایک شہر میں طاعون کی بیماری پیدا ہو گئی۔ بڑی عجیب اور سرسام آور تیزی سے لوگ مرنے لگے کچھ لوگ موت سے بچنے کے لیے وہ شہر اور علاقہ چھوڑ گئے۔ علاقے سے فرار اور موت سے نجات نے ان میں یہ



احساس پیدا کر دیا کہ وہ بہت قدرت و استقلال کے مالک ہیں۔ ارادۃ الہی سے بے پرواہ ہو کر فقط طبعی خواہش پر نظر رکھتے ہوئے وہ غرور اور غریب میں مبتلا ہوئے لہذا پروردگار نے انہیں اسی بیماری کے ذریعے اسی بیماری میں نیست و نابود کر دیا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بیماری دراصل مکافات عمل کا منظر تھی اور منرا کے طور پر آتی تھی کیونکہ ان کے پیشوا اور رہبر نے ان سے جہاد کے لیے شہرستان بھنے کا حکم دیا تو انہوں نے بہانہ کیا کہ جنگی عدالت میں طاعون کی بیماری پھیلی ہوئی ہے اور اس طرح انہوں نے جنگ میں جانے کے حکم سے روگردانی کی۔ اس پر حواریوں کہ جس چیز سے وہ ڈرتے تھے وہ اپنے آپ کو بھانے سے وہ جنگ سے فرار چاہتے تھے انہیں اسی میں مبتلا کر دیا گیا ان میں طاعون کی بیماری پھیل گئی۔ وہ اپنا کھربا پھوڑ کر طاعون سے نجات کے لیے بھاگ کھڑے ہوئے لیکن سب کے سب بیماریاں میں پہنچ کر نابود ہو گئے۔

اس واقعہ کے ایک عربی بعد نبی اسرائیل کے ایک بنی حضرت حزقیل آہن سے گزرے انہوں نے خدا سے خواہش کی کہ انہیں زندہ کر دے۔ خدا نے ان کی دعا قبول کر لی اور وہ دوبارہ زندہ ہو گئے۔

تفسیر

ادبیات عرب کا طریقہ ہے کہ جب کسی مفہوم کو زیادہ مجسم انداز میں پیش کرنا چاہیں اور اس کی بہتر تصویر کشی مطلوب ہو تو "المعتر" استعمال کرتے ہیں یعنی کیا تو نے نہیں دیکھا۔

اس مقام پر بظاہر تو یہ پیغمبر اکرم سے خطاب ہے لیکن درحقیقت یہ سب لوگوں سے فرمایا جا رہا ہے۔ پیغمبر اکرم کی طرف خطاب کا رخ اس تاکید اور زیادہ اہمیت کے پیش نظر ہے۔

"الم تر" کے بعد آیت میں ایک گروہ کی کیفیت بیان کی گئی ہے کہ وہ موت کے ڈر سے اپنے گھر کو چھوڑ گیا اور پھر وہ سب لوگ خدا کے حکم سے مر گئے اور انہیں بھاگ جانے کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ "المعتر الی الذین نخرجوا من دیارہم وہم الوف حذر الصوت فقتل لہم اللہ موتوا....." بات واضح ہے کہ لفظ الوف جس کا معنی ہے ہزاروں۔ یہ یہاں کسی خاص تعداد کی طرف اشارہ نہیں ہے بلکہ اس گروہ کی زیادتی اور کثرت کی طرف اشارہ ہے۔ اسی لیے بعض روایات میں ان کی تعداد دس ہزار اور بعض میں ستر ہزار بیان کی گئی ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ "موتوا" یعنی نہ جاؤ سے اور حکم نقلی نہیں بلکہ خدا کا امر تکوینی ہے جو تمام عالم ہستی اور جہاں حیات پر حکم فرما ہے۔ یعنی خدا نے ان کی موت کے اسباب اہل قایم کیے اور سب کے سب بڑی تیزی سے مر گئے یہ امر اس امر کی طرح ہے۔

"اتمعا امرہ اذا اراد شیئا ان یقول لہ کن فیکون"

اس کا حکم صرف یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کے ہونے کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ فوراً ہو جاتی ہے ایسے ہی ہم "مشرق احیاء" آیت کے اس حصے میں اس گروہ کی موت کے بعد پھر زندگی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے شان نزول میں بیان کیا جا چکا ہے کہ ایسا حضرت حزقیل جو پیغمبر تھے اکی دعا سے ہوا۔

"ان اللہ لئذو فضل علی الناس ولکن اکثر الناس لا یشکرون"

اللہ بعض مخلوقات کے ساتھ رحمت و مہربانی سے یہود حضرت حزقیل کی راہیوں کے پیغمبر رہنا تھے۔



گئے تھے۔ خداوند عالم نے انہیں پھر سے زندہ کیا۔ کوئی واقعہ غیر عادی یا غیر معمولی ہونے کی وجہ سے توجہیہ وقایہ کے قابل سمجھا جاتے تو پھر انبیاء کے تمام معجزات کے ساتھ یہی سوکھ کیا جائے خدا صہ یہ کہ اگر ایسی توجہیات اور تفاسیر کو قرآن کی طرف ٹھیکہا جانے لگا تو انبیاء کے معجزات کے انکار کے علاوہ قرآن کے بہت سے تاریخی مباحث کا انکار کرنا پڑے گا اور انہیں قسمل یا سمبالک (SYMBOLIC) قرار دینا پڑے گا۔ مثلاً اہل وقایل کی سرگزشت کو عدالت و حق کی جستجو اور رسالت و سنگم کی مقابلے کی شکل سمجھا پڑے گا اور اس صورت میں قرآن کے تمام تاریخی مباحث اپنی قد و قیمت کھودیں گے۔ علاوہ ازیں اس تعبیر سے یہ نہیں ہو سکتا کہ اس آیت کی تفسیر میں وارد ہونے والی تمام ہدایات سے چشم پوشی کر لی جائے کیونکہ ان میں سے بعض تو معتبر اسناد سے منقول ہیں اور انہیں جعلی و اسرائیلی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

۳۔ رجعت کی طرف اشارہ : اس آیت میں ایک اور نکتے کی طرف بھی توجہ کرنا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رجعت کا امکان ہے۔ گزشتہ لوگوں کی تاریخ میں ایسے بہت سے افراد ہیں جو مرنے کے بعد دوبارہ اس جہاں میں پلٹ آئے۔ جیسے نبی اسرائیل کی وہ جماعت جس کی طرف زیر بحث آیت میں اشارہ ہوا ہے۔ اس بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ اگر آئندہ کسی دور میں ایسے واقعے کا عاودہ ہو تو اس میں کیا مضائقہ ہے۔ مشہور شیعہ عالم شیخ صدوق نے اسی آیت سے رجعت کے امکان کے سبب پر استدلال کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے عقائد میں سے ایک عقیدہ رجعت ہے البتہ رجعت کا تنازع سے کوئی تعلق نہیں۔ اس سبب کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

۲۴۴۔ وَ قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ○
۲۴۵۔ مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً وَاللَّهُ يَقْبِضُ وَ يَبْصُطُ وَ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ○

ترجمہ

۲۴۴۔ اور راہِ خدا میں جنگ کرو اور جان لو کہ خدا سننے والا جاننے والا ہے۔
۲۴۵۔ کون ہے جو خدا کو قرضِ حسنہ دے (اور اس نے جو مال دیا ہے اس میں سے خرچ کرے) تاکہ خدا اس مال کو اس کے لیے کئی گنا کر دے اور خدا (بندوں کی روزی کو) محدود اور وسیع کرتا ہے (اور خرچ کرنے سے روزی میں کمی نہیں ہوتی) اور اس کی طرف لوٹ جاؤ گے (اور اپنا بدلہ اور جزا پا لو گے)۔



تفسیر

بنی اسرائیل کے بعض لوگوں کی سرگذشت جو گذشتہ آیت میں بیان ہوئی ہے۔ یہ واضح ہو چکا ہے کہ موت و حیات پروردگار کے ہاتھ میں ہے۔ اگر یہ واقعہ نظر میں رہے تو انسان یہ سمجھ سکتا ہے کہ جہاد سے بھاگ جانے اور جنگ میں سستی کرنے سے وہ موت سے نہیں بچ سکتا۔

زیر نظر آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ راہِ خدا میں جہاد کرو اور جان لو کہ خدا نے بزرگ و برتر تمام چیزوں سے باخبر ہے اور تمہارے باطن سے اٹھنے والے علل و اسباب کو جانتا ہے اور جنگ کے بارے میں تمہاری نیتوں سے آگاہ ہے۔ وہ تمہاری ہر گنہگار شے ہے اور کوئی چیز اس کی درگاہ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔

”مَنْ ذَا الَّذِي يَعْصِرُ مِنَ اللَّهِ فَتَرْصَنَّا حَسْبًا“

جیسے معاشرہ اپنے استقلال، پیش رفت اور سرزندگی کے لیے مجاہد و مبارزہ افراد کا محتاج ہے اس طرح عہد و انسانوں کی حمایت، عمومی منافع اور وسائلِ جہاد کے لیے بھی کمک کی ضرورت ہے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن راہِ خدا میں خرچ کرنے کے سلسلے پر خاص طور پر زور دیتا ہے۔

خدا بندوں سے قرض لیتا ہے

یہ امر قابلِ غور ہے کہ قرآن اس آیت میں اور چند دیگر آیات میں اس اجتماعی ذمہ داری کو قرض سے تعبیر کرتا ہے یہ نکتہ نگاہ میں رہے کہ تمام اموال کا حقیقی مالک پروردگار عالم ہے۔ انسان تو صرف منشاءِ خدا ہونے کی حیثیت سے اس میں صرف کرتا ہے۔ البتہ اس سرپرستی اور منشاء گی کی شرط یہ ہے کہ اپنی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کے علاوہ عام لوگوں کی حاجات و ضروریات کو پورا کرنے کے لیے خرچ کرے۔ جیسا کہ سورہ حدید کی آیہ ۷ میں ہے۔

”أَمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَأَنْعَمُوا“

”مَقَامًا جَعَلَ لَكُمْ مَسَاحِلَ فِيهِ“

خدا پر ایمان لے آؤ اور جن اموال میں خدا نے تمہیں

اپنا منافع بنایا ہے ان میں سے خرچ کرو۔

لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود قرآن کہتا ہے کہ اس مادی کمک کو خدا کو قرض دینے کے حساب میں شمار کرو۔ اُس خالقِ کائنات کو قرض دو کہ جس کی طرف سے تمام چیزیں ہیں اور جب واپس لوگے تو کئی گنا ملے گا (”فَيُضَاعَفُهُ لَكُمْ أَضْعَافًا كَثِيرَةً“)

اس سے بندوں پر پروردگار کے انتہائی لطف و کرم کا اظہار ہوتا ہے اور انفاق اور خرچ کرنے کی کمالِ اہمیت اس سے ظاہر ہوتی ہے۔ باوجودیکہ وہی مالک اور بخشش والا ہے۔ پھر بھی اپنے بندوں سے قرض کی خواہش کرتا ہے اور



قرض بھی ایسا کر جس کے ساتھ اس قدر نفع بھی ملے جو جائے یعنی خداوند کریم کا کرم بین اور لطف و عنایت (فیضا عفوہ لہ اضعافاً کثیراً)۔

”اضعاف“ ”ضعف“ : بروزن شعر کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے کسی چیز کو دو برابر یا چند برابر کرنا۔ توجہ رہے کہ ”اضعاف“ جمع ہے ”کثیرۃ“ تاکید کے لیے ہے۔ ”یضعاف“ تاکید مزید کے لیے ہے کیونکہ باعتبار لغت ”فیضا عفوہ“ ”یضعف“ کی نسبت زیادہ تاکید ہے۔ ان تمام امور سے معلوم ہوتا ہے کہ انفاق اور خرچ کرنے کے مقابلے میں خدا تعالیٰ ایک بڑی مقدار عطا فرماتا ہے۔ جیسے ایک مستعین حج کو جب زمین میں ڈالا جاتا ہے اور اس کی آبپری کی جاتی ہے تو نشوونما کے بعد وہ ایک سے بہت زیادہ مقدار میں میسر آتا ہے جیسا کہ آیت ۲۴۱ میں آئے گا۔

”وَاللّٰهُ يَغْنَصُ وَيَبْصُطُ وَالْيَهُ تَرْجَمُونَ“

آیت کے آخر میں یہ جملہ گویا اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ خیال نہ کرنا کہ انفاق اور بخشش تمہارے اموال کو کم کر دیتے ہیں کیونکہ تمہارے سردار نے اس کی وسعت اور محدودیت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہی ہے جو آسمان اور زمین کی برکتوں سے تمہیں مالا مال کر سکتا ہے اور عطا کردہ اموال کی جگہ کئی گنا ثروت تمہیں بخش سکتا ہے۔ بلکہ معاشرتی روابط اور وابستگیوں کے انداز پر نظر کی جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہی عطا کردہ اموال آخر کار تمہاری طرف پلٹ آئیں گے۔

ان تمام چیزوں سے قطع نظر تمہیں بھونا نہیں چاہیے کہ تم نے خدا کی طرف پلٹ جانا ہے اور ایک اور جہان تمہارے آگے ہے جہاں تم اپنے ان انفاق اور معارف کا ثمرہ پاؤ گے۔

۲۴۶۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاۤءِ مِنْ بَنِيۤ اِسْرٰٓءِیْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰی اِذْ قَالُوْا لِنَبِیِّۨ لَہُمْ اَبْعَثْ لَنَا مَلِکًا نُّقَاتِلْ فِیۡ سَبِیْلِ اللّٰهِ قَالَ هَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا قَالُوْا وَمَا لَنَا اَلَّا نُقَاتِلَ فِیۡ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَفَدَّ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَابْنَانَا فَلَمَّا کُتِبَ عَلَیْہِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْہُمْ ۝ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ بِالظَّالِمِیۡنَ ۝

۲۴۷۔ وَقَالَ لَہُمْ نَبِیُّہُمْ اِنَّ اللّٰہَ فَدَّ بَعَثَ لَکُم طٰلُوْتَ

مَلِكًا قَالُوا أَتَىٰ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ
بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِنَ الْعَالِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ
اضْطَفَنَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللَّهُ
يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ٥

٢٣٨- وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِمْ أَن يَأْتِيَهُمُ التَّابُوتُ
فِيهِ سَكِينَةٌ مِّن تَرْتِيمِكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ
هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْعَلَائِكُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ
إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ٥

٢٣٩- فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ
فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَنْ لَّمْ يَلْعَمْهُ فَإِنَّهُ
مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا
قَلِيلًا مِّنْهُمْ فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ
قَالُوا لَاطِقَاتُ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالَ
الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَّاكَوَاللَّهُ لَكُمْ مِنْ فَتْنَةٍ قَلِيلَةٌ
غَلَبَتْ فَتْنَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ٥

٢٤٠- وَلَمَّا بَرَرْنَا وَالْجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا
صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ٥
٢٤١- فَهَزَمُوهُمْ بِإِذْنِ اللَّهِ وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ وَاتَّاهُ اللَّهُ



الْمُلْكِ وَالْحِكْمَةِ وَعَلِمَهُ مَعَايِشَاءُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ
النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَكِنَّ اللَّهَ
ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ○

۲۵۲۔ تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّكَ
لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ○

ترجمہ

۲۴۶۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ بنی اسرائیل کا ایک گروہ موسیٰؑ کے بعد اپنے نبی سے کہنے لگا کہ ہمارے لیے کسی فرمانروا کا انتخاب کر دے تاکہ (اس کی قیادت میں) ہم راہِ خدا میں جنگ کریں۔ ان کے پیغمبر نے کہا کہ ہو سکتا ہے کہ تمہیں جنگ کا حکم دیا جائے تو تم (رو گردانی کرو اور) راہِ خدا میں جہاد نہ کرو۔ انہوں نے کہا کہ کیسے ممکن ہے کہ ہم راہِ خدا میں جنگ نہ کریں جب کہ ہمارے گھر اور اولاد ہم سے چھوٹ چکے ہیں اور ہمارے شہروں پر دشمنوں نے قبضہ کر کے ہماری اولاد کو قید کر لیا ہے، لیکن جب انہیں جنگ کا حکم دیا گیا تو چند لوگوں کے علاوہ سب پھر گئے اور خدا مستکروں کو جانتا ہے۔

۲۴۷۔ ان کے نبی نے ان سے کہا کہ خدا نے طاوت کو تمہاری بادشاہی کے لیے انتخاب کر کے بھیجا ہے۔ وہ کہنے لگے یہ ہم پر کیسے حکومت کر سکتا ہے جب کہ ہم اس سے زیادہ اہل ہیں اور اس کے پاس تو زیادہ دولت و ثروت بھی نہیں ہے اس (نبی) نے کہا کہ اسے خدا نے علم اور جسمانی طاقت میں تم سے برتری کی بنیاد پر منتخب کیا ہے۔ خدا جسے چاہتا ہے اپنا ملک بخش دیتا ہے اور خدا کا احسان وسیع ہے اور وہ لوگوں کی اہلیت سے آگاہ ہے۔

۲۴۸۔ اور ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اس کی حکومت کی نشانی یہ ہے کہ "مندوقِ عبد" تمہاری طرف آئے گا۔ (وہی صندوق کہ جس میں آلِ موسیٰ اور آلِ ہارون کی یادگاریں ہیں جب کہ فرشتوں نے اُسے اٹھا رکھا ہوگا اور اگر تم ایمان رکھتے ہو تو اس میں تمہارے لیے (واضح) نشانی ہے۔

۲۴۹۔ اور جب طاوت بنی اسرائیل کے لشکر کی فرمانروائی کے لیے مقرر ہو گئے اور وہ لشکر کو باہر لے گئے تو ان سے کہا کہ خدا تمہارا پانی کی ایک ہر کے ذریعے امتحان لے گا تو جو لوگ (پاس کے وقت)



اسے پی لیں گے وہ مجھ سے نہیں ہیں اور جو اپنے ہاتھ سے ایک پیالے سے زیادہ نہیں پیئیں گے وہ مجھ سے نہیں چننا افراد کے علاوہ سب نے اس سے پانی پی لیا۔ اس کے بعد وہ اور ان پر ایمان لانے والے (اور امتحان کی کسوٹی میں پورے اترنے والے) نہر سے گزر گئے (اب وہ اپنی تعداد کی کمی پر پریشان ہو گئے) اور ایک گروہ کے لوگ، کہنے لگے آج ہم جالوت اور اس کی فوج سے لڑنے کی طاقت نہیں رکھتے لیکن وہ جو جانتے تھے کہ خدا کی طاقت ہوگی (اور وہ قیامت پر ایمان رکھتے تھے) کہنے لگے کہ کتنے ہی ایسے مقررے لوگ تھے جو حکم خدا سے بڑے بڑے گروہوں پر غالب آئے اور کامیاب ہو گئے اور خدا صابرین (اور استقامت دکھانے والوں) کے ساتھ ہے۔

۲۵۰۔ اور وہ جالوت اور اس کے لشکر کے سامنے ڈٹ گئے تو کہنے لگے پروردگار! ہم پر شکیبائی اور استقامت نازل فرما اور ہمیں ثابت قدم رکھ اور ہمیں کافر قوم پر کامیابی عطا فرما۔

۲۵۱۔ اس کے بعد انہوں نے خدا کے حکم سے دشمن کی فوج کو شکست سے دوچار کر دیا اور داؤد نے جالوت کے لشکر میں قوی اور شجاع نوجوان تھے (جالوت کو قتل کر دیا اور خدا نے انہیں حکومت اور علم و دانش عطا فرمائی اور جو کچھ اُس اللہ نے چاہا انہیں تعلیم دی اور اگر خدا بعض لوگوں کے ذریعے بعض کو دفع نہ کرے تو زمین فساد سے بھر جائے لیکن خدا تمام جہانوں پر لطف و احسان کرنے والا ہے۔

۲۵۲۔ یہ خدا کی آیات ہیں جو ہم حق کے ساتھ تم پر پڑھتے ہیں اور تم مرسلین میں سے ہو۔

تفسیر

خدا نے بزرگ و بزرگان آیات میں ایک عبرتناک واقعہ بیان کرتا ہے۔ اس میں بنی اسرائیل کے ایک گروہ کی سرگذشت بیان کی گئی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد وقوع پذیر ہوئی۔ جہاد اور حریم دین خدا یعنی حریم انسانیت کے دفاع کا یہ تذکرہ مسلمانوں کی عبرت کے لیے ہے۔ آیات کی تفسیر سے قبل ہم اس داستان کو بیان کرتے ہیں۔

ایک عبرت خیز واقعہ

اہل فرعون کے زیر اثر رہ کر بنی اسرائیل کمزور و ناتواں ہو چکے تھے۔ حضرت موسیٰ کی دانشمندانہ رہبری کے نتیجے میں انہیں اس افسوسناک حالت سے نجات ملی اور انہوں نے قسمت و عظمت حاصل کر لی۔

اس پیغمبر کی برکت سے خدا تعالیٰ نے انہیں بہت سی نعمات سے نوازا۔ ان نعمات میں سے ایک صندوق عہد بھی تھا۔ یہودی اپنے لشکر کے آگے اُسے اٹھانے دیتے تھے۔ اس سے من میں ایک طرح کا سکون قلب اور روحانی طاقت پیدا ہوتی تھی۔

بنی اسرائیل کو یہ قسمت و عظمت حضرت موسیٰ کے بعد ایک مدت تک حاصل رہی لیکن یہی کامیابیاں اور نعمتیں رفتہ رفتہ ان کے غرور و تکبر کا باعث بن گئیں اور وہ قانون شکنی کرنے لگے۔ اس کے نتیجے میں بنی اسرائیل کے ہاتھوں شکست

ملے بہت جلد صندوق عہد اس کی تار پھٹ اور اس میں موجود چیزوں کے بارے میں بحث کرنے لگے۔



اٹھنا پڑی۔ وہ اپنی قدرت و عظمت کھو بیٹھے اور صندوقِ عہد بھی ہاتھ سے گنوا بیٹھے۔ پھر اس قدر پرالٹندی اور اختلاف کا شکار ہوئے کہ چھوٹے سے چھوٹے دشمنوں سے بھی وفائے کے قابل نہ رہے یہاں تک کہ دشمنوں نے ان کے بہت سے لوگوں کو ان کی سرزمین سے نکال دیا اور ان کی اولاد کو غلام اور قیدی بنالیا۔ کئی برس تک یہ کیفیت رہی یہاں تک کہ خداوند عالم نے ان کی نجات اور ارشاد و ہدایت کے لیے حضرت اشموئیل کو پیغمبر بنا کر مبعوث فرمایا۔ بنی اسرائیل بھی دشمنوں کے ظلم و جور سے تنگ آچکے تھے اور کسی پناہ گاہ کی تلاش میں تھے لہذا ان کے گرد جمع ہو گئے اور ان سے خواہش کی کہ وہ ان کے لیے کوئی رہبر اور امیر مقرر کر دیں تاکہ وہ اس کی قیادت میں ہمہ آواز اور ایک جہن موکر دشمن سے جنگ کریں اور عزت و رتہ بھال ہو سکے۔ اشموئیل ان کی امداد فی کیفیت اور سست ہمتی سے پوری طرح واقف تھے۔ انہوں نے کہا۔

مجھے ڈر ہے کہ جب ہمہ آواز کے حکم آئے تو تم کہیں امیر و رہبر کے حکم سے روگردانی نہ کرو اور دشمن سے مقابلے اور جنگ سے پہلو تہی نہ کرو۔

وہ کہنے لگے

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم امیر کے حکم سے منہ پھیر لیں اور اپنی ذمہ داری نبھانے سے دریغ کریں حالانکہ دشمن ہمیں ہمارے وطن سے نکال چکا ہے۔ ہماری زمینوں پر قبضہ کر چکا ہے اور ہماری اولاد کو قیدی بنا کر لے گیا ہے۔

حضرت اشموئیل نے دیکھا کہ وہ اپنی بیماری کی تشنیں کر چکے ہیں اور اب انہیں ایک حبیب کی ضرورت ہے۔ گویا وہ اپنی پس ماندگی کے راز سے واقف ہو چکے ہیں۔ اس پر حضرت اشموئیل نے بارگاہِ الہی کا رخ کیا اور قوم کی خواہش کو اس کے حضور پیش کیا۔ وحی ہوئی:

”میں نے طاوت کو ان کی سربراہی کے لیے منتخب کیا ہے“

حضرت اشموئیل نے عرض کیا:

خداوند! میں نے ابھی تک طاوت کو دیکھا ہے نہ اسے پہچانتا ہوں

ارشاد ہوا:

ہم اسے تہادی طرف بھیجیں گے۔ جب وہ تہارے پاس آئے تو فوج کی کمان اُس کے حوالے کر دینا اور علم جب اس کے ہاتھ میں دے دینا

طاوت کون تھے

طاوت ایک بلند قامت، تنومند و خوبصورت مرد تھے۔ وہ مضبوط اور قوی اعصاب کے مالک تھے۔ روحانی طور پر بھی بہت ہی زیرک، دانشمند اور صاحبِ تدبیر تھے۔ بعض لوگوں نے اُن کے نام ”طاوت“ کو بھی اُن کے طولانی قد کا سبب قرار دیا ہے۔



ان تمام صفات کے باوجود وہ مشہور نہیں تھے۔ اپنے والد کے ساتھ دریا کے کنارے ایک بستی میں رہتے تھے والد کے چوپایوں کو چراتے اور زراعت کرتے تھے۔

ایک دن کچھ جانور بیابان میں گم ہو گئے۔ طاوت اپنے ایک دوست کے ساتھ ان کی تلاش میں کئی دن تک سرگرداں رہے۔ انہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ شہر صوف کے قریب پہنچ گئے۔

ان کے دوست نے کہا: 'ہم تو شموئیل کے شہر صوف میں آپہنچے ہیں۔ آئیے ان کے پاس چلتے ہیں۔ شاید وہی کے سامنے میں اور ان کی راستے کی روشنی میں ہیں کچھ پتہ چل سکے۔

شہر میں داخل ہونے تو حضرت شموئیل سے ملاقات ہو گئی۔ جب شموئیل اور طاوت نے ایک دوسرے کو دیکھا تو یوں لگے۔ شموئیل نے اسی لمحے طاوت کو پہچان لیا۔ وہ جان گئے کہ یہ وہی نوجوان ہے جسے خدا نے ان لوگوں کی قیادت کے لیے منتخب کیا ہے۔

طاوت نے اپنی کہانی سنائی تو شموئیل کہنے لگے: 'وہ چوپائے تو اس وقت مٹا رہی بستی کی راہ پر ہیں اور تبار سے باپ کے باغ کی طرف جا رہے ہیں۔ ان کے بارے میں فکر نہ کرو۔ میں تمہیں اس سے کہیں نبی کے کام کے لیے دعوت دیتا ہوں۔ خدا نے تمہیں بنی اسرائیل کی نجات کے لیے مامور کیا ہے۔

طاوت پہلے تو اس پر درگزر پر حیران ہوئے اور پھر اسے سعادت سمجھتے ہوئے قبول کر لیا۔ شموئیل نے اپنی قوم سے کہا:

خدا نے طاوت کو تمہاری قیادت سونپی ہے لہذا ضروری ہے کہ تم سب اس کی پیروی کرو۔ اب اپنے تیش دشمن سے مقابلے کے لیے تیار کرو۔

بنی اسرائیل کے نزدیک تو حب و نسب اور ثروت کے حوالے سے کئی خصوصیات فرمانروا کے لیے ضروری تھیں اور ان میں سے کوئی چیز بھی طاوت میں دکھائی نہ دیتی تھی اس انتخاب و تقرر پر وہ بہت حیران و پریشان ہو گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ ان کے عقیدے کے برخلاف وہ نہ تو لادی کی اولاد میں سے تھے جن میں سے بنی ہوتے تھے، نہ یوسف اور یعقوب کے خاندان سے تھے جو گذشتہ زمانے میں حکمرانی کرتے تھے بلکہ ان کا تعلق تو بنیامین کے گنام خاندان سے تھا اور پھر وہ مالی طور پر بھی تہی دست تھے۔

انہوں نے اعتراض کیا: 'وہ کیسے حکومت کر سکتا ہے جبکہ ہم اس سے زیادہ حقدار ہیں۔

شموئیل سمجھتے تھے کہ یہ بہت اشتباہ کر رہے ہیں۔ کہنے لگے: 'انہیں خدا نے تم پر امیر مقرر کیا ہے نیز قیادت کے لیے ان کی اہمیت اور لیاقت کی دلیل یہ ہے کہ وہ جسمانی طور پر زیادہ طاقتور ہیں اور روحانی طاقت میں بھی سب سے بڑھ کر ہیں۔ اس لحاظ سے وہ تم سب پر برتری رکھتے ہیں۔

بنی اسرائیل نے خدا کی طرف سے اس کے تقرر کے لیے کسی نشانی یا علامت کا مطالبہ کر لیا۔ اس پر شموئیل بڑے انبیاء بنی اسرائیل کی جہاد گارانتا بوقت دمندوق عہد جو جنگ میں تبار سے لیے اہمیت اور ولوںے کا باعث تھا تبار سے



پاس لوٹ آئے گا اور اسے قہار سے آگے لے گئے چند فرشتوں نے غار کھا ہوگا۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ مسند وق عبدان کے سامنے آیا۔ یہ نشانی دیکھ کر انہوں نے طاوت کی سربراہی قبول کر لی۔

طاوت نے ملک کی باگ ڈور سنبھال لی

طاوت نے لشکر کی قیادت کا بیڑا اٹھایا۔ انہوں نے تھوڑی ہی مدت میں امور سلطنت کی انہام دہی اور فوج کی تنظیم نو کے سلسلے میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ پھر آپ نے فوج کو دشمن سے مقابلہ کی دعوت دی۔ دشمن نے ان کی ہر چیز کو خطرے سے دو چار کر رکھا تھا۔

طاوت نے تاکید کرتے ہوئے کہا: میرے ساتھ وہ لوگ چلیں جن کی ساری توجہ جہاد پر مرکوز رہ سکے۔ جن کی صحت ناقص ہو اور جو درمیان ہی میں ہمت ہار بیٹھنے والے ہوں، اس جنگ میں شرکت نہ کریں۔

بہت جلد ظاہراً ایک کثیر تعداد اور طاقتور فوج جمع ہو گئی اور وہ دشمن کی طرف چل پڑے۔

سورج کی پیش تھی۔ گرمی میں چلتے چلتے انہیں سخت پیاس لگ گئی۔ طاوت خدائے حکم سے انہیں آزمانا چاہتے تھے اور ان کی تطہیر بھی کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے کہا: جلد تباہی دہانے میں ایک نبر آئے گی، اس کے ذریعے خدا تمہارا امتحان لے گا۔ جو لوگ اس میں سے سیر ہو کر پانی پیئیں گے ان کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں البتہ جو تھوڑا سا پانی پیئیں گے وہ میرے ساتھی ہیں۔ ان کی نظر نبر پر پڑی تو بہت خوش ہوئے۔ جلدی سے وہاں پہنچے۔ خوب سیر ہو کر پانی پیا۔ تھوڑے سے فوجی اپنے عہد و پیمان پر قائم رہے۔

طاوت نے دیکھا کہ ان کی فوج کی اکثریت بے ارادہ اور کمزور عہد و پیمان کی حامل ہے اور اس میں تھوڑے سے صاحب ایمان افراد موجود ہیں۔ انہوں نے بے قاعدہ اور نا فرمان اکثریت کو چھوڑ دیا اور انہی کہ تعداد صاحب ایمان کو ساتھ لیا اور شہر سے گزر کر میدان جہاد کی طرف پیش قدمی جاری رکھی۔

طاوت کی فوج نے اپنی کم تعداد دیکھی تو پریشان اور دشت زدہ ہوئی۔ فرجیوں نے ان سے کہا: ہم میں تو اس طاقتور فوج کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں ہے۔ لیکن کچھ ایسے بھی تھے جن کا دل خدا کی محبت سے معمور تھا وہ دشمن کی فوجی کثرت و قوت اور اپنی تھوڑی تعداد پر ہراساں نہ ہوئے اور بکمال شجاعت سے طاوت سے کہنے لگے: آپ جو مصیبت سمجھتے ہیں حکم دیجیے۔ ہم ہر مقام پر آپ کا ساتھ دیں گے اور انشاء اللہ کم تعداد کے باوجود دشمن سے جہاد کریں گے کیونکہ یہ تو کتنی مرتبہ ہو چکا ہے کہ کم تعداد خدا کے ارادہ و مشیت کے منہائے کثیر تعداد پر غالب آئی ہے اور خدا انتقامت و پامردی دکھانے والوں کے ساتھ ہے۔ طاوت ان کہ تعداد اہل ایمان مجاہدین کے ساتھ آمادہ کار زار ہوئے۔ ان لوگوں نے درگاہ الہی سے مشکبانی اور کامیابی کی دعا کی۔

جنگ کی آگ بھڑک اٹھی۔ طاوت اپنا لشکر سے کمر باندھا۔ لشکروں کے مابین مبارزہ طبعی ہوئی۔ اس کی باز عیب پکار نے دلوں کو مرزادیا۔ میدان میں جانے کی جرأت کسی میں نہ رہی۔ داؤد ایک کم سن نوجوان تھا۔ شاید وہ جنگ کے لیے بھی



میدان میں نہ آیا تھا بلکہ اپنے جنگجو ترے بھائیوں اور باپ کی خدمت کے لیے چلا آیا تھا لیکن چاک و چوبند اور قوی تھا۔ غلہ خن اس کے ہاتھ میں تھی اس کے ذریعے اس نے دو پتھر ایسے مابرز انداز میں پھینکے کہ ٹھیک جاوت کی پیشانی اور سر میں چوست ہو گئے۔ اس کے سپاہیوں پر وحشت اور تعجب کا غام غامی تھا۔ وہ ان کے درمیان گرا اور مر گیا۔ جاوت کے قتل سے اس کی فوج میں عجیب خوف و ہراس پیدا ہو گیا۔ جاوت کا لشکر بھاگ کھڑا ہوا اور بنی اسرائیل کا سیلاب و کامران ہو گئے۔ سنہ

”السر متر الحی الصلۃ من بنی اسرائیل.....“

نعت میں ”علاء“ اس چیز کو کہتے ہیں جس سے آنکھ بھر جانے اور دیکھنے والے کے تعجب کو بڑھانے کے لیے اس نے ذیلہ جمعیت کو جو ہم رائے اور ہم عقیدہ ہو ”علاء“ کہتے ہیں۔ نیز ہر قوم و ملت کے اشراف اور بزرگوں کو بھی علاء کہتے ہیں کیونکہ وہ ایک خاص مقام و منزلت کے حامل ہونے کی وجہ سے دیکھنے والے کی آنکھ کو بھر دیتے ہیں۔

جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے یہ آیت بنی اسرائیل کی ایک بڑی جمعیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ان لوگوں نے بیک آواز اپنے پیغمبر سے امیر و سربراہ کا تقاضا کیا تاکہ اس کی قیادت میں جاوت کا مقابلہ کر سکیں جس نے ان کی دینی، اجتماعی اور اقتصادی معیشت کو معرض خطر میں ڈال رکھا تھا۔ یہ واقعہ حضرت موسیٰ کے بعد رونما ہوا۔

”ف سبیل اللہ“

بنی اسرائیل اس دشمن کے تجاوز اور زیادتی سے نجات چاہتے تھے جس نے انہیں ان کی سرزمین سے نکال دیا تھا۔ اس کے لیے وہ آمادۂ جنگ تھے۔ اس کے باوجود اس پر دو گرام کو ”فی سبیل اللہ“ قرار دیا گیا تھا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ جو چیز انسانوں کی آزادی، علم کی سرکوبی اور تجاوز سے نجات کے لیے مددگار ثابت ہو سکے وہ ”فی سبیل اللہ“ میں شمار ہوتی ہے۔

”قال هل حسيت ان كتب عليكم القتال الا قتالوا“

ان کے پیغمبر چونکہ ان کی سستی و کاہلی سے واقف تھے اس لیے کہنے لگے، ممکن ہے جب تمہیں جہاد کا حکم دیا جائے تو تم عمل نہ کرو۔

”قالوا وما لنا الا نقاتل في سبيل الله وقد اخرجنا من ديارنا وابناشنا“

وہ کہنے لگے، یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم دشمن کے ساتھ جنگ سے روگردانی کریں۔ حالانکہ اُس نے ہمیں ہمارے شہر سے باہر نکال دیا ہے اور ہمارے بچوں کو ہم سے جدا کر دیا ہے۔

اسی طرح اُن سے یہ بیان و فاداری دیا گیا لیکن خدا کا نام اس کا فرمان۔ اپنے وجود اور استقلال کی حفاظت کا تقاضا اور اولاد کی آزادی کی خواہش کوئی چیز بھی انہیں عہد شکنی سے نہ روک سکی۔ اس لیے قرآن نے ساتھ ہی یہ فرمایا ہے:

”فلما كتب عليهم القتال تولوا الا قليلا منهم“

یعنی جب اُن پر جہاد فرض ہوا تو تنہا سے افراد کے علاوہ سب لوگ روگرداں ہو گئے اور اُن کے قائد نے ایک قبیل سی فوج لے کر جنگ کے عظیم میدان میں شرکت کی۔



”وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالْظَّالِمِيْنَ“

خدا ان ظالموں کو جانتا ہے جنہوں نے اپنے آپ پر معاشرے پر، گنہگاروں پر اور اپنی اولاد پر ظلم کیا ہے۔ ان کے حسب حال سزا اب ان کا انتقام کر رہی ہے۔

”وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اِلٰهَكُمْ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا“

اس آیت کے مطابق بنی اسرائیل کے لشکر کی بادشاہی اور سربراہی کے لیے خدا تعالیٰ نے طالت کو منتخب کیا تھا اور شاید ”بعث“ کا لفظ اسی طرف اشارہ ہو جو کچھ اس واقعہ کی تفصیل میں بیان کیا گیا ہے یعنی غیر متوقع صورت حال کی وجہ سے طالت بنی اسرائیل کی مجلس تک پہنچے۔

ضمنی طور پر آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ طالت فقط لشکر کے کمانڈر ہی نہ تھے، ملک کے حکمران بھی تھے

”فَتَنَّاوْا اِيَّكَ يَكُوْنُ لَكَ الْمَلِكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَسْقٰ بِالْمَلِكِ مِنْهُ

وَلَهُ يَوْمًا سَعْدَةٌ مِّنَ الْحَالِ“

بنی اسرائیل کی طرف سے یہ پہلی عید گنتی ہے کہ انہوں نے اپنے پیغمبر کے سامنے طالت کے انتخاب کے بارے میں اعتراض کیا۔ حالانکہ وہ تصریح کر چکے تھے کہ یہ چناؤ خدا کی طرف سے ہے لیکن وہ خدا کے انتخاب پر اعتراض کرنے سے جی نہ چو کے اور کہنے لگے: ہم اس سے زیادہ حق دار ہیں کیونکہ عالی نسب اور افراد دولت تو ہمارے پاس ہے جو حکمرانی کی دولاہمی شریں ہیں۔

جیسا کہ ہم اس واقعہ کی تفصیل میں دیکھ چکے ہیں کہ طالت بنی اسرائیل کے ایک گمنام قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور مالی طور پر ایک عام زراعت پیشہ شخص سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے۔

قیادت کی شرائط

اس زمانے کے پیغمبر نے معتزین کو جو دندن شکن جواب دیا قرآن نے اسے یوں بیان کیا ہے: خدا نے اُسے تم پر حکمرانی کی خاطر اس لیے چنا ہے کہ وہ دانائی و مردانگی اور علم سے مالا مال ہے اور جسمانی طاقت کے لحاظ سے قوی اور صاحب قدرت ہے۔ یعنی تم، اشتباہ کا شکار ہو اور رہبری کی بنیادی شرائط کو سمجھنے سے بیٹے ہو۔

اس طرح قرآن نے قیادت کے لیے پیش کردہ ان کی شرائط کی نفی کر دی کیونکہ ان کی پیش کردہ دونوں شرائط میں سے کوئی بھی حقیقی امتیاز اور خصوصیت نہیں کہلا سکتی۔ آباؤ اجداد کی شخصیت اور دولت و ثروت دونوں اعتباری اور خارج ذات امتیازات ہیں۔ لیکن علم و دانش اور جسمانی طاقت ذات میں داخل امتیازات اور خصوصیات ہیں۔

پھر اپنے علم و دانش سے معاشرے کے لیے راہ سعادت کی نشاندہی کرتا ہے اور اس کے لیے اصول بتاتا ہے نیز اپنی طاقت و قوت کے ذریعے اس کے جبار کا اہتمام بھی کرتا ہے، اسی لیے تو فرمایا گیا ہے: ”اِنَّ اِلٰهَكُمْ اَصْبَحَ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِزِّ وَالْجَسَدِ“



”بسطۃ“ جس کا معنی ”وسعت“ ہے انسانی طور پر علم و قدرت کے سامنے میں انسانی وجود کی وسعت کی طرف اشارہ ہے یعنی علم و دانش اور فرزانی نیز جسمانی قدرت و طاقت وجود و ہستی کے اعتبار سے انسان میں وسعت پیدا کرتی ہے اور جوں جوں یہ صفات وسیع ہوتی ہیں وجود ہستی میں بھی وسعت پیدا ہوتی رہتی ہے۔
 ”وَاللّٰهُ يُوَفِّقُ مَلِكًا مِّنْ يَّشَاءُ“

ممکن ہے یہ جہد ربیری کی تیسری شہ کی طرف اشارہ ہو جو یہ ہے کہ ربیر کے لیے مختلف اسباب و ذرائع کی فراہمی بھی درکار ہے کیونکہ ممکن ہے ربیر علم و قدرت سے تو کاغذ و مال ہو لیکن اس کا سابقہ ایسے حالات و اوقات سے ہو جو اس کے مقدس مقاصد کے لیے سازگار نہ ہوں۔ یہ طے شدہ بات ہے کہ ایسی ربیری واضح کامیابی حاصل نہیں کر سکتی۔ قرآن کہتا ہے کہ حکومت الہی جسے خدا چاہتا ہے بخش دیتا ہے یعنی اس ماحول کے لیے جو وسائل و ذرائع ضروری ہوں وہ اس کے لیے فراہم کر دیتا ہے۔
 ”وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ“

یعنی خدا ایک وسیع اور لامتناہی ہستی ہے۔ اس کا فضل اور بخشش بھی اس کے وجود کی طرح لامتناہی ہے لیکن وہ عظیم ہے اور جانتا ہے کہ کون سا منصب کسے بخش جانا چاہیے۔

”وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مَلِكِهِ اَنْ يَّاْتِيَكُمْ التَّابُوتُ“

یہ آیت نشاندہی کرتی ہے کہ بنی اسرائیل ابھی تک خدا کی طرف سے طاوت کی ماموریت پر مطمئن نہیں ہوئے تھے مگر اُن کے پیغمبر اشوشیل تصریح کر چکے تھے کہ وہ اس کام کے لیے خدا کی طرف سے مامور ہوئے ہیں۔ انہوں نے اس کی نشانی اور دلیل کا تقاضا کیا۔ جواب میں اشوشیل نے کہا: طاوت کے مامور من اللہ جو نے کی نشانی یہ ہے کہ تابوت (مندوق عہد) تباری طرف آئے گا۔

یہ بات بنی اسرائیل کے لیے کافی ہونا چاہیے تھی۔ بہر حال اب دیکھتے ہیں تابوت کیا چیز تھی۔

تابوت کیا ہے

”تابوت“ کا لغوی معنی ہے وہ صندوق جسے گڑی سے بنایا جائے۔ جہاز سے کے صندوق کو بھی اسی سے تابوت کہتے ہیں لیکن تابوت مردوں سے مخصوص نہیں بلکہ ہر قسم کے گڑی کے صندوق کے لیے مستعمل ہے۔

بنی اسرائیل کا تابوت یا صندوق عہد کیا تھا، وہ کس کے ہاتھ سے بنا تھا اور اس میں کیا چیزیں موجود تھیں۔ اس سلسلے میں ہماری روایات و تفاسیر میں اور اس طرح ”عہد قدیم“ (تورات) میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ سب سے زیادہ واضح چیز جو احادیث اہل بیت اور بعض مفسرین مثلاً ابن عباس سے منقول ہے یہ ہے کہ یہ تابوت وہی صندوق تھا جس میں حضرت موسیٰ کی والدہ نے انہیں پیش کر دیا میں پھینکا تھا۔ فرعون کے کارندوں نے اسے دریا میں سے پکڑ لیا۔ حضرت موسیٰ کو اس میں سے نکال لیا گیا اور صندوق جون کاتر فرعون کے پاس محفوظ کر لیا گیا۔ بعد ازاں وہ بنی اسرائیل کے ہاتھ آیا تو وہ اس عجیب صندوق کو ختم شمار کرنے لگے اور اسے متبرک سمجھنے لگے۔



حضرت موسیٰ نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں وہ الواح مقدسہ جن پر احکام خدا لکھے ہوئے تھے اس میں رکھ دیں۔ نیز اپنی زردہ اور دوسری یادگار چیزوں کا بھی اس میں اضافہ کر دیا۔ صندوقِ آپ نے اپنے دمی حضرت یوشع بن نوح کے سپرد کر دیا۔ یوں صندوق کی اہمیت بنی اسرائیل کی نگاہ میں اور بڑھ گئی۔ لہذا وہ دشمنوں کے ساتھ جنگوں میں اسے ہمراہ لے جاتے اور اس کا ان پر نفسیاتی اور روحانی طور پر بہت اثر جوتا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ جب تک وہ دل انگیز صندوق ان مقدس چیزوں کے سمیت ان کے ساتھ رہا وہ سر بلند رہے اور آبرو مندانہ زندگی بسر کرتے۔ یہ یکن رفتہ رفتہ ان کی دینی بنیادیں کمزور پڑ گئیں اور دشمن ان پر غلبہ حاصل کرتے رہے۔ وہ صندوق بھی ان سے چھین گیا۔

ان آیات کے مطابق حضرت اشموئیل نے ان سے وعدہ کیا کہ عنقریب صندوقِ عہد ان کے قول کی سچائی کا مظہر بن کر واپس آ جائے گا۔

”فیه سکینتہ من تربتکم وبقیۃ مفا ترک الی موسیٰ وال ہزرون“

اس جملے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں صندوقِ عہد وہ ایسے تبرکات تھے جو حوادث کے موقع پر بنی اسرائیل کے لیے اطمینان بخش تھے اور معنوی و نفسیاتی اثرات کے حامل تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بعد ازاں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کے خاندان کی کچھ یادگاریں بھی اس میں رکھ دی گئی تھیں۔

توجہ رہے کہ ”سکینتہ“ سکون کے مادہ سے ہے اور تسکین و آرام کے معنی میں مستقل ہے۔ یہاں اس سے مراد جان و دل کا سکون اور اطمینان ہے۔

حضرت اشموئیل نے بنی اسرائیل کو یہ بات دل نشین کرانی کہ صندوقِ عہد دوبارہ انہیں مل جائے گا اور جو سکون اور اطمینان وہ کھو بیٹھے ہیں دوبارہ حاصل کریں گے۔ معنوی و تاریخی پیوستہ کے حامل اس صندوق کی اہمیت دراصل بنی اسرائیل کے لیے ایک پرچم اور شعار سے بڑھ کر تھی۔ اسے دیکھ کر ان کی تلووں میں دینی غفلت رفتہ رفتہ تازہ ہو جاتی تھی۔ حضرت اشموئیل نے خبر دی کہ وہ صندوق لوٹ آئے گا۔ فوری اس لیے کہ یہ بنی اسرائیل کے لیے ایک بہت بڑی بشارت تھی۔

تَجَلَّی الْمَلٰٓئِکَةُ فَرِشَتُوں نے اُسے اُٹھا رکھا ہوگا

فرشتے صندوقِ عہد کیسے لائے؟ اس سے میں مفسرین نے مختلف باتیں کی ہیں۔ ان میں سے زیادہ واضح تواریخ کے حوالے سے یہ ہے کہ جب صندوقِ عہد فلسطین کے بت پرستوں کے ہاتھ لگا اور وہ اسے اپنے بت خانے میں لے گئے اس کے بعد وہ بہت سی ٹیجیستوں اور بتوں کا شکار ہو گئے تو ان میں سے بعض کہنے لگے کہ یہ سب کچھ صندوقِ عہد کے آثار ہیں۔ لہذا انہوں نے سٹے کر دیا کہ اسے اپنے شہر اور علاقے سے باہر بھیج دیں گے۔ کوئی شخص اسے باہر لے جانے کو تیار نہ ہوا۔ مجبوراً وہ بیل جو تھے گئے اور صندوقِ عہد کو بازندہ کر سلیوں کو سیلابان میں جا کر چھوڑ دیا گیا۔ اتفاق سے یہ واقعہ ٹیکس اس وقت رونما ہوا جب حالات کو بنی اسرائیل کا فرمانروا بنایا گیا۔

خدا کے فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ان دو بیسیوں کو اشموئیل کے شہر کی طرف ٹانگ کر لے جائیں۔ بنی اسرائیل نے



صندوق عہد کو دیکھا تو اسے طاوت کے خدا کی طرف سے مامور ہونے کی نشانی کے طور پر قبول کر لیا۔ اس لیے ظاہراً تو وہ یسے شہر میں لائے لیکن درحقیقت یہ کام خدائی فرشتوں کی وجہ سے انجام پذیر ہوا اسی وجہ سے صندوق اٹھانے کی نسبت فرشتوں کی طرف دی گئی ہے۔ اصولی طور پر فرشتہ اور ملک قرآن حکیم اور روایات میں ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے، اس مفہوم میں روحانی عقل رکھنے والے موجودات کے علاوہ اس جہان کی مخفی قوتوں کا ایک سلسلہ بھی شامل ہے۔

”اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّكُلِّ اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسِيْنًا“

آیت کے آخر میں بنی اسرائیل کو یاد دہانی کرائی گئی ہے کہ صندوق عہد کی بقا سے پاس واپسی تمہارے لیے ایک واضح نشانی ہے بشرطیکہ تم ایماندار بنو۔ حقیقت میں یہ جلد اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس روشنی اور نشانی کے باوجود تم میں ایسے افراد ہیں جو حق کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کریں گے۔ اس ذائقے کے آخر میں یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔

”فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهُ عَتَىٰ اِلَآءَ مَنْ اٰغْتَرَفَ

غُرْفَةً بِيَدِهِ فَشَرَبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ“

”فصل“ کا معنی ہے ”علف دہونا“ اور ”قطع ہونا“۔ ”جُنُود“ ”جُند“ کی جمع ہے جنہ و اصل ایسی زمین کو کہتے ہیں جو بڑے بڑے پھروں سے بھری ہو، تاہم ہر گزرنے والی اور آنکھوں میں کھینے والی چیز کے لیے بھی یہ لفظ مستعمل ہے۔ اسی لیے عموماً شکر کی شرت واد کو جند کہتے ہیں۔

یہ بات وضاحت کی محتاج نہیں کہ ہر گزرو کی لاسیابی نہ میر اور گندش کے حکم کے مطابق فوج کے نغم و ضبا اور ایمان کی مرہون منت ہے۔

مگر فوجی اپنے کمانڈر کی تابیت اور حکم پر ایمان رکھتے ہوں تو اپنی ذمہ داری کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کرتے۔ طاوت جو بنی اسرائیل کو جہاد کے لیے لے جا رہا ہے ان کے لیے یہ جاننا ضروری تھا کہ ان کے اہل لشکر ان کے حکم کی کتنی اطاعت کرتے ہیں۔ خصوصاً جب کہ یہ وہ لشکر تھا جس نے تردد اور ہردلی سے ان کی قیادت قبول کی تھی۔ اگرچہ وہ ظاہراً ان کی رہبری کو تسلیم کر چکے تھے لیکن اس بات کا امکان تھا کہ وہ فطرتاً ابھی شک و تردد کے عالم میں ہوں۔ لہذا فرمان الہی کے ذریعے انہیں حکم دیا گیا کہ انہیں آزمائشیں اس پر طاوت نے خبر دی کہ بہت جلد ایک شہر آئے گی۔ ساتھ ہی ان سے کہہ دیا گیا کہ وہ پیاس کا مقابلہ کریں اور تھوڑا سا پانی پیئیں تاکہ واضح ہو جائے کہ دشمن کی شمشیر آتش بار کے مقابلے میں جانے والا لشکر پیاس کو برداشت کرنے کی سکت رکھتا ہے یا نہیں۔

اس واقعے کی تفصیل میں یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ اکثریت آزمائش کی اس کٹھالی سے صحیح سالم نہ نکل سکی۔

اس طرح طاوت کا لشکر تعبیر کے دوسرے عمل سے گزرا۔ پہلی تعبیر وہ تھی جب انہوں نے عام لوگوں کو تیار کر کے وقت کہا تھا کہ جو لوگ دل جمعی سے ساتھ نہ دے سکیں اور تکمیل مقصد تک قائم نہ رہ سکیں، وہ میرے ساتھ نہ آئیں۔



”فلما جاوزہ هو والذین آمنوا معہ قالوا لا ملأقۃ لنا الیوم

بجالتوت وجنودہ.....“

یہ جملہ نشانہ ہی کرتا ہے کہ وہ تھوڑے سے افراد جو پیاس کی آزمائش پر پختہ اترے وہی حالات کے ساتھ گئے لیکن جب اس چھوٹے سے گروہ نے غمہ کیا کہ جلد ہی ان کا دشمن کے عظیم اور طاقتور لشکر سے سامنا ہوگا تو اپنی تعداد کی کمی پر وہ بہت پریشان ہوئے۔ یہ وہ وقت تھا جب آزمائش کا تیسرا مرحلہ شروع ہوا۔

”قال الذین یظنون انہم ملاقوا اللہ کم من فتنۃ قلیلۃ غلبت فتنۃ کثیرۃ۔“

”فتنہ“ کا مادہ ہے ”فی“ اس کا معنی ہے ہزشت، گمراہی اور تشکیل شدہ جماعت کو بھی فتنہ کہتے ہیں کیونکہ وہ ایک دوسرے کی طرف پٹ پٹ کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔

آیت کہتی ہے کہ اس وقت قیامت پر ایمان نہ آسکے رکھنے والے باقی ساتھیوں کو بیدار اور تنبیہ کرنے لگے کسی جمیعت کی مقدار اور تعداد پر نگاہ نہیں کرنا چاہیئے بلکہ کیفیت اور جذبے کو دیکھنا چاہیئے۔ کیونکہ بہت دفعہ ایسا ہوا ہے کہ ایک کم تعداد مگر ایمان اور عزم مصمم رکھنے والی جمیعت نے حکم خدا سے اپنے سے کہیں بڑی تعداد پر غلبہ پالیا۔

توجہ رہے کہ ”یظنون“ اس مقام پر ”یعلمون“ کے معنی میں ہے۔ یعنی جو قیامت پر یقین رکھتے ہیں نہ کہ قیامت کا گمان رکھتے ہیں کیونکہ ”ظن“ بہت سے مواقع پر یقین کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اگر اسے گمان کے معنی میں لیا جائے تب بھی غیر مناسب نہیں ہے کیونکہ پھر آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ قیامت کا گمان اچھا ہائیکہ کہ علم و یقین بھی کافی ہے کہ وہ انسان کو مقاصد اپنی کے سامنے آسکے اور مبادی کے کیونکہ زندگی میں کامیابی کا گمان رکھنے والے تمام لوگ مثلاً زراعت، تجارت، صنعت اور سیاست سے وابستہ لوگ صرف گمان کی بنیاد پر اپنا کام نہختہ ارادے سے انجام دیتے ہیں قیامت کے دن لگائے پروردگار کا دن کیوں کہا گیا ہے اس سلسلے میں تفسیر نمونہ کی جلد اول کے اردو ترجمہ کے صفحہ ۱۸۳ پر گفتگو کی جا چکی ہے۔ ”بما ذلک اللہ“ یعنی حکم خدا سے۔

عزم مصمم رکھنے والے ایمان دار لوگوں کی بہت سے بے ایمان گروہوں اور جماعتوں پر کامیابی ایک مستحکم ہے جو روحانی اور نفسیاتی عوامل سے مربوط ہے پھر بھی قرآن اسے فرمانِ اپنی سے منسلک قرار دیتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس عالم میں کسی بھی طرح کے آئندہ نتائج ہوں سب آزمائش پروردگار کی برکت سے، اس کی طرف سے اور اس کے حسبِ فرمان ہیں۔ ایسی ہی تفسیر قرآن میں بہت سے مواقع پر نظر آتی ہے۔

”واللہ مع الصابرین“

یہ جملہ عزم مصمم رکھنے والے اہل ایمان کی طرف سے دوسروں کو صبر و استقامت کی دعوت کا حرفِ آخر ہے۔ یہ اہل ایمان انہیں بشارت دیتے تھے کہ خدا اہل صبر و استقامت کے ساتھ ہے۔

”ولتصابر زوالجالوت وجنودہ“



”بروز“ کا معنی ہے ظہور۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی آمادہ جنگ ہو اور میدان جنگ میں نکل گئے تو اس کے عمل کو براہِ راست کہتے ہیں اور جب کوئی دوسرے کو جنگ کی دعوت دے تو کہتے ہیں کہ وہ مبارز طلبی کر رہا ہے۔ یہ آیت کہتی ہے کہ جب طاوت اور ان کا لشکر ایسی جگہ پر پہنچ گئے جہاں جالوت کا طاقتور لشکر نمایاں طور پر نظر آ رہا تھا تو وہ اس عظیم قوت کے سامنے صاف ہستہ ہو گئے۔ انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اپنے تئیں پروردگار کی لامتناہی قدرت کے سپرد کر دیا اور اس سے استقامت اور صبر کا تقاضا کیا۔

”وَقَبَّلْنَا اقْبِرْ عَلَيْنَا صَبْرًا“

”اقْبِرْ“ کا مطلب ہے کسی سیلِ مادے کو برتن سے ایسے گرا کر برتن خالی ہو جائے حضرت طاوت کے ہمراہی دعا کے وقت کہتے ہیں کہ خداوند! ہم پر صبر و استقامت انڈیل دے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا سے صبر، استقامت اور پامردی کا آخری درجہ طلب کر رہے ہیں جیسے کسی برتن کا ساہلہ پانی کسی پر ڈال دیا جائے اور برتن خالی ہو جائے۔

”وَشَبَّتْ اَفْتَدَانَا“

یعنی ہمیں ثابت قدم رکھو کہ ہمارے قدم اکثر نہ جائیں اور میدان سے بھاگ کھڑے نہ ہوں حقیقت میں پہلی دعا باطنی پہلو کی حامل ہے اور یہ دعا ظاہری پہلو کہتی ہے اور یہ مستم ہے کہ ثابت قدمی صبر و استقامت کی روح کا نتیجہ ہے

”وَانصُرْنَا عَلٰی الْغَوٰمِ الْكَافِرِيْنَ“

دراصل یہ مجدد استقامت اور ثبات قدمی کا نتیجہ ہے جو گزشتہ دو جملوں میں بیان ہو چکی ہے یعنی خداوند! استقامت اور ثبات قدمی کے زیر سایہ ہمیں کفار پر فتح عطا فرما۔

”فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوْتَ“

اس آیت میں طاوت کی رہبری اور کمان میں بنی اسرائیل کی جالوت جیسے ظالم اور اس کے طاقتور لشکر سے جنگ کے آخری مرحلے کو بیان کیا گیا ہے جالوت کا لشکر آخر کار شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا خود جالوت بھی حضرت طاوت کے لشکر کے ایک شخص واؤد کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ واؤد کے ہاتھوں جالوت کے قتل کی تفصیلات گزشتہ اوراق میں بیان کی جا چکی ہیں۔

زیر نظر آیت میں یہ صراحت موجود نہیں کہ یہ واؤد وہی پیغمبر ہیں جو حضرت سیدنا داؤد کے والد گرامی ہیں یا کوئی اور شخص۔ لیکن اس آیت سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مقام نبوت کے حامل ہوئے آیت کا انکا حصہ یہ ہے۔

”وَاتَّخَذَ اللّٰهُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَالْحِڪْمَةَ وَعِلْمًا مَّقَادِشًا“

یعنی۔ خدا نے اسے حکومت اور علم عطا کیا اور جو کچھ وہ چاہتا تھا اسے سکھایا

ایسی تعبیر عام طور سے انبیاء کے متعلق ہی ہوتی ہے۔

سورہ ص آیت ۲۰ میں حضرت داؤد پیغمبر کے بارے میں ہے۔



”وَشَدَدًا مَلِكُهُ وَأَتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ“

اور ہم نے اس کی حکومت کو مضبوط کر دیا اور اسے علم و دانش عطا کیا۔

اس آیت کے ذیل میں جو احادیث منقول ہیں ان سے بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ وہی مشہور پیغمبر حضرت داؤد تھے۔
”عَلَّمَهُ مَشَارِدَ شَاءٍ“ (جو مہم خدا چاہتا تھا اسے سکھائے، اسے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا و دوسریں کے علوم اور حکمتیں اس محدود مقرر کی حامل ہوتی ہیں جس کا خدا ارادہ کرتا ہے اگرچہ ان کے علم و دانش کا دائرہ بہت ہی وسیع ہوتا ہے پھر بھی وہ اس مقدار میں ہوتا ہے جو خدا چاہتا ہے۔

تنازع بقا کا مفروضہ

”وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ“

اس حرف توجہ رکھتے ہوئے کہ یہ آیت بنی اسرائیل کے مومنین کی ایک جماعت کے ہاتھوں ظالم جاہلوت اور اس کی فوج کی شکست کے بعد آئی ہے تفسیر خود بخود واضح ہو جاتی ہے کیونکہ اگر خداوند عالم بعض اوقات صاحب ایمان و استقامت لوگوں کے ذریعے مستکرموں اور ظالموں کی سرکوبی نہ کرے تو ممکن ہے کہ وہ تمام روئے زمین پر قدرت حاصل کر لیں۔ پروردگار عالم کی سنت تو یہ ہے کہ دنیا میں ارادہ و اختیار کی آزادی ہو اور لوگ خیر و شر کا راستہ اختیار کرنے میں آزاد ہوں، لیکن جب ستم گردوں کی سرکشی دنیا کی عفو و تباہی کا باعث بن رہی ہو تو خدا اپنے بندوں میں سے کسی ایک گروہ کی مدد کرتا ہے جو راہ سرکشی کو روک دیتے ہیں اور یہ پروردگار عالم کا اپنے بندوں پر ایک لطف و کرم ہے۔

اس جملے کی تفسیر سورج آیت ۴۴ میں موجود ہے ارشاد ہوتا ہے :

”وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَهْدَمَتِ صَوَامِعُ وَبِيعُ

وَصُنُوفُ وَمَسَاجِدُ.....“

اگر خدا اپنے بعض بندوں کے ذریعے بعض دوسروں کو دفع نہ کرے تو گرجے، کلیسے، یہودیوں

کے عبادت خانے اور مسلمانوں کی مسجدیں ویران ہو جائیں۔

جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ بعض لوگوں کے گمان کے برخلاف آیت تنازع بقا سے کوئی ربط نہیں رکھتی ان کا خیال ہے کہ محل بحث آیت کہتی ہے کہ انسانوں میں ہمیشہ جنگ و جدال رہنا چاہیے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو جمہور، سستی اور فساد پوری زمین کو اپنی گرفت میں لے لے گا اور نسل انسانی تنزل کا شکار ہو جائے گی لیکن نزاع اور دائمی جنگ و جدال کے باعث زیادہ طاقتور باقی رہ جاتے ہیں اور کمزور پامال ہو کر ختم ہو جاتے ہیں اور یوں زیادہ صلاحیت رکھنے والا منتخب ہو جاتا ہے جسے انتخاب اصلاح کہتے ہیں۔

لیکن یہ تفسیر اس صورت میں ہی ممکن ہے کہ ہم آیت کو اس کے ماقبل سے بالکل منقطع کر دیں اور اس کی مشابہ سورہ حج کی آیت سے بھی حرف نظر کر لیں لیکن مگر ان پر توجہ رکھیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہ ظالم اور سرکش لوگوں سے جنگ



کے بارے میں ہے اور ان میں اس قدر جوہر جنگ کو مقدم قرار نہیں دیا گیا علاوہ ان میں تنازع بقاء کے قانون کے نام سے جو کچھ کہا جاتا ہے اور جو ذروں کے چیزوں کے تکامل و ارتقاء کے چار یا دو گار اصولوں میں شمار ہوتا ہے وہ کوئی مستند علمی قانون نہیں ہے بلکہ ایک باطل شدہ مفروضہ ہے یہاں تک کہ تکامل انواع کے حامی بھی دنیا میں تنازع بقاء کے قانون کا برگز سہارا نہیں دیتے اور جانوروں کے تکامل کو حیثیت و خلقت کے قانون سے مربوط سمجھتے ہیں نہ ان تمام چیزوں سے قطع نظر اگر تنازع بقاء کے مفروضے کی کوئی علمی بنیاد تسلیم کر لی جائے تب بھی اس سے صرف جانوروں کی زندگی کے سلسلے میں استفادہ کیا جاسکتا ہے لیکن اسے انسانی زندگی کی بنیاد پر گزار قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ انسانی تکامل و ارتقاء، لقمان بقاء کے ذریعے ہے نہ کہ تنازع بقاء کے زیر سایہ۔ اس طرح واضح ہوتا ہے کہ تنازع بقاء کے مفروضے میں فوج انسانی کو بھی شامل کرنا ایک طرح کی استعمادی اور سامراجی طرز فکر ہے سرمایہ داری کے بعض حامی اپنی خونی جنگوں اور نفرت انگیز حکومتوں کی توجیع اس طرز فکر سے کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ جنگ و جدل کو ایک فطری تقاضے اور انسانی معاشرہ کی ترقی کے ذریعے کے طور پر متعارف کرانیں اور اپنے جرائم کو ایک علمی مبادیہ اور حادیں سمجھا جن لوگوں نے ان کے انسان دشمن افکار کے زیر اثر زیر بحث آیت کو ان کی فکر پر منطبق کیا ہے وہ یقینی طور پر قرآنی تعلیمات سے بہت دور چلے گئے ہیں کیونکہ قرآن مرامت سے کہتا ہے:

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً“ : (البقرة آیت ۱۹۰)

اے ایمان والو! سب کے سب صلح و سلامتی میں داخل ہو جاؤ
آیت کے آخر میں نسرا یا گیا ہے:

”وَلَكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ“

خدا عالمین پر کثرت و رحمت کی نظر رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ روئے زمین پر فساد و بربادی کے پھیلنے اور لوگوں کو اس کی پیٹ میں آنے سے روکتا ہے۔

”تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَأَنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ“

ہر آیت میں بنی اسرائیل کے بارے میں بیان کیے گئے متعدد واقعات کی طرف اشارہ موجود ہے ان میں سے ہر واقعہ پروردگار کی قدرت و عظمت کی نشانی ہے اور یہ واقعات مغربات اور ہر افسانوی رنگ سے پاک ہو کر پیغمبر اسلام پر نازل ہوئے اور یہ امر بذات خود پیغمبر اکرم کی سچائی اور نبوت کی ایک علامت ہے و اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ

۲۵۳۔ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللَّهُ وَرَفَعَ بَعْضُهُمْ دَرَجَاتٍ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلَ

سنہ مزید وضاحت کے لیے ”مختارین از فضیلتہ“ تکمیل کا مطالعہ فرمائیں۔



الَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمْ الْبَيِّنَاتُ
وَلَكِنْ اخْتَلَفُوا فِيهَا مِنْ آمَنَ وَمِنْهُمْ مَنْ كَفَرَ
وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلُوا وَلَكِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ ۝

ترجمہ

۲۵۳۔ ان بعض رسولوں کو ہم نے بعض بر فضیلت دی ہے۔ ان میں سے بعض سے خدا نے (براہ راست) گفتگو کی ہے اور بعض کو برتر درجات عطا کیے ہیں اور عیسیٰ بن مریم کو ہم نے واضح نشانیاں دی ہیں اور ان کی تائید ہم نے روح القدس کے ذریعے کی (لیکن کسی پیغمبر کے مقام کی فضیلت سے امتوں کا اختلاف ختم نہ ہوا) اگر خدا چاہتا تو ان پیغمبروں کے بعد آنے والے لوگ واضح نشانیاں آجائے کے بعد ایک دوسرے سے جنگ و جدال نہ کرتے (لیکن خدا لوگوں کو عہد نہیں کیا کرتا اور انہیں راہ سعادت ملے کرنے کے لیے آزاد رہنے دیتا ہے) مگر ان امتوں نے آپس میں اختلاف کیا۔ بعض یہ مان لے آئے اور بعض کافر ہو گئے (اور جنگ و جدال اور اختلاف کے درپے ہو گئے) پھر بھی اگر خدا چاہتا تو وہ آپس میں جنگ نہ کرتے لیکن خدا جو چاہتا ہے (حکمت کی بنا پر) انجام دیتا ہے۔

تفسیر

”يَتْلَاكَ الرُّسُلُ“ :

”يَتْلَاكَ“ اشارہ بید کے لیے ہے لیکن جیسا کہ ہم جانتے ہیں کبھی کسی شخص یا چیز کے احترام کے لیے، اس کی حیثیت اور مقام کو مد نظر رکھتے ہوئے اشارہ بید استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں بھی ”رُسُلُ“ سے پہلے ”يَتْلَاكَ“ پیغمبرانِ خدا کی عظمت اور بلند مقام کی طرف اشارہ ہے۔

”رُسُلُ“ سے یہاں مراد تمام مرسّیین اور پیغمبر ہیں یا پھر وہ رسول مراد ہیں جن کا ذکر اسی سورہ کی گذشتہ آیات میں آچکا ہے یا جن کے واقعات کی طرف اشارہ ہو چکا ہے۔ مثلاً ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ، داؤد اور اشموئیل۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد وہ تمام رسول ہوں جن کے نام قرآن میں اس آیت کے نزول سے پہلے آچکے تھے اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے لیکن زیادہ تر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس سے تمام پیغمبر مراد ہیں۔ کیونکہ اصلاحی طور پر لفظ ”الرسل“ جمع علی بالام ہے جو عمومیت پر دلالت کرتا ہے۔ لہذا سب رسولوں کے لیے ہے۔

”فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ“



یہ مجدد وضاحت کرتا ہے کہ اگرچہ نبوت و رسالت کے لحاظ سے تمام پیغمبر ایک دوسرے کی مثل و نظیر ہیں لیکن مقام و منزلت میں یکساں نہیں ہیں کیونکہ ان کی ذمہ داریاں مختلف تھیں۔ لہذا کار تو وہ سب تھے لیکن ان کی فداکاری کے درجات مختلف ہیں۔ اسکی لیے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ان میں سے بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت دی ہے۔
”مَنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللَّهُ“

اس جملے میں پیغمبروں کے بعض فضائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ خدا نے ان سے بعض کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ واضح ہے کہ اس سے مراد حضرت موسیٰؑ ہیں چونکہ وہی ایسی شخصیت ہیں جو کلمہ اللہ کے نام سے مشہور ہیں۔ سورہ نسا آیت ۱۶۴ میں اُن کے بارے میں ہے
”وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا“

یہ اخذ کرنا بہت بعید ہے کہ اس سے مراد پیغمبر اسلامؐ ہیں اور سورہ شوریٰ آیت ۵۱ کے قریب سے اس ”تکلمہ“ سے مراد وحی ہی ہے۔
”وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ“

اس جملے میں بعض پیغمبروں کی درجہ اور مرتبے کے اعتبار سے فضیلت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ آیت کی ابتدا میں پیغمبروں کے درجات کے فرق کو بیان کیا گیا ہے۔ اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ زیر نظر جملے سے مراد ایک یا کئی مخصوص افراد ہیں جن کا کمال نمونہ پیغمبر اسلامؐ ہیں کیونکہ آپؐ کی ذات بابرکات ایسی ہے جس کا لایا ہوا دین و آئین آخری اور کمال ترین تھا اور جس کی رسالت کمال ترین دین کی تبلیغ کیلئے ہے اُسے خود سب سے برتر ہونا چاہیے اور خصوصاً یہ کہ قرآن اُن کے بارے میں کہتا ہے۔
”وَجَعَلْنَا بَنِي إِسْرَءِيلَ سَمَٰعًا“

قیامت کے دن ہر پیغمبر اپنی امت پر گواہ ہے اور تم تمام پیغمبروں پر گواہ ہو۔ (نساء ۱۳۱)
یہ آیت بھی مذکورہ موقف کی درستی پر دلالت کرتی ہے۔ گذشتہ جملے میں چونکہ حضرت موسیٰؑ کی فضیلت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بعد کا جملہ حضرت عیسیٰؑ کے مقام و منزلت کی صراحت کرتا ہے۔ لہذا بحث کی مناسبت سے یہ بھی بطور پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ مجدد بھی پیغمبر اسلامؐ کی عظمت کی طرف اشارہ کرتا ہے کیونکہ یہ تینوں پیغمبر عالمی مذاہب کے پیشوا ہیں اور اگر پیغمبر اسلامؐ کا ذکر ان دونوں کے درمیان آیا ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ آپؐ ہی کا دین دیگر ادیان کے لیے حد وسط ہے اور اس میں ہر چیز اعتدال کے ساتھ موجود ہے جیسا کہ قرآن کہتا ہے:
”وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا“ (بقرہ - ۱۴۳)

اور اس طرح ہم نے تمہیں امت وسط قرار دیا

ان تمام چیزوں کے باوجود آیت کے آئندہ جملے نشانہ دہی کرتے ہیں کہ ”وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ“ درجات سے مراد بعض گذشتہ پیغمبر مثلاً حضرت ابراہیمؑ، حضرت نوحؑ اور بعض دیگر ہیں کیونکہ بعد میں فرمایا گیا ہے:



”ولو شاء الله ما اقتتل الذين من بعد هم“

یعنی : اگر خدا چاہتا تو ان پیغمبروں کی امتیں ان کے بعد آپس میں جنگ و جدل نہ کرتیں۔
اس جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ گزشتہ جملے سابق پیغمبروں کے بارے میں ہیں۔
”واتینا عیسیٰ ابن مریم البیتات و ائدناہ بروح القدس“

فرمایا گیا ہے کہ ہم نے عیسیٰ کو واضح نشانیوں میں مثلاً ناقابل علاج بیماروں کو شفا دینا، مردوں کو زندہ کرنا، اعلیٰ مذہبی معارف اور روح القدس کے ذریعے انہیں تائید و تقویت بخشی۔
اس بارے میں سورہ بقرہ کی آیت ۸۷ میں بحث ہو چکی ہے کہ روح القدس سے مراد وحی الہی پہنچانے والے جبرئیل ہیں یا کوئی مخفی معنوی قوت جو تمام مومنین میں مختلف درجے پر موجود ہے۔

”ولو شاء الله ما اقتتل الذين من بعد هم من بعد ما حانتهم البیتات“
یہ جملہ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ پیغمبروں کی عظمت ان پیروکاروں کے درمیان اختلاف میں رکاوٹ کا سبب نہیں بنی کیونکہ خدا نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے۔ مکالمہ و ارتقاء کے لیے ضروری ہے کہ انسان حق و فضیلت کے راستے کو اپنے ارادے سے طے کرے۔ اگر خدا چاہتا تو اس میں کوئی رکاوٹ نہ تھی کہ وہ ان کو حیوانات کی طرح غامض عزائم و طبائع کے ساتھ پیدا کرتا اور ان کے زیر اثر وہ انبیاء کی پیروی کرتا اور صلح و صفائی سے رہتا لیکن یہ مسلم ہے کہ پھر ان پیغمبروں کی پیروی کرنا یا صلح و راستی سے رہنا اور جنگ و جدل سے بچنا فضیلت و فخر کا باعث نہ ہوتا کیونکہ اس میں جبر و الزام کا پہلو پایا جاتا ہے۔

”ولكن اختلفوا فمنهم من امن ومنهم من كفر“

اس اختلاف کا سہ چتر خود لوگ ہی تھے ورنہ انبیاء و مرسلین میں تو کوئی اختلاف نہ تھا۔ ان سب کا تو ایک ہی ہدف اور مقصد تھا۔ ہوا یہ کہ بعض لوگ ان کی تعلیمات پر ایمان لے آئے اور بعض نے مخالفت کی اور یہ امر اختلافات کے ظہور کا باعث بنا۔

”ولو شاء الله ما اختلفوا ولكن الله يضل ما يريد“

دوبارہ تاکید کی گئی ہے کہ یہ کام خدا کے لیے آسان تھا کہ جبری طور پر اختلافات کو ختم کر دیتا لیکن خدا اپنے ارادے کے مطابق امور انجام دیتا ہے اور خدا کا ارادہ حکمت اور کمال انسانی سے ہم آہنگ ہے۔ اس نے انسان کو آزاد و مختار قرار دیا ہے اگرچہ بعض لوگ اس آزادی سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں۔

کیا مختلف مذاہب اختلاف کا سبب ہیں؟

بعض مغربی مصنفین ادیان و مذاہب پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ انسانوں میں تفرقے اور نفاق کا باعث ہیں اور مذاہب کی راہ میں بہت زیادہ انسانی خون بہایا گیا ہے۔ تاریخ میں بہت سی مذہبی جنگوں کے تذکرے موجود ہیں۔



اس اعتراض کے ذریعے وہ مذہب کی مذمت کرنا چاہتے ہیں اور اسے جنگ و جدل کا موجب قرار دیتے ہیں۔
اس کے مقابلے میں یہ امور قابل توجہ ہیں۔

اولاً

جیسکے مندرجہ بالا آیت نشانہ ہی کرتی ہے کہ حقیقت میں کچھ پروکاروں اور حقیقی مذاہب کے درمیان کوئی اختلاف نہ تھا بلکہ اختلاف تو پیران مذہب اور مخالفین مذہب کے درمیان تھا اور یہ جو مختلف مذاہب کے پروکاروں میں جنگ و جدل دکھائی دیتا ہے وہ ان کی مذہبی تعلیمات کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ مذاہب میں تحریف، ناروا تعصبات اور آسمانی مذاہب میں خلافات کی آمیزش ہے۔

ثانیاً

آج جب کہ بیشتر انسانی معاشروں میں سے مذہب (یا کم از کم اس کی تاثیر) ختم ہو چکی ہے تو پھر جنگوں میں دشمنانک ترین صدمت میں وسعت کیوں آگئی ہے۔ آج یہ وحشت ناک جنگیں دنیا کے وسیع علاقوں میں جاری و ساری ہیں کیا اس کا الزام بھی مذہب کو دیا جائے گا یا پھر یہ تسلیم کریا جائے گا کہ انسانوں کے ایک گروہ کا سرکش نفس ان جنگوں کا حقیقی سرچشمہ ہے۔ ہاں البتہ یہ لوگ کہیں مذہب کا بھیس بدل دیتے ہیں، کہیں سیاسی و اقتصادی مکتب کا لباس پہن لیتے ہیں اور کہیں کسی اور سانچے میں ڈھل کر سامنے آ جاتے ہیں اس لیے قصور مذہب کا نہیں ہے۔ یہ سرکش لوگ ہیں جو اصل مجرم ہیں جو جیسے بہانوں سے جنگوں کی آگ بھڑکاتے رہتے ہیں۔

ثالثاً

آسمانی مذاہب بالخصوص اسلام نسل پرستی اور قوم پرستی کے مخالف ہیں ایسے انہوں نے بہت سی نسلی، جغرافیائی اور قبائلی سرحدوں کو ختم کر دیا ہے اور جن جنگوں کا سرچشمہ یہ امور تھے وہ فخرنا ختم ہو گئی ہیں۔ یوں جنگوں کا ایک حصہ انسانی زندگی کے مذہب کے زیر اثر آنے کے باعث تاریخ سے حذف ہو گیا ہے۔ علاوہ ازیں مسیح و سوسما، اچھے اخلاق و اوصاف تمام آسمانی مذاہب کی توجہ کا مرکز ہیں اور مختلف قوموں میں دشمنیوں اور نفرتوں کو کم کرنے میں مذاہب کی اس نصیحت نے گہرا اثر مرتب کیا ہے۔

رابعاً

مذاہب آسمانی کا ایک پیغام محروم اور ستم رسیدہ طبقات کی آزادی تھا۔ اسی لیے انبیاء اور ان کے پیروکاروں نے جو جنگیں، شہرکوں، ظالموں، فرعونوں اور عمروں سے لڑیں وہ دراصل انسانوں کی آزادی کے لیے جہاد کا مرتبہ رکھتی ہیں اور یہ مذاہب کے لیے کسی عیب یا نقص کا موجب نہیں بلکہ ان کی قوت و طاقت کا نغمہ ہیں۔ ایک طرف مشرکین عرب اور مکہ کے سود خواروں اور دوسری طرف کسری و قیصر سے پیغمبر اکرم کی جنگ بھی اسی سلسلے کی کڑی تھی۔

۲۵۴۔ یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِصُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعَ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ لِّلْكَافِرِينَ
ترجمہ ۱

۲۵۴۔ اے ایمان والو! جو کچھ ہم نے تمہیں رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرو، اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہو سکتی ہے نہ کہ تم اپنے لیے سعادت اور سزا سے



نجات خرید سکو اور نہ دوستی (اور عام رفاقتیں وہاں سود بخشش ہوں گی) اور نہ ہی شفاعت (کیونکہ تم شفاعت کے لائق نہ ہو گے) اور کافر تو ظالم ہیں اور اپنے اوپر بھی ظلم کرتے ہیں اور معاشرے پر بھی (تفسیر گزشتہ آیات میں پہلی آیتوں کی سرنوشت، جہاد اور حکومت کا ذکر تھا۔ اب اس آیت میں مسلمانوں کی ذمہ داریوں کا بیان ہے نیز حکومت اور معاشرے کے لیے دفاعی بنیادوں کی تقویت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اے صاحب ایمان لوگو! ہم نے جو روزی تمہیں دی ہے اس میں سے خرچ کرو۔ بعید نہیں کہ اس آیت میں اتفاق سے مراد اتفاق واجب یعنی زکوٰۃ ہو کیونکہ اس کے بعد اس سے منہ موڑنے والوں کو روز قیامت سزا کی دھمکی دی گئی ہے۔ علاوہ انہی اتفاق واجب ہی دراصل بیت المال اور حکومت کی بنیاد کو تقویت پہنچاتا ہے۔ ضمنی طور پر بتاتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اتفاق واجب ہمیشہ مال کے ایک حصے پر مشتمل ہوتا ہے نہ کہ سارے مال پر۔

”مَنْ قَبْلُ انْ يَأْتِي يَوْمَ لَا بَيْعَ فِيهِ وَلَا خِلَّةٍ وَلَا شَفَاعَةً“

آج جب کہ تم میں تو انائی ہے اتفاق کرلو اور خرچ کرلو چونکہ دوسرا جہان تو یہاں بوٹے گئے کے کاٹنے کی جگہ ہے۔ وہاں معاملہ تمہارے ہاتھ سے نکل چکا ہوگا وہاں خرید و فروخت کا معاملہ انجام نہ دے سکو گے کہ جس کے ذریعے اپنے لیے سعادت و نجات خرید سکو اور نہ اس جہان میں سرمائے کے ذریعے مادی دوستیاں حاصل کی جاسکتی ہیں کہ جو وہاں فائدہ بخش ہو سکیں اور شفاعت بھی تمہارے لیے سودمند نہ ہوگی کیونکہ تم واجب دانیوں سے بھی عہدہ برآ نہیں ہوتے اس لیے تم پر نجات کے سارے دھارے بند ہو جائیں گے۔

”وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ“

اس جملہ میں قرآن یہ حقائق واضح کرنا چاہتا ہے:

۱۔ کافر اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں کیونکہ اتفاق اور واجب محتاج نیز دیگر دینی اور انسانی فرائض ترک کر کے خود کو عظیم ترین سعادتوں سے محروم کر دیتے ہیں۔ ان کے یہی اہمال اس جہان میں ان کے دامن گیر ہوں گے اور یہ خدا کی طرف سے کوئی ظلم نہ ہوگا۔

۲۔ کافر اپنے معاشرے پر بھی ظلم کرتے ہیں۔ اصولی طور پر کفر ہی قنات، سنگینی، مادہ پرستی اور دنیا داری کا منبع ہے۔ یہی چیزیں ظلم و ستم کے اصلی سرچشمے ہیں۔

یہاں اس نکتے کی یاد آوری بھی ضروری ہے کہ کفر کا لفظ اس آیت میں حکم اتفاق کے بعد آیا ہے۔ لہذا یہاں یہ لفظ روگردانی، گناہ اور حکم خدا کی خلاف ورزی کے معنی میں ہے اور اس معنی میں یہ لفظ قرآن و حدیث میں بہت مقامات پر آیا ہے۔

۲۵۵۔ اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مِمَّنْ ذَا الَّذِیْ

يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ
وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ وَسِعَ
كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا وَهُوَ
الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ۝

ترجمہ

۲۵۵۔ اُس خدائے یگانہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو زندہ ہے اور اپنی ذات سے قائم ہے اور
باقی موجودات اُس کے ساتھ قائم ہیں۔ اُسے کبھی اونگھ اور غمید نہیں آتی (اور لمحہ بھر کے لیے
بھی وہ جہان ہستی کی تدبیر سے غافل نہیں ہوتا) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اسی کی طرف سے
ہے۔ کون ہے جو اُس کے حضور اس کے فرمان کے بغیر شفاعت کرے (اُس لیے شفاعت کے
اہل لوگوں کے لیے شفاعت کرنے والوں کی شفاعت اس کے مالک مطلق ہونے میں کوئی کمی
نہیں کر سکتی)۔ جو کچھ ان بندوں کے سامنے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اُسے وہ جانتا ہے
(ان لوگوں کے گزشتہ اور آئندہ حالات یکساں طور پر اس کے علم میں ہیں) اور سوائے اس مقدار کے جسے وہ چاہے کوئی شخص
اس کے علم سے واقف نہیں ہو سکتا (وہ ایسی ذات ہے کہ جو تمام چیزوں سے آگاہ ہے اور دوسروں کا محدود علم و دانش
اسی کے لامتناہی اور لامحدود علم کا پرتو ہے) اور اُسکی (حکومت کی) کرسی آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر لیے ہوئے
ہے اور ان آسمانوں اور زمین کی نگہداری اس کے لیے گراں نہیں ہے اور بندگی مقام اور عظمت
اسی سے مخصوص ہے۔

تفسیر

”اِنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ.....“

یعنی وہ ذات جو یگانہ اور تنہا ہے عورت و صفت کمال کی جامع ہے وہی عالم ہستی کو پیدا کرنے والی ہے۔ لہذا عالم وجود
میں کوئی اس کے علاوہ پرستش کے لائق نہیں ہے۔ لا الہ الا اللہ۔ اُس ارشاد میں قرآنِ عظمیٰ عالم کی وحدت و یگانگی کو جو
اسلام کی بنیاد ہے بیان کرتا ہے لیکن جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے لفظ ”اِنَّهٗ“ میں بھی یہ حقیقت پوشیدہ ہے اس بناء
پر کہا جاسکتا ہے کہ لا الہ الا اللہ اس حقیقت کی تاکید ہے۔

”حَیُّ“ کا معنی ہے زندہ اور یہ لفظ ہر صفتِ مشبہ کی طرح دوام و ہمیشگی پر دلالت کرتا ہے۔ خدا کی حیات



حقیقی ہے کیونکہ اس کی حیات عین ذات ہے نہ کہ عارضی یا کسی دوسرے سے لی ہوئی۔ سورہ فرقان آیہ ۵۸ میں ہے۔
 ”وَتَوَكَّلْ عَلَى النِّحْتِ الذِّیْ لَا یَمُوتُ“

یعنی اس زندہ ذات پر بھروسہ کر دے جسے کبھی موت نہ آئے گی

ایک یہ پہلو ہے اور دوسرا یہ ہے کہ حیاتِ کامل وہ زندگی ہے جس میں موت کا تصور نہ ہو۔ اس لیے حقیقی حیات اسی کی ہے جو ازل تا ابد قائم و دائم ہے۔ ربی انسان کی زندگی خصوصاً اس جہان میں جہاں موت بھی ہے یہ حقیقی حیات نہیں ہو سکتی اسی لیے سورہ عنکبوت کی آیت ۶۴ میں ہماری نظر سے یہ عبادت گزرتی ہے۔

وما هذه الحیوة الدنیا الا لہو ولعب وان الذار الاخرۃ
 ’لہم الحیوان‘

اس جہان کی زندگی ہر دلعب کے سوا کچھ نہیں (ایک لحاظ سے) حقیقی زندگی تو دارِ آخرت کی زندگی ہے۔

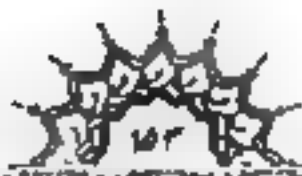
ان دو جہوں کی بناء پر حقیقی زندگی خدا ہی کیلئے مفسوس ہے۔

خدا کے زندہ ہونے کا مفہوم

عام طور پر موجود زندہ اس چیز کو کہتے ہیں جو نمو، تغذیہ، تولیدِ مثل، جذب و دفع کسی بھی حس و حرکت رکھتی ہو لیکن اس نکتے کی طرف توجہ رہے کہ ممکن ہے کوتاہ نظر افراد خدا کے بارے میں بھی ایسی ہی حیات سمجھتے ہوں حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ خدا تعالیٰ میں ایسی کوئی صفت موجود نہیں۔ یہی قیاس انسان کو خدا شناسی کے بارے میں اشتباہ میں مبتلا کر دیتا ہے کیونکہ وہ خدا کی صفات کو اپنی صفات پر قیاس کرنے لگتا ہے۔ حیات اپنے وسیع اور واقعی معنی کے لحاظ سے علم و قدرت سے عبارت ہے لہذا جو وجود لامتناہی علم و قدرت کا حامل ہے، وہ حیاتِ کامل رکھتا ہے۔ خدا کی حیات اس کے علم و قدرت کا مجموعہ ہے اور درحقیقت علم و قدرت ہی کے ذریعے موجود زندہ اور غیر زندہ میں امتیاز کیا جاسکتا ہے۔ رہا نمو، حرکت، تغذیہ اور تولیدِ مثل تو یہ ناقص اور محدود موجودات کے اسباب ہیں اور یہ آثارِ ناقص پر دلالت کرتے ہیں۔ کیونکہ غذا، تولیدِ مثل اور حرکت دراصل کسی نہ کسی کمی کو پورا کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ لیکن وہ ذات کہ جس میں کوئی نقص اور کمی نہیں اس میں یہ امور نہیں پائے جاتے۔

کیا خالق کا بھی کوئی خالق ہے؟

مادہ پرستوں کا مشہور اعتراض ہے کہ سب چیزوں کو تو خدا نے پیدا کیا ہے تو پھر خدا کو کس نے پیدا کیا ہے۔ مندرجہ بالا بحث سے یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے کیونکہ اس اعتراض کی بنیاد یہ بے بنیاد مفروضہ ہے کہ ہر



موجود ایک پیدا کرنے والے کا محتاج ہے حالانکہ مسلمان کوئی غیر قاعدہ نہیں ہے کیونکہ وہ موجودات جو پیدا کرنے والے کے محتاج ہیں وہ ایسے ہیں کہ جن کے وجود کا سرچشمہ ان کی ذات سے خارج ہوا اصطلاح میں کہا جاتا ہے کہ جن کی حیات اور وجود ان کی ذات کا جزو نہیں یعنی جو ممکن الوجود ہیں لیکن وہ وجود جس کی ہستی اس کی ذات سے ہے یا بہتر الفاظ میں جس کی ہستی اس کا عین وجود ہے ایسی ذات کو پیدا کرنے والے کی کوئی احتیاج نہیں، اسے کوئی حیات دینے والا نہیں، وہ ازل سے ہے اور اب تک رہے گی اور اس کی ذات کے لیے موت کا کوئی تصور ہی نہیں کہ کیا جاسکتا کہ وہ پیدا کرنے والے کی محتاج ہے، گویا وہ واجب الوجود ہے۔

اسان ترجمان میں کہا جاسکتا ہے کہ جو حقیقت بھی اس جہان میں وجود رکھتی ہے آخر کار اس کا کوئی سرچشمہ اور منبع ہے۔ مثلاً اگر سوال کیا جائے کہ یہ کون کیوں روشن ہے، ہم جواب دیں گے کہ نور نے اُسے روشن کیا ہے۔ اب اگر یہ سوال ہو کہ نور کیوں روشن ہے تو ہم کہیں گے کہ نور کے لیے یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ وہ کیوں روشن ہے کیونکہ یہ تو اس کی ذاتی خاصیت ہے۔

یہی بات موجودات عالم کی ہستی کے بارے میں یقیناً ثابت ہے۔ انسان، سبزہ زار اور تمام جہان خلقت وجود میں آئے ہیں۔ ہم کہیں گے کہ ان سب کو خدا نے پیدا کیا ہے اور ان کی حیات خدا کی طرف سے ہے لیکن اگر یہ سوال ہو کہ خدا نے کس طرح وجود پایا ہے تو ہم کہیں گے کہ ہستی اس کی عین ذات ہے اور وہ جہان ہستی کا سرچشمہ ہے پس

القیوم

”قیوم“ ماننے کا صیغہ ہے۔ اس کا مادہ ”قی“ ہے۔ اسی بناء پر اس کا معنی ہے: ”وہ وجود جس کا قیام اپنی ذات کے ساتھ ہے اور تمام موجودات کا قیام اس کے ساتھ ہے۔“ دوسرے لفظوں میں عالم ہستی کے تمام موجودات اُسی کے بھروسے اور سہارے پر قائم ہیں۔

واضح ہے کہ قیام کا معنی ہے کھڑا ہونا۔ وہ فرد میں یہ لفظ اسی مخصوص ہیئت و کیفیت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس معنی کا خدا کے لیے کوئی مفہوم نہیں کیونکہ وہ جسم اور صفات جسمانی سے منزہ ہے اس لیے اس سے مراد تخلیق، تدبیر اور نگہداری کے لیے قیام کرنا ہے۔ صرف وہی ذات ہے جس نے تمام موجودات کو پیدا کیا ہے اور اسی نے ان کی نگہداری و تربیت اپنے ذمے رکھی ہے۔ وہ کسی اس کام کی انجام دہی میں غفلت نہیں کرتا اور وہ ہمیشہ سے بغیر کسی وقفے کے ان امور کو انجام دینے کے لیے قیام کیے ہوئے ہے۔

اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ قیوم ”حقیقت میں تمام صفات فعل کی بنیاد ہے۔ صفات فعل سے مراد وہ صفات ہیں جو کسی موجود سے خدا کے ارتباط کو بیان کرتی ہیں، مثلاً پیدا کرنے والا، روزی دینے والا، زندہ کرنے والا، ہدایت کرنے والا وغیرہ۔

موجودات عالم کی خلقت و تدبیر کے لیے قیام کرنے میں یہ تمام امور شامل ہیں۔ وہی ہے جو روزی دیتا ہے وہی

سہ مزید وضاحت کے لیے کتاب ”مجموعہ عقائد“ کی طرف رجوع فرمائیں۔



ہے جو زندہ کرتا ہے، وہی بے جود کتاب ہے، وہی بے جودایت کرتا ہے، اس لیے خالق، رزق اور مہی وغیرہ صفات سب قیوم میں جمع ہیں۔

لَا تَأْخُذُہٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ

”سنہ“ مخصوص سستی ہے جو نیند کی ابتدا میں عارض ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اونگھ یا نیند کے جھونکے کو سنہ کہتے ہیں۔

”نوم“ کا معنی ہے نیند یعنی وہ حالت جب انسان کے کچھ ہواس طبیعی عوامل کے ذریعے کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ ”لَا تَأْخُذُہٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ“ اور اس خدا کے قیوم ہونے کی تاکید کرتا ہے کیونکہ عالم ہستی کے لیے کامل و مطلق قیام کا تقاضا ہے کہ ایک لمحہ بھر کی غفلت نہ ہو یعنی حکومت مطلقہ اور عالم ہستی کے امور کی تدبیر کے لیے خدا تعالیٰ لمحے بھر کی غفلت نہیں کرتا، لہذا ہر وہ چیز جو خدا کی اصل قیومیت کی کھینچ سارگار اور مناسب نہیں اس کی خود بخود اللہ کی بارگاہ مقدس سے نفی ہو جاتی ہے۔

یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ ”اونگھ“ کا ذکر آیت میں ”نیند“ سے پہلے کیوں ہے جب کہ قوی چیز کا ذکر پہلے ہونا چاہیے تھا پھر ضعیف کا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی وجہ فطری ترتیب ہے۔ پہلے اونگھ کی حالت پیدا ہوتی ہے، اس کے بعد گہری نیند کا مرحلہ آتا ہے۔

یہ جہد اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کا فیض اور لطف دائمی ہے اور یہ ایک لمحے کے لیے بھی اس کے وجود سے منقطع نہیں ہوتا۔ وہ بندوں کی طرح نہیں ہے کہ نیند یا دیگر عوامل کے زیر اثر دوسروں سے غافل ہو جائے۔ ”لَا تَأْخُذُہٗ“ (یعنی اسے نہیں پکڑ سکتی) یہ بھی ایک جاذب نظر اور موثر تعبیر ہے، اس سے انسان پر نیند کے تسلط کی کیفیت جھم ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ یا نیند ایک طاقت و درپے کی مانند ہے جو انسان کو مضبوطی سے جکڑ لیتا ہے اور اسیر کر لیتا ہے۔ بیداری کے برعکس نیند کے عالم میں قوی ترین انسانوں کی جو حالت ہوتی ہے اس کا احساس کیا جاسکتا ہے۔

خدا کی مالکیت مطلقہ

”لَهُ مَافِ السَّمٰوٰتِ وَمَافِ الْاَرْضِ“

آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان میں ہے اسکی مالکیت کے بغیر امور عالم کی تدبیر کے لیے قیام ممکن نہیں۔ اس لیے خدا کی قیومیت کا ذکر کرنے کے بعد اس حقیقت کی تصریح کی گئی ہے کہ تمام عالم اس کا ملک خاص ہے، عالم ہستی میں جو بھی تعریف ہو اسی کی طرف سے ہے۔

اس بناء پر جو کچھ انسان کے اختیار میں ہے اور جن چیزوں سے وہ مستفاد کرتا ہے وہ اس کی حقیقی ملکیت نہیں ہیں۔ انسان ان چیزوں سے مالک حقیقی کی معین کردہ شہادت کے تحت ایک محدود مدت کے لیے حق تعریف رکھتا ہے۔ اس

وجہ سے عام مالک کی ذمہ داری ہے کہ ملک حقیقی کی طرف سے جو شرائط معین ہوئی ہیں ان کا پورا لحاظ رکھے مگر ایسا نہ کرے تو اس کی ملکیت باطل ہو جاتی ہے اور تصرف جائز نہیں رہتا۔ ملک خدا میں تصرفات کی شرائط وہی ہیں جو قوانین اسلامی کے ذریعے لوگوں تک پہنچی ہیں۔

مثلاً کہ جسے واضح ہے کہ اس مفہوم کی طرف توجہ کرنا حقیقت میں ایک بھڑکھڑاتی عام ہے کیونکہ اگر انسان میں یہ عقیدہ پیدا ہو جائے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ دراصل اس کا نہیں ہے بلکہ چند روز کے لیے اسے عاریتاً ہے تو یقیناً یہ عقیدہ اسے دوسروں کے حقوق میں تجاوز، استثناء، ذخیرہ اندوزی، حرص، طمع اور سخیل سے باز رکھے گا۔ کیونکہ ممکن ہے شدید دینار پرستی کی وجہ سے یہ چیزیں انسان میں پیدا ہو جائیں۔ یہ عقیدہ انسان کی یہ تربیت کرتا ہے کہ وہ اپنے شرعی حقوق پر راضی رہے۔

”من ذا الذی یشفع عندہ الاباذنہ“

اصطلاحی طور پر یہ جملہ استفہام انکاری ہے یعنی کوئی شخص جی خدا کے حکم کے بغیر اس کی بارگاہ میں شفاعت و سفارش نہیں کر سکتا۔ یہ جملہ درحقیقت تمام موجودات عالم ہستی پر حشر کی قیومیت اور مالکیت مطلقہ کے مفہوم کی تکمیل کرتا ہے یعنی اگر کچھ لوگ بارگاہ الہی میں شفاعت کرتے نظر آتے ہیں تو یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ کسی چیز کے مالک ہیں اور وہ تاثیر میں اشتغال رکھتے ہیں بلکہ یہ مقام شفاعت بھی انہیں خدا نے عطا کیا ہے۔ ان کی شفاعت چونکہ حکم خدا سے ہے اس لیے یہ خود خدا کی قیومیت اور مالکیت پر ایک دلیل ہے۔

شفاعت کوئی پارٹی بازی نہیں ہے

”شفاعت“ کا مفہوم بھلیک تو یہ موجود کا ضعیف تر موجود کی مدد کرنا تاکہ وہ آسانی سے کمال و ارتقاء کے مراحل طے کر سکے۔ البتہ عموماً یہ لفظ گھبروں کی شفاعت کے بارے میں استعمال ہوتا ہے لیکن شفاعت کے وسیع تر معنی میں عالم ہستی کے تمام عوامل اور علل و اسباب شامل ہیں۔ مثلاً زمین، پانی، ہوا اور سورج کی روشنی چار عامل ہیں جو دانے کو ایک مکمل درخت یا مکمل مہرے کے مرحلے تک پہنچانے میں شفاعت اور ہدایت کرتے ہیں۔ اب اگر مذکورہ آیت کو اس وسیع معنی میں دیکھا جائے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ عالم ہستی کے مختلف عوامل و اسباب کا وجود خدا کی مالکیت مطلقہ کو ہرگز محدود نہیں کرتا اور اس میں کسی قسم کی کمی نہیں کرتا۔ کیونکہ ان تمام اسباب کی تاثیر اس کے حکم سے ہے اور دراصل اس کی قیومیت اور مالکیت کی نشانی ہے۔

بعض لوگ سمجھتے ہیں شفاعت بھی جادو جیسی کسی کی سفارش کرنے کی طرح ہے اور ایک طرح کی پارٹی بازی ہے کہا جاتا ہے کہ اس کا مفہوم یوں ہے کہ لوگ جو چاہیں گناہ کریں اور جیب سر سے پاؤں تک گناہوں میں ڈوب جائیں تو شفیع کا دامن پکڑ لیں اور اس طرح کہتے پھریں!

سے ان دم کہ مردمان بہ شفیع ز تند دست

ما شیم و دست و دامن اولاد فاطمہ

یعنی جب دوسرے لوگ کسی شیخ کا دامن تھامیں گے تو ہم اولادِ طرہ
کا اتحاد اور دامن تمام میں گئے۔

اعراض کرنے والوں نے شفاعت کے بارے میں دین کی منطق کو نہیں سمجھا اور نہ ہی اس گنہگار، جس اور بے پروا کردہ
نے اسے سمجھا ہے جو ایسی باتیں کرتا ہے کیونکہ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے شفاعت جو خدا کے خاص بندے کریں گے شفاعت
مکونین کی طرح ہے جو طبیعی عوامل کے ذریعے انجام پاتی ہے۔ جیسے ایک دلنے میں اگر عامل حیات اور زندگی کے سیل LIFE
CELLS موجود نہ ہوں تو ہزاروں سال تک سٹورج کی تپش، بونیم اور بارش کے حیات بخش قطرے اسے نشوونما اور
رشد نہیں دے سکتے، اس طرح اولیاء خدا کی شفاعت بھی ملائق افراد کے لیے بے اثر ہے یعنی اصولی طور پر وہ ایسے افراد
کی شفاعت نہیں کریں گے۔

شفاعت ایک طرح کے معنوی ربط کی محتاج ہے۔ یہ ربط شفاعت کرنے والے اور جس کی شفاعت ہو رہی ہے
اُس کے درمیان درکار ہے۔ اس لیے جو شفاعت کی اُمید رکھتا ہے اس کا فرض ہے کہ اس جہاں میں اُس شخص سے معنوی
والہ پیدا کرے جس سے وہ شفاعت کی توقع رکھتا ہے اور حقیقت میں یہ ربط ہی شفاعت حاصل کرنے والے کے لیے تربیت
کا ایک ذریعہ ہوگا۔ یہ تعلق اسے شفاعت کرنے والے کے افکار، اعمال اور مکتب کے قریب کرے گا اور اس کے نتیجے میں وہ
شفاعت کے اہل ہو جائے گا۔

اس سے واضح ہوا کہ شفاعت ایک عامل تربیت ہے نہ کہ پارٹی بازی یا فرائض سے غلڑ کا ذریعہ یہ بھی واضح ہو گیا کہ شفاعت
گنہگار کے بارے میں پردہ دہار کے ارادے میں تغیر و تبدل پیدا نہیں کرتی بلکہ گنہگار ہی شفاعت کرنے والے سے معنوی ربط
کے ذریعے ایک مکمل تربیت حاصل کرتا ہے اور ایسی سرحد میں جا پہنچتا ہے جہاں وہ غفور خدا کے اہل ہو جاتا ہے ۱ غفر
کہتے ۱۱

”يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ“

گذشتہ جلد میں بیان کیا گیا ہے کہ شفاعت بارگاہِ الہی میں حکمِ خدا ہی سے ممکن ہے زیرِ نظر جیلے میں اس کی دلیل کے طور پر
فرمایا گیا ہے کہ خدا شفاعت کرنے والوں کے گزشتہ اور آئندہ اعمال سے آگاہ ہے اور جو کچھ ان سے پہلے ہے اُسے جانتا ہے
اس لیے وہ خدا کے سامنے جن کی شفاعت کر رہے ہیں ان کے بارے میں کوئی ایسی بات پیش نہیں کر سکتے جس سے خدا ناواقف
ہو اور جس کی وجہ سے وہ ان کے سلسلے میں اپنے حکم میں نظر ثانی کرے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ سفارش کا علم اسلوب یہ ہے کہ سفارش کرنے والا جس کی سفارش کر رہا ہے اس کی اہلیت و لیاقت کا ذکر
کرتا ہے یا پھر جس کی سفارش کر رہا ہے اس سے اپنا ارتباط بیان کرتا ہے تاکہ جس سے سفارش کی جا رہی ہے وہ سفارش کرنے
والے کی خاطر اپنے حکم میں تبدیلی کر سکے۔ واضح ہے کہ دونوں صورتوں میں سفارش کرنے والا دراصل نئی معلومات فراہم کر رہا ہوتا ہے
لیکن جس سے سفارش کی جا رہی ہے اگر وہ برجیز اور ہر شخص کے بارے میں جیسے ہی پوچھ کرچ سکا آگاہ ہے تو پھر کوئی شخص بھی
اس کی بارگاہ میں کسی کی سفارش نہیں کر سکتا کیونکہ وہی شفاعت کے لیے اہل لوگوں کی تصدیق کرنے والا ہے اور وہی شفاعت

۱۱ تفسیر سورۃ اول، ترجمہ تہذیب کے صفحہ ۱۰۷ سے ۱۰۸ تک مسئلہ شفاعت کے تحت ملاحظہ فرمادیں جس بحث کی جاتی ہے۔



کی اجازت دینے والا ہے۔

”یَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ“ پروردگار کی قدرت کاملہ اور اس کے مقابلے میں دوسروں کا قدرت سے جتنی ہونے پر تاکید بھی ہے کیونکہ جو اپنے گزشتہ اور آئندہ سے بے خبر ہے اور آسمانوں اور زمین کے غیب کا علم نہیں رکھتا اُس کی قدرت بہت ہی محدود ہوگی لیکن وہ ذات جو ہر دور میں ہر چیز سے آگاہ ہے اس کی قدرت ہر لحاظ سے لامتناہی ہے اس لیے ہر اقدام پہلے تک کہ شفاعت بھی اس کے فرمان کے تابع ہے۔

اس جملے کا ربط آیت کے گزشتہ جملوں اور سند شفاعت سے واضح ہے۔ اب یہ سوال باقی ہے کہ ما بین ایدید یہہم ”اُن کے سامنے“ و ما خلفہہم ”اور اُن کے پیچھے“ سے کیا مراد ہے۔ اس سلسلے میں یاد رکھنا چاہیے کہ یہ دونوں تیسری قرآن مجید میں کسی مکان کے بارے میں اور کسی زمان کے بارے میں استعمال ہوئی ہیں۔ مثلاً سورہ آل عمران آیہ ۷۰ میں ہے۔

”وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَوْ يَدْخُلُوا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ“

شہیدانِ راہِ خدا انہیں بشارت دیتے ہیں جو انہیں ان سے ملنے نہیں ہوتے۔
 واضح ہے کہ یہاں تقدیم و تاخیر زمانی ہے۔ لیکن سورہ اعراف آیہ ۷۱ میں ہے۔

”ثُمَّ لَا تَعْلَمُ مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ عَنْ إِيْمَانِهِمْ“

وَعَنْ شَعَائِلِهِمْ“

میں اُن کے سامنے سے، اُن کے پیچھے سے، اُن کی دائیں طرف سے اور اُن کی بائیں طرف سے آؤں گا۔

یہ سامنے اور پیچھے مکان کے لحاظ سے ہے۔ البتہ محل بحث آیت میں جو مکان ہے جامع معنی جو جس میں زمان و مکان دونوں شامل ہوں۔ یعنی خداوند عالم گزشتہ اور آئندہ سے اسی طرح لوگوں کے سامنے اور پس پشت جو کچھ ہے اگرچہ لوگوں سے پوشیدہ و چھپا ہے۔ سب کچھ جانتا ہے اور سب سے آگاہ ہے۔ اس کی بارگاہِ علم میں زمان و مکان کی وسعت اور پہنائی واضح ہے اور شفاعت کرنے والے اُس کے سامنے کوئی نئی اطلاع پیش نہیں کر سکتے۔
 ”وَلَا يَحِيطُ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ“ :

یہ جملہ بھی درحقیقت سابقہ جملے کی تاکید کے طور پر ہے اور علم خدا کے مقابلے میں شفاعت کرنے والوں کے محدود علم کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ وہ پروردگار کے علم پر اعادہ نہیں رکھتے اور خدا جس قدر چاہے وہ اتنا ہی باخبر ہوتے ہیں۔
 اس جملے سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص بھی اپنی طرف سے کوئی علم نہیں رکھتا اور انسان کے تمام علوم



خدا کی طرف سے ہیں۔ وہی ہے جو رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ تدریجاً جہانِ آفرینش کے حیرت انگیز اسرار سے پردہ اٹھاتا ہے اور نئے حقائق انسان کے ہاتھ میں دیتا ہے اور اس کی معلومات میں وسعت پیدا کرتا ہے۔ اس کی جگہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ممکن ہے خدا بعض علوم غیبیہ بعض منتخب لوگوں کو دے دے اور کچھ لوگوں کو اسرار غیب سے آگاہ کر دے۔ اس بناء پر یہ بات ان لوگوں کا جواب ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ علم غیب تو انسان کے لیے ممکن ہی نہیں۔ نیز یہ ان آیات کی بھی تفسیر ہے جو بشر کے لیے علم غیب کی نفی کرتی ہیں یعنی انسان ذاتی طور پر اسرار غیب میں سے کسی چیز کو نہیں جانتا مگر یہ کہ خدا علم ہے اور جس قدر دے وہ اس قدر جان دیتا ہے (مزید وضاحت انشاء اللہ غیب سے مربوط آیات کے ذیل میں آتی گی)۔

عرش و کرسی سے کیا مراد ہے؟

”وسع کرسیہ السموات والارضین“

لفظ کرسی اصل لغت کے لحاظ سے ”کرسی“ (بروزن ارث) سے ہے جس کا معنی ہے اصل، اساس اور بنیاد۔ بعض اوقات اس چیز کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے جو ایک دوسرے سے پیوستہ اور ترکیب شدہ ہو اسی بناء پر چھوٹے تخت کو کرسی کہتے ہیں۔ اس کا نقطہ مقابل عرش ہے جس کا معنی ہے ”چھت والی چیز“ یا چھت۔ یا جند پایہ تخت۔

چونکہ استاد اور معلم، تدریس و تعلیم کے وقت کرسی پر بیٹھتا ہے لہذا بعض اوقات لفظ کرسی ”علم“ کے لیے کنایہ کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ کرسی چونکہ انسان کے اختیار اور کنٹرول میں ہوتی ہے اس لیے کسی کجاریہ لفظ حکومت و قدرت اور فرمانروائی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا آیت میں ہے کہ خدا کی کرسی تمام آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے یہاں لفظ ”کرسی“ چند معانی میں ممکن ہے:

۱۔ قلم و اور حکومت کا علاقہ: یعنی خدمات آسمانوں اور زمین پر حکومت کرتا ہے اور اس کا نفوذ تمام جگہوں پر محیط ہے۔ اس معنی میں خدا کی کرسی ہے مولا عالم مادہ کا مجموعہ ہے چاہے وہ زمین ہو یا ستارے، کہکشائیں ہوں یا بادل۔

یہ فطری امر ہے کہ کرسی کا یہ مفہوم جو قعر عرش اس جہانِ مادہ سے کسی بالاتر اور عالی تر مرحلے کا نام ہونا چاہیے کیونکہ یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ عرش کا معنی کرسی کے برعکس لغت میں چھت، سائبان اور جند پایہ تخت ہے۔ اس صورت میں عرش کا معنی عالم ارواح، ملائکہ اور جہانِ باوراء طبیعت ہوگا۔ البتہ یہ اس صورت میں ہے جب عرش و کرسی ایک دوسرے کے بد مقابل ہوں تاکہ ایک عالم مادہ و طبیعت اور دوسرا عالم ماوراء طبیعت کہلا سکے لیکن جیسا کہ سورہ

اعراف کی آیت ۵۳ کے ذیل میں آیت گاکہ عرش کے کچھ اور معانی بھی ہیں خصوصاً اگر وہ کرسی کے مقابلے میں نہ ہو تو پھر ممکن ہے کہ اس کا معنی تمام عالم ہستی ہو۔

۲۔ وسعت علم کا علاقہ : یعنی خدا کا علم تمام آسمانوں اور زمین پر محیط ہے اور کوئی چیز بھی اس کی حکومت علم سے باہر نہیں۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ کرسی بعض اوقات علم کے لیے لکایا جاتی ہے۔ کئی ایک روایات میں بھی یہی مفہوم بیان کیا گیا ہے۔ حفص بن غیاث امام صادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں :

”وسع کرسیہ السموات والارض“ سے کیا مراد ہے۔
آپ نے فرمایا :

اس سے مراد اس کا علم ہے۔

۳۔ آسمانوں اور زمین سے وسیع تر چیز : یعنی ایک ایسا موجود جو آسمانوں اور زمین سے زیادہ وسعت رکھتا ہے جو ہر طرف سے ان پر محیط ہے۔ اس طرح آیت کا معنی ہو گا کہ خدا کی کرسی تمام آسمانوں اور زمین کو اٹھانے والی ہے اور ان پر محیط ہے۔ ایک حدیث میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے یہی تفسیر منقول ہے۔ آپ فرماتے ہیں :

”الكرسي محيط بالسموات والارض وما بينهما وما تحت الثرى“ :

یعنی : کرسی زمین و آسمان جو کچھ ان میں ہے اور جو کچھ زمین کی گہرائیوں میں ہے سب پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔

یہاں تک کہ کچھ روایات میں معلوم ہوتا ہے کہ کرسی آسمانوں اور زمین سے اس قدر وسیع تر ہے کہ وہ سب کے سب کرسی کے مقابلے میں اس انگوٹھی کی طرح ہیں جو وسط بیابان میں پڑی ہو۔ امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے۔
”ما السموات والارض عند الكرسي الا كحلقه خاتم في فلاة وما
الكرسي عند العرش الا كحلقه في فلاة“ :

آسمان اور زمین کرسی کے مقابلے میں بیابان میں پڑی ہوئی انگشتری کے حلقے کی طرح ہیں اور کرسی بھی عرش کے مقابلے میں بیابان میں پڑی ہوئی انگشتری کے حلقے کی طرح ہے۔

پہلا اور دوسرا معنی تو قابل فہم اور واضح ہے لیکن تیسرا معنی ایسا ہے کہ ابھی تک علم و دانش بشر اس سے پردہ نہیں اٹھا سکے کیونکہ ایسے عالم کا وجود جو آسمانوں اور زمین پر بھی محیط ہو اور ہمارے جہاں سے کہیں زیادہ وسعت رکھتا ہو ابھی تک مروج علمی ذرائع سے ثابت نہیں ہو سکا۔ اگرچہ اس کی نفی پر بھی کوئی دلیل موجود نہیں۔ جدید علوم کے تمام ماہرین معترف ہیں کہ

”تورات الثقلین“ ج ۱، ۱



علوم و مطالعات نجوم کے وسائل اور ذرائع کی ترقی کے ساتھ ساتھ آسمان و زمین کی وسعت جاری نظر میں بڑھتی جا رہی ہے اور کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ عالم ہستی کی وسعت میں اتنی بے جتنی آج کے علم نے بتائی ہے بلکہ قوی احتمال ہے کہ بے شمار عالم ایسے ہوں جو آج کے وسائل اور ذرائع کی نگاہ سے اوجھل ہوں۔

یہ بات کہے بغیر نہ رہ جائے کہ مندرجہ بالا تینوں تفاسیر ایک دوسرے سے کوئی اختلاف نہیں رکھتیں اور ”وسیع کمر سیتہ الشفوف والاسرار“ ان تمام معانی کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے۔ یعنی

— پروردگار کی حکومت مطلقہ اور قدرت کا نفاذ،

— علمی نفوذ و احاطہ اور

— ایسا وسیع تر جہان جو آسمانوں اور زمین پر محیط ہو۔

بہر صورت یہ جملہ آیت کے پہلے جملوں کی تکمیل کرتا ہے جو پروردگار کے علم کی وسعت کے بارے میں تھے۔ خلاصہ اور نتیجہ یہ کہ پروردگار کا تختہ حکومت و قدرت تمام آسمانوں اور زمین کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس کے علم و دانش کی کرسی تمام عالمین پر محیط ہے اور کوئی چیز اس کی حکومت و علم سے خارج نہیں۔

”وَلَا يَفُودُهُ حِفْظُهُمْ“

”یَفُودُهُ“ ”لُود“ (ہروزن تول) سے ہے۔ اس کا معنی ہے ”سنگینی“ یعنی آسمانوں اور زمین کی حفاظت اور عکرائی خدا تعالیٰ کے لیے کسی قسم کی سنگینی، بوجھ اور مشقت کا باعث نہیں کیونکہ وہ اپنی مخلوق اور بندوں کی طرح نہیں کہ جن کی قدرت محدود ہے کیونکہ بندے تو بعض اوقات کسی چیز کی حفاظت سے تنگ کر عاجز آ جاتے ہیں جب کہ اس کی قدرت لامحدود ہے اور لامحدود قدرت کے لیے اصولی طور پر سنگینی و آسانی، مشقت و راحت کا کوئی مفہوم نہیں۔ یہ سب مفہام تو محدود قوتوں پر صادق آتے ہیں۔

اوپر ہم جو کچھ کہہ چکے ہیں اس سے واضح ہوتا ہے کہ ”یَفُودُهُ“ کی ضمیر خدا کی طرف لوٹتی ہے آیت کے سابقہ و لاحقہ جملہ میں اسی کے شاہد ہیں کیونکہ ان کی ضمیر میں بھی سب خدا کی طرف لوٹتی ہیں۔ اس بناء پر یہ احتمال بہت ضعیف دکھائی دیتا ہے جس کے مطابق یہ ضمیر کسی کی طرف لوٹتی ہے اور جس کے مطابق معنی یہ ہوتا ہے کہ آسمانوں اور زمین کی حفاظت کسی کے لیے سنگین اور بوجھل نہیں۔

”وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ“

یچود و اصل سابقہ جملوں کی دلیل کے طور پر ہے یعنی وہ خدا جو برتر و بہتر ہے۔ ہر طرح کے شبہ اور شریک سے پاک ہے اور ہر قسم کی کمی، عیب اور نقص سے مبرا ہے۔ وہ خدا جو عظیم، بزرگ اور لامتناہی ہے اس کے لیے کوئی کام بھی مشکل نہیں ہے اور وہ کسی وقت بھی جہی بستی کو منظم کرنے اور اس کی تدبیر کرنے سے غصہ، عاجز، غافل اور بے خبر نہیں ہو سکتا اور اس کا علم تمام چیزوں پر محیط ہے۔



۲۵۶۔ لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ۚ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ
يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ
الْوُثْقٰى ۙ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝

ترجمہ

۲۵۶۔ دین قبول کرنے میں کوئی جبر واکراہ نہیں ہے، کیونکہ صحیح راستہ ٹیڑھے راستے سے جدا اور آشکار
ہو چکا ہے اس بناء پر جو کوئی طاغوت ابت، شیطان اور برسرکش، سے منہ موڑ کر خدا پر ایمان لے
آئے تو اس نے محکم کڑے کو تھاما ہے جو ٹوٹ نہیں سکتا اور خدا سننے والا جانتے والا ہے۔

شان نزول

مشہور مفسر طبری نے مجمع البیان میں اس آیت کی شان نزول یہ نقل کی ہے کہ مدینے میں ایک شخص حصین نامی
تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ مدینہ میں مل تجارت لانے والے دو تاجروں نے ان لوگوں سے ملاقات کی تو انہیں
عیسائیت کی دعوت دی اور وہ بھی اس سے بہت متاثر ہوئے اور عیسائی ہو گئے۔

حصین اس واقعے سے بہت پریشان ہوا اور پیغمبر اسلام کو اس کی اطلاع دی اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں انہیں اپنی
اپنے مذہب میں لانا چاہتا ہوں اس نے سوال کیا کہ وہ جبری طور پر انہیں اپنے مذہب میں واپس لا سکتا ہے تو اس پر مندرجہ
بالآیت نازل ہوئی جس میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ کسی مذہب کو اختیار کرنے میں کوئی جبر واکراہ نہیں ہے۔

تفسیر المنار میں لکھا ہے کہ حصین نے اپنے دونوں بیٹوں کو جبراً اسلام کی طرف پھانسنے کی کوشش کی تو وہ شکایت سے
کر پیغمبر اکرم کے پاس آئے۔ حصین نے عرض کیا کہ میں کیسے برداشت کروں کہ میرے بیٹے جہنم کی آگ میں جلیں اور میں دیکھتا
رہوں۔ اس پر عمل بحث آیت نازل ہوئی۔

تفسیر

”رُشْد“ لغت میں راستہ پانے اور واقع ملک پہنچنے کے معنی میں ہے۔ اس کے برعکس ”غی“ حقیقت
سے انحراف کرنے اور واقع سے دور ہونے کے معنی میں ہے۔ دین و مذہب کا تعلق چونکہ لوگوں کی فکر اور روح سے ہے
اور اس کی اساس و بنیاد ایمان و یقین پر استوار ہے لہذا منطق و استدلال کے علاوہ اس کے لیے کوئی دوسرا راستہ صحیح نہیں۔
جیسا کہ آیت کی شان نزول سے معلوم ہوتا ہے بعض افراد پیغمبر اکرم سے چلبستے تھے کہ آپ بھی جابر حکمرانوں کی طرح
طاقت اور زور سے لوگوں کے عقائد تبدیل کرنے کے لیے غلطی اقدامات کریں۔ مندرجہ بالا آیت نے اس پر صراحت



سے جواب دیا کہ دین و آئین ایسی چیز نہیں کہ جس کی جبری تبلیغ کی جائے۔

یہ آیت ان لوگوں کا وندان شکن جواب ہے جو اسلام کو زبردستی اور جبری پہلو کا حامل قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کی ترقی فوج اور تلوار کی مرہون منت ہے۔

جب اسلام باپ کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے بیٹے کو مذہبی عقیدہ زبردستی بدلنے پر مجبور کرے تو دوسروں کی خوداری اس سے واضح ہو جاتی ہے مگر عقیدہ بدلنے کے لیے جبر ممکن اور جائز ہوتا تو ضروری تھا کہ سب سے پہلے باپ کو بیٹے کے بارے میں اجازت دی جاتی جبکہ اسے یہ حق نہیں دیا گیا۔

مذہب جبری نہیں ہو سکتا

اصولی طور پر اسلام یا کوئی مذہب حق و دوجوہ کی بناء پر جبر واکراہ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

۱۔ ان تمام واضح دلائل، منطقی استدلالات اور آشکار مجزات کے ہوتے ہوئے اس بات کی ضرورت ہی نہیں کہ جبر واکراہ کا راستہ اختیار کیا جائے۔ جبر واکراہ تو وہ اختیار کرتے ہیں جو منطق سے عاری ہوتے ہیں نہ کہ اسلام جیسا دین جو واضح اور قوی استدلالات کا حامل ہے۔

۲۔ اصولی طور پر دین جس کی بنیاد قسمی اشتقاقیات کا ایک سلسلہ ہے ممکن ہی نہیں کہ جبری ہو۔ زور، طاقت، تلوار اور فوجی قوت ہمارے جسمانی اعمال و حرکات پر تو اثر انداز ہو سکتے ہیں لیکن ہمارے افکار و عقائد کو نہیں بدل سکتے۔ جو کچھ کہا گیا ہے گیساک کی زہریلی تبلیغ کا واضح جواب ہے کیونکہ قرآن کے ان الفاظ ”لا اکراہ فی الدین“ سے بڑھ کر اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کہی جاسکتی۔ البتہ یہ لوگ اسلامی جنگوں کو غلط رنگ دینے کے درپے رہتے ہیں جب کہ ان اسلامی جنگوں کے مطالعے سے پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کہ ان میں سے بعض تو دفاعی تھیں اور بعض ابتدائی جہاد کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ان میں کشور کشائی اور لوگوں کو دین اسلام کے لیے مجبور کرنے کا کوئی پہلو نہ تھا۔ ان کا مقصد غلط اور ظالمانہ نظام کو تہ و بالا کرنا تھا تاکہ لوگوں کو آزادانہ طور پر مذہب اور اجتماعی زندگی کے مطالعے کا موقع فراہم کیا جائے۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان جب کسی شہر کو فتح کرتے تو دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کو مسلمانوں کی طرح آزادی دیتے تھے اور جزیہ کے طور پر جو ٹیکس ان سے وصول کیا جاتا وہ دراصل امن و امان برقرار رکھنے اور امن و امان برقرار رکھنے والی قوتوں کے اخراجات کی تکمیل کے لیے ہوتا تھا کیونکہ اسلام میں غیر مسلموں کی جان و مال اور عزت و ناموس محفوظ تھی۔ یہاں تک کہ وہ اپنی مذہبی رسوم بھی آنا دانا بچلاتے تھے۔

وہ سب لوگ جو تاریخ اسلام سے واقف ہیں اس حقیقت کو جانتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ عیسائی جنہوں نے اسلام کے بارے میں کتابیں لکھی ہیں انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ مثلاً کتاب تمدن اسلام و عرب میں ہے:

مسلمانوں کا دوسرے لوگوں سے سلوک اس قدر محبت بھرا اور نرم تھا کہ ان کے سرداروں نے انہیں اپنی مذہبی تقریبات تک منعقد کرنے کی اجازت دے رکھی تھی۔



کئی ایک تواریخ میں ہے کہ عیسائیوں کا ایک گروہ جو بعض سوالات اور تحقیقات کے لیے پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں پہنچا تھا اُس نے اپنی مذہبی عبادت مدینہ کی مسجد نبویؐ میں آزادانہ انجام دی۔

اسلام میں فوجی طاقت کے استعمال کے مواقع

اصولی طور اسلام صرف تین مواقع پر فوجی طاقت کو ذریعہ قرار دیتا ہے:

۱۔ شرک اور بت پرستی کی تبلیغ کتنی کے لیے: شرک اور بت پرستی کے آثار کو مٹانے کے لیے اسلام فوجی طاقت استعمال میں لاتا ہے کیونکہ بت پرستی اسلام کی نفیر میں کوئی دین و آئین نہیں ہے بلکہ کجروی، بیماری اور بے ہودہ چیز ہے اور اس کی اجازت ہرگز نہیں دی جانا چاہیے کہ لوگ سو فیصد غلط اور بے ہودہ راستے پر چلتے رہیں بلکہ اس کی جملہ شکنج کی جانا چاہیے۔ لہذا اسلام نے بت پرستوں کو تبلیغ کے ذریعے راہ توحید کی طرف دعوت دی لیکن جہاں انہوں نے مقابلہ کا راستہ اختیار کیا اسلام نے طاقت استعمال کی۔ ان کے بت خانے توڑے گئے اور بت پرستی کے تمام آثار مٹا دیے گئے تاکہ اس روحانی اور فکری بیماری کی مکمل ریشہ کنی کی جاسکے۔

شرکین سے قتال کرنے کی آیات اسی مفہوم کی حامل ہیں۔ سورہ بقرہ کی آیت ۱۹۳ میں ہے:

”وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ“

شرکین سے جنگ جاری رکھو یہی تک کہ شرک کا فتنہ معاشرے سے ختم ہو جائے۔

اس بناء پر محل بحث اور اس قسم کی آیات میں کوئی تضاد نہیں کہ جس کی بنیاد پر نسخ کا ذکر ضروری۔

۲۔ اسلام کے خلاف حملے کی تیاری کرنے والوں سے: جو لوگ مسلمانوں کی نابودی کے لیے اُن پر حملے کی سازش کر رہے ہوں وہاں دفاعی جہاد اور فوجی قوت استعمال کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پیغمبر اکرمؐ کے زمانے کی اسلامی جنگیں شاید زیادہ اسی قسم کی تھیں۔ مثال کے طور پر احد، احزاب، حنین، موتہ اور تبوک کے غزوات کے نام سے جاسکتے ہیں۔

۳۔ تبلیغ کی آزادی حاصل کرنے کے لیے: ہر دین حق رکھتا ہے کہ منطقی طریقوں سے اس کا آزادانہ تعارف کرایا جاسکے۔ اگر کچھ لوگ اس میں مایوس ہوں اور رکاوٹ پیدا کریں تو یہ حق طاقت کے ذریعے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

”فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَى“

”طاغوت“ صیغہ مبالغہ ہے۔ اُس کا مادہ ہے ”طغیان“ اس کا معنی ہے حد سے تجاوز کرنا اور زیادتی کرنا۔ ہر وہ چیز جو حد سے تجاوز کا ذریعہ بنے اسے طاغوت کہا جاتا ہے۔ اسی بناء پر شیطان، بت، جارج اور ظالم و حکمران کو طاغوت کہا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ پروردگار عظیم کے علاوہ ہر معبود اور ہر راستہ جو غیر حق تفسیر مینپائے اس پر



طاغوت کا اطلاق ہوتا ہے یہ لفظ مفرد اور جمع دونوں معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

آیت کے اس حصے میں قرآن کہتا ہے: جو شخص طاغوت سے کفر کرے اور اس سے منہ پھیرے اور خدا پر ایمان لے آئے اُس نے گویا مضبوط کڑے پر ہتھ ڈالا ہے جو کہیں ٹوٹنے والا نہیں۔

عروۃ الوثقیٰ اُس آئے کو کہتے ہیں جو دروازے کی کپٹ پر نصب کرتے ہیں اور دروازہ بند کرتے یا کھولتے وقت اُس پر ہتھ ڈالتے ہیں۔

طاغوت سے یہاں کیا مراد ہے۔ اس بارے میں مفسرین نے مختلف باتیں کی ہیں بعض نے بت کہا ہے بعض نے شیطان مراد دیا ہے، بعض نے کافروں کو طاغوت قرار دیا ہے اور بعض نے جادوگر مراد دیے ہیں۔ لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس سے وسیع تر مفہوم مراد ہے یعنی ہر سرکش، ٹیڑھے اور غلط مذہب اور راستے کو یہ لفظ اپنے اندر سمونے ہونے ہے۔

درحقیقت یہ حصہ آیت کے سابقہ حصوں کے لیے ایک دلیل ہے۔ دین و مذہب جبر و اکراہ کا مقلد نہیں کیونکہ دین خدا کی طرف دعوت دیتا ہے جو ہر غیر و برکت اور سعادت کا منبع ہے جبکہ دوسرے لوگ تباہی، انحرف اور فساد کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ بہر حال مذہب کا نام ایسا ہی ہے جیسے کسی حکم کڑے پر ہتھ ڈالنا کہ جس کے ٹوٹنے کا کوئی امکان نہ ہو۔
”وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ“

آیت کے آخر میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ کفر و ایمان کا مسئلہ ایسا نہیں جو دکھاوے سے حل ہو جائے کیونکہ خدا سب کی باتوں کو سنتا ہے چاہے وہ آشکار ہوں یا ہندکروں اور غفی اجداسوں میں اس طرح وہ لوگوں کے دلوں میں چھپی ہوئی چیزوں اور لوگوں کے ضمیروں کی حالت سے آگاہ ہے۔

یہ جملہ دراصل حقیقی ایمان لانے والوں کے لیے تشویق اور منافقین کے لیے تہدید اور دھمکی ہے۔

۲۵۷۔ اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی التَّوْرٰتِ
وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا اَوْلِیَآءُهُمُ الظَّالِمُوْنَ یُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ
التَّوْحِیْدِ اِلَی الظُّلُمٰتِ ۚ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْمَقٰرِءِ ۚ هُمْ فِیْہَا
خٰلِدُوْنَ ۝

ترجمہ

۲۵۷۔ خدا ان لوگوں کا سرپرست ہے جو ایمان لے آئے ہیں۔ انہیں وہ تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آتا ہے (لیکن) وہ لوگ جو کافر ہو گئے ہیں ان کے اولیاء اور سرپرست طاغوت و بت، شیطان اور ظالم و سرکش لوگ ہیں جو انہیں نور سے نکال کر تاریکیوں

کی طرف سے جاتے ہیں وہ اہل آتش جہنم ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

تفسیر

”ولی“ کا معنی جیسا کہ بعد میں ”اتصا ولتکمہ اللہ ورسونہ.....“ والی آیت کے ذیل میں آئے گا اصل میں ”نزدیکی اور عدم جدائی“ ہے۔ اسی بناء پر سرپرست کو ولی کہتے ہیں اور جو شخص تربیت اور سرپرستی کا محتاج ہو اُس کے مربی کو ولی کہا جاتا ہے۔ غرض دوستوں اور رفقاء کے لیے بھی ولی اور اولیاء کا اطلاق ہوتا ہے لیکن واضح ہے کہ اس آیت میں پسے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

گذشتہ آیات میں کفر و ایمان، حق و باطل اور راہِ راست اور انحرافی راستے کی وضاحت کے بعد اب یہ آیت تکمیل مطلب کے لیے کہتی ہے: مومن و کافر کسی کاربہر و راستہ اور اپنا مخصوص راستہ ہے۔ مومنین کا رہبر و راہِ بنا خدا ہے، ان کا راستہ تاریکوں سے جدا ہو کر نور کی طرف جاتا ہے۔ لیکن کافروں کا رہبر طاغوت ہے اور ان کی راہ مومنین کے برعکس نور سے ظلمت کی طرف جاتی ہے اور ان کا انجام بھی واضح ہے کیونکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آگ میں رہیں گے (اولئک اصحاب النار ہم فیہا مخلدون)۔

چند اہم نکات

۱۔ نور و ظلمت کی تشبیہ: ایمان اور کفر کو نور اور ظلمت سے تشبیہ دینا اس موقع کی مناسب ترین تشبیہ ہے۔ نور — زندگی اور تمام برکات و آثار حیات کا منبع ہے۔ نور ہی رشد، نمو، تکامل، تحرک اور جنبش کا سرچشمہ ہے اور نور ہی سکون بخش، مطمئن کرنے والا، آگاہ کرنے والا اور نشانہ دہی کرنے والا ہے جبکہ ظلمت و تاریکی سکوت، موت، خواب، نادانی، گمراہی اور وحشت کی رمز ہے۔

۲۔ ”نور“ کے مقابل ”ظلمات“ کیوں: اس آیت میں اور اس کے مشابہ آیات قرآن میں لفظ ظلمت کی جمع ظلمات استعمال کیا گیا ہے اور نور صیغہ مفرد کے طور پر آیا ہے۔ یہ دراصل اس طرف اشارہ ہے کہ راہِ حق میں کسی قسم کی کوئی پرگندگی اور آتشزدہ نہیں بلکہ وہ ابھام بخش وحدت و یگانگی ہے۔ راہِ حق خط مستقیم کی طرح ہے جو دو نقطوں کے درمیان کھینچا جائے تو ہمیشہ ایک ہی ہوگا اور اس میں ایک سے زیادہ کی تعداد ممکن نہیں لیکن اہل باطل اپنے باطل میں ہم آہنگ نہیں ہیں۔ ان میں بدھ اور مقصد کی وحدت نہیں ہے ان کی حالت بالکل دو نقطوں کے درمیان کھینچے جانے والے غیر منظم خطوط کی سی ہے جن کی تعداد خط مستقیم کے دونوں طرف بے شمار ہے۔

۲۵۸۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّہٖ اَنْ اَتَّہُ
اَللّٰهُ الْمَلٰٓئِکَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحٰی وَیُمِیْتُ



قَالَ أَنَا أُخِي وَأُمِيتُ قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي
بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ
الَّذِي كَفَرَ ۖ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۝

ترجمہ

۲۵۸۔ کیا دیکھتے نہیں ہو (اور اُس سے آگاہ نہیں ہو) جس نے ابراہیم کے ساتھ اُس کے پروردگار کے بارے میں حجت بازی اور کلام کیا کیونکہ خدا نے اُسے حکومت دے رکھی تھی (اور وہ کم ظرفی کی وجہ سے بادۂ غرور سے سرمست ہو گیا تھا) جب ابراہیم نے کہا: میرا خدا وہ ہے جو زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ اس نے کہا میں زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔

(اس کے بعد اُس نے مغالطہ پیدا کرنے کا حکم دیا اور دو قیدی حاضر کیے گئے، اُس نے ایک کی آزاوی اور دوسرے کے قتل کا فرمان جاری کر دیا) ابراہیم نے کہا خدا آفتاب کو افق مشرق سے نکالتا ہے اگر تم اپنے اس قول میں سچے ہو کہ تمہی جہان، مستی پر حکمران ہو تو تم غرید کو مغرب سے نکال کر دکھاؤ (یہاں وہ کافر بہوت ہو گیا اور خدا کا عالم قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔

تفسیر

گذشتہ آیت پروردگار کی ولایت اور رہنمائی کے ذریعے مومنین کی ہدایت اور طاقت کی پیروی کے ذریعے کفار کی گمراہی کے بارے میں تھی۔ اس کے بعد زیر نظر آیت میں خدا ایک زندہ اور واضح شاہد کا ذکر کرتا ہے جو اس کے عظیم پیغمبر حضرت ابراہیم کے متعلق رونما ہوا۔

ہوایہ کہ حضرت ابراہیم نے اپنے زمانے کے ایک جابر سے بحث مباحثہ کیا اور اپنے موقف کے حق میں دلائل پیش کئے وہ اپنی حکومت کی وجہ سے بادۂ غرور سے سرمست تھا لہذا حضرت ابراہیم سے پوچھنے لگا تیرا خدا کون ہے حضرت ابراہیم نے کہا وہی جو زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ حقیقت میں آپ نے عظیم ترین شاہکار قدرت کو دہلیز کے طور پر پیش کیا۔ مبداء جہان مستی کے علم و قدرت کی واضح نشانی ہی قانون موت و حیات ہے لیکن اُس نے مکر و تزویر کی راہ اختیار کی اور مغالطہ پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ لوگوں کو اور اپنے حمایتیوں کو غافل رکھنے کے لیے کہا وہ تو میں زندہ کرتا اور مارتا ہوں اور موت و حیات کا قانون میرے ہاتھ میں ہے (اَنَا أُخِي وَأُمِيتُ)۔

قرآن میں اس کے جھٹلنے کے بعد واضح نہیں ہے کہ اُس نے اپنے پیدا کیے گئے مغالطے کی تائید کے لیے کس طرح علمی اقدم کیا لیکن احادیث و تواریخ میں آیا ہے کہ اُس نے فرار و قیدیوں کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ قیدی لانے گئے تو اس نے



فرمان جاری کیا کہ ایک کو آزاد کر دو اور دوسرے کو قتل کر دو۔ پھر کہنے لگا: تم نے دیکھا کہ موت و حیات کس طرح میرے قبضے میں ہے۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی موت و حیات سے متعلق دلیل بر لگانا سے قوی تھی لیکن دشمن سادہ لوح لوگوں کو جھیل دے سکتا تھا لہذا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دوسرا استدلال پیش فرمایا کہ خدا آفتاب کو افقِ مشرق سے نکلنے کا ہے مگر جہانِ ہستی کی حکومت تیرے ہاتھ میں ہے تو تو اسے مغرب سے نکل کر دکھا۔ یہاں دشمن خاموش، مبہوت اور عاجز ہو گیا۔ اس میں سکت نہ رہی کہ اس زندہ منطوق کے بارے میں کوئی بات کر سکے۔ ایسے ہٹ دھرم دشمنوں کو جواب دہ کرنے کا یہ بہترین طریقہ ہے۔ یہ مسلم ہے کہ موت و حیات کا مسئلہ کئی جہات سے آسمان اور گردشِ شمس و قمر کی نسبت پروردگارِ عالم کے علم و قدرت پر زیادہ گواہی دیتا ہے۔ اسی بناء پر حضرت ابراہیم نے پہلے وہی مسئلہ پیش کیا اور یہ فطری امر ہے کہ اگر صاحبِ فکر اور روشن ضمیر افراد اس مجلس میں ہوں گے تو وہ اسی دلیل سے مطمئن ہو گئے ہوں گے کیونکہ ہر شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ ایک تبدیلی کو آزاد کرنا اور دوسرے کو قتل کر دینا یہ جیسی اور حقیقی موت و حیات سے بالکل ربط نہیں رکھتا لیکن جو لوگ کم عقل تھے اور اس دور کے ظالم حکمران کے پیدا کردہ مفالطے سے متاثر ہو سکتے تھے ان کی فکر راجح سے منحرف ہو سکتی تھی لہذا آپ نے دوسرا استدلال پیش کیا اور سورج کے طلوع و غروب کا مسئلہ پیش کیا تاکہ حق ہر دو طرح کے افراد کے سامنے واضح ہو جائے۔

چند اہم نکات

۱۔ حضرت ابراہیم کے مد مقابل کون تھا: سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کے مد مقابل اس اجتماع میں کون تھا اور کون آپ سے حجت بازی کر رہا تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں اس کے نام کی صراحت نہیں ہے لیکن فرمایا گیا ہے۔
”ان ائسہ اللہ العلاف“

یعنی — اس غرور تکبر کے باعث جو اس میں نشہ حکومت کی وجہ سے پیدا ہو چکا

تھا وہ ابراہیم سے حجت بازی کرنے لگا۔

لیکن حضرت علی علیہ السلام سے منقول در مشور کی ایک حدیث میں اور اسی طرح تواریخ میں اس کا نام ”غرد بن کنعان“ بیان کیا گیا ہے۔

۲۔ یہ مباحثہ کب ہوا: زیر بحث آیت میں اس مباحثے کا وقت نہیں بتایا گیا۔ لیکن قرآن سے انداز ہوتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت ابراہیم کی بت شکنی اور آگ کی مٹھی سے نجات کے بعد کا ہے کیونکہ یہ مسلم ہے کہ آگ میں ڈالے جانے سے قبل اس گفتگو کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور اصولی طور پر بت پرست آپ کو ایسے مباحثے کا حق نہ دے سکتے تھے وہ حضرت ابراہیم کو ایک ایسا مجرم اور گناہگار سمجھتے تھے جسے ضروری تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے اپنے اعمال اور خدایانِ مقدس کے



خلاف قیام کی مزاحمت۔ وہ تو انہوں نے بت شکنی کے اقدام کا صرف سبب پوچھا تھا اور اس کے بعد انتہائی غصے اور سختی سے انہیں آگ میں جلانے کا حکم صادر ہوا تھا لیکن جب آپ حیرت انگیز طریقے سے آگ سے نجات پا گئے تو پھر اصطلاحی الفاظ میں "نمرود کے حضور رسائی ہوئی" اور پھر بحث و مباحثے کے لیے بیٹھ گئے۔

۳۔ بحث سے نمرود کا مقصد: آیت سے اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ اس بحث اور گفتگو کے ذریعے نمرود کسی حقیقت کی جستجو کر رہا تھا بلکہ وہ اپنے باطل موقف کو برتر ثابت کرنا چاہتا تھا۔ شاید لفظ "حج" اسی مقصد کے استعمال ہوا ہے کیونکہ یہ لفظ عربی ایسے ہی مواقع پر استعمال ہوتا ہے۔

۴۔ نمرود کا دعوائے الوہیت: آیت سے یہ بھی اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ وہ ظالم حکمران اپنے بارے میں الوہیت کا مدعی تھا یہی نہیں کہ وہ اپنی پرستش کو داتا تھا بلکہ اپنے آپ کو عالم ہستی کا پیدا کرنے والا بھی بتاتا تھا یعنی اپنے آپ کو معبود بھی سمجھتا تھا اور خائف بھی۔

ایسا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ جب لوگ پتھر اور کھڑی کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں اور ان کی پرستش کرنے کے علاوہ انہیں امور عالم میں موثر اور سببیم بھی مانتے ہیں تو ایسا موقع ایک سکڑ اور ظالم حکمران کے لیے بھی پیش آ سکتا ہے کہ وہ سادہ لوح لوگوں سے فائدہ اٹھائے۔ انہیں اپنی طرف دمت دے اور اپنے آپ کو ایک بانگ پیش کرے تاکہ اس کی بھی پرستش ہو اور لوگ اس کی خالقیت کے سامنے گردن جھکائیں۔

بت پرستی کی مختصر تاریخ

ہم یہاں بت پرستی کی مختصر تاریخ بیان کرتے ہیں۔
بت پرستی کی ابتداء کا تعین بہت مشکل ہے۔ قدیم ترین زمانے سے جہاں تک ہمیں انسانوں کی تاریخ معلوم ہے یہ بت پرستی ان لوگوں میں موجود رہی ہے جو پست فکر اور گھٹیا تھے۔ بت پرستی دراصل خدا پرستی کے عقیدے کی ایک تحریف ہے۔ خدا پرستی دراصل انسان کی فطرت اور مرثیت کا جز ہے اور شروع سے انسان اسی فطرت اور مرثیت کا مالک رہا ہے لہذا اس کی تحریف بھی پست افراد میں ہمیشہ رہی ہے لہذا کہا جاسکتا ہے کہ بت پرستی کی تاریخ تقریباً تاریخ انسانی کے ساتھ ساتھ شروع ہوئی ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ انسان اپنی سرشت اور خلقت کے تقاضے کی بناء پر طبیعت سے ماوراء ایک قوت کی طرف متوجہ تھا۔ نظام ہستی کے واضح استدلالات اس سرشت کی تائید کرتے تھے اور ایک ایسے مبداء کی نشاندہی کرتے تھے کہ جو عالم و قادر ہے اور انسان سرشت اور عقل کے ان دونوں طریقوں سے کم و بیش ہمیشہ ہی اس مبداء ہستی سے آشنا رہا ہے لیکن۔۔۔ جب کہ وہ احساس جو بچے میں موجود ہے اگر بر عمل اس کی رہبری نہ کی جائے اور اسے صحیح غذا نہ دی جائے تو پھر وہ کچھ اور اس جیسی چیزوں کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے اور آہستہ آہستہ ایسی ہی چیزوں کا عادی ہو جاتا ہے اور اپنی صحت و سلامتی کو بیٹھتا ہے اسی طرح انسان کی عقل و فطرت کو ملحوظ رکھتے ہوئے بروقت راہنمائی میسر نہ آئے

تو وہ معنوی خدا اور طرح طرح کے بتوں کا رخ کر لیتا ہے اور ان کے سامنے سر تسلیم خم کر بیٹھا ہے اور ان کے لیے خدائی صفات کا قائل ہو جاتا ہے۔

یاد دہانی کی ضرورت نہیں کہ کوتاہ فکر اور بے وقوف لوگوں کی کوشش جوتی ہے کہ ہر چیز کو حسی قالب میں دیکھیں۔ بنیادی طور پر ان کی فکر محسوسات کی دنیا سے آگے قدم نہیں رکھتی اس لیے ان دیکھے خدا کی پرستش ان کے لیے مشکل ہے ان کی خواہش جوتی ہے کہ اپنے خدا کو پیکر محسوس میں دیکھیں۔ یہ جہالت و نادانی جب خدا پرستی کی سہرشت سے مل جاتی ہے تو بت پرستی اور خدائے حسی کی شکل میں رونما ہوتی ہے۔

دوسری طرف کہا جاتا ہے کہ گذشتہ قومیں انبیاء اور بزرگان دین کے لیے جو خاص احترام رکھتی تھیں اس کے پیش نظر ان کی وفات کے بعد ان کے مجسمے یا دھار کے طور پر بنا لیتی تھیں۔ کوتاہ فکر اور کم فکر لوگوں میں جو جعلی فضائل اور شلو کی روح ہوتی ہے وہ انہیں جوش و لاقی اور مجبور کرتی کہ ان مجسوں کے لیے جند مرتبوں اور مجوزوں کے قائل ہو جائیں اور یوں انہیں سرمد الوہیت تک پہنچا دیں۔ یہ انداز بت پرستی کا دوسرا سرچشمہ ہے۔

بت پرستی کا ایک سرچشمہ یہ بھی تھا کہ موجودات کا ایک سلسلہ جو انسانی زندگی کے لیے سودمند تھا مثلاً چاند، سورج، آگ اور پانی وغیرہ۔ لوگ ان کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے اور اپنی فکر کے افق کو وسیع نہ کرتے کہ جس کے نتیجے میں وہ ان سے ماوراء سبب اول اور خالق عالم کو دیکھ پاتے۔ احترام اور تعلیم کے اس انداز نے رفتہ رفتہ بت پرستی کی شکل اختیار کر لی۔

بت پرستی کی تمام اشکال کی جڑ اور بنیاد ایک ہی چیز ہے اور وہ ہے فکری لپستی اور جہل و نادانی نیز مذہب جوتی اور خدا شناسی کے لیے صحیح رہبری کا نہ ہونا مگر جب انبیاء کی تعلیم و تربیت اور رہنمائی موجود تھی تو پھر بت پرستی نادر قابل گرفت ضرور ہے۔

۲۵۹۔ اَوْكَالِذِي مَزَعَالِي قَرْبِيَّةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى غَرْوِشِهَآ
قَالَ اَنّٰى يُخِي هٰذِهِ اِلٰهٌ بَعْدَ مَوْتِهَآ فَاَمَاتَهُ اِلٰهٌ
مِائَةً عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا
اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَلْ لَبِثْتَ مِائَةً عَامٍ فَانْظُرْ اِلَى
طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهٗ وَانْظُرْ اِلَى حِمَارِكَ
وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ



فَنُشِرْهَا ثُمَّ نَكْسُوها لَحْمًا فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ ۚ قَالَ
أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

ترجمہ

۲۵۹۔ یا اس شخص کی طرح جو ایک آبادی میں سے گزرا، حالت یہ تھی کہ اس کی دیواریں چھتوں پر گری پڑی تھیں، اور اس میں رہنے والوں کے جسم اور بڑیاں ہر طرف بکھرے پڑے تھے۔ یہ دیکھا تو وہ شخص اپنے آپ سے کہنے لگا: خدا انہیں موت کے بعد اب کیسے زندہ کرے گا (اسی وقت) خدا نے اسے ایک سو سال کیلئے مار دیا۔ پھر اسے زندہ کیا اور اس سے کہا: کتنی دیر ٹھہرے رہے ہو۔ کہنے لگا: ایک دن۔ یا دن کا کچھ حصہ فرمایا: انہیں بلکہ ایک سو سال تک ٹھہرے رہے ہو، اپنی غذا اور پینے کی چیز کی طرف دیکھو جو تمہارے پاس تھی اور سالہاں سال گزرنے کے باوجود اس میں کوئی تغیر نہیں آیا (وہ خدا جس نے جلد خراب ہو جانے والی ان چیزوں کی اتنی طویل مدت حفاظت کی ہے وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے) لیکن اپنے گدھے کی طرف دیکھو کہ وہ کیسے ریزہ ریزہ ہو چکا ہے موت کے بعد زندگی تمہارے ایمان کے لیے ہے نیز اس لیے بھی کہ تمہیں ہم لوگوں کے لیے امعاد کے بارے میں انشائی قرار دیں اب (اپنی سواری کی) بڑیوں کی طرف دیکھو کہ ہم انہیں کیسے اٹھا کر ایک دوسرے سے جوڑ دیتے ہیں اور اس پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ (یہ حقائق) جب اس پر آشکار ہوئے تو اس نے کہا: میں جانتا ہوں کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

تفسیر

واقعے کی تفصیلات

یہ آیت ایک گزشتہ نبی کا دوسرا واقعہ بیان کرتی ہے یہ واقعہ امعاد اور قیامت پر ایک زندہ گواہ سے درحقیقت گزشتہ آیات جن میں حضرت ابراہیم کی غرود سے ہونے والی گفتگو کو بیان کیا گیا تھا توحید اور خدا شناسی کے بارے میں تھیں اور یہ آیت امعاد اور موت کے بعد کی زندگی کے بارے میں ہے۔ پہلے ہم اجمالی طور اس واقعے کو دیکھیں گے اور پھر آیت کی تفسیر کریں گے۔ آیت ایک ایسے شخص کی سرگزشت بیان کر رہی ہے جو اثنائے سفر میں تھا۔ ایک سواری پر سوار تھا، کھانے پینے کا کچھ سامان اس کے ہمراہ تھا اور وہ ایک آبادی میں سے گزر رہا تھا جو وحشتناک حالت میں گری پڑی تھی اور دیواریں ہوجی تھی اور اس کے باسیوں کے جسم اور بوسیدہ بڑیاں نظر آرہی تھیں۔ جب اس نے یہ وحشتناک منظر دیکھا تو کہنے لگا:



خدا ان مردوں کو کس طرح زندہ کرے؟

ہاں البتہ اُس کی یہ بات شک اور انکار کے طور پر نہ تھی بلکہ از روئے قہر تھی کیونکہ آیت میں موجود قرائن نشانہ ہی کرتے ہیں کہ وہ ایک نبی تھے۔ جیسا کہ آیت کے مطابق خدا نے اُس سے گفتگو کی۔ روایات بھی اس حقیقت کی تائید کرتی ہیں جس کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے۔

خدا تعالیٰ نے اسی وقت اُس کی روح قبض کر لی اور پھر ایک سو سال کے بعد اسے زندہ کیا۔ اب اس سے سوال کیا کہ اس بیابان میں کتنی دیر ٹھہرے رہے ہو۔ وہ تو یہ خیال کرتا تھا کہ یہاں تھوڑی دیر ہی توقف کیا ہے۔ فوراً جواب میں عرض کیا: ایک دن یا اس سے بھی کم۔ اسے خطاب ہوا: تم ایک سو سال یہاں رہے ہو لیکن اپنے کھانے پینے کی چیزوں کی طرف دیکھو کیسے طویل مدت میں حکم خدا کی وجہ سے ان میں تغیر نہیں آیا۔ اب اس دلیل کے لیے کہ تم جان لو کہ تمہیں سو سال موت کے عالم میں گزر گئے ذرا اپنی سواری کی طرف نگاہ کرو اور دیکھو کہ کھانے پینے کی چیزوں کے برعکس وہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر چکی ہیں۔ اسی طرح طبیعت کے عام قوانین سے اپنی لمبائی میں لے چکے ہیں اور موت نے اس کے جسم کو منتشر کر دیا ہے۔ اب دیکھو کہ ہم اس کے پرگندہ اجزاء کو کیسے جمع کر کے اسے زندہ کرتے ہیں۔ اس نے یہ منظر دیکھا تو کہنے لگا: میں جانتا ہوں کہ خدا ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے یعنی میں مطمئن ہو چکا ہوں اور مردوں کے دوبارہ اُٹھنے کا معاملہ متشکل ہو کے میرے سامنے آگیا ہے اس بارے میں کہ وہ پیغمبر کون تھے، مختلف احتمالات دیے گئے ہیں۔ بعض نے "ازمیا" کہا ہے اور بعض "خضر" سمجھتے ہیں لیکن مشہور یہ ہے کہ وہ عزیر تھے۔ امام صادق علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں بھی حضرت عزیر کے نام کی تائید ہوئی ہے۔

یہ بھی سوال اُٹھتا ہے کہ یہ آبادی کہاں تھی۔ بعض، سے بیت المقدس سمجھتے ہیں جو نجات النصر کے حملوں کی وجہ سے ویران اور برباد ہو چکا تھا۔ لیکن یہ احتمال بعید نظر آتا ہے۔

اب آیت کی تفسیر کی طرف لوٹتے ہیں۔

"او کا لذی مز علی قریۃ وھی خاویۃ علی عروشہا"

جیسا کہ ہم کہ چکے ہیں یہ آیت گذشتہ آیت کی تکمیل کر رہی ہے۔ گذشتہ آیت میں توحید کے بارے میں بحث تھی۔ یہ اور اس سے اگلی آیت معاد اور قیامت کے حسی نمونے پیش کر رہی ہیں۔ ابتدا میں جوتی ہے: کیا تو نے اُس شخص کو نہیں دیکھا جو ایک ایسی جگہ سے گذر رہا تھا جو بالکل ویران ہو چکی تھی۔

"عروش جمع ہے عرش کی۔ یہاں چھت کے معنی میں ہے۔" خاویہ "خالی" کے معنی میں ہے اور یہاں ویران ہونے کے مفہوم کے لیے کناسے کے طور پر آیا ہے کیونکہ آباد گھر موما سکوتی ہوتے ہیں اور جو گھر خالی ہوتے ہیں، پہلے سے ویران ہوتے ہیں یا خالی رہنے کی وجہ سے ویران ہو جاتے ہیں۔ اس لیے "وھی خاویۃ علی عروشہا" کا مطلب ہے کہ اس آبادی کے سب گھر ویران ہو چکے تھے لیکن اس شکل میں کہ پہلے ان کی چھتیں گری تھیں اور اس کے بعد ان کی دیواریں زمین ہوس ہو گئی تھیں ایسی ویرانی ایک مکمل ویرانی ہوتی ہے کیونکہ کسی عمارت کی تباہی کے وقت عموماً پہلے چھت تباہ ہوتی

ہے اور ایک حد تک دیواریں کٹری رہتی ہیں اور پھر وہ بھی تباہ شدہ چشتوں پر آ جاتی ہیں۔

”قال اقبیٰ یحییٰ هذه اقله بعد موتها“

ظاہر اس ماجر سے میں پیغمبر کے ساتھ کوئی اور شخص نہیں تھا لہذا انہوں نے اپنے آپ سے کہا: خدا اس بستی کو موت کے بعد کیسے زندہ کرے گا۔ ”قریب سے مراد یہاں بستی والے ہیں۔ یہ جملہ نشاندہی کرتا ہے کہ وہ اس حادثے میں اہل بستی کی کھجری پڑی بڑیوں کو لہذا انکھوں سے دیکھ کر ان کی طرف اشارہ کر کے یہ بات کر رہے تھے۔“

”فما ماتہ اقلہ مائۃ عام فثم بعثہ“

اکثر مفسرین اس جملے سے یہ سمجھتے ہیں کہ خدا نے پیغمبر مذکور کو ایک سو سال کے لیے مار دیا تھا۔ پھر انہیں زندہ کیا۔ ”اماتہ“ کا لفظ بھی جو ”موت“ کے مادہ سے ہے اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتا ہے لیکن تفسیر المنار کا سرائف کہتا ہے:

”ممکن ہے یہ ایک قسم کی نیند کی طرف اشارہ ہو جسے آج کے علماء ”سات“

کہتے ہیں، جس کے مطابق موجود زندہ ایک طویل مدت تک گہری نیند میں

مستغرق رہتا ہے لیکن اس میں شعلہ حیات خاموش نہیں ہوتا جیسا کہ ہم نے

اصحاب کہف کی نیند کے بارے میں پڑھ لکھا ہے“

پھر وہ مزید لکھتا ہے

”اس طویل نیند کے بارے میں اب تک جو اتفاق ہوا ہے وہ چند سال سے

زیادہ نہیں لہذا اس کا سو سال تک طویل ہو جانا خلاف معمول ہے لیکن یہ مسلم ہے

کہ جب چند سال کے لیے ایسا ممکن ہے تو سو سال کے لیے بھی ممکن ہو سکتا

ہے۔ خلاق عادت اور قبول کہنے کے لیے جو چیز ضروری ہے وہ یہ ہے کہ

کام ممکن ہو محال عقلی نہ ہو۔

اس تفسیر کے لیے ظاہر آیت میں کوئی دلیل موجود نہیں بلکہ آیت کا ظہور یہ ہے کہ پیغمبر مذکور دنیا سے چلے

اور سو سال کے بعد پھر سے زندہ ہوئے۔ ایسی موت و حیات البتہ ایک خلاق عادت اور غیر معمولی چیز ہے لیکن محال ہرگز

نہیں اور پھر خارق عادت واقعات صرف اسی موقع کے لیے منحصر نہیں کہ ہمیں اس کی توجیہ و تاویل کرنا پڑے۔

بہت سے حیوانات ایسے ہیں جو سردیوں کے موسم میں سونے پڑے رہتے ہیں اور جب ہوا گرم ہوتی ہے تو بیدار

ہو جاتے ہیں۔ بعض حیوانات طبعی طور پر بخند ہو جاتے ہیں اور انسان بھی جانوروں کو مصنوعی طریقے سے بخند کر سکتا ہے۔

اگر یہاں چند سال تک کی طویل نیند کے امکان کے حوالے سے سو سال تک مردہ رہنے کے بعد زندہ ہونے کو

بھی ایک امر ممکن شمار کیا جائے تو یہ ایک اچھی بات ہوگی۔ اس کا معنی یہ ہوگا کہ وہ خدا جو جانوروں کو ساہا سال تک طویل

نیند یا حالت انجماد میں رکھ کر انہیں پھر بیدار کر دیتا ہے اور وہ پہلی حالت پر لوٹ آتے ہیں وہ اس پر بھی قادر ہے کہ مردوں



کو موت کے بعد دوبارہ زندہ کرے۔

اصولی طور پر معاد، قیامت کے دن مردوں کی دوبارہ زندگی خلاق عادت واقعات اور انبیاء کے معجزات تسلیم کر لینے کا فائدہ یہ ہے کہ تمام آیات قرآن کی جمعی قوانین کی روشنی میں تفسیر کرنے پر اصرار کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی اور نہ ظاہری مفہوم کے خلاف بیان کرنا پڑتا ہے کیونکہ ایسا کرنا نہ تو ضروری ہے اور نہ ہی صحیح

”قاتل کم لبثت قتال نبثت یومت او بعض یوم“ :

اس جملے میں خدا تعالیٰ پیغمبر سے پوچھتا ہے : اس جگہ کتنی دیر ٹھہرے۔ ہے جو۔ وہ جواب میں ترقو سے کہتے ہیں : ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔

جواب میں ترقو سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مرنے کا وقت اور زندہ ہونے کا وقت دن کی کوئی ایک عین گھنٹی نہ تھی شفا موت کا وقت ٹھہرے پہلے تھا اور زندہ ہونے کا زول کے بعد تھا۔ لہذا وہ شکر میں پڑ گئے کہ کیا ایک شب و روز گزر گئے ہیں یا دن کے چند گھنٹے گزرے ہیں۔ اسی لیے ایک دن کہنے کے بعد پھر ترقو کے عالم میں کہا : یا دن کا کچھ حصہ۔ لیکن قرآن خطاب ہوا کہ انہیں بلکہ تم تو یہاں ایک سو سال سے ٹھہرے ہوئے ہو ”بل لبثت مائتہ عام“

”فانظروا الٰہ طعامک وشرابک لم یتسنہ“ :

”تیسنہ“ کا مادہ ہے۔ ”سنہ“ بمعنی ایک سال ”لم یتسنہ“ کا معنی ہے ”اُسے ایک سال نہیں گزرا“۔ یہ اس بات کے لیے کنایہ ہے کہ یہ متغیر اور خراب نہیں ہوا۔ اس طرح جیسے مجموعی معنی یہ ہوا کہ اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھو کہ سالہا سال گزر جانے کے باوجود یوں لگتا ہے گویا ان پر ایک سال کا عرصہ بھی نہیں گزرا اور ان میں کوئی تغیر نہیں آیا۔ یعنی وہ خدا جو تیری کھانے پینے کی چیزوں کو ان کی اصل حالت میں محفوظ رکھ سکتا ہے جب کہ قاعدہ انہیں بہت جلد خراب اور فاسد ہو جانا چاہیے اسی خدا کے لیے مردوں کو زندہ کرنا کیا مشکل ہے۔ کھانے پینے کی چیزوں کو اتنی مدت تک خراب ہونے سے بچانا دراصل حیات کو باقی رکھنا ہے کیونکہ ایسی چیزوں کی مدت عمر تو بالعموم بہت کم ہوتی ہے جو کہ بذات خود مردوں کو زندہ کرنے سے آسان تر نہیں ہے۔ سنہ

رہا یہ سوال کہ پیغمبر کے پاس کھانے پینے کی کیا چیزیں تھیں تو آیت میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ کھانے کے لیے انھیں اور پینے کے لیے کسی پھل کا جوس تھا اور یہ معلوم ہے کہ یہ چیزیں جلدی خراب ہو جاتی ہیں اس لیے ایک طویل مدت تک ان کی بقا ایک اہم امر ہے۔

”وانظروا الٰہ حمارک“ :

یعنی۔ اپنے کہے کو دیکھو۔ قرآن نے ان کی سواری کے متعلق اس سے زیادہ نہیں کہا لیکن بعد کے جہنوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سواری وقت گزرنے کے ساتھ باطل گل شرمچی تھی کیونکہ اس کے علاوہ سو سال گزرنے پر کوئی دلیل نہ تھی۔

لے توجہ رہے کہ تم تیسنہ کی ضمیر مفرد ہے جبکہ اس کا تعلق طعام سے بھی ہے اور شراب سے بھی اس لیے تلف ہر ضمیر ضمیر ہونا چاہیئے تھی نہیں جو کہ یہاں مراد جنس ہے اور سب ایک چیز شمار ہوتی ہے لہذا ضمیر بھی مفرد کی شکل میں ہے۔



یہ خود ایک عجیب و غریب چیز ہے کہ جانور جس کے لیے طویل عمر کا امکان ہے اس کے اجزاء اس طرح بکھر جائیں لیکن پھل اور پھول کا جو جس جیسے ہمت جلد خراب ہونا چاہیے اس میں کوئی تبدیلی نہ آئے یہاں تک کہ اس کا ذائقہ اور بو تک نہ بدھے۔ یہ خدا تعالیٰ کی انتہائی قدرت نمائی ہے۔

”وَلَنَجْجِلَنَّ آيَةَ الْفُتُورِ“ :

یعنی یہ واقعہ نہ صرف تمہارے لیے قیامت میں اٹھائے جانے کی دلیل ہے بلکہ تمام لوگوں کے لیے نشانی ہے۔

”وَانْظُرْ اِلَ الْعِظَامِ كَيْفَ نَنْشُرُهَا مَعْمَ نَكْسُوها لَحْمًا“ :

”ننشُرُها“ کا مادہ ہے ”نَشَوَ“ اس کا معنی ہے ”ارتقاع“ اور ”بند ہونا“۔ یہاں مراد ہے بکھری ہوئی چیزوں کا جمع ہو کر باہم چوست ہونا۔ اس بناء پر اس جگہ کا معنی یوں ہوگا، بکھری ہوئی ہڈیوں کو دیکھو کہ ہم کیسے انہیں اٹھا کر ایک دوسرے سے چوست کرتے ہیں اور ان پر گوشت اکا باس اپہنا تے ہیں اور اسے زیادہ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ بوسیدہ ہڈیوں سے مراد ان کی سواری کے جانور کی ہڈیاں ہیں نہ کہ اہل بستی کی بوسیدہ ہڈیاں کیونکہ یہ امر گذشتہ جملوں سے مناسبت نہیں رکھتا۔

”فَلَمَّا قَبِلْنِ لِذَاقَاتِ اَعْمَامِ اَنْ اَعْلَهُ عَلَيَّ شَيْءٌ فَتَدِيرُ“

یہ مسائل جب پیغمبر پر آشکار ہو گئے تو وہ کہنے لگے : میں جانتا ہوں کہ فذہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ وہ یہ نہیں کہتے کہ میں نے اب جان لیا ہے، جب کہ زینا کی حضرت یوسفؑ سے گفتگو میں اس طرح ہے،

”الان حصص الحق“

یعنی اب حق واضح ہوا ہے۔

بلکہ پیغمبر کہتے ہیں : میں جانتا ہوں۔ یعنی اب اپنی آگاہی کا اعتراف کرتا ہوں۔

۲۶۰۔ وَلَا ذَقَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِي كَيْفَ تُخَيِّ الْعَوْنِ قَالَ
اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي قَالَ
فَاْخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ
عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ اذْعُرْهُنَّ سَفِيًّا
وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيْمٌ

ترجمہ

۲۶۔ اور اس وقت (گو یاد کرو) جب ابراہیم نے کہا: خدایا! مجھے دکھا کہ تو کیسے مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ فرمایا: کیا تم ایمان نہیں لاتے۔ کہنے لگے: کیوں نہیں میں چاہتا ہوں میرے دل کو اطمینان ہو جائے۔ فرمایا: یہ بات ہے تو چار پرندے انتخاب کر لو (ذبح کرنے کے بعد) انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر لو (پھر ان کے گوشت کو آپس میں ملا دو) پھر ہر پہاڑ پر ایک حصہ رکھ دو، پھر انہیں پکارو، وہ تیزی سے تمہارے پاس آئیں گے اور جان لو کہ خدایا غالب اور حکیم ہے (وہ مردوں کے اجزائے بدن کو بھی جانتا ہے اور انہیں جمع کرنے کی طاقت بھی رکھتا ہے)۔

تفسیر

بہت سے مفسرین اور مؤرخین نے اس آیت کے ذیل میں یہ نوٹ لکھا ہے:

ایک دن حضرت ابراہیمؑ دیا کے کنارے سے گزر رہے تھے۔ آپ نے ایک مردار دیا کے کنارے پڑا ہوا دیکھا۔ اس کا کچھ حصہ دیا کے اندر اور کچھ باہر تھا۔ دیا اور خشکی کے جانور دونوں طرف سے اسے کھا رہے تھے بلکہ کھاتے کھاتے ایک دوسرے سے لڑنے لگتے تھے۔ اس منظر نے حضرت ابراہیمؑ کو ایک ایسے مسئلے کی فکر میں ڈال دیا جس کی کیفیت سب تفصیل سے جانتا چلتے ہیں اور وہ ہے موت کے بعد مردوں کے زندہ ہونے کی کیفیت۔ ابراہیمؑ سوچنے لگے کہ اگر ایسا ہی انسانی جسم کے ساتھ ہو اور انسان کا بدن جانوروں کے بدن کا جز بن جائے تو قیامت میں اٹھنے کا معاملہ کیسے حل میں آئے گا جبکہ وہاں انسان کو اسی بدن کے ساتھ اٹھنا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ نے کہا: خدایا! مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا تم اس بات پر ایمان نہیں رکھتے۔ انہوں نے کہا: ایمان تو رکھتا ہوں لیکن چاہتا ہوں دل کو تسلی ہو جائے۔

خدا تعالیٰ نے حکم دیا: چار پرندے سے دو اور ان کا گوشت ایک دوسرے سے ملا دو۔ پھر اس سارے گوشت کے کئی حصے کر دو اور ہر حصہ ایک پہاڑ پر رکھ دو۔ اس کے بعد ان پرندوں کو پکارو تاکہ میدانِ حشر کا منظر دیکھ سکو۔ انہوں نے ایسا ہی کیا تو انتہائی حیرت کے ساتھ دیکھا کہ پرندوں کے اجزاء مختلف مقامات سے جمع ہو کر ان کے پاس آگئے ہیں اور ان کی ایک نئی زندگی کا آغاز ہو گیا ہے۔

اس مشہور واقعے کے مقابلے میں ایک مفسر ابومسلمؒ نے ایک اور نظریہ پیش کیا ہے جسے مشہور مفسر فخر رازیؒ نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے۔ ابومسلمؒ کا نظریہ باقی مفسرین کے برخلاف ہے لیکن چونکہ ایک معاصر مفسر مؤلف المنار نے اس کی تائید کی ہے، لہذا ہم اسے نقل کرتے ہیں۔

موصوف نے کہا ہے کہ آیت اس بات پر مرکوز وعات نہیں کرتی کہ حضرت ابراہیمؑ نے پرندوں کو ذبح کیا اور پھر حکم خدا سے انہیں زندہ کیا۔ بلکہ آیت میں تو مسند حشر و نشر واضح کرنے کے لیے ایک مثال پیش کی گئی ہے۔ یعنی اسے ابراہیمؑ! چار پرندے



لے لو اور انہیں اپنے ساتھ ایسے مانوس کر لو کہ جب انہیں پکارو تو وہ تمہارے پاس آجائیں مگر یہ ان میں سے ہر ایک کو ایک پہاڑ کی چوٹی پر بٹھا دو تو یہ کام تمہارے لیے کتنا آسان ہے۔ اسی طرح مردوں کو زندہ کرنا اور مختلف مقامات عالم سے ان کے پراگندہ اجزاء جمع کرنا بھی خدا کے لیے آسان ہے۔

اس لیے خدا نے ابراہیمؑ کو پرندوں کے بارے میں جو حکم دیا تھا وہ یہ نہ تھا کہ وہ ایسا کوئی کام کریں بلکہ صرف ایک مثال اور تشبیہ کے طور پر بیان کیا گیا تھا۔ یہ بعینہ ایسا ہے جیسے کوئی دوسرے سے کہے کہ میں فلاں کام نہایت آسانی سے اور تیزی سے کر سکتا ہوں۔ پس تم پانی کا ایک گھونٹ پو اور میں یہ کام کیسے دیتا ہوں۔ یعنی یہ میسے ہے اس قدر آسان ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے پر پانی کا گھونٹ مینا فرض ہو گیا ہے۔

دوسرے نظریے کے حامی ”صبرھن الیٹ“ سے استدلال کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب یہ لفظ ”الی“ سے متعدی ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے ”مائل کرنا“ اور ”مانوس بنانا“ اس لیے جملے کا مفہوم ہوگا کہ مذکورہ پرندوں کو اپنے ساتھ مانوس کرو۔ علاوہ ازیں ”صبرھن“ ”منہن“ ”ادعھن“ کی ضمیریں پرندوں کی طرف لٹتی ہیں اور یہ اسی صورت میں صحیح ہے کہ ہم دوسری تفسیر کو دست مل میں کیونکہ پہلی تفسیر کے مطابق بعض ضمیریں پرندوں سے متعلق ہیں اور بعض ان کے اجزاء سے متعلق جب کہ یہ مناسب دکھائی نہیں دیتا۔

ان استدلالات کا جواب ہم آیت کی تفسیر میں بیان کریں گے لیکن جس بات کی طرف یہاں اشارہ کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ آیت یہ حقیقت و وضاحت سے پیش کرتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے حشر و نشر کے محسوس مشاہدے کا تقاضا کیا تھا تاہم ان کا دل مطمئن ہو جانے اور واضح ہے کہ ایک مثال حشر و نشر کی منظر کشی نہیں کر سکتی اور نہ ہی دل کے لیے باعث اطمینان ہو سکتی ہے۔ درحقیقت عقل و منطق کے ذریعے تو حضرت ابراہیمؑ پہلے ہی حشر و نشر پر ایمان رکھتے تھے لیکن وہ چاہتے تھے کہ اس کا حس طور پر مشاہدہ کریں۔

اب ہم آیت کی تفسیر کی طرف لوٹتے ہیں تاکہ واضح ہو جائے کہ کونسا نظریہ تفسیر سے میل کھاتا ہے۔

”واذ قال ابرہم رب انی کفیت تعسی الموقوف“

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ ہو چکا ہے کہ حشر و نشر کے بارے میں یہ آیت گذشتہ آیت کے موضوع کی تکمیل کرتی ہے۔

”اگر فک کیف“ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ مشاہدہ رویت اور شہود کا تقاضا کر رہے تھے اور وہ جن اسل معاد کا نہیں بلکہ اس کی کیفیت کا۔

”قال اولم تؤمن قال بلی و لکن لیطمئن قلبی“

محکم تھا کہ مذکورہ مطالبے پر لوگ حضرت ابراہیمؑ کے ایمان کے بارے میں تزلزل کا گمان کرتے مہذا انہیں وحی ہوئی: تو کیا تم ایمان نہیں لائے ہو؟ یہ اس لیے تھا تاکہ وضاحت ہو جائے اور اس واقعے سے کسی کو غلط فہمی نہ ہو مہذا انہوں نے کہا: جی ہاں، میرا ایمان تو ہے لیکن چاہتا ہوں دل مطمئن ہو جائے۔

مہذا اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ مسئلے میں علمی اور منطقی دلائل سے یقین پیدا ہو جائے



لیکن ایمان قلب نہ ہو کیونکہ استدلال عقل انسانی کو تو راضی کر لیتا ہے لیکن دل اور جذبات انسانی کو نہیں۔ جو دونوں کو سیراب کرتا ہے وہ شہود عینی اور شہادت حسی ہی ہیں۔ یہ ایک ہم بات ہے جس کے بارے میں اس کے مقام پر مزید وضاحت کریں گے۔
 ”قال فخذ اربعة من الطير فصهرهن لينك شتم اجعلن علی کل جہل منین جزءاً“ :

”صہرہن“ کا ما = ہے ”صہور“ اور وزن قول اس کا معنی ہے ٹکڑے کرنا۔ ”ماکل کرنا“ اور ”بند آواز سے پکارنا“ یہاں پہلا معنی ہی مناسب ہے۔ یعنی چار پرندے انتخاب کرو۔ انہیں ذبح کرو اور انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے ایک دوسرے سے ملا دو۔

مقصود یہ تھا کہ حضرت ابراہیم حشر و نشر اور مردوں کے اجزاء بدن کے کچر جانے کے بعد زندہ ہونے کے نونے کا مشاہدہ کر لیں اور یہ بات پکارنے اور مانگنے کے معانی سے حاصل نہیں ہوتی خصوصاً جبکہ آیت کا بعد کا حصہ کہتا ہے ”پھر ہر پہاڑ پر ان میں سے ایک حصہ رکھ دو“ آیت کا یہ حصہ واضح گواہی دیتا ہے کہ پہلے پرندوں کو ٹکڑے ٹکڑے کیا گیا ہے اور ان کے اجزاء ہنے ہیں۔ جو کہ ”سرحن“ کا ترجمہ مانوس ہونا مانگنا کرتے ہیں وہ دراصل فقط ”جزء“ کے معنی سے غافل ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ چار پرندے : اس میں شک نہیں کہ مذکورہ چار پرندے مختلف انواع میں سے تھے کیونکہ اس کے بغیر حضرت ابراہیم کا مقصد پورا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ ہر ایک کے اجزاء اس کے اصلی بدن میں واپس آئیں اور یہ مختلف انواع ہونے کی صورت میں ہی ظاہر ہو سکتا تھا۔ مشہور روایات کے مطابق وہ چار پرندے مور، مرغ، کبوتر اور کوا تھے جو کہ کئی چلوؤں سے ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔

بعض ان پرندوں کو انسانوں کی مختلف صفات اور جذبات کا مظہر سمجھتے ہیں۔

مور : خود غائی، زیبائش اور تکبر کا مظہر ہے،
 مرغ : شدید جنسی میلانات کا مظہر ہے،
 کبوتر : ہود و لعب اور کھیل کود کا مظہر ہے اور
 کوا : لمبی چوڑی آنکھوں اور تباہی کا مظہر ہے۔

۲۔ پہاڑ کی تعداد : جن پہاڑوں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پرندوں کے اجزاء رکھے تھے ان کی تعداد کی صراحت قرآن حکیم میں نہیں ہے لیکن روایات اہل بیت میں یہ تعداد دس بتائی گئی ہے۔ اسی لیے بعض روایات میں آیا ہے کہ اگر کوئی شخص وصیت کر جائے کہ اس کے مال کا ایک جزء فلاں سے میں صرف کرنا اور اس کی مقلد معین ذکر جانے تو مال کا دسواں حصہ دینا کافی ہے۔

۳۔ واقعہ کب رونما ہوا : یہ واقعہ کب پیش آیا، جب حضرت ابراہیم بابل میں تھے یا جب شام چلے آئے تھے۔ یوں



لگتا ہے کہ یہ شام میں آنے کے بعد کا واقعہ ہے کیونکہ سرزمین بابل میں پہاڑ نہیں ہیں۔

”مشرق ادعشتی یا تینلف سعیا“ :

”پہاڑ نہیں پکارو تو وہ تیزی سے تمہاری طرف آئیں گے“ اس موقع پر ایک پرندے کے بکھرے ہوئے اجزاء جمع ہونے اور آپس میں مل گئے اور پرندے نئے سرے سے زندہ ہو گئے۔ البتہ ایسا ہونا باطل غارت اور خلاف معمول ہے لیکن اگر ہم خدا کو طبیعی قوانین پر حاکم سمجھیں نہ کہ محکوم تو پھر مسئلے میں کوئی چھیدگی نہیں رہے گی۔

ضمناً یہ بھی ایک پہلو ہے کہ بعض نے لفظ ”سعیا“ سے یہ سمجھا ہے کہ پرندے زندہ ہونے کے بعد پرواز نہ کر سکے بلکہ دھڑکراہٹیم کے پاس آئے ”سعیا“۔ عموماً لغت عرب میں تیزی سے چلنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔
خیل بن احمد مشہور عربی ادیب سے منقول ہے کہ ابراہیم پل سب سے تھے کہ پرندے ان کے پاس آئے (یعنی ”سعی“ ابراہیم سے متعلق ہے پرندوں سے نہیں)۔

بہر حال ان تمام باتوں کے باوجود کوئی مانع نہیں کہ ”سعیا“ صریح اور تیز پرواز کے لیے کنایہ ہو۔
”واعلم ان ان الله عزیز حکیم“ :

جب ابراہیم یہ حیرت انگیز منظر دیکھ چکے تو انہیں وحی ہوئی کہ یہ واقعہ دیکھ کر جان لو کہ خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے اور اس کے تمام کام حکمت کے ماتحت ہیں اور لامتناہی علم و قدرت رکھنے کی وجہ سے اس کے لیے مردوں کے منشر اجزاء کو جاننا اور انہیں جمع کرنا کوئی مشکل نہیں۔

معاد جسمانی

قیامت کے بارے میں قرآن مجید میں آنے والی بہت سی آیات معاد جسمانی کی توضیح و تشریح کرتی ہیں۔ اصولی طور پر جن لوگوں کا قرآن میں آیات معاد سے رابطہ ہے وہ جانتے ہیں کہ قرآن میں معاد سے مراد معاد جسمانی کے علاوہ اور کچھ نہیں اور معاد جسمانی کا یہ مطلب ہے کہ حشر و نشر کے وقت یہ جسم بھی پٹ آئے گا اور روح بھی۔ اسی لیے تو قرآن میں اسے احیاء المسوقیٰ ”مردوں کو زندہ کرنا کہا گیا ہے اور اگر قیامت صرف روحانی پہلو کی حامل ہوتی تو زندہ کو تنے کا اصلاً کوئی مفہوم ہی نہ تھا۔

زیر بحث آیت بھی مراعت سے اسی بدن کے منشر اجزاء کا ٹٹنا بیان کر رہی ہے جس کا نمونہ حضرت ابراہیم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

شبه آکل و مأکول

مردوں کے زندہ ہونے کے منظر کا مشاہدہ کرنے کا تقاضا حضرت ابراہیم نے جس وجہ سے کیا تھا اس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے اور وہ تھا مردہ جانور کا دریا کے کنارے پڑا ہونے کا واقعہ جسے دریا اور خشکی کے جانور کھا رہے تھے۔ اس سے معلوم



ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کا تقاضا زیادہ تر یہ تھا کہ ایک جنازہ کا بدن دوسرے جانوروں کے بدن کا جزو بننے کے بعد اپنی اصلی صورت میں کیسے پٹ سکتا ہے۔ علم عقائد میں اسی بحث کو "بند آکاں لیاکول" کہا جاتا ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ قیامت میں خدا انسان کو اسی مادی جسم کے ساتھ پٹائے گا۔ اصطلاحی الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ جسم اور روح دونوں پٹائیں گئے۔

اس صورت میں یہ اشکال سامنے آتا ہے کہ اگر ایک انسان کا بدن خاک ہو جائے اور درختوں کی جڑوں کے ذریعے کسی سبزی یا پھل کا جزو بن جائے پھر کوئی دوسرا انسان اسے کھائے اور اب یہ اس کے بدن کا جزو بن جائے یا مثال کے طور پر قوطی ماری میں ایک انسان دوسرے انسان کا گوشت کھائے تو میدانِ حشر میں کھائے ہوئے اجزاء ان دونوں میں سے کس کے بدن کا جزو بنیں گے اگر پہلے بدن کا جزو بنیں تو دوسرا بدن ناقص اور دوسرے کا بنیں تو پہلا ناقص رہ جائے گا۔ اس کا جواب یہ ہے :

فلاسفہ اور علم عقائد کے علماء نے اس قدیم اعتراض کے مختلف جواب دیے ہیں۔ یہاں سب کے بارے میں گفتگو کرنا ضروری نہیں۔ بعض علماء ایسے بھی ہیں جو قابلِ اطمینان جواب نہیں دے سکے اس لیے انہیں معاذِ جہانی سے مربوط آیات کی توجیہ و تاویل کرنا پڑی اور انہوں نے انسان کی شخصیت کو روح اور روحانی صفات میں منقسم کر دیا۔ ملائکہ انسانی شخصیت صرف روح پر منحصر نہیں اور نہ ہی معاذِ جہانی سے مربوط آیات ایسی ہیں کہ تاویل کی جائے بلکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں وہ کاملہ صریح آیات ہیں۔

بعض لوگ ایک ایسی معاد کے بھی قائل ہیں جو ظاہراً جہانی ہے لیکن معادِ روحانی سے اس کا کوئی خاص فرق بھی نہیں۔ لیکن ہم یہاں قرآنی آیات کے حوالے سے ایک ایسا واضح راستہ اختیار کریں گے جو دورِ حاضر کے علوم کی نظر میں بھی صحیح ہے البتہ اس کی وضاحت کے لیے چند پہلوؤں پر غور کی ضرورت ہے۔

۱۔ ہم جانتے ہیں کہ انسانی بدن کے اجزاء بچپن سے لے کر موت تک بار بار بدلتے رہتے ہیں یہاں تک کہ دماغ کے خلیے اگرچہ تعداد میں کم یا زیادہ نہیں ہوتے پھر بھی اجزاء کے لحاظ سے بدل جاتے ہیں کیونکہ ایک طرف سے وہ غذا حاصل کرتے ہیں اور دوسری طرف سے ان کی تحلیل ہوتی رہتی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ ایک مکمل تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ دس سال سے کم عرصے میں انسانی بدن کے گزشتہ ذرات میں سے کچھ باقی نہیں رہ جاتا لیکن توجہ رہے کہ پہلے ذرات جب موت کی وادی کی طرف روانہ ہوتے ہیں اپنے تمام خواص اور آثار نئے اور تازہ خلیوں کے سپرد کر جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انسانی جسم کی تمام خصوصیات رنگ، شکل اور قیافہ سے لے کر دیگر جسمانی کیفیات تک زمانہ گزرنے کے باوجود اپنی جگہ پر قائم رہتی ہیں اور اس کی وجہ یہی ہے کہ پرانی صفات نئے خلیوں میں منتقل ہو جاتی ہیں (غور کیجئے گا)۔

اس بنا پر ہر انسان کے بدن کے آخری اجزاء جو موت کے بعد خاک میں تبدیل ہو جاتے ہیں وہ سب ان صفات کے حامل ہوتے ہیں جو اس نے پوری عمر میں کسب کئے ہیں اور یہ صفات انسانی جسم کی تمام عمر کی سرگذشت کی بولتی ہوئی تاریخ ہوتی ہیں۔



ایک سوال اب یہاں باقی رہ جاتا ہے وہ یہ کہ اگر کسی شخص کا سدا جسم دوسرے کے اجزاء سے تشکیل پایا ہو تو اس صورت میں کیا ہے؟

اس سوال کا جواب بھی واضح ہے کہ اصولی طور پر ایسا ہونا محال ہے کیونکہ مسند آکل و ماکول کی بنیاد یہ ہے کہ ایک بدن ہے موجود ہو اور وہ دوسرے بدن سے کھائے اور پیوں پرورش پائے لہذا یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی بدن کے تمام اجزاء دوسرے بدن سے تشکیل پائیں۔ پہلے ایک بدن فرض کرنا ہوگا جو دوسرے بدن کو کھائے اس طرح دوسرے بدن کا جز بنے گا۔ کہ کل (عزیز کیجئے گا)۔

ہم نے جو کچھ کہا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ایسے بدن سے معاد جسمانی کے مسئلے پر کوئی اعتراض پیدا نہیں ہوتا اور جن آیات میں اس مفہوم کی صراحت کی گئی ہے، ان کی کسی توجیہ کی ضرورت نہیں۔

۲۶۱۔ مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِائَةُ حَبَّةٍ ۚ وَاللَّهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝

ترجمہ

۲۶۱۔ جو لوگ اپنا مال راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں وہ اس بیج کی مانند ہیں جس کے سات خوشے نکلیں اور ہر خوشے میں سودانے ہوں اور خدا جس کے لیے چاہے (اور جویاقت و ولایت رکھتا ہو) روگنیا یا کئی گنا کر دیتا ہے اور خدا قدرت و رحمت کے لحاظ سے (واسع اور) وسیع اور (تہام چیزوں سے) آگاہ و دانایا ہے۔

تفسیر

انفاق۔ طبقاتی تفاوت کا ایک حل

معاشرے کی ایک شکل جس سے انسان ہمیشہ دو چار رہتا ہے اور باوجود اتنی صنعتی اور مادی ترقی کے انسان اس میں مبتلا ہے وہ طبقاتی تفاوت ہے۔ ایک طرف فقر۔ بے چارگی اور تنگدستی ہے اور دوسری طرف مال و دولت کے ڈھیر ہیں۔

کچھ وہ لوگ ہیں کہ انہیں اپنی دولت کا اندازہ نہیں اور کچھ وہ ہیں کہ فقر و فاقہ کی ایسی تکلیف دہ حالت سے دو چار ہیں کہ ضروریات زندگی مثلاً کھانا، رہائش اور سادہ لباس بھی جھٹیا کرتا ان کے لیے ممکن نہیں۔



واضح ہے کہ جس معاشرے کا ایک حصہ دولت و ثروت کے پائے پر اور دوسرا جم غفہ فقر و فاقے کے پائے پر کھڑا ہو زندہ نہیں رہ سکتا اور ہر کسی حقیقی - عادت تک نہیں پہنچ سکتا۔ ایسا معاشرہ اضطراب، پریشانی، نفرت اور آخر کار دشمنی کا شکار ہو جاتا ہے اور اس میں جنگ ناگزیر ہوتی ہے۔ اگرچہ گزشتہ زمانوں میں بھی انسانی معاشروں میں یہ اختلاف رہا ہے لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے زمانے میں یہ حقیقی فاصلہ زیادہ ہو گیا ہے اور خطرناک ترین صورت اختیار کر چکا ہے۔

حالت یہ ہے کہ ایک طرف سے حقیقی معنی میں انسانی ہمدردی، تعاون اور مدد کے دروازے بند ہو چکے ہیں، سودجو طبقاتی اختلافات کا بہت بڑا سبب ہے اس کا دروازہ کئی مختلف شکلوں میں کھل چکا ہے۔ کیونکہ جیسے نظاموں کی پیدائش، خون ریزیوں، چھوٹی بڑی اور وحشت ناک جنگیں اس مدی کی پیداوار ہیں۔ یہ جنگیں ابھی تک دنیا کے مختلف حصوں میں جاری ہیں۔ ان سب حالات کی زیادہ تر بنیادیں اقتصادی ہیں اور یہ انسانی معشروں میں سے اکثریت کی محرومیت کا نتیجہ ہیں۔

دنیا کے اقتصادی ماہرین اور مکتبہ اس عظیم اجتماعی مشکل کی چارہ جوتی اور حل کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ ہر ایک نے ایک راستہ انتخاب کر لیا ہے کیونکہ انہوں نے انفرادی حکمت کو منظور کر دیا ہے اور سرمایہ داری نے بھاری مالیات وصول کر کے عام لوگ کے غم سے کے ہم پر بار سے قائم کر دیے ہیں جو طبقاتی تفاوت کے حل کی بجائے زیادہ تر دکھاوے پر مبنی ہیں۔ یہ سب اپنے شیں طبقاتی فاصلوں کو سمجھنے کے درپے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان میں سے کوئی بھی اس راستے میں موثر قدم نہیں اٹھا سکا کیونکہ روح مادہ پرستی جو اس وقت دنیا پر مگر ان ہے اس کی موجودگی میں اس مسئلے کا حل ممکن نہیں۔

قرآن مجید کی آیات میں غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام کا ایک ہدف اور مقصد یہ ہے کہ معاشرے میں سے غیر عادلانہ اختلافات ختم ہو جائیں جو اجتماعی بے انصافی کی وجہ سے غریب اور امیر طبقے میں پائے جاتے ہیں اور جو لوگ دوسروں کی مدد کے بغیر اپنی ضروریات زندگی پوری نہیں کر سکتے ان کی سطح زندگی بلند ہو جائے اور کم از کم لوگوں کے پاس لوازمات زندگی کو خریدنا ہونا چاہیے۔

اس مقصد تک پہنچنے کے لیے اسلام کے پاس ایک وسیع پروگرام ہے۔ اسلام نے سود خواری مطلقاً حرام قرار دی ہے، زکوٰۃ خمس وغیرہ جو کہ اسلامی مالیات ہیں ان کی ادائیگی واجب قرار دی ہے۔ انفاق، خرچ کرنے، وقف کرنے، قرض حسنہ دینے اور مختلف قسم کی مالی امداد دینے کا شوق پیدا کرنا بھی اسی پروگرام کا ایک حصہ ہے اور ان سب سے زیادہ روح ایمانی پیدا کرنا اور انسانی بھائی چارے کو زندہ کرنا اسلامی پروگرام کی عظمت ہے۔

”مثل الذین ینفقون اموالہم فی سبیل اللہ کمثل حبۃ“

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس آیت میں انفاق اور خرچ کرنے سے مراد جہاد میں خرچ کرنا ہے۔ اس لیے کہ اس سے قبل آیات میں جہاد کی گفتگو آئی ہے لیکن واضح ہے کہ یہ مناسبت تخصیص کا سبب نہیں بنتی کیونکہ ”سبیل اللہ“ مطلقاً آیات میں جہاد کے معنی میں شامل ہے۔ علاوہ ازیں بعد کی آیات گواہی دیتی ہیں کہ ان تمام آیات میں جہاد کے علاوہ دوسری بحث ہو رہی ہے اور ”انفاق“ اور خرچ کرنے کی بحث کا مستقل طور پر پتہ چلا گیا ہے۔ تفسیر مجمع البیان کے مطابق روایات میں بھی آیت کے عمومی مفہوم کی طرف اشارہ ہوا ہے۔



قابل توجہ امر یہ ہے کہ اس آیت میں ربہ خدا میں خرچ کرنے والے اشخاص کو اس پر برکت دانے سے تشبیہ دی گئی ہے جسے مستعد اور قابل زمین میں ڈالا جائے۔ چاہے تو یہ تھا کہ ان اشخاص کو دانے سے تشبیہ نہ دی جاتی بلکہ ان کے ”انفاق“ اور خرچ کرنے کو دانے سے تشبیہ دی جاتی یا خود انہیں بیج ڈالنے والے کسان سے تشبیہ دی جاتی۔ اسی لیے بعض مفسرین نے کہا ہے کہ آیت میں کوئی لفظ حذف ہو گیا ہے یا لفظ ”صدقات“ ”الصدیقین“ سے پہلے یا لفظ ”بأذنا“ ”حبۃ“ سے قبل فرض کرنا چاہیے لیکن آیت میں ایسی کوئی دلیل اور قرینہ نہیں کہ حذف یا فرض کرنے کا معاملہ درمیش ہو۔ انفاق اور خرچ کرنے والے افراد کو پر برکت دانوں سے تشبیہ بڑی جاذب نظر ہے اور یہ ایک عمیق اور گہری بات ہے۔

قرآن یہ کہنا چاہتا ہے کہ ہر شخص کا عمل اس کے وجود کا پرتو ہے اور عمل میں جتنی وسعت پیدا ہوتی ہے دراصل اتنی ہی وسعت انسانی وجود میں پیدا ہوتی ہے۔ کیا ایسا نہیں کہ انسانی اعمال انسانی قوتوں کی تبدیل شدہ صورت ہیں۔

زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن انسان کے عمل کو اس کے وجود سے جدا نہیں سمجھتا اور دونوں کو ایک ہی حقیقت کی مختلف شکلیں قرار دیتا ہے۔ اس بناء پر آیت بغیر کسی حذف اور مفروضے کے قابل تفسیر ہے اور یہ ایک عقلی حقیقت کی طرف اشارہ ہے یعنی ایسے نیک لوگ ایک پُر شریعت کی طرح ہیں جو ہر طرف اپنی خیریں اور شاخیں پھیلاتا ہے اور تمام جگہیں اس کے پُر و بال کے سامنے میں آ جاتی ہیں۔

”انبت سبع سنابل فی کل سنبلۃ مائۃ حبۃ“

اس جملے میں قرآن اس پر برکت دانے کی توصیف یوں کرتا ہے کہ اس سے سات سنبل اور خوشے اگتے ہیں ان میں سے ہر خوشے میں سو دانے ہیں۔ یوں وہ اپنی اصل سے سات سوگن ہو جاتے ہیں۔

کیا یہ ایک فرضی تشبیہ ہے

کیا ایسا کوئی دانا نہیں ہے جس سے سات سو دانے نکلیں یا پھر اس سے مراد ”ارزق“ کے دانوں جیسے دانے ہیں جن میں ایسی تعداد دیکھی جاسکتی ہے جو کہ کہتے ہیں کہ گندم وغیرہ میں یہ تعداد نظر نہیں آتی۔

لیکن یہ بات قابل توجہ ہے کہ چند سال پیشتر ایک مرتبہ کثرت سے بارشیں ہوئیں تو اخذات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ بوشہرہ کے گرد و نواح کے بعض کھیتوں میں گندم کے تنے بہت جلد اور پُر خوشہ تھے اور ان میں سے بعض اوقات ایک ہی تنے میں گندم کے چار ہزار تک دانے موجود تھے۔ یہ خود ایک دلیل ہے کہ قرآن کی تشبیہ واقعا ایک مکمل تشبیہ ہے۔

”واللہ یضاعف لمن یشاء“ واقعہ ”واسع علیہم“

”یضاعف“ کا مادہ ہے ”ضعت“ (بروزن ”شعر“)۔ یہ دوگنا یا چندگنا کے معنی میں

ہے۔ اس لیے اس جملے کا مفہوم یہ ہوگا کہ خدا جس کے لیے چاہے اس برکت کو زیادہ کر دے اور دوگنا یا کئی گنا کر دے۔ مندرجہ بالا تحریر کو نظر میں رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ کچھ دانے ایسے بھی ہیں جو سات سو سے کئی گنا زیادہ ٹھرتے ہیں۔ اس بناء پر یہ تشبیہ ایک حقیقت کی حیثیت رکھتی ہے۔

سید ایک دعویٰ اور ایک حق سچ سے بڑا کیا غیر حرم



آیت کے آخری حصے میں پروردگار کی وسعت قدرت اور تمام چیزوں سے اس کی آگاہی کی نشاندہی کی گئی ہے تاکہ خرچ کرنے والے جان لیں کہ وہ ان کے عمل اور نیتوں سے بھی آگاہ ہے اور ہر قسم کی برکت عطا کرنے پر قدرت بھی رکھتا ہے۔

۲۶۱- الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَعَزَّ
لَا يَشْبَعُونَ مِمَّا أَنْفَقُوا مَتًّا وَلَا أَذًى ۚ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ
رَبِّهِمْ ۖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ○

ترجمہ

۲۶۱- جو لوگ اپنا مال راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں اور جو کچھ انہوں نے خرچ کیا ہو اس پر کوئی منت اور احسان نہیں جتاتے اور اذیت نہیں پہنچاتے ان کی جزا ان کے پروردگار کے ہاں محفوظ ہے اور انہیں کوئی خوف ہے نہ وہ غمگین ہوتے ہیں۔

تفسیر

کس اتفاق کی قدر و قیمت ہے

اس آیت میں بھی اتفاق فی سبیل اللہ کا ذکر ملحوظ آیا ہے اور اس میں ہر وہ نیک کام شامل ہے جو خدا کے لیے انجام پذیر ہو۔

”ثُمَّ لَا يَتَبِعُونَ مِمَّا أَنْفَقُوا مَتًّا وَلَا أَذًى“ :

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ بارگاہِ پروردگار میں خرچ کرنے کی قبولیت تبھی ہے جب اُس میں احسان جتانے کا عمل نہ ہو اور کوئی ایسی چیز نہ ہو جو ضرورت مندوں کے لیے تکلیف و آزار کا باعث ہو۔ اس بناء پر جو لوگ راہِ خدا میں مال خرچ کرتے ہیں اور بعد میں احسان جتلاتے ہیں یا کوئی ایسا کام کرتے ہیں جو اذیت اور تکلیف کا باعث ہو تو وہ درحقیقت اس ناپسندیدہ عمل سے اپنا اجر اور عمل بھی کھو بیٹھتے ہیں۔

اس آیت میں جو بات اپنی طرف زیادہ توجہ مبذول کرواتی ہے یہ ہے کہ قرآن واقع میں انسانی زندگی کے سرمائے کو مادی سرمائے میں منحصر نہیں سمجھتا بلکہ روحانی اور اجتماعی سرمائے کو بھی شمار کرتا ہے۔

جو شخص کوئی چیز کسی کو دیتا ہے اور پھر اسے احسان جتلاتا ہے یا تکلیف پہنچا کر دل شکستہ کرتا ہے حقیقت میں اس نے اسے کوئی چیز نہیں دی کیونکہ اگر کچھ سرمایہ اسے دیا ہے تو کچھ لے بھی لیا ہے۔ مگر تو ایسا ہوتا ہے کہ وہ تحقیر و تذلیل اور



روحانی شگستگی دے دیے جانے والے ملے سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے اگر ایسے اشخاص کے لیے کوئی اجر اور ثواب نہ ہو تو یہ بالکل فطری اور عادلانہ معاملہ ہوگا بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایسے افراد بہت سے مواقع پر تو مقروض ہوتے ہیں نہ کہ قرض خواہ کیونکہ انسان کی عزت و آبرو مال و ثروت سے کئی درجے برتر و بالاتر ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ احسان جنکے اور اذیت پہنچانے کا ذکر آیت میں لفظ ”شہر“ کے ساتھ آیا ہے جو عام طور پر دو واقعات کے درمیان خاصے اور اصطلاح میں ”تراخی“ کے لیے ہے۔ اس لیے آیت کا معنی یہ ہوگا کہ جو لوگ خرچ کرتے ہیں اور بعد میں منت و احسان جتلاتے ہیں نہ اذیت و تکلیف پہنچاتے ہیں ان کی جزا اور اجر پروردگار کے پاس محفوظ ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا مقصد صرف یہ نہیں کہ اتفاق ادب و احترام سے اور احسان جتلاتے بغیر جو بلکہ بعد ازاں بھی احسان نہیں جتلیا جانا چاہیے۔ یہ امر اسلام کی انتہائی عمیق فطری اور انسانی خدمات میں خلوص کا پتہ دیتا ہے۔ توجہ رکھنی چاہیے کہ احسان جتنا اور اذیت پہنچانا جو اتفاق کی عدم قبولیت کا سبب ہیں فقراء اور مسکین سے مخصوص نہیں بلکہ عمومی اور اجتماعی کاموں مثلاً راہِ خدا میں جہاد کن یا فلاح و بہبود کے کام جن میں مال خرچ کرنے کی ضرورت پڑتی ہے کے بحالانے میں بھی اس امر کو ملحوظِ نظر رکھنا چاہیے۔

”لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ“

یہ جملہ خرچ کرنے والوں کو اطمینان دلاتا ہے کہ ان کی جزا اور اجر پروردگار کے پاس محفوظ ہے تاکہ وہ دلی اطمینان سے اس راہ میں بڑھ چڑھ کر قدم اٹھائیں کیونکہ جو چیز خدا کے پاس ہے نہ اس کے باوجود ہونے کا غور ہے نہ اس کے نقصان کا اندیشہ ہے بلکہ لفظ ”رب“ کے ساتھ ”ہم“ کی ضمیر (جس کا معنی ہے ان کا پروردگار) یہ گویا اس طرف اشارہ ہے کہ وہ ان کی پرورش کرتا ہے اور اس میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔

”وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ“ :

پہلے بھی بیان ہو چکا ہے کہ ”خوف“ گمراہی کے امور کے بارے میں ہوتا ہے اور حزن و اندوہ گزشتہ امور کے بارے میں۔ خرچ کرنے والے جانتے ہیں کہ ان کا اجر اور جزا بارگاہِ خدا میں محفوظ ہے اس لیے نہ وہ آئندہ اور روزِ قیامت کا خوف رکھتے ہیں اور نہ راہِ خدا میں بخشش دینے والے کے بارے میں کوئی ملال کرتے ہیں۔

۲۶۳۔ قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا أَذًى
وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ○

ترجمہ

۲۶۳۔ (ضرورت مندوں کے سامنے) پسندیدہ گفتگو اور عفو (اور ان سے تلخ باتیں کہنے سے بچنا) اس بخشش و عطا سے بہتر ہے جس کے بعد اذیت اور تکلیف پہنچائی جائے اور خدا سب سے تیار اور بردبار ہے۔



تفسیر

یہ آیت درحقیقت گذشتہ بحث کی تکمیل کرتی ہے۔ جو لوگ حاجت مندوں سے اچھی بات اور خوش کن گفتگو کرتے ہیں اور سخت لب و لہجے میں ان کے اصرار کے باوجود غفود درگزر سے کام لیتے ہیں وہ ان سے بہتر ہیں جو کچھ دینے کے بعد لوگوں کو اذیت اور تکلیف پہنچاتے ہیں۔

یہ آیت اشخاص کی اجتماعی قدر و قیمت اور وقت و حیثیت کے بارے میں اسلام کی منطبق واضح کرتی ہے۔ جو لوگ انسانیت کے سرمائے کی حفاظت کی کوشش کرتے ہیں۔ حاجت مندوں سے اچھی گفتگو کرتے ہیں۔ کبھی ان کی ضروری رہنمائی بھی کرتے ہیں اور ان کے راز بھی فاش نہیں کرتے وہ ان کے مقابلے میں اسلام کی نظر میں برتر و بالاتر ہیں جو خود پرست ہیں۔ کوتاہ نظر ہیں۔ تعویذی سی مدد کرنے عزت دار اور کبر و مند لوگوں کو زبان کے ہزار چر کے لگاتے ہیں اور ان کی شخصیت بروج کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں ایسے افراد درحقیقت جتنا فائدہ پہنچاتے ہیں اس سے زیادہ نقصان دہ اور مضر ہیں اور اگر کچھ سرمایہ دیتے ہیں تو بہت بڑا سرمایہ بہاؤ کر دیتے ہیں۔

جو کچھ اوپر کہا جا چکا ہے اس سے واضح ہوتا ہے "قول معروف" ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ ہر قسم کی اچھی بات دلجوئی اور رہنمائی اس کے مفہوم میں شامل ہے۔

"مفسرة" کا مفہوم ہے۔ حاجتمندوں کی سختی کے جواب میں غفود درگزر کرنا کیونکہ مصائب و آلام کے هجوم کی وجہ سے کبھی ان کا پائیدار صبر بریز بھی ہو جاتا ہے اور بعض اوقات وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سخت باتیں کر جاتے ہیں۔ یہ لوگ دراصل اپنا حق غصب کرنے والے ظالم معاشرے سے اس طرح انتقام لینا چاہتے ہیں اور معاشرے اور صاحبان استطاعت ان کی محرومیت کی جو کم از کم تلافی کر سکتے ہیں۔ یہ ہے کہ ان کی باتیں تحمل سے سنیں کیونکہ یہ ان کے اندر ملی ہوئی آگ کی چٹائیاں ہیں۔ انہیں نرمی اور محبت سے خاموش کرنا چاہیے۔ واضح ہے کہ ان کی سختی کو برداشت کرنا، ان کی سخت نکتہ چینی پر درگزر کرنا اور ان کے دکھ درد کی گریہوں کو ڈھیل کرنا ایک اسلامی حکم ہے اور یہ ہدایت اسلامی حکم کی اہمیت کو مزید روشن کر دیتی ہے۔

بعض نے یہاں "مفسرة" کو اس کے اصلی معنی میں لیا ہے۔ اس کا اصل معنی ہے "پردہ پوشی کرنا"۔ اس مفہوم میں اس لفظ کو حاجت مندوں کے اسرار کی پردہ پوشی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن جو کچھ ہم نے کہا ہے یہ تفسیر اس سے کوئی تضاد یا اختلاف نہیں رکھتی کیونکہ "مفسرة" اپنے وسیع مفہوم میں غفود درگزر بھی ہے اور حاجتمندوں کے رازوں کی پردہ پوشی بھی ہے۔

تفسیر نور الثقلین میں پیغمبر اسلام کی ایک حدیث یوں منقول ہے۔

"اذا سئل السائل فلا تقطعوا عليه مألته حتى يصرخ منها ثم ردوا عليه
بوقاسم ولین اما يبذل يسير او رد جیل فانته فتد یا تکم من لیس بانس



وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ كَيْفَ صَنِيعْتُمْ فِيمَا أُغْوِيَكُمْ اللَّهُ تَعَالَى

اس حدیث میں پیغمبر اکرمؐ نے خرچ کے آداب کے ایک پہلو کو واضح کرتے ہوئے فرمایا ہے:
 ”جب کوئی حاجت مندرجہ سے کوئی چیز مانگے تو جب تک وہ اپنا تمام مقصد بیان
 نہ کرے اس کی بات قطع نہ کرے۔ اس کے بعد اُسے وقار و ادب اور نرمی سے
 جواب دو۔ جو چیز تمہارے بس میں ہے اسے دے دو یا پھر شلستہ اور
 خوبصورت طریقے سے اُسے واپس کر دو۔ کیونکہ ممکن ہے سوال کرنے والا کوئی فرشتہ
 ہو جو تمہاری آزمائش پر مامور ہو تاکہ وہ دیکھے کہ خدا نے جو نعمتیں تمہیں دی ہیں
 ان کے پیش نظر تم عمل کس طرح کرتے ہو۔“

”وَاللَّهُ غَفِيرٌ حَلِيمٌ“

چھوٹے چھوٹے جملے جو عموماً آیات کے آخر میں آتے ہیں اور جن میں خدا کی بعض صفات بیان کی گئی ہوتی ہیں آیت کے
 مضمون سے یقیناً مربوط ہوتے ہیں۔ اس نکتے کی طرف توجہ رکھتے ہوئے ”وَاللَّهُ غَفِيرٌ حَلِيمٌ“ (یعنی خدا
 بے نیاز اور بردبار ہے) کے جملے سے مراد گویا یہ ہے کہ انسان چونکہ طبعی طور پر سرکش ہے اور کسی مقام و مرتبہ اور ثروت
 و دولت تک پہنچ جانے کے بعد اپنے آپ کو بے نیاز سمجھنے لگتا ہے اور یہ حالت بعض اوقات اس کی طرف سے فقراء
 اور مساکین سے گرمی اور بد زبانی کا باعث بن جاتی ہے۔ لہذا فرمایا گیا ہے کہ غنی بالذات صرف خدا سے حقیقت میں
 رہی ہے جو تمام چیزوں سے بے نیاز ہے اور انسان کی بے نیازی تو سب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی لہذا مقام
 اور دولت کی وجہ سے اسے فقراء سے بے اعتنائی نہیں برتنا چاہیے۔ علاوہ ازیں خدا لوگوں کی ناشکری کے مقابلے
 میں بردبار ہے لہذا صاحب ایمان افراد کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ مذکورہ جملہ میں اس طرف اشارہ ہو کہ خدا تمہارے انفاق اور خرچ کرنے سے بے نیاز ہے اور جو
 کچھ تم انجام دیتے ہو تمہارے ہی فائدے میں ہے۔ اس لیے تمہارا کسی پراچھان نہیں ہے۔ علاوہ ازیں وہ تمہاری سخت
 روی اور درشتی کے مقابلے میں بردبار ہے اور سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا تاکہ تم بیدار ہو کر اپنی اصلاح کر لو۔

۲۶۴۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقَتِكُمْ بِالْمَنِّ

وَالَّذِيْ كَاٰلَ ذِيْ الْقُرْبَىٰ يُنْفِقُ مَالَهُ رِثَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ
 وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَمَسْئَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهُ
 وَاِبِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا ۚ لَا يَنْفَعِدُوْنَ عَلَيْهِ شَيْءٌ مِّمَّا كَسَبُوْا



وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ۝

۲۶۵۔ وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّتٍ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَاِبِلٌ فَاَتَتْ اُكْلَهَا ضَعْفَيْنِ ۚ فَاِذَا لَمْ يُصْبِحْهَا وَاِبِلٌ فَطَلَّ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيْرٌ ۝

ترجمہ

۲۶۴۔ اے ایمان والو! اپنی بخششوں کو احسان جتانے اور آزار پہنچانے سے اُس شخص کی طرح باطل نہ کرو جو دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے، خدا اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اور اس کا کام، پتھر کے ٹکڑے کی طرح ہے جس پر مٹی کی باریک تہ ہو (اور اس میں بیج ڈالے جائیں) اور خوب بارش اس پر برسے (اور ساری مٹی اور بیج بہا لے جائے) اور اُسے (مٹی اور بیج سے) خالی کر دے۔ ایسے لوگ جو کام بجالاتے ہیں اس سے کوئی چیز حاصل نہیں کر سکتے اور خدا کا فرقہ کو ہدایت نہیں کرتا۔

۲۶۵۔ اور ان لوگوں کا (کام) جو اپنا مال خدا کی خوشنودی اور اپنی روح میں ملکاتِ انسانی باقی رکھنے کے لیے خرچ کرتے ہیں اس باخ کی طرح ہے جو بلند جگہ پر ہو، اس پر تیز بارش برسے (اور وہ کھلی ہوا اور نورِ آفتاب سے خوب بہرہ ور ہو) اور اپنا پھل دوگنا دے اور اگر اس پر سخت بارش نہ برسے اور اس پر ٹھنڈا اور شبنم پڑے (لہذا وہ ہمیشہ سسر، شاداب اور تروتازہ رہے) اور تم جو کچھ انجام دیتے ہو خدا اس سے جینا ہے۔

تفسیر

راہِ خدا میں خرچ کرنے کے اسباب و نتائج

ان دو آیات میں ہے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ اہل ایمان کو نہیں چاہیے کہ وہ راہِ خدا میں خرچ کئے گئے سرمائے کو احسان جتاکر اور آزار پہنچا کر ضائع کر دیں۔ اس کے لیے دو عمدہ مثالوں کے ذریعے دونوں طرح کے انفاق کی حیثیت کو واضح کیا گیا ہے۔ ایک وہ خرچ ہے جس میں احسان جتانا، آزار پہنچانا، ریاکاری اور خود نمائی کی آمیزش ہے اور دوسرا وہ کہ جس کا سرچرہ غلوں اور انسانی ہمدردی کے جذبات ہیں۔

پہلی مثال سخت پتھر کی ہے جس پر مٹی کی باریک سی تہ جمی ہو، اس میں بیج ڈال دیا جائے، اس پر کھلی ہوا چلے



اور سورج چمکے، پھر اس پر موٹے موٹے قطرات کی بارش خوب برے۔ مسلم است کہ ایسی بارش مٹی کی تھی ہی نہ کہ دھوڑلے کی اور بیج کو پیاسے جانے کی سخت پتھر جس میں پانی اور بیج نہیں ڈالا جاسکتا اُس پر سبزہ کیسے اُگ سکتا ہے۔ اس کی سختی ظاہر ہو جانے لگی۔ یہ سب اس لیے نہیں ہوا کہ سورج کی مدت۔ فعلی ہوا اور مذکورہ بارش کوئی برا اثر رکھتی ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیج کے لیے جو جگہ منتخب کی گئی تھی وہ مناسب نہیں تھی۔ ظاہری طور پر صحیح تھی اندرونی طور پر ناقابلِ لغو تھی اس پر صرف مٹی کی تپلی سی تہ جمی ہوئی تھی جبکہ سبزے اور درخت کی جڑوں کے لیے گہری مٹی درکار ہے تاکہ پودوں کو اس ذریعے سے غذا بھی پہنچتی رہے۔

قرآن نے ریاکاری، احسان جتانے اور آزار پہنچانے کے لیے کیے۔ کئے خرچ کو جس کا سرچشمہ، سخت اور قنات رکھنے والے دل پر، مٹی کی اس نازل تہ سے تشبیہ دی ہے جس نے سخت پتھر کے بالائی حصے کو چھپا رکھا ہو اور جس سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا جاسکتا ہو بلکہ وہ باغبان اور کسان کی محنت ضائع کر دے۔

دوسری مثال: ایک سرسبز و شاداب باغ کی ہے جو بلند اور زرخیز زمین میں ہے اس پر آندہ ہوا چلے اور واؤ دھوپ پڑتی ہے۔ موسلا دھل اور نفع بخش بارش اُس پر برسے اور جب کے موسلا دھل بارش نہ برے تب بھی شبنم اور پھوار کے ذریعے اس کی زمین ایسی زرخیز ہے کہ شبنم اور پھوار بھی اُس کے درختوں کے ثمر آ کر ہونے کے لیے کافی ہے۔ چونکہ وہ جگہ ہی پر سب اس لیے کھلی ہوا اور دھوپ سے خوب بہرہ مند ہوتا ہے۔ اس کا خوبصورت منظر یہ دیکھنے والے کی آنکھ کے لیے پرکشش ہے یہ سیلاب کے خطرے سے بھی محفوظ ہے۔

جو لوگ اپنا مال خدا کی خوشنودی اور اپنے قلب و روح میں ایمان و یقین کو استوار کرنے کے لیے خرچ کرتے ہیں وہ اس باغ کی طرح ہیں جو پر برکت و سفید اور بیش بہا پھل دینے والا ہو۔

چند اہم نکات

۱۔ بعض اعمال نیک اعمال کے نتائج کو ختم کر دیتے ہیں :- "لا تبطلوا صدقاتکم بالعن" والا ذمہ :- (یعنی اپنے صدقات کو احسان جتنا کر اور ایذا رسانی سے باطل نہ کرو۔) اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ ممکن ہے کہ کچھ اعمال نیک اعمال کے نتائج کو ختم کر دیں۔ یہ وہی مسئلہ احیاء ہے جس کی تفصیل اسی سورہ کی آیت ۲۱۷ کے ذیل میں گزر چکی ہے۔

۲۔ ریاکاری کی مشابہت :- وہ پتھر جس پر مٹی کی باریک سی تہ ہو اس کی ریاکارانہ عمل سے مشابہت واضح ہے۔

۳۔ "صفوان" جسے۔ اس کا مفرد "صفوان" ہے اس کا معنی ہے صاف و شفاف پتھر۔ "واہل" سخت اور موٹے قطرات والی بارش کو کہتے ہیں۔ "معد" کا معنی بھی صاف پتھر ہے۔ "ضعیف" کا معنی ہے اس کا معنی ہے دو گنا اور تفتیہ ہونے کی وجہ سے اس کا معنی چرگ نہیں ہو جاتا مثلاً جیسے زمین ہے جو کہ درخت کی نشاندہی کرتا ہے وغیرہ سمجھئے گا۔



یا کار لوگ اپنے سخت اور بے شرم باطن کو خیر خواہی اور نیکی کے چہرے سے چھپا لیتے ہیں اور ایسا عمل بجا لاتے ہیں جن کی جڑیں ان کے وجود میں استوار نہیں ہیں لیکن زندگی کے واقعات و حوادث بہت جلد اس پر دے کو ہٹا دیتے ہیں اور ان کے باطن کو آشکار کر دیتے ہیں۔

(۱۲) اتفاق کے اسباب: "ابتغاء مرضات الله وتشيئنا من انفسهم" (یعنی جو اپنا مال خوشنودی خدا اور اپنے آپ میں انسانی فضائل باقی رکھنے کے لیے خرچ کرتے ہیں، سے ظاہر ہوتا ہے کہ صحیح اللہ خدا کیسے خرچ کرنے کے دو اسباب ہیں۔)

(۱۱) خوشنودی خدا

(۱۲) روح ایمان کی تقویت اور ایمان قلب

اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ خدا میں خرچ کرنے والے دراصل وہ لوگ ہیں جو صرف خوشنودی خدا اور فضائل انسانی کی پرورش اور اپنی مدح میں ان صفات کے ثبات و استقامت کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ اس اضطراب اور دکھ کو دور کرنے کے لیے خرچ کرتے ہیں جو عہد و موعود کو دیکھ کر احساس ذمہ داری اور مسکونیت کے پیش نظر ان کے وجدان میں پیدا ہو جاتا ہے اس بناء پر آیت میں لفظ "من" "فی" کے معنی میں ہوگا۔

(۱۴) خدا بصیر ہے: دوسری آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے "والله بما تعملون بصير" (یعنی تم جو کچھ انجام دیتے ہو خدا اُسے دیکھنے والا ہے) یہ جملہ نیک اعمال انجام دینے والوں کے لیے ہے کہ جب بھی وہ کوئی عمل خیر انجام دیں تو توجہ رکھیں کہ نیت یا عمل میں معمولی سی آلودگی بھی پیدا نہ ہو کیونکہ خدا تعالیٰ ان کے اعمال کی نگرانی کرتا ہے۔

۲۶۶۔ اَيُّوْذَ اَحَدِكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهُ جَنَّةٌ مِّنْ تَّخْيِيلِ
وَ اَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ لَهُ فِيْهَا مِنْ كُلِّ
الشَّمَرَاتِ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّتٌ ضَعْفَاءٌ
فَاَصَابَهَا اِغْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ
اللهُ لَكُمْ الْاٰيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝

ترجمہ

۲۶۶۔ کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ اس کا کھجوروں اور انگور کا باغ ہو جس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں۔ اس باغ میں اُس کے لیے ہر طرح کا پھل موجود ہو لیکن وہ بڑھاپے کو پہنچ چکا ہو اور اُس کی اولاد اچھوٹی اور کمزور ہو (ایسے میں) آگ کا زبردست گولہ اُسے اور جلاؤں سے (جو لوگ خرچ



کے ریاکاری، احسان جتلا نے اور ایذا رسانی کے ذریعے اس غل کو باطل کر دیتے ہیں ان کی حالت ایسی ہی ہے، خدا اس طرح اپنی آیات آشکار کرتا ہے کہ شاید تم غور و فکر کرو اور سوچ سمجھ کر راہ حق کو پا لو۔

تفسیر

ایک اور مثال

”ایوذ احدکم ان تکون لہ جثۃ.....“

انسان کو روز قیامت، اعمال صالح کی سخت ضرورت ہوگی نیز ریاکاری، احسان جتلا اور کسی کو تکلیف پہنچانا انفاق اور عمل صالح کو ضائع کر دیتا ہے یہ مطالب واضح کرنے کے لیے زیر نظر آیت میں ایک اور عمدہ مثال بیان کی گئی ہے۔ یہ ایسے شخص کی مثال ہے جس کا ایک سرسبز و شاداب باغ ہو اس میں کھجوروں اور انگوروں جیسے طرح طرح کے پھل دار درخت ہوں، درختوں کے نیچے پانی بہتا رہتا ہو اور آبیاری کی احتیاج نہ ہو۔ وہ شخص بڑھا بھوکا ہو، اس کی اولاد بھی کمزور و ناتواں ہو اور ان کی زندگی کا دار و مدار اسی باغ پر ہو۔ اب اگر یہ باغ اُڑ جائے تو وہ اور اس کی اولاد اسے آباد نہیں کر سکتے۔ اگر اچانک آتش بد آدھی کے گھر سے اس باغ پر برسے لگیں اور اسے جھا کر خاکستر کر دیں تو اس وقت وہ بڑھا بھوکا شخص جو جوانی کی توانائیاں کھو چکا ہے اور کسی اور ذریعے سے اپنے اخراجات بھی پورے نہیں کر سکتا تو اس کی حالت کی ہوگی۔ ایسی حسرت و غم کی کیفیت سے دوچار ہوگا۔ جو لوگ نیک عمل بھلاتے ہیں اور پھر ریاکاری، احسان دھرنے اور اذیت دینے سے اسے ضائع کر دیتے ہیں اسی شخص کی طرح ہیں جس نے محنت سے باغ تیار کیا ہو اور جب پھل حاصل کرنے کی ضرورت ہو تو اس کے کام کا نتیجہ باطل برباد ہو جانے اور اس کے پاس حسرت و اندوہ کے علاوہ کوئی چیز باقی نہ رہے۔

”کذلک یبیت اللہ لکم الذل لعلکم تتفکرون“

تمام بد مختیوں کا سرچشمہ یہ ہے کہ غور و فکر سے کام نہ لیا جائے جس ضمن میں خصوصاً ایسے کام ہیں جو بے وقوف لوگ کرتے ہیں مثلاً احسان جتلا، جن کا فائدہ بہت کم اور نقصان بڑی تیزی سے اور بہت زیادہ ہوتا ہے اس لیے آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ لوگوں کو غور و فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے اور فرماتا ہے: اس طرح خدا تمہارے لیے اپنی آیات کی وضاحت کرتا ہے کہ شاید تم غور و فکر کرو۔

چند اہم نکات

”واصحابہ الکبر ولہ ذریرۃ ضعیفۃ“ یعنی باغ کا مالک بڑھا بھوکا ہے اور اس کے بچے ابھی کمزور و ناتواں ہیں۔ اس جملے سے لگتا ہے کہ راہ خدا میں بخشش کرنا اور ضرورت مندوں کی مدد کرنا غرے کے باغ کی طرح ہے جسکے پھلوں سے انسان خود بھی بہرہ مند ہوتا ہے اور اس کی اولاد بھی جب کہ ریاکاری، احسان دھرنے اور ایذا رسانی خود انسان کی اپنی عرویت کا سبب بنتی ہیں اور اسکی ایک وکیل بھی اس سے عرویت کا شکار ہوتی ہیں حالانکہ انہیں تو اس کے نیک اعمال اور ثمرات کا فائدہ پہنچنا چاہیے تھا۔



یہ بات اس امر کی بھی دلیل ہے کہ آئندہ نسلیں گزشتہ نسلوں کے اعمال نیک کے نتائج میں حصہ دار ہوتی ہیں۔ عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے کیونکہ آباؤ اجداد اپنے نیک کاموں کی وجہ سے لوگوں کے افکار میں جو ایک محبوبیت اور اعتماد پیدا کر لیتے ہیں وہ ان کی اولاد کے لئے بھی ایک بہت بڑا سرمایہ ہوتا ہے۔

”اعصار فیہ نادر“: یعنی۔۔۔ جو کچھ بگولہ جس میں آگ بھی ہو۔ ممکن ہے یہ ان بگولوں کی طرف اشارہ ہو جو بگولہ نما جلانے والی اور خشک کر دینے والی ہوا ہوتی ہے۔ یا پھر اس سے وہ بگولہ مراد ہے جو آگ کے لالٹوں سے گزرتے اور عام طور پر بگولے کے راستے میں جو چیز آتی ہے وہ اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے تو ہو سکتا ہے وہ آگ کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ جاسیکے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ صاعقہ کے ساتھ چڑھنے والے بگولے کی طرف اشارہ ہو جو تمام چیزوں کو خاکستر کر دے۔ بہر حال یہ نوری اور مکمل نابودی کی طرف اشارہ ہے۔ لہ

۲۶۷۔ یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْصِفُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَلَا تَتَّبِعُوا الْخَبِيثَاتِ مِنْهُ تَنْصِفُونَ وَلَسْتُمْ بِأَخْذِيهِ إِلَّا أَنْ تُغْنِضُوا فِيهِ ۖ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَمِيدٌ ○

ترجمہ

۲۶۷۔ اے ایمان والو! پاکیزہ اموال (جو تجارت کے ذریعے) تمہارے ہاتھ آئے ہیں اور جو ہم نے تمہارے لیے زمین (کے خزانوں اور معدن) سے نکالے ہیں خرچ کرو حالانکہ یہ اموال (قبول کرتے وقت) تم چشم پوشی کرتے ہوئے اور ناپسندیدگی کے علاوہ قبول کرنے کو تیار نہیں ہو اور جان لو کہ خدا بڑا بے نیاز اور لائق تعریف ہے۔

شانِ نزول

امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ یہ ایک گروہ کے بارے میں نازل ہوئی جس نے زمانہ جاہلیت میں سود کے طور پر دولت جمع کر رکھی تھی اور اس میں سے راہِ خدا میں خرچ کرتا تھا۔ خدا تعالیٰ نے انہیں اس کام سے رد کیا اور انہیں حکم دیا کہ وہ پاک اور حلال مال سے خرچ کریں۔

سہ لغت میں اعصار کا معنی وہ بگولہ ہے جو جوا کے چلتے وقت دو مختلف سمتوں سے ہوتا ہے اور عمودی شکل میں ہوتا ہے۔ اس کا ایک سر زمین سے پٹا ہوتا ہے اور دوسرا سر آسمان میں ہوتا ہے۔



تفسیر مجمع البیان میں یہ حدیث نقل کرنے کے بعد حضرت علی علیہ السلام سے ایک روایت بیان کی گئی ہے کہ آپ نے فرمایا:

”یہ آیت ایسے لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو خرچ کرتے وقت خشک، کم مادہ اور غیر مرغوب کھجوریں، اچھی کھجوروں میں ملا کر دیتے تھے۔ اس میں انہیں حکم ہوا کہ اس کام سے اجتناب کریں۔“

دونوں شان نزول ایک دوسرے سے کوئی اختلاف نہیں رکھتیں۔ ممکن ہے یہ آیت دونوں گروہوں کے بارے میں نازل ہوئی ہو یعنی ایک معنوی پاکیزگی کی طرف اور دوسری ظاہری اور عام مرغوبیت کے بارے میں ہو۔ لیکن خیال رہے کہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۷۵ کے مطابق جن لوگوں نے زمانہ جاہلیت میں سودی ذرائع سے کچھ مال جمع کر لیا تھا اور اس آیت کے نزول کے بعد انہوں نے سود خوری کو جاری رکھنے سے اجتناب کیا مگر گذشتہ مال ان پر حرام نہیں ہوا تھا یعنی یہ قانون گذشتہ اموال کے لیے نہ تھا اور حقیقت میں ان اموال سے مشابہ تھا جو ناپسندیدہ طریقے سے حاصل کئے گئے ہوں۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں انفاق کے ثمرات و فوائد اور خرچ کرنے والوں کی صفات بیان کی گئی ہیں نیز وہ اعمال بھی بتائے گئے ہیں جو انسانی اور خدا پسند کاموں کو آلودہ کر سکتے ہیں اور ان کی جزاء اور ثواب ختم کر سکتے ہیں۔ اب اس آیت میں یہ تشریح کی گئی ہے کہ کیسے مال کو خرچ کیا جانا چاہیے۔ آیت کے پہلے حصے میں خدا ایسا نذر لوگوں کو حکم دیتا ہے کہ اپنے اموال میں سے ”طہنیات“ کو خرچ کرو۔

ہم جانتے ہیں کہ ”طہنیہ“ کا لغوی معنی پاکیزہ اور طہنیات اس کی جمع ہے۔ یہ لفظ جیسے ظاہری اور مادی پاکیزگی کے لیے بولا جاتا ہے اس طرح معنوی اور باطنی پاکیزگی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ یعنی وہ مال جو عمدہ، مفید اور قیمتی بھی ہے اور ساتھ ساتھ ہر قسم کے شبہ اور آلودگی سے بھی مبرا ہے۔

لہذا شان نزول جن کا ذکر کیا گیا ہے آیت کے معنی کی عمومت کی بھی تائید کرتی ہیں۔

”لستم باخذہ اذا انت تضعضوا فیہ“ (یعنی تم تیار نہیں ہو کہ غیر طہنیہ مال قبول کرو۔ مگر چشم پوشی اور کراہت کے ساتھ، یہ جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ دوسری ظاہری پاکیزگی ہو کیونکہ اہل ایمان نہ اس کے لیے تیار ہوتے ہیں کہ جو مال ظاہری طور پر آلودہ اور بے قیمت ہو اسے قبول کر لیں اور نہ شبہ والے، ناپسندیدہ اور مکروہ مال کو قبول کرتے ہیں مگر چشم پوشی اور کراہت کے ساتھ۔

”و مقلنا اخراجنا لکم مقلنا الا برضی“

”ما کسبتکم“ (جو کچھ تم نے کسب کیا ہے)۔ یہ لفظ تجارتی اموال کی طرف اشارہ ہے اور ”مقلنا“ اخراجنا.....“ (زر مقلنا، معدنی اور زیر زمین سرچشموں کی دولت کے بارے میں ہے۔ اس بناء پر تمام طرح کے اموال



کا ذکر آگیا ہے کیونکہ تمام انسانی اموال کی بنیاد زمین اور اس کے گونا گوں منایع ہیں۔ یہاں تک کہ صنعتیں، تجارتیں، جانوروں کا کاروبار اور ایسی دیگر چیزوں کی بنیاد یہی ہے۔

ضمناً اس جیسے کے مطابق تمام منایع انسان کے اختیار میں دے دیے گئے ہیں۔ اس لیے راہ خدا میں کسی اچھے مال کو خرچ کرنے میں کوئی معائنہ نہیں سمجھنا چاہیے۔

”وَلَا تَيْسَرُوا الْعَيْثَ مِنْهُ تَمَتُّعُونَ وَلَا تَمْنُوا فِيهِ“

بعض لوگوں کی عادت ہے کہ ہمیشہ وہ مال جو بے قیمت ہو اور تقریباً ناقابل استعمال ہو اور خود ان کے لیے کام کا نہ ہو اسے خرچ کرتے ہیں۔ ایسے خرچ نہ انسان کی اپنی تربیت کا باعث بنتے ہیں اور نہ انسانی روح کی پرورش کا ذریعہ بنتے ہیں اور ضرورت مندوں کے لیے بھی یہ کوئی خاص فائدہ مند نہیں ہوتے بلکہ ایسے ان کی ایک طرح سے تحقیر و توہین ہوتی ہے لہذا یہ جلد لوگوں کو صراحت سے اس کام سے منع کر رہا ہے۔ فرمایا گیا ہے، ایسے مال سے کس طرح خرچ کرتے ہو جب کہ تم خود اسے کراہت و مجبوری کے سوا قبول کرنے کو تیار نہیں ہو۔ تو کیا تمہارے مسلمان بھائی بلکہ اس سے بڑا گروہ خدا کی راہ میں خرچ کر رہے ہو تبدیلی نگاہ میں خود تم سے بھی کمتر ہیں۔

آیت درحقیقت ایک باریک بینی کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور وہ یہ کہ جو اخراجات اللہ کی راہ میں ہوتے ہیں ان میں ایک طرف تو حاجت مند، فقراء اور مسکین ہیں اور دوسری طرف خدا ہے جس کے لیے اخراجات کیے جاتے ہیں، اس حالت میں اگر بہت اور بے قیمت مال کا انتخاب کیا گیا تو ایک طرف پروردگار کے مقام بندگی تو میں شہد ہوگی کہ اسے طیب و پاکیزہ اجناس کے لائق نہ سمجھا گیا اور دوسری طرف حاجت مندوں کی تحقیر ہے کیونکہ ممکن ہے ہتی دست ہونے کے باوجود وہ ایسا مال اور انسانیت میں بلند مقام رکھتے ہوں اور وہ ایسے انفاق سے روحانی طور پر آزرہ اور دکھی ہوں۔

ضمناً اس بات کی طرف بھی توجہ رہے کہ ”وَلَا تَيْسَرُوا“ یعنی ”تھک نہ کرو“ ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ اموال انفاق میں اگر نہ جانتے ہوئے کوئی ناپسندیدہ چیز شامل ہو گئی ہے تو اس گفتگو میں اسے شامل نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ یہ گفتگو تو ان لوگوں کے بارے میں ہے جو جان بوجھ کر ایسے کام کرتے ہیں۔

”وَأَعْلَسُوا أَنْتَ اللَّهُ غَنَىٰ حَمِيدٌ“

ارشاد فرمایا گیا ہے: جان لو کہ خداوند عالم بے نیاز اور ہائے تعریف ہے یعنی اس امر کی طرف متوجہ رہو کہ اس خدا کی راہ میں خرچ کدہ ہمہ جو جسے تمہارے خرچ کرنے کی ضرورت نہیں اور حمد و ستائش کے لائق وہی ہے جس نے یہ تمام نعمتیں تمہارے اختیار میں دی ہیں۔

ممکن ہے ”حمید“ کا معنی ”حمد و تعریف کرنے والا“ یعنی بے نیاز ہونے کے باوجود جب تم خرچ کرتے ہو تو وہ تمہاری تعریف کرتا ہے۔ اس لیے اپنے پاکیزہ اموال سے خرچ کرنے کی کوشش کرو۔



۲۶۸۔ الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُم بِالْفَحْشَاءِ
وَاللَّهُ يَعِدُكُم مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا وَاللَّهُ وَاسِعٌ
عَلِيمٌ ۝

ترجمہ

۲۶۸۔ شیطان تمہیں (خرچ کرتے وقت) فقر و فاقہ اور تنگ دستی کے وعدے دیتا ہے اور معصیت اور برائیوں کی دعوت دیتا ہے لیکن خدا تم سے مغفرت و بخشش اور اضافے کا وعدہ کرتا ہے اور خدا کی قدرت وسیع ہے اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے (اس لیے وہ اپنا وعدہ پورا کرے گا)۔

تفسیر

انفاق کی رکاوٹوں اور شیطانی افکار سے مقابله

آیت کا پہلا حصہ کہتا ہے کہ خرچ کرتے وقت اور زکوٰۃ دیتے وقت شیطان تمہیں فقر و تنگ دستی سے ڈراتا ہے۔ خصوصاً جب اچھے اور قابل توجہ اموال خرچ کرنا چاہو جن کی طرف گزشتہ آیت میں اشارہ ہوا ہے اکثر اوقات یہ شیطانی وسوسہ خرچ کرنے میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے بلکہ زکوٰۃ خمس اور دیگر واجبات پر بھی اثر انداز ہو سکتا ہے۔ خدا تعالیٰ انسان کو آگاہ کر رہا ہے کہ تنگ دستی کے خوف سے انفاق اور راہ خدا میں خرچ کرنے سے بچنا غلط فکر اور شیطانی وسوسہ ہے اور ممکن ہے انسان کی نظر میں ہو کہ یہ خوف اگرچہ شیطان کی طرف سے ہے پھر بھی ایک منطقی خوف تو ہے لہذا بلا فائدہ فرماتا ہے ”وَيَأْمُرُكُم بِالْفَحْشَاءِ“ شیطان تمہیں معصیت اور گناہ کا حکم دیتا ہے، اس لیے فقر و فاقہ اور تنگ دستی سے ڈنا ہر حالت میں غلط ہے کیونکہ شیطان باطل اور گمراہی کے سوا کسی چیز کی دعوت نہیں دیتا۔ اصولی طور پر ہر منطقی، مانع اور کوتاہ فکر کی بنیاد فطرت سے انحراف اور شیطانی وسوسوں کے سامنے سرسید خم کرنا ہے لیکن ہر مشیت، اصلاحی، محرک اور بلند فکر کا سرچشمہ خدائی الہامات اور خدا داد پاک فطرت ہے۔

اگر اس بات کی طرف توجہ رہے کہ شیطانی وسوسے قوانین فطرت اور سنت الہی کے برخلاف ہیں تو یہ واضح ہو جائے گا کہ ان کا نتیجہ منفی اور نقصان دہ بنتی پر مبنی ہوگا۔

اس کے مقابلے میں پروردگار عالم کے فرامینِ خلقت و فطرت سے ہم آہنگ اور اس کے ہم اندیش ہیں اور ان کا نتیجہ سعادت بخش زندگی ہے۔

وضاحت یہ ہے کہ پہلی نظر میں انفاق اور مال خرچ کرنا، مال کم کرنے کے سوا کچھ نہیں اور یہی کوتاہ بینی کا شیطانی نظریہ



ہے لیکن وقت گزر اور دوست نکلا رہے دیکھا جاتے تو اتفاق معاشرت کی بقا کا ضامن۔ عدالت اجتماعی کے قیام کا ذریعہ، طبقاتی فاسلوں کو کم کرنے کا سبب اور پورے معاشرے اور مادیوں کی پیش رفت کا ذریعہ ہے۔ یہ سبب ہے کہ معاشرے کی اجتماعی پیش رفت میں افراد کو رعایت اور آسائش و آرام میسر آئے اور یہی حقیقت شغلی کا الٹی نظریہ ہے۔

قرآن اس ذریعے سے مسلمانوں کو متوجہ کرتا ہے کہ اتفاق اگرچہ ظاہری طور پر تم سے کسی چیز کو کم کر دیتا ہے لیکن حقیقت تمہارے سرمائے میں "نہی اور مادی ہر دو لحاظ سے بہت سی چیزوں کا اضافہ کر دیتا ہے۔

آج کی دنیا میں طبقاتی کشمکش کے نتیجے میں اور فقیر دوست میں عدم اعتدال کی وجہ سے انسانی سرمائے کی پامالی کی جو صورت پیدا ہو چکی ہے اس کے پیش نظر مندرجہ بالا آیت کے معنی کو سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔

آیت سے ضمنی طور پر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ترک اتفاق اور فحش و فبیح امور کے درمیان ایک خاص ربط ہے البتہ فحش سے بخل مراد لیا جانے تو پھر اس کا ترک اتفاق سے ربطیوں ظاہر ہوگا کہ اس طرح آہستہ آہستہ انسان میں صفت بخل پیدا ہو جائے گی جو بدترین صفات میں سے ایک ہے اور اگر فحشاء کا معنی مطلق گناہ یا جنسی برائیاں لیا جائے تب بھی ترک اتفاق سے اس کا ربط کسی سے پوشیدہ نہیں کیونکہ بہت سے گناہوں، آلودگیوں اور خود فروشیوں کا سرچشمہ فقر و ناتوانی اور تنگ دستی ہے۔ علامہ ابراہیم اتفاق ایک معنوی آثار و برکات کے سلسلے کا بھی حامل ہے جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔

”وَاللّٰهُ يَعْلَمُ عَمَلَكُمْ صَعْمَةً“ وقتہ و فضلہ :

تفسیر "جمع البیان" میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے :

اتفاق کرتے وقت دو چیزیں خدا کی طرف سے ہیں اور دو چیزیں شیطان کی طرف سے ہیں۔ خدا کی طرف سے گناہوں کی بخشش اور رحمت مال ہے اور شیطان کی طرف سے فقر و تنگ دستی کا وعدہ اور فحشاء و منکر کا حکم دیتا ہے۔

اس بناء پر حضرت سے مراد گناہوں کی بخشش ہے اور فضل سے مراد جیسا کہ ابن عباس سے منقول ہے اتفاق کے ذریعے سرمائے میں اضافہ ہے۔

ایک بات کی طرف اوجہ توجہ رہے اور وہ یہ کہ حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام سے منقول ہے۔ آپ نے فرمایا :

جب سختی اور تنگ دستی میں مبتلا ہو جاؤ تو اتفاق کے ذریعے خدا سے معاف کرو

یعنی اتفاق کرو تا کہ تنگ دستی سے نجات پا جاؤ۔۔۔

”وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ“ :

اسا جیسے یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ خدا تعالیٰ چود و وسیع قدرت اور آفتابا ہی علم رکھتا ہے اس لیے وہ اپنے وعدہ پر عمل کر سکتا ہے۔ لہذا اس کے وعدے پر یقین کرنا چاہیے نہ کہ فریب کا اور تاہم شیطان کے وعدے پر جو انسان کو گناہ کی طرف کھینچ



ہے جتنا ہے۔ چونکہ وہ مستقبل سے آگاہ نہیں ہے اور قدرت بھی نہیں رکھتا۔ اس لیے اس کا وعدہ مگر کسی اور نادانی کی تشریح کے
عدہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

۲۶۹۔ یُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ
أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ۝

ترجمہ

۲۶۹۔ حکمت و دانش جسے چاہتا ہے (اور اہل دیکھتا ہے) عطا کرتا ہے اور جسے حکمت و دانش دی گئی
اسے بہت بھلائی عطا کی گئی اور عقلمندوں کے سوا (ان حقائق کو) کوئی نہیں پاسکتا (اور نہ کوئی سمجھ سکتا ہے)

تفسیر

لفظ حکمت کے بہت سے معانی بیان کیے گئے ہیں مثلاً "جہان مستی کی معرفت و شناخت" "حقائق قرآن کا علم"
"اقتدار و کردار کے لحاظ سے حق تک پہنچنا" اور "خدا کی معرفت و آشنائی" وغیرہ۔ یہ سب معانی ایک وسیع مفہوم میں
یکجا ہو جاتے ہیں۔

اس آیت کی گزشتہ آیات سے مناسبت یہ ہے کہ بعض افراد کو خدا تعالیٰ ان کی پاکیزگی اور کوشش کی وجہ
سے ایک علم و آگاہی عطا کرتا ہے جس کی بنا پر وہ نہایت عمدہ طریقے سے معاشرے میں اتفاق کے فوائد و آثار اور نقوش
حیات کا ادراک کر لیتے ہیں اور خدائی انعامات اور شیطانی وسوسوں میں فرق کو جان پیتے ہیں دوسرے لفظوں میں گزشتہ
آیت میں چونکہ اس بات پر گفتگو تھی کہ خدا تعالیٰ اتفاق کے نتیجے میں بخشش و برکت کا وعدہ کرتا ہے اور شیطان انسان کے دل
میں نفوذ و فساد کا دوسرا پیدا کرتا ہے اس لیے زیر نظر آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ حکمت ہی ایسی چیز
ہے جو خدائی اور شیطانی وعدوں میں فرق کر سکتی ہے اور گمراہ کرنے والے وسوسوں سے نجات بخشتی ہے۔

واضح ہے کہ "مَنْ يَشَاءُ" جسے وہ چاہتا ہے، سے یہ مراد نہیں کہ حکمت و دانش بغیر کسی وجہ سے اسے یا
اسے دی جاتی ہے بلکہ خدا کی مشیت و ارادہ تمام امور میں حکمت سے منسلک ہے۔ یعنی جس شخص کو وہ اہل سمجھتا ہے
اسے دیتا ہے اور اس حیات بخش، صاف و شفاف اور شیریں سرچشمے سے سیراب کرتا ہے۔
"وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا"۔

حکمت بخشنے والا اگرچہ خدا ہی ہے لیکن اس جملے میں اس کا نام نہیں لیا گیا، صرف یہ فرمایا گیا ہے: جس کسی کو حکمت
دی جاتی ہے اسے بہت سی خیر دی گئی ہے، اور جس طرف سے ہے اس کے خیر کرنے میں کوئی فرق نہیں۔
یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ اس جملے میں فرمایا گیا ہے کہ جسے دانش و حکمت دی گئی ہے، اسے بہت سی خیر و برکت



مل گئی ہے۔ مطلق "خیر" نہیں کہا گیا کیونکہ خیر و سعادت صرف دانش و حکمت میں نہیں ہے بلکہ حکمت اس کا ایک اہم عامل ہے۔
 "وَمَا يَذْكُرُ إِلَّا أُولَٰئِ الْأَلْبَابُ" :

"تذکر" کا معنی ہے "یاد آوری" اور "روح میں علوم اور دانائیوں کی حفاظت" "الْبَاب" "درب" کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے "مغز" چونکہ ہر چیز کے بہترین اور بنیادی حصے کو مغز کہتے ہیں اس لیے عقل و خرد کو "لب" کہا جاتا ہے اس جیسے میں کہا گیا ہے کہ صرف صاحبانِ عقل و خرد ہی ان حقائق کو یاد رکھتے ہیں، دوسروں کو یاد دلاتے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اگرچہ دیوانوں کے علاوہ سب لوگ صاحبِ عقل ہیں لیکن سب کو "أُولَٰئِ الْأَلْبَابُ" نہیں کہا جاتا۔ بلکہ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو عقل و خرد کو کام میں لاتے ہیں اور اس چراغِ پر فروغ کے ذریعے راہِ حیات پاتے ہیں۔

۲۴۰۔ وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ نَفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُمْ مِنْ نَذِيرٍ فَإِنَّ
 اللَّهَ يَعْلَمُهُ ۖ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ○

ترجمہ

۲۴۰۔ جو چیز خرچ کرتے ہو! (جن اموال کو راہِ خدا میں خرچ کرنے کی) نذر کرتے ہو خدا انہیں جانتا ہے اور مستغروں کا کوئی یار و مددگار نہیں۔

تفسیر

آیت کہتی ہے: راہِ خدا میں جو کچھ خرچ کرو وہ واجب ہو یا غیر واجب، کم ہو یا زیادہ..... حلال طریقے سے حاصل شدہ ہو یا حرام سے، خلوص سے ہو یا ریاکاری سے، احسان جتنا کرو ہو یا ایذا پہنچا کر یا اس کے بغیر، ایسے اموال میں سے جنہیں خرچ کرنے کا خدا نے حکم دیا ہے یا انسان نے نذر کے ذریعے اپنے اوپر واجب کر لیا ہو۔ غرض جس طرح کا بھی ہو خدا اس کی تمام خصوصیات کو جانتا ہے اور اس کی جزا بھی ہو یا بُری، ضرور دے گا۔
 "وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ" :

یہ جملہ کہتا ہے: مستغروں اور ظالموں کا کوئی یار و مددگار نہیں۔ یعنی جو لوگ راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں اور اس کے ذریعے محروموں اور تہمتی دستوں کو مصیبت سے نجات دہتے ہیں یا ایسے کاموں میں مال صرف کرتے ہیں جو اجتماعی مفاد میں ہو اور عام لوگوں کی رفاه و آسائش کے لیے ہو تو ان کے لیے یہ اخراجات پشتِ پناہ اور توی مددگار ثابت ہوں گے جب کہ تکمیلِ سزاوار یا ریاکاری و مردم آزاری کے ساتھ خرچ کرنے والے اس یار و مددگار سے محروم ہوں گے۔

ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ قیامت کے دن کے لیے جو سزائیں ریاکاروں، بخیلوں، احسان دھرنے



دلوں اور لوگوں کو اذیت پہنچانے والا، کے اعتبار میں یہی ان سے بچانے کے لیے کوئی بھی ان کی حمایت اور شفقت نہیں کرے گا۔ یہ ظالم وہ ہیں جنہوں نے عوام کے حقوق پامال کیے ہیں اس لیے کوئی اُس عظیم عدالت میں ان کا دفاع نہیں کرے گا۔

ہر ظلم اور ہر ستم کا بھی اثر ہے چاہے وہ جس چہرے اور جس شکل میں ہو۔

۲۷۱۔ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَاِنْ تَخْفُوْهَا وَتُوْتُوْهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّئَاتِكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝

ترجمہ

۲۷۱۔ اگر انفاق اور صدقات کھلے بندوں کرو تو اچھا ہے اور اگر مخفی طور پر کرو تو حاجتمندوں کو دیر سمجھاتے لیے بہتر ہے اور ایسا کرنا تمہارے کچھ گناہوں کو چھپا دیتا ہے (اور راہ خدا میں بخشش کرنے کے ذریعے تم بخشنے جاؤ گے) اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے۔

تفسیر

خرچ کیسے کرنا چاہیے

اس میں شک نہیں کہ راہ خدا میں اعلانیہ یا مخفی طور پر خرچ کرنے میں سے ہر ایک مفید اثر رکھتا ہے کیونکہ انسان جب آشکار اور اعلانیہ اپنا مال راہ خدا میں خرچ کرتا ہے تو اگر وہ واجب خرچ ہے تو قطع نظر اس کے کہ اس سے ایسے نیک کاموں کا کوئی شوق پیدا ہوتا ہے انسان اس ثابت سے بھی بچتا ہے کہ اس نے واجب فمرداری پوری نہیں کی اور اگر یہ انفاق مستحب ہے تو حقیقت میں ایک طرح کی عملی تبلیغ ہے جو اچھے کام کرنے، محروموں کا ساتھ دینے اور اجتماعی مفاد کے لیے نیک کام کرنے کی تشویق کا باعث ہے۔

دوسری طرف اگر انفاق مخفی طور پر ہو تو یقیناً اس میں ریا کاری اور خود نمائی کمتر ہوگی اور اس میں خلوص زیادہ ہوگا۔ خدایا محروم انسانوں کی مدد کے بارے میں یہ طرز عمل بہتر ہے کیونکہ اس طرح ان کی عزت و آبرو بہتر طور پر محفوظ رہ سکے گی۔ انہی پہلوؤں کے پیش نظر آیت میں ان ہر دو طریقوں کو بڑی جگہ پر اچھا اور شائستہ قرار دیا گیا ہے

مخفی طور پر خرچ کرنے کے بارے میں اس علم پر بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ صرف مستحب انراجات کے لیے ہے، واجب انفاق مثلاً زکوٰۃ وغیرہ کی ادائیگی تو ہمیشہ آشکار اور اعلانیہ ہی بہتر ہے لیکن مسلم ہے کہ دونوں احکام اظہار اور اخفاء میں سے کوئی بھی عمومی اور سب کے لیے ایک جیسا پسند نہیں رکھتے بلکہ حالات مختلف ہوتے ہیں بعض اوقات جب کہ تشویق زیادہ موثر



جو اور غلوں پر زنجی نہ پڑتی ہو تو اظہار کرنا بہتر ہے۔ بعض اوقات آبرو مند افراد سے ایسا معاملہ درپیش ہے کہ ان کی عزت و آبرو کا تقاضا ہے کہ انفاق مخفی طور پر انجام پائے اور یہاں کاری اور عدم غلوں کا خوف بھی ہے تو وہاں اسے مخفی ہی رکھنا چاہیے۔ امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے: آپ نے فرمایا:

واجب زکوٰۃ اپنے مال سے آشکار طور پر مالک کر لو اور کھلے

بندوں خرچ کرو۔ لیکن مستحب انفاق مخفی ہو تو بہتر ہے۔

جو کچھ ہم نے کہا ہے ایسی احادیث اس سے متضاد نہیں کیونکہ واجبات کی ادائیگی میں ریا کی آمیزش بہت کم ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ذمہ داری اور ذمہ داری ہوتی ہے اور اسلامی ماحول میں ہر شخص مجبور ہوتا ہے کہ اسے ادا کرے اور یہ یقینی احوال کی حیثیت سے ادا کرنا ہوتے ہیں۔ اس بناء پر ان کا اظہار بہتر ہے اور تمہیں انفاق میں چونکہ لازمی ہونے کا پہلو نہیں تو ممکن ہے اس کا اظہار غلوں نیت کو نقصان پہنچائے لہذا اسے مخفی طور پر انجام دینا زیادہ مناسب ہے۔
”و یکنفر عنکم من سبب سببکم“:

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ راہ خدا میں خرچ کرنا ان جہوں کی بخشش کے لیے بہت مؤثر ہے کیونکہ حکم انفاق کے بعد اس جملے میں فرمایا گیا ہے: اور تمہارے گناہوں کو چھپاتا ہے۔

ابستہ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ تمہارے سے انفاق کی وجہ سے سب گناہ بخش دیے جائیں گے بلکہ یہاں ”حسن“ استعمال ہوا ہے جو عام طور پر کچھ حق کے لیے ”تبعض“ کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انفاق کچھ گناہوں کو چھپاتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ انفاق کی مقدار اور غلوں کے معیار سے وابستہ ہے۔ اس بارے میں کہ انفاق بسبب بخشش ہے، اہل بیتؑ کے ذرائع سے اور اہل سنت کے طریق سے بہت سی روایات وارد ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث میں ہے:

پوشیدہ طور پر خرچ کرنا غضب خدا کو ٹھنڈا کر دیتا ہے

اور جس طرح پانی آگ کو بجھاتا ہے اس طرح یہ انسان کے

گناہ ختم کر دیتا ہے۔

ایک اور روایت میں ہے۔

سات اشخاص ایسے ہیں جن پر قیامت کے دن خدا اپنے

لطف کا سایہ کرے گا جب کہ اس دن اس کے سایہ لطف

کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا اور وہ سات اشخاص یہ ہیں:

۱۔ عادل و راستا۔

۲۔ وہ جہان جو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں پروان چڑھتا ہے۔

لغة الزکوٰۃ المعروفة بخرج علانیة و متدفع علانیة و غیر الزکوٰۃ اذ دفعه سراً فهو اقمیل۔ (تفسیر مجمع البیان
نقد از علی بن ابراہیم) کہ (صدقة التبرع تفضی بحسب التبرع و تفضی الخبیثۃ کما یطغی الماء النار)



- ۳۔ وہ شخص جس کا دل مسجد سے پیوستہ ہے۔
 ۴۔ وہ اشخاص جو ایک دوسرے کو خدا کے لیے دوست رکھتے ہیں، محبت والفت سے ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور محبت ہی سے ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔
 ۵۔ وہ شخص جسے خوبصورتی اور قدر و منزلت کی حامل عورت دھوٹ گئی، اسے اور وہ کہے: میں تو خدا سے ڈرتا ہوں۔
 ۶۔ وہ شخص جو اس طرح غمی طور پر اتفاق کرتا ہے کہ اس کے دائیں ہاتھ کو خبر نہیں کہ بائیں نے اتفاق کیا ہے۔
 ۷۔ وہ شخص جو ایسا یاد خدا میں محو ہو اور اس کی آنکھوں کے کناروں سے آنسو گر رہے ہوں۔ سہ

”وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ“

اس جملہ کا معنی ہے کہ تم جو کچھ خرچ کرتے ہو ظاہراً جو یا پوشیدہ، خدا جانتا ہے، اسی طرح وہ تمہاری نیتوں سے بھی آگاہ ہے کہ ظہار و اخفاء کس مقصد کے لیے انجام دیتے ہو۔
 ہر حال اتفاق میں جو چیز موثر ہے وہ عمل میں پاکیزہ نیت اور خلوص ہے، لوگوں کا بھانپنا یا نہ جاننا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اہم چیز خدا کا جاننا ہے کیونکہ انسان کے اعمال کی جزا دینے والا وہی ہے، وہ اعمال مخفی ہوں چاہے آشکار۔

۲۷۲۔ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَا يُنْفِقُكُمْ وَمَا تُنْفِقُوا إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُّؤْتِ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ○

ترجمہ

۲۷۲۔ اے جبر سے، ان کی ہدایت کرنا تمہارے ذمے نہیں ہے اس بنا پر غیر مسلموں کو اسلام لانے پر

لَا تُسْمِعُ يَوْمَئِذٍ قُلُوبَهُمْ قُلُوبُهُمْ لَافِقُونَ لَا تَسْمَعُ إِلَّا قُلُوبُ الَّذِينَ يَتَذَكَّرُونَ فِى قُلُوبِهِمْ حَقٌّ لِّعَوْدِ إِلَيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ
 اور جس دن اللہ تعالیٰ ان کے دل سے سنا دے گا، تو ان کے دل بے فائدہ رہیں گے، نہ وہ سنے گا اور نہ ہی ان کے دل اس کی طرف لوٹیں گے، اور ان کے دل بے فائدہ رہیں گے، اور ان کے دل بے فائدہ رہیں گے، اور ان کے دل بے فائدہ رہیں گے۔



مجبور کرنے کے لیے ان پر خرچ نہ کرنا صحیح نہیں ہے، لیکن خدا جسے چاہتا ہے (اور وہ اہمیت رکھتا ہے تو) ہدایت کرتا ہے اور جو کچھ تم اچھی چیزوں میں سے خرچ کرتے ہو وہ تمہارے ہی لیے ہے (لیکن) اللہ کی رضا کے سوا خرچ نہ کرو اور اچھی چیزوں میں سے جو کچھ تم خرچ کرتے ہو وہ تمہیں دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں ہوگا۔

شان نزول

تفسیر مجمع البیان میں ابن عباس سے منقول ہے کہ مسلمان غیر مسلموں پر خرچ کرنے کو تیار نہیں تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور انہیں اجازت دی گئی کہ ضروری مواقع پر یہ کام انجام دیں۔

اس آیت کے بارے میں ایک اور شان نزول بھی منقول ہے جو پہلی شان نزول سے غیر مشابہ نہیں ہے اور یہ کہ اسلام ایک مسلمان عورت تھی۔ عترة القضاہ کے سفر میں وہ پیڑا کریم کی خدمت میں تھی۔ اس کی ماں اور دادی اسے ڈھونڈتے ہوئے انہیں انہوں نے اس سے مدد مانگی۔ چونکہ وہ دونوں مشرک اور بت پرست تھیں اس لیے اسما نے ان کی مدد کرنے سے انکار کر دیا اور کہا: ضروری ہے کہ پیڑے پیڑا کریم سے اجازت حاصل کروں۔ کیونکہ تم میرے دین کی پیروی نہیں ہو۔ اس کے بعد وہ آنحضرت کی خدمت میں آئی اور اجازت چاہی۔ اس پر عمل بحث آیت نازل ہوئی۔

تفسیر

”لَیْسَ عَلَیْکُمْ هَٰذَا“ یعنی: تم ان کی ہدایت پر مجبور نہیں ہو۔

اس جملے میں پیڑا کریم سے خطاب ہے اور گذشتہ آیات سے اس کا رابطہ واضح ہے کیونکہ گزشتہ آیت میں کلی طور پر اتفاق کا ذکر ہے اور یہ آیت غیر مسلموں پر اس معنی میں خرچ کرنے کی تشریح کرتی ہے کہ غیر مسلم فقراء و مساکین پر اس مقصد کے لیے خرچ نہ کرنا کہ وہ فقر و فاقہ کی سفق سے الٹا کر اسلام قبول کر لیں اور ان کی ہدایت ہو جائے، یہ صحیح نہیں ہے۔ جیسے اس دنیا میں خدائی بخششیں اور نعمتیں، بلا تفریق دین و آئین، سب انسانوں کے لیے ہیں مسلمانوں کو بھی چاہیے کہ جب مستحب اتفاق کریں اور حاجت مندوں کی حاجت ردائی کریں تو ضروری مواقع پر غیر مسلموں کی حالت کا بھی خیال رکھیں۔

البتہ یہ اس صورت میں ہے جب غیر مسلموں پر خرچ کرنا انسانی مدد کے طور پر ہو۔ کفر کی تعزیر اور اسلام دشمنوں کی تنہوں سازشوں کی پیش رفت کا سبب نہ بنے بلکہ انہیں اسلام کی روح انسان دوستی سے آگاہی کا ذریعہ بنے۔

یہ جو پیڑا کریم سے کہا گیا ہے کہ تم ان کی ہدایت پر مجبور نہیں ہو، واضح ہے کہ اس کا یہ مقصد نہیں کہ ارشاد و تبلیغ آپ کا فریضہ اور ذمہ داری نہیں، کیونکہ ارشاد و تبلیغ تو پیڑا کریم کے واضح ترین اور بنیادی ترین پروگرام کا حصہ ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ آپ کا فریضہ نہیں کہ ان پر سختی کریں اور انہیں ہدایت پر مجبور کریں۔ دوسرے لفظوں میں مراد حیرت ہدایت کی نفی ہے اختیار ہدایت کی نہیں یا مراد ہدایت تکوینی کی نفی ہے، ہدایت تشریعی کی نہیں۔ اس کی وضاحت ذیل میں پیش کی جائے گی۔

ہدایت کی اقسام

ہدایت کی بہت سی قسمیں ہیں۔



۱۔ ہدایت تکوینی :- ہدایت تکوینی سے مراد یہ ہے کہ خدا نے مختلف موجودات عالم مثلاً انسان اور دیگر جاندار بلکہ بے جان موجودات کے ارتقاء اور تکامل کے لیے عوالم کا ایک سلسلہ پیدا کیا ہے۔ شکم مادر میں بچے کا رشد و تکامل مختلف اجناس اور نباتات کے دانوں کی زمین کے اندر پیش رفت اور نشو و نما، نظام شمسی کے مختلف کواکب کی اپنے مدار میں حرکت اور اس قسم کی دیگر چیزیں ہدایت تکوینی کے مختلف نمونے ہیں۔ ایسی ہدایت خدا سے مخصوص ہے اور اس کے بھیسی و مادیات طبعی عوالم و اسباب ہیں۔ قرآن مجید کہتا ہے :

”الَّذِي اعطى كُلَّ شَيْءٍ خُلُقًا وَخَلَقَ شَمْسًا وَهُدًى“

وہ خدا جس نے ہر موجود و مخلوق کو اس کی مخصوص خلقت عطا کی

اور اس کے بعد اسے ہدایت کی۔ (نملہ : ۵۰)

۲۔ ہدایت تشریعی :- اس ہدایت سے مراد ہے تعلیم و تربیت، مفید قوانین، خادانہ حکومت اور پسند و ناپسند کے ذریعے لوگوں کی رہنمائی کرنا۔ یہ ہدایت انبیاء، مرسلین، آئمہ معصومین، صالحین اور ہمدرد مرسلین کے ذریعے انجام پاتی ہے۔ قرآن میں بار بار اس کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے :

”ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ“

اس عظیم کتاب میں کوئی شک و شبہ نہیں اور یہ پرہیزگاروں کی ہدایت

کا ذریعہ ہے۔ (سورۃ بقرہ : آیت ۲)

۳۔ وسیلے کی فراہمی :- ہدایت کا ایک معنی وسیلہ اور ذریعہ فراہم کرنا بھی ہے۔ ایسی ہدایت کو کبھی توفیق بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں کو ضروری وسائل فراہم کر دیے جائیں تاکہ وہ اپنی رضا و رغبت سے اپنی پیش رفت کے لیے ان سے استفادہ کر سکیں۔ مثلاً مدرسہ، مسجد اور دیگر ترقیاتی مراکز قائم کرنا، ضروری پروگرام اور کتب تیار کرنا اور لائق و اہل مصلحتین اور مسلمین کی تربیت کرنا۔ یہ سب امور ہدایت کی اس قسم میں شامل ہیں۔ دراصل ہدایت کی یہ قسم ہدایت تکوینی اور ہدایت تشریعی کے درمیان حد فاصل ہے۔ قرآن کہتا ہے :

”وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنَّا فَسَبَّوهُمُ فَسَبَّوْهُمْ فَسَبَّوْهُمْ فَسَبَّوْهُمْ“

اور جو لوگ ہماری راہ میں جہاد اور شورش کرتے ہیں انہیں اپنے

راستوں کی ہدایت کرتے ہیں۔ (عنکبوت : ۲۶)

۴۔ نعمتوں اور جزا و ثواب کی طرف کی ہدایت :- اس ہدایت سے مراد ہے ملامت و عتاب میں اہل ایمان کو ان کے نیک اعمال کے نتائج سے بہرہ مند کرنا۔ ایسی ہدایت اہل ایمان اور اعمال صالحہ انجام دینے والے افراد سے مخصوص ہے۔ قرآن کہتا ہے :

”سَيَجْزِيهِمْ وَيَصْلَحُ بِاللَّهِمْ“

خدا انہیں ہدایت کرتا ہے اور ان کی حالت کی اصلاح کرتا ہے (نملہ : ۵)

آیت میں یہ جملہ راہِ خدا میں شہید بننے والوں کی ندامتوں کے ذکر کے بعد آیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ ہدایت صرف دوسرے جہان میں اُن کے اپنے عمل کے اچھے نتائج سے بہرہ مند ہونے سے وابستہ ہے۔

واقع میں یہ چار قسم کی ہدایت ایک ہی حقیقت کے مختلف نام ہیں۔ ان میں سے ہر ایک پہلے کے بعد اگلا مرحلہ ہے۔ سب سے پہلے ہدایت تکوینی ہے جو انسان کی تلاش میں آتی ہے اور عقل و فکر اور دوسرے قویٰ اس کے اختیار میں دے دیتی ہے۔

پھر انبیاء کی ہدایت اور راہنمائی شروع ہو جاتی ہے اور وہ لوگوں کو راہِ حق کی ہدایت کرتے ہیں اس کے بعد جب لوگ اگلے مرحلے میں داخل ہوتے ہیں تو توفیقِ الہی اُن کے شامل حال ہوتی ہے، اُن کے لیے راستے ہموار ہوتے چلے جاتے ہیں اس طرح وہ تیسرے مرحلے کو طے کرتے ہیں۔

آخر میں درِ آخرت ہے جہاں لوگ اپنے اعمال کے نتائج سے بہرہ مند ہوں گے۔

ان چار اقسام میں سے ارشادِ تبلیغِ انبیاء اور آخرِ حدیث کے حتمی فرائض میں سے ہے اور تیسری قسم میں یہ جو راہِ ہموار کرنا کہا گیا ہے یہ انبیاء اور ائمہ کی حکومتِ الہی کے پردہ گروہوں کا جزء ہے آخری اور پہلی قسم ذاتِ خدا سے مخصوص ہے۔ اس بناء پر قرآن میں جہاں کہیں یہ تعبیر اکرم سے ہدایت کی نفی کی گئی ہے اس سے مراد دوسری اور تیسری قسم کی ہدایت نہیں ہے۔

”وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ يَهْدَىٰ مِنْ غِشَاةٍ“

یعنی خدا جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے لیکن یہ مسلم ہے کہ پردہ نگارِ عالم کی طرف سے ہدایت حسبِ کتاب اور حکمت و دانش کے بغیر نہیں یعنی ایسا نہیں کہ وہ کسی کو بلاوجہ ہدایت دے دے اور دوسرے کو محروم رکھے۔

زیرِ نظر آیت سے ایک اور حقیقت بھی معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کو یہ جو ریاکاری، احسان جتلانے اور آثار پہنچانے سے منع رہنے کی یاد دہانہ کی گئی ہے اس کے باوجود اگر کچھ لوگ اپنے آپ کو ان امور سے آلودہ کریں تو تم پریشان نہ ہونا، تمہاری ذمہ داری فقط احکام بیان کرنا اور ایک صحیح اجتماعی ماحول پیدا کرنا ہے۔ اس کے بعد ہرگز ذمہ دار نہیں ہو کہ انہیں مجبور کرو۔ واضح ہے کہ یہ تفسیر گذشتہ تفسیر سے اختلاف نہیں رکھتی اور یہ بھی ممکن ہے کہ آیت سے دونوں مفہام حاصل کئے جائیں

اتفاق کرنے والوں پر اس کے اثرات

”وَمَا تَنْفَعُوا مِنْ غَيْرِ قِبَلِ نَفْسِكُمْ“

آیت کے اس حصے میں فرمایا گیا ہے کہ اتفاق کے فوائد کی بازگشت خود تمہاری طرف ہے، اس میں اتفاق کرنے والوں کو اس انسانی عمل کی تشویق دلائی گئی ہے۔ مسلم ہے کہ جب انسان یہ جان لیتا ہے کہ اس کے کام کا نتیجہ اور فائدہ خود اسی کو حاصل ہوگا تو اس کا دل زیادہ اس کام میں لگے گا۔

مکن ہے بادی النظر میں یہ معلوم ہو کہ اتفاق کے منافع کی بازگشت سے مراد اس کی اخروی جزا اور اس کے اخروی نتائج ہیں۔ یہ مفہوم اگرچہ صحیح ہے لیکن ایسا نہیں کہ اتفاق کا فائدہ فقط آخرت میں حاصل ہوتا ہے بلکہ اس دنیا میں



بھی اس کے مادی اور معنوی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

معنوی لحاظ سے اتفاق کرنے والے میں عفو و بخشش، ایثار، دوستی اور اخوت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور حقیقت میں یہ انسان کے مکمل اور اس کی روح کے ارتقاء کے لیے ایک موثر تربیتی ذریعہ ہے۔

مادی لحاظ سے دیکھا جائے تو معاشرے میں محروم اور بے فوائد لوگوں کی موجودگی خطرناک دھماکوں کا سبب ہوتی ہے اور یہ دھماکے بعض اوقات اصل ملکیت کو ختم کر دیتے ہیں۔ تمام دولت اور سرمائے کو نکل جلتے ہیں اور نابود کر دیتے ہیں۔

اتفاق اور خرچ کرنے سے مختلف طبقات میں تعاون میں کمی آتی ہے اور حقیقی کشش مکش کی وجہ سے معاشرت کو جو خطرات لاحق ہوتے ہیں اتفاق کے ذریعے ٹل جاتے ہیں۔ اتفاق غیظ و غضب کی آگ کو ٹھنڈا کرتا ہے اور محروم طبقوں کے جلا دینے والے شعلوں کو بجھا دیتا ہے اور ان میں سے انتظام کے جذبات ختم کر دیتا ہے۔

اس بناء پر اتفاق اجتماعی اہمیت، اقتصادی سالمیت اور مختلف دیگر مادی و معنوی چیزوں کے پیش نظر خود خرچ کو نہ والوں کے فائدے میں ہے۔

”وَمَا تَنْفَعُكُمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ“

یعنی مسلمان اپنے اموال غرضوں کی خدائی طلب کے علاوہ خرچ نہیں کرتے۔

بہرحال بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ممکن ہے کہ جملہ خبریہ یہاں بھی کے معنی میں ہو یعنی لوگوں کو اتفاق نہیں کرنا چاہیے مگر یہ کہ خدائی رضا کے لیے ہو اور اتفاق صرف اس صحت میں سودمند اور مفید ہے جب خدائی فطرت انجام پذیر ہو۔

وجہ اللہ کا مفہوم

”وجہ“ کا لغوی معنی ہے ”چہرہ“۔ بعض اوقات یہ ”ذات“ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، اس بناء پر ”وجہ اللہ“ کا معنی ہوا ”ذات خدا“۔

اتفاق کرنے والوں کی نظر میں پروردگار کی ذات پاک ہونا چاہیے اس سے معلوم ہوا کہ لفظ ”وجہ“ اس آیت میں اور ایسی دیگر آیات میں ایک طرح کی تاکید کا حامل ہے کیونکہ ”ذات خدا کے لیے“ میں ”خدا کے لیے“ کی نسبت زیادہ تاکید ہے یعنی حتمی طور پر خدا کے لیے ہو لسی اور کے لیے نہ ہو۔

علاوہ ازیں انسان کا چہرہ اس کے ظاہری بدن کو بتدین حصہ ہوتا ہے۔ قوت بصارت، قوت سماعت اور قوت گویائی اسی حصے میں موجود ہیں۔ اس لیے جب لفظ ”وجہ“ استعمال ہو تو وہ اہمیت کی طرف اشارہ کر رہا ہوتا ہے۔ یہاں بھی خدا کے بارے میں یہ لفظ بطور کنایہ استعمال ہوا ہے اور واقع میں اس سے ایک طرح کا احترام اور اہمیت ظاہر ہو رہی ہے۔ یہ بدیہی ہے کہ خدا تعالیٰ ہمہ کتبے نہ کوئی اس کا چہرہ ہے۔

”وَمَا تَنْفَعُكُمْ مِنْ شَيْءٍ يَتُوبُ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَتُوبُونَ“

آیت کے اس حصے میں سابق مفہوم کو زیادہ واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے یہ گمان نہ کرو کہ اتفاق سے



تہیں صرف تھوڑا سا فائدہ پہنچے گا جبکہ جو کچھ خرچ کر دے سب تمہاری طرف پٹ آئے گا اور تم پر تھوڑا سا ظلم بھی نہیں ہوگا
اس لیے اتفاق کرتے وقت باعقد اور دل کھلا رکھو۔

ضمنی طور پر یہ جملہ تجسم اعلیٰ کے مسند پر بھی دلیل ہے۔ لیونکہ اس کے مطابق جو تم خرچ کر دے وہی چیز تمہیں واپس
کر دی جائے گی۔

۲۷۳۔ لِنَظْمَرَاءِ الَّذِينَ أَحْصَرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ
ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ
الْثَمَنِ لَا يُعْرِفُهُمُ بَيْنَهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ
الْحَافَا ۚ وَمَا تَنْفَعُوهَا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ۝

ترجمہ

۲۷۳۔ (تمہارا اتفاق خاص طور پر ایسے لوگوں کے لیے ہونا چاہیے) جو حاجت مند ہوں اور راہِ خدا
میں محصور ہو چکے ہوں (دینِ خدا کی طرف ان کی رغبت کی وجہ سے وہ بے وطن ہو گئے ہوں اور جہاد میں
شرکت کی وجہ سے ان کے لیے ممکن نہ رہا ہو کہ وہ کسب و تجارت کے ذریعہ اپنے اسبابِ زندگی فراہم کر
سکیں) سفر نہ کر سکتے ہوں (اگر سفر کے ذریعے روزگار مہیا کر سکیں اور ان کی خودداری کی وجہ سے بے خبر
لوگ انہیں دوات مند اور توکر سمجھتے ہیں لیکن تم انہیں ان کے چہروں سے پہچان لو گے اور وہ اصرار کر کے
ہرگز لوگوں سے کوئی چیز طلب نہیں کرتے) یہ ان کی نشانیاں ہیں، اور براہی چیز جو تم راہِ خدا میں خرچ
کر دو خدا اس سے آگاہ ہے۔

شانِ نزول

امام باقرؑ سے منقول ہے کہ یہ آیت اصحابِ صفہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ مسجد میں ان کی رہائش چونکہ مسجد کے
احترامات کے معافی تھی لہذا انہیں حکم دیا گیا کہ مسجد سے باہر صفہ میں مستقل کو جائیں۔ اس صورتِ حال پر مندرجہ بالا آیت نازل
ہوئی جس میں مسلمانوں کو اپنے ان ہمتیوں کو ہر ممکنہ امداد کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔

سلسلہ اصحابِ صفہ: یہ تقریباً چھ سو افراد تھے، ان کا تعلق مکہ اور ہجرتِ مدینہ سے تھا۔ مدینہ میں ان کا کوئی گھرانہ نہ تھا۔ ہر روز خدا
سے انہوں نے مسجدِ نبویؐ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ انہوں نے ہر اسلامی جہاد میں شرکت کے لیے اپنی زندگی کا اعلان کر رکھا تھا۔
سلسلہ صفہ: بڑے اور وسیع برآمدے کہتے ہیں۔



تفسیر انفاق کا بہترین موقع

اس آیت میں خدا تعالیٰ نے انفاق کے لیے بہترین موقع بیان کیا ہے۔ جن پر خرچ کیا جانا چاہیے ان لوگوں کی یہ صفات بیان کی گئی ہیں :

۱۔ **الَّذِينَ احْصَوْا فِي سَبِيلِ اللَّهِ** : یعنی وہ لوگ جو اہم کاموں مثلاً جہاد، دھم سے مقابلہ، فنونِ جنگ کی تعلیم اور ضروری علوم کی تحصیل میں مصروف ہیں اور اس وجہ سے اپنی زندگی کے اسباب مہیا نہیں کر سکتے۔ جیسے اصحابِ صفہ جو اس کے واضح مصداق تھے۔

۲۔ **لَا يَسْتَطِيعُونَ صَرْفًا** : وہ اسبابِ زندگی کی تلاش میں سفر اختیار نہیں کر سکتے۔ ان کے لیے ممکن نہیں کہ وہ شہروں، بستیوں اور ایسے علاقوں میں جائیں جہاں اللہ کی نعمتیں فرازاں ہیں، اس لیے جو لوگ اسبابِ زندگی بنایا کر سکتے ہیں وہ سفر کی مشقت اور تکلیف برداشت کریں اور دوسروں کے دستِ دہانہ کی کمائی پر ہرگز نہ بیٹھیں۔ ہاں البتہ کسی زیادہ اہم کام کی وجہ سے وہ لوگ رک جائیں مثلاً جہاد جو رضائے الہی کا محل و مقام ہے۔

۳۔ **يَحْسِبُهُمُ الْبَاحِلُ اغْنِيَاءَ** : یعنی جو لوگ ان کے حالات سے آگاہ نہیں ہیں وہ ان کی خود داری، عزت نفس اور پاکدامنی کی وجہ سے گمان کرتے ہیں کہ یہ غنی اور کسی کی امداد سے بے نیاز ہیں۔

۴۔ **تَعْرِفُهُمْ بِسِيَرِهِمْ** : ”سیعاً“ سنت میں ”عادت“ اور ”ثَنًى“ کے معنی میں ہے۔ یعنی اگرچہ وہ اپنے بارے میں کوئی بات نہیں کہتے لیکن ان کے چہرے پر داغی دکھ دہی کی نشانیں موجود ہوتی ہیں جو یا شعور افراد کے لیے واضح ہوتی ہیں۔ ان کے رخساروں کا رنگ ان کے اندرونی نازکی خیر و تلبے ہے۔

۵۔ **لَا يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْفُقَرَاءِ** : ”سألوہ“ ہے کہ وہ پیشہ ور فقیروں کی طرح کسی سے سوال نہیں کرتے یعنی وہ تو اصولی طور پر سوال کرتے ہی نہیں یہ جانید وہ سوال میں اصرار یا ٹکڑا کریں، دوسرے فقہوں میں پیشہ ور فقیروں کا معمول ہے کہ وہ سوال پر اصرار کرتے ہیں لیکن وہ بالعموم ضرورت مند اور عاجز نہ نہیں ہوتے۔

یہ جو قرآن نے کہا ہے کہ وہ اصرار کے ساتھ سوال نہیں کرتے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ سوال تو کرتے ہیں مگر اصرار نہیں کرتے بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ پیشہ ور فقیر نہیں ہوتے کہ سوال کرتے پھریں۔ اس بناء پر اس جملے کا آیت کے ابتدائی جملے سے کوئی اختلاف نہیں جس میں فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنی عادت سے پہچانے جاتے ہیں نہ کہ سوال کے ذریعے۔

آیت میں ایک احتمال اور بھی ہے اور وہ یہ کہ اگر شدید حالتِ اضطرار کے باعث وہ سوال پر مجبور بھی ہو جائیں تو یہی سوال پر اصرار نہیں کرتے بلکہ اپنی حاجت کو نہایت احسن طریقے سے اپنے مسلمان بھائیوں کے گوش گزار کرتے ہیں۔

وَمَا تَنْفَعُكُمْ مِنَ الْغَنَىٰ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ : یہ مجدِ خرچ کرنے والوں کو شوق دلانے



کے لئے ہے۔ خصوصاً ایسے افراد پر خرچ کرنا جو صاحب عزت نفس اور عالی رتبت میں کیونکہ جب خرچ کرتے وقت کسی کو یہ خیال ہو کہ جو کچھ وہ راہ خدا میں خرچ کر رہا ہے چاہے عقیقی طور پر ہے لیکن خدا تعالیٰ اس سے آگاہ ہے اور اُسے اس کے عمل کے ثمرات سے بہرہ مند کرے گا تو وہ زیادہ مکافد اور انہماک سے یہ عظیم خدمت سرانجام دے گا۔

۲۷۴۔ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ○

ترجمہ

۲۷۴۔ وہ لوگ جو شب و روز اپنے اموال پنہاں و آشکار خرچ کرتے ہیں، ان کا اجر ان کے پروردگار کے پاس ہے۔ ان پر کوئی خوف ہے نہ وہ غمگین ہوتے ہیں۔

تفسیر

ہر صورت میں خرچ کرنا

بہت سی احادیث میں آیات کہ یہ آیت حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے کیونکہ آپ نے ایک درہم رات کو، ایک دن کو، ایک چمپاکر اور ایک ظاہر بظاہر خرچ کیا تھا۔ لیکن قرآن کا حکم حسب معمول ایک عمومی حیثیت رکھتا ہے۔ اس آیت میں اتفاق کے طور طریقوں اور مختلف کیفیات کی تشریح کی گئی ہے اور اتفاق کرنے والوں کی ذمہ داری کی وضاحت کی گئی ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ ظاہر یا پوشیدہ طور پر خرچ کرتے وقت اخلاقی و اجتماعی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ جس پر خرچ کیا جا رہا ہے اس کی شخصی حیثیت کو بھی مد نظر رکھا جانا چاہیے۔

جس مقام پر حاجتمندوں کی حفاظت آبرو اور زیادہ غلوص عقیقی ہو کہ اتفاق کو پوشیدہ رکھا جائے وہاں پوشیدہ ہی رہنا چاہیے اور جہاں دیگر مصالح مثلاً شعائر مذہبی کی تعظیم اور دوسروں کو تشویق و ترغیب دلانامہ مسودہ ہو اور کسی مسلمان کی متکبر حرمت بھی نہ ہوتی ہو وہاں ظاہری طور پر خرچ کرو۔ ایسے افراد کو اجر اور اچھے بدلے کی خوشخبری دیتے ہوئے فرماتا ہے: ان کا اجر و ثواب خدا کے پاس ہے اور ان کے لیے کوئی وحشت و خوف اور غم و اندوہ نہیں ہے

لَا تَقْرَأُ الْقُرْآنَ حَتَّى تَغْتَسِلَ مِنْ مِیْ سَبْعِ مَرَّاتٍ (ابن جریر)

اور دیگر بہت سے روایات کے حوالے سے تعقیب کی گئی ہے۔



”فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ“:

ہم جانتے ہیں کہ انسان اپنی زندگی کو جاری و ساری رکھنے اور اس کا انتظام کرنے کے لیے اپنے آپ کو مال و دولت سے بے نیاز نہیں سمجھتا۔ اس لیے جب اسے ہاتھ سے دے بیٹھا ہے تو حزن طاعن کا شکار ہو جاتا ہے اور اپنی آئندہ زندگی کے لیے بھی پریشان ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ اس کے حالات آئندہ کیسے رہیں گے۔ یہی خیال بہت سے مواقع پر اسے خرچ کرنے سے روک لیتا ہے۔ مگر جو لوگ خدا کے وعدوں پر ایمان رکھتے ہیں اور خرچ کرنے کے اجتماعی آئندہ کو بھی سمجھتے ہیں وہ راہ خدا میں خرچ کرنے سے مستقبل کے لیے کسی خوف و وحشت میں مبتلا نہیں ہوتے اور اپنی کچھ دولت خرچ کر دینے پر غمزدہ نہیں ہوتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ وہ اس کے بارے میں پورا دیکھ کے ہاں کئی مراتب حاصل کریں گے اور اس کے بہت نفع سے بہرہ مند ہوں گے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ انہیں اس دنیا میں اور آخرت میں اس عمل کے ذریعے انفرادی، اجتماعی اور اخلاقی برکات حاصل ہوں گی۔

۲۴۵۔ اَلَّذِينَ يَأْكُلُونَ الزَّبْوَا لَا يَتُومُونَ اِلَّا كَمَا يَتُومُ
الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ
قَالُوْا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الزَّبْوَا وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ
وَحَرَّمَ الزَّبْوَا فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَبِّهِ
فَانْتَهَىٰ فَلَهُ مَا سَلَفَ وَاَمْرٌ اِلَى اللّٰهِ وَمَنْ
عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○

۲۴۶۔ يَمْحَقُ اللّٰهُ الزَّبْوَا وَيُزِي الصَّدَقَتِ وَاِنَّهُ لَا يُحِبُّ
كُلَّ كَفَّارٍ اَشِيْمٍ ○

۲۴۷۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ
وَاتَوَّا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

ترجمہ

۲۷۵۔ جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ تو بس اُس شخص کی طرح کھڑے ہوتے ہیں جسے شیطان نے چھو کر پاؤں لا کر دیا ہو اور وہ اپنے اعتدال کو برقرار نہ رکھ سکتا ہو، کبھی زمین پر گر پڑتا ہو اور کبھی کھڑا ہو جاتا ہو، یہ سب اس لیے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ بیع بھی سود کی طرح ہے، اور ان دونوں میں کوئی فرق نہیں جب کہ اللہ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے، کیونکہ دونوں میں بہت فرق ہے، اور اگر کسی تک خدا تعالیٰ کی طرف سے نصیحت پہنچ جائے اور وہ اسود خوری سے بچ جائے تو وہ سود جو اس کی حرمت کے حکم کے نازل ہونے سے پہلے اسے مل چکا ہے وہ اس کا مال ہے، اور اس حکم میں گزشتہ مال شامل نہ ہوگا، اور اس کا معاملہ خدا کے سپرد ہو جائے گا، اور وہ اس گزشتہ معاملے کو بخش دے گا، لیکن جو لوگ ٹوٹ جائیں اور اس گناہ کا نئے سرے سے ارتکاب کریں وہ اہل آتش جہنم میں ہوں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

۲۷۶۔ اللہ سود کو نابود کر دے گا اور صدقات کو بڑھائے گا اور خدا کسی ناشکر گزار گنہگار کو درست نہیں رکھتا۔

۲۷۷۔ جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے اچھے اعمال انجام دیے اور نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی ان کی اجرت و ثواب ان کے پروردگار کے پاس بٹائے لیے کوئی خوف ہے نہ وہ کسی حزن و غم میں مبتلا ہوں گے۔

تفسیر

سود خوری قرآن کی نظر میں

گزشتہ آیات میں حاجت مندوں کے لیے مال خرچ کرنے اور رفاہ عامہ کے کام سرانجام دینے کے بارے میں گفتگو تھی۔ ان آیات میں سود خوری کا مسئلہ زیر بحث آیا ہے۔ سود خوری کا اثر اور نتیجہ الفاق کے اثر اور نتیجے کی ضد ہے۔ ان آیات کا مقصد اصل گزشتہ آیات کے صلے کی تکمیل کرنا ہے کیونکہ سود طبقاتی تفادات میں اضافہ، چند لوگوں کے پاس سرمائے کی ریل سیل اور معاشرے کے بیشتر لوگوں کی محرومیت کا سبب بنتا ہے۔ ان آیات میں سختی سے سود کے بارے میں حکم اور اس کی حرمت بیان کی گئی ہے آیات کے لب و لہجے سے معلوم ہوتا ہے کہ قبل ازیں بھی سود کے بارے میں گفتگو ہو چکی ہے۔ قرآنی سورتوں کی تاریخ نزول کی طرف توجہ کرنے سے یہ معاملہ اسی طرح معلوم ہوتا ہے۔



قرآن کے نزول کی ترتیب کے مطابق سب سے پہلے جس سورۃ میں سود کے متعلق گفتگو ہوئی ہے وہ سورہ روم ہے کیونکہ سورۃ روم تیسویں سورت ہے جو مکہ میں نازل ہوئی اس سورت کے علاوہ کسی اور سکتی سورت میں سود کے بارے میں کوئی حکم نظر نہیں آتا لیکن اس میں بھی سود کے بارے میں اخلاقی نصیحت کے طور پر گفتگو کی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے کہ سود خوری بارگاہ پروردگار میں کوئی پسندیدہ کام نہیں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :

”وَمَا أَنتُم مِّن ذٰلِكَ لِیَرْبُوا فِیْ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوا عِنْدَ اللّٰهِ“

یعنی ۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ تاء بین افراد کی نظر میں سود خوری سرمائے میں اضافے کا

ذریعہ ہو لیکن بارگاہ خدا میں اس سے کوئی زیادتی نہیں ہوتی ۔ (روم - ۳۹)

پھر ہجرت کے بعد تین مدنی سورتوں میں سود کی بحث آئی ہے۔ ان سورتوں کی ترتیب یہ ہے، سورہ بقرہ، سورہ آل عمران اور سورہ نساء۔ سورہ بقرہ اگرچہ سورہ آل عمران سے قبل نازل ہوئی ہے لیکن بعید نہیں سورہ آل عمران کی آیت ۱۳۰ جس میں سود کی حرمت کا حکم ہے سورہ بقرہ اور زیر نظر آیات سے پہلے نازل ہوئی ہو۔

بہر حال یہ آیت اور سود کے بارے میں دیگر آیات اس وقت نازل ہوئی ہیں جب سود خوری مکہ، مدینہ اور پورے جزیرۃ العرب میں کمال شدت سے رائج تھی اور بیعتی زندگی، محنت کش طبقے کی پسماندگی اور اشراف کی سرکشی کا اہم عامل تھی لہذا سود کے خلاف اسلام کی جنگ اجتماعی امور کے بارے میں اس کے اہم محرکوں میں شمار ہوتی ہے۔

”الذین یأکلون الربوا لا یقومون الا کما یقوم الذی یتخبط الشیطان من العسل“

”خبط“ کا لغوی معنی ہے : ”راہ چھتے یا اٹھتے وقت بدن کو اعتدال پر نہ رکھ سکنا“۔ آیت میں سود خور کو آسیب زدہ اور دیوانہ سے تشبیہ دی گئی ہے جو چھتے وقت اپنے بدن کو اعتدال میں نہ رکھ سکے اور صحیح طریقے سے قدم نہ اٹھا سکے۔

اس سے مراد دنیا میں سود خوروں کا اجتماعی چلن چلن ہے کیونکہ ان کا یہ عمل دیوانوں کا سا ہے۔ وہ صحیح اجتماعی فکر نہیں رکھتے یہاں تک کہ وہ اپنے فرائد کو بھی نہیں پہچان پاتے کیونکہ تعاون، ہمدردی، انسانی جذبے اور دوستی جیسے مسائل ان کے نزدیک کوئی مفہوم نہیں رکھتے۔ دولت کی پرستش نے ان کی آنکھوں کو ایسا اندھا کر رکھا ہے کہ وہ نہیں سمجھتے کہ پیسے جوئے طبقوں کا استحصال اور ان کی محنت و زحمت سے حاصل ہونے والے مال کی غارت گری ان کے دلوں میں دشمنی کا بیج بونے کی اور معاملہ ایسے انقلابات اور تغیرات تک جا پہنچے گا کہ مالکیت کی بنیادی خطرے سے دوچار ہو جائے گی اور ایسی صورت میں معاشرے میں سے امن و امان اور راحت و سکون رخصت ہو جائے گا۔ اس طرح سود خور بھی راحت و آسائش کی زندگی نہیں گزار سکیں گے لہذا ان کا چال چلن دیوانوں کا سا ہے۔

اس سے مراد حشر و نشر کے وقت کھڑا ہونا اور میدان قیامت میں آنا بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی سود خوار اس جہاں میں زندہ ہونے کے وقت دیوانوں اور آسیب زدہ افراد کی طرح محسوس ہوگا۔



اکثر تفسیرین نے دوسرے احتمال کو قبول کیا ہے لیکن بعض نے مفسرین نے پہلے احتمال کو ترجیح دی ہے لیکن انسان کے اعمال چونکہ اس جہان میں ختم ہو کر پیش جاتے ہیں لہذا ممکن ہے آیت کا اشارہ دونوں معانی کی طرف ہو یعنی دنیا میں جن لوگوں کا قیام غیر عادلانہ اور دیوانہ وار ہو یا یہ اندوہی ہے دوسرے جہان میں بھی وہ دیوانوں کی طرح مشغول ہوں گے۔
یہ بات قابل توجہ ہے کہ روایات میں دونوں مذاہب کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ آیت کی تفسیر میں ایک روایت امام بخاری و ترمذی سے منقول ہے۔ آپ نے فرمایا۔

”اَكُلُ الزَّلْبُو لَا يَخْرُجُ مِنَ النَّسَبِ حَتَّى يَتَخَبَّطَهُ الشَّيْطَانُ“

سو خود جب تک پاگل پن کی ایک قسم میں مبتلا نہ ہو جائے دنیا سے نہیں جاتا۔ اے لوگوں کی حالت ایک روایت میں بین کی گئی ہے۔ یعنی اگر تم سے منقول ہے :

”میں معراج پر گیا تو وہاں ایک گروہ وہاں میں دیکھا کہ ان کے پیٹ اتنے بڑے ہیں کہ وہ اٹھ کر چنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ناکام رہتے ہیں اور اشد کی کوشش میں بار بار زمین پر گر پڑتے ہیں۔ میں نے جبریل سے پوچھا : یہ کون لوگ ہیں اور ان کا جرم کیا ہے۔ انہوں نے جواب دیا : یہ سود خور ہیں۔“

پہلی حدیث اس دنیا میں سود خوروں کی پریشان حالی کو منکس کرتی ہے اور دوسری میدان قیامت میں ان کے حالات بیان کرتی ہے۔ دونوں ایک ہی حقیقت سے مربوط ہیں۔ جیسے پیٹ لوگ بہت زیادہ موٹے ہوتے جانتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان میں بے عقلی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ یہ بایہ و ربوبی سود خوری کی وجہ سے ہونے ہو جاتے ہیں ان کی غیر معیہ اقتصادی زندگی ان کے لیے وبال جان بن جاتی ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جنون اور آسیب کا سرچشمہ شیطان ہے جس کی طرف زیر مطالعہ آیت میں اشارہ ہوا ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ آسیب اور جنون نفسیاتی بیماریوں میں سے ہیں اور ان کے زیادہ تر عوامل کی شناخت ہو چکی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کچھ لوگوں کا اعتقاد ہے کہ ”مس الشیطان“ کی تعبیر نفسیاتی بیماری اور جنون کے لیے کنایہ ہے اور عربوں کے درمیان یہ تعبیر عام تھی۔ یہ نہیں کہ واقعاً شیطان روح انسانی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ لیکن بعید نہیں کہ بعض شیطانی کام اور بے سوچے سمجھے غلط اعمال ایک طرح کے شیطانی جنون کا سبب بنتے ہوں یعنی ان اعمال کے بعد شیطان کسی شخص پر اثر انداز ہو کر اس کے نفسیاتی اعتدال کو درہم برہم کر دیتا ہو۔ علاوہ انہیں جب غلط اور شیطانی کام پے درپے ہوتے ہیں تو ان کا یہ نظری اثر ہوتا ہے کہ انسان کے صحیح چیز کی تشویش کا احساس اور منفعتی طرز فکر چھین جاتی ہے۔



سود خوروں کی منطق

”ذالک بائعہم فتالوا اشعا البیع مثل التربوا“ :

آیت کے اس حصے میں سود خوروں کی یہ منطق بیان کی گئی ہے کہ تجارت اور سود خوری میں کوئی فرق نہیں یعنی دونوں ایک ہی طرح کا لین دین ہیں جنہیں طریقی اپنے ارادہ و اختیار سے انجام دیتے ہیں۔

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے : خدا نے بیع اور تجارت کو حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔ یعنی ان دونوں کے درمیان واضح فرق ہے۔ انہیں ایک دوسرے سے مشتق نہیں کرنا چاہیے (واحسن الله البیع وحترم التربوا) قرآن نے اس کی مزید تفصیل اس لیے بیان نہیں کی کہ یہ بالکل واضح ہے۔ اس سلسلے میں بعض پیلو یہاں ذکر کئے جلتے ہیں :

۱۔ عام خرید و فروخت میں طریقی نفع و نقصان میں برابر کے شریک ہوتے ہیں بعض اوقات دونوں کو نفع ہوتا ہے اور بعض اوقات دونوں کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے اور کبھی ایک کو نفع اور دوسرے کو نقصان ہوتا ہے جبکہ سودی معاملات میں سود خور کو کسی نقصان نہیں ہوتا اور نقصان کے احتمال کا سارا بوجھ دوسرے کے کندھے پر جا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سودی ادارے دن بدن بڑے سرمایہ دار بنتے چلے جاتے ہیں۔ ضعیف و نحیف تر ہوتے چلے جاتے ہیں اور دولت مندوں کی ثروت کا حجم ہمیشہ بڑھتا رہتا ہے۔

۲۔ عام تجارت اور خرید و فروخت میں طریقی تو یہ مال و مصدق کی راہ میں قدم اٹھاتے ہیں جبکہ سود خور اس سلسلے میں کوئی مثبت عمل سرانجام نہیں دیتا۔

۳۔ سود خوری کے عام ہو جانے سے سرمایہ غلط اور غیر صحیح راستے پر استعمال ہونے لگتا ہے اور اقتصاد کے ستون ہر معاشرے کی بنیاد میں متزلزل ہو جاتے ہیں۔ جبکہ تجارت سرمدنی درست اور صحیح گردش کا سبب ہے۔

۴۔ سود خوری طبقاتی کشمکشوں اور جنگوں کا ذریعہ ہے جبکہ صحیح تجارت اس حرج نہیں بنے وہ معاشرے کو کبھی طبقاتی تقسیم اور اس سے پیدا ہونے والی جنگوں کی طرف نہیں گھمکتی۔

”فمن جناه موعظہ فمن زبہ فانتهى فله ما سلف وامرہ

الح اللہ“ :

اس جملے میں کہا گیا ہے کہ جن لوگوں کے پاس سود کی حرمت کے بارے میں خدائی نصیحت پہنچ جائے اور وہ یہ کام چھوڑ دیں جو سود وہ اس حکم کے نزول سے قبل سے چلے ہیں وہ انہی کی غنیمت ہے یعنی یہ قانون ہر دوسرے قانون کی طرح ماقبل پر لگ نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ اگر قوانین گزشتہ دور پر بھی نافذ ہو جائیں تو بہت سی مشکلات پیدا ہو جائیں اور زندگی شدید آوارہ چڑھاؤ کا شکار ہو جائے اس لیے قوانین جب بننے ہیں اس وقت سے نافذ ہوتے ہیں۔

البتہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سود خوروں کے حساب میں اگر کچھ سود لوگوں کے ذمے ابھی باقی تھا تو اس آیت کے نزول کے بعد بھی وہ سے لے سکتے تھے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ جو سود وہ اس وقت تک لے چکے تھے وہ حلال کر دیا گیا ہے۔

مزید فرمایا گیا ہے۔ ”وامرہ الح اللہ“ یعنی ان کا معاملہ قیامت میں خدا کے سپرد ہوگا۔ اس جملے کا



ظاہری مفہوم تو یہ ہے کہ سزا یا معافی کے بارے میں ان لوگوں کا مستقبل واضح ہے لیکن گذشتہ صفحے کی طرف توجہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مراد غفوی ہے گویا سود اتنا بڑا گناہ ہے کہ جو لوگ پہلے یہ کام کرتے تھے۔ ان کی معافی کا ذکر بھی مہربانی سے کرنا پڑا ہے تاکہ بات محض نہ رہے۔

”وَمَنْ عَادَ غَضَابُ اللَّهِ عَلَيْهِ اصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ“

یعنی جو شخص خدا تعالیٰ کی طرف سے اس نصیحت اور بار بار کی تاکید کے باوجود اس عمل سے دست کش نہ ہو اسے چاہیے کہ پروردگار کے درونِ ناک اور دائمی عذاب کا منتظر رہے۔

دائمی عذاب اگرچہ اہل ایمان کے لیے نہیں ہے لیکن آیت میں ایسے سود خوار مراد ہیں جو خدا سے جنگ اور دشمنی کرتے ہوئے نہایت ڈھٹائی سے اس گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ مسلم ہے کہ ایسے لوگوں کا ایمان صحیح نہیں ہے۔ اسی لیے آیت میں ان کے لیے دائمی عذاب کی خبر دی گئی ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہاں دوام سے مراد طولانی عذاب ہے نہ کہ دائمی اور اس کی مثال سورہ نسا کی آیت ۹۳ ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہمیشہ سود خوری میں مبتلا رہنے کی وجہ سے انسان بغیر ایمان کے دنیا سے آنکھیں موندے۔

”يَمْحَقُ اللَّهُ التَّوْبَةَ وَيُزِيلُ الْعُصْدَ قُلْتُ“

”محقق“ کا معنی ہے ”نقصان“ اور ”تدریجاً“ نابود ہونا اور ”ربا“ تدریجی رشد و نمو کو کہتے ہیں۔

سود خور چونکہ اپنی دولت کے ذریعے محنت کش طبقے کے پسینے کی کافی سیٹھا ہے اور بعض اوقات اس طرح سے ان کے دہڑی کو ختم کر دیتا ہے یا کم از کم ان کے دل میں دشمنی پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے اور حالت یہاں تک جا پہنچتی ہے کہ وہ آہستہ آہستہ سود خور کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں اور یوں خود سود خور کی جان اور مال خراب سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے: اللہ سوری مٹائے بناوڑ کی طرف لے جاتا ہے تدریجاً باقی ہونی چاہیے سود خوروں کیلئے ہے اسی طرح سود خور معاشرے کے لیے بھی ہے۔ ان کے مقابلے میں جو لوگ انسانی جذباتوں کا احترام کرتے ہیں اور سہمدہی اور غفوری کا راستہ اختیار کرتے ہیں، اپنے سرمائے اور مال میں سے خرچ کرتے ہیں اور لوگوں کی احتیاج پوری کرنے کی کوشش کرتے ہیں انہیں عوام کی طرف سے محبت اور احترام حاصل ہوتا ہے۔ ان کا سرمایہ نہ فقط یہ کہ خطرے سے دوچار نہیں ہوتا ہے بلکہ عوام کے تعاون سے طبعی رشد حاصل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کہتا ہے: اتفاق کرنے میں اللہ تعالیٰ اضافہ عطا کرتا ہے۔ یہ حکم فرد اور معاشرہ دونوں کے لیے ایک سلسلے ہے جس معاشرے میں عام لوگوں کی ضروریات پوری کی جاتی ہیں اس کے محنت کش اور کارگر طبقے کی فکری اور جسمانی صلاحیتیں بہر طور پر کام کرتی ہیں اور پھر یہی طبقہ معاشرے کی اکثریت ہوتا ہے اس طرح سے ایک صحیح اقتصادی نظام وجود میں آتا ہے جس کی بنیاد عوام کا تعاون اور عوام کی ضرورت کی کفالت پر استوار ہوتی ہے۔

”وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْكَافِرَ الْكَثِيرَ“

”کفار“ مادہ ”کفرو“ (بروزن ”فجرو“) سے ہے۔ کفار اس شخص کو کہتے ہیں جو بہت ہی ناسکرا اور کفرانِ نعمت کرنے والا ہو اور ”شیم“ زیادہ گناہ کرنے والے کو کہتے ہیں۔



اس جملے میں کہا گیا ہے کہ سود خور نہ صرف یہ کہ راہ خدا میں خرچ نہ کر سکے، قرض حسد نہ دے کر اور عام ضرورت مندوں کے کام نہ آ کر خدا کی عطا کردہ نعمتوں کا شکر یہ ادا نہیں کرتے بلکہ اس کے ذریعے ہر قسم کا ظلم و ستم اور گناہ و فساد کرتے ہیں اور یہ فطری بات ہے کہ خدا ایسے لوگوں کو دوست نہیں رکھتا۔

”اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاتَّامَوْا الْعُقُوْلَةَ وَالسُّوْا
الرَّكَوْعَةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ“

ہاشمگر گزار کنندہ گار سود خوروں کے مقابلے میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ایمان کے زیر سایہ خود پرستی کو ترک کئے ہوئے اپنے فطری جذبات کو زندہ کیے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ اپنے پروردگار سے رابطہ قائم رکھے ہوئے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں۔ حاجت مندوں کے کام آتے ہیں اور ان کی حمایت میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ سرمائے کے ارتکاز، طبقاتی کشمکش اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بیادریوں جرائم کی راہ روکے ہوئے ہیں۔ ان کی جزا ان کے پروردگار کے پاس ہے اور وہ دونوں جہانوں میں اپنے نیک عمل کے نتیجے سے بہرہ مند ہوں گے۔

فطری امر ہے کہ ایسے لوگوں کے لیے اضطراب اور پریشانی کے عوامل پیدا نہیں ہوتے اور جو خطرات مفت خور سرمایہ داروں کو لاحق تھے اور ان پر جو لعن طعن اور نفوٹ ہوتی تھی ایسے لوگوں پر نہیں ہوتی۔ مختصر یہ کہ مکمل راحت، آرام اور ایمان سے بہرہ یاب ہوں گے اور ان کے لیے کسی قسم کا اضطراب اور غم و اندوہ نہیں ہے۔ ”وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ“

۲۷۸۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ
الزِّبْوٰۤا۟ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

۲۷۹۔ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاَذْنُبُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِۦ
وَإِنْ تُبَيِّنْكُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسٌ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ
وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۝

۲۸۰۔ وَإِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰی مَّيْسَرَةٍ وَّاَنْ
تَصَدَّقُوْا حَزِيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝



ترجمہ

۲۷۸۔ اے ایمان والو! خدا سے ڈرو اور جو رہا (کا تقاضا ابھی) باقی ہے اُسے چھوڑ دو اگر تم ایمان

۲۷۹۔ اگر ایسا نہیں کرتے ہو تو پھر خدا اور رسول سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ تو بہ کرلو تو (سود کے بغیر اصل) سرمایہ تمہاری ہی ملکیت رہے گا۔ تم ظلم کرو نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔

۲۸۰۔ اور اگر (مقدوم قرض) ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو اسے اتنی مہلت دو کہ وہ ایسا کر سکے اور اگر وہ بالکل ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو بخش دو تو بہتر ہے۔ اگر (تم اس کام کے فائدے سے)

آگاہ ہو۔
شان نزول

علی بن ابراہیم کی تفسیر میں ہے کہ سود کی آیات کے نزول کے بعد خالد بن ولید نامی ایک شخص پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کہنے لگا: میرے باپ کے ثقیف قبیلے سے سودی معاملات تھے اور اس نے مطالبات وصول نہیں کیے تھے اور مجھے وصیت کر گیا تھا کہ اس کا سودی مال جو ابھی تک اُس نے وصول نہیں کیا حاصل کر لوں اور اپنی تحویل میں لے لوں۔ کیا یہ عمل میرے لیے جائز ہے؟

اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور لوگوں کو ایسے کام سے سختی سے روک دیا گیا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے یہ آیت نازل ہونے کے بعد فرمایا:

”الاکل رباً من ربنا الجاهلیۃ موضوع و اقول ربنا اضحہ ربنا العباس بن عبد المطلب“:

آگاہ رہو کہ زمانہ جاہلیت کے لوگوں کے تمام سودی مطالبات چھوڑ دیے جائیں اور سب سے پہلے

میں عباس بن عبد المطلب کے سودی مطالبات ترک کرنے کا اعلان کرتا ہوں۔

اس روایت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جب پیغمبر اکرمؐ زمانہ جاہلیت کے سودی مطالبات پر نسخ قلم پھیر رہے تھے تو آپؐ نے یہ کام اپنے رشتے داروں سے شروع کیا اور اگر ان میں عباس بن عبد المطلب جیسے دولت مند افراد تھے کہ جو زمانہ جاہلیت میں دیگر سرمایہ داروں کی طرح اس گناہ میں آلودہ تھے تو آپؐ نے سب سے پہلے انہی کے سودی تقاضوں کو مسترد قرار دیا۔

تفسیر

پہلی آیت میں خدا تعالیٰ نے اہل ایمان کو مخاطب فرمایا ہے۔ انہیں پرہیزگاری کی وصیت کے بعد فرمایا گیا ہے کہ



اگر وہ ایمان رکھتے ہیں تو اپنے باقی ماندہ سودی مطالبات بھول جائیں۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ آیت ایمان باللہ سے شرطنا ہوتی ہے اور ایمان ہی کے تقاضے پر ختم ہوتی ہے۔ یہ امر اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ سود روح ایمان کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔

”فَانِصِرْهُمْ تَكُنْ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ“ (سورہ بقرہ: ۱۷۷)

اس آیت میں قرآن نے اپنے لب و لہجہ کو بدل دیا ہے۔ پہلی آیت کی تفصیلات کے بعد اس آیت میں سود خوروں پر شدید حملہ کیا ہے اور انہیں خسرت کا لالہم دیا ہے۔ حکم ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے اپنا کام جاری رکھا اور حق و حقیقت کے سامنے سر تسلیم خم نہ کیا اور اسی طرح محروم لوگوں کا خون چوستے رہے تو بغیر مجبور ہیں کہ فوجی طاقت سے انہیں روکیں اور حق کے سامنے جھکا دیں۔ حقیقت میں یہ بغیر کی طرف سے اعلان جنگ ہے۔ یہ رہی جنگ ہے جو اس قانون کے تحت انجام پاتی ہے:

”فَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَمَا كَانُوا يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ“ (احزاب: ۸۱)

تجاوز اور بغاوت کرنے والے گروہ سے جنگ کرو تاکہ وہ فرماں خدا کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔ اجرات - ۱۹۔ یہی وجہ ہے کہ جب امام صادق علیہ السلام نے ایک شخص کے بارے میں سنا کہ وہ بڑی جرأت سے سود کھاتا ہے اور اس نے اس کا نام لیا، دودھ، دیکھ رکھا ہے تو فرمایا:

”اگر بے اس پر دسترس حاصل ہو جائے تو اسے قتل کر دوں۔“

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم ان لوگوں کے لیے ہے جو اسلام میں حرمت سود کے منکر ہوں۔ بہر صورت اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی حکومت طاقت کے ذریعے سود خوری کو روک سکتی ہے۔

”وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ“ (سورہ بقرہ: ۲۷۵)

ارشاد ہوتا ہے، اگر تو بہ کر ہو اور سود خوری کی دوکان بڑھا دو تو تمہیں حق پہنچتا ہے کہ لوگوں کے پاس جو تیار اصلی سرمایہ ہے (سود چھوڑ کر) دے لو اور یہ قانون ہر طرح سے عادلانہ ہے۔ کیونکہ یہ قانون ایک طرف تو تمہیں دوسروں پر ظلم کرنے سے روکتا ہے اور دوسری طرف تمہیں ظلم کے وارث نہ بناتا ہے۔ اس طرح نہ ظالم بنو گے اور نہ مظلوم۔

”وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ“ (سورہ بقرہ: ۲۷۵)

یہ وسیع مفہوم کا حامل نہایت قیمتی اسلامی شعار ہے جو کہتا ہے کہ جس طرح مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ظلم کرنے سے پرہیز کریں اس طرح اپنے آپ کو ظلم و ستم کے پیر نہ مگرنے سے بھی اجتناب کریں۔ اصولی طور پر اگر ستم کش نہ ہوں تو ستمگر بھی کم پیدا ہوں گے۔ مگر مسلمان اپنے حقوق کے دفاع کا پورا حوصلہ اور آمادگی رکھتے ہوں تو کوئی ان پر ظلم نہیں کر سکتا۔ لہذا ظالم کو ظلم سے منع کرنے سے پہلے مظلوم سے کہو کہ ظلم نہ ہے۔

”وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ“ (سورہ بقرہ: ۲۷۵)

قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے کہ سود کے بغیر اصل سرمایہ طلبکار کا حق ہے۔ اس آیت میں مقررہ کا ایک حق بیان کیا گیا ہے کہ اگر وہ اپنا قرض ادا کرنے سے عاجز ہو تو نہ صرف یہ کہ زمانہ جاہلیت کی رسم کے مطابق ان پر نپا سود نہ لگایا جائے



اور انہیں ستیانہ جائے جگہ اصل قرض کی ادائیگی پر بھی انہیں مہلت دی جانا چاہیے تاکہ جب وہ واپس کر سکنے کے قابل ہوں اس وقت لوٹا سکیں۔ قوانین اسلامی میں جو دراصل اس آیت کے مفہوم کو واضح کرتے ہیں یہ تصریح ہو چکی ہے۔ کبھی بھی مقرض افراد کے گھر اور دیگر ضروری وسائل کو قرق کر کے اس سے قرضہ وصول نہیں کیا جاسکتا بلکہ ضروریات زندگی سے نامد مال پر طلبگار اسی سے اپنا حق لے سکتے ہیں اور یہ انسانی معاشرے کے ضعیف اور پسماندہ طبقے کی بہت واضح حمایت ہے۔

”وَإِن تَصَدَّقْتُمْ خَيْرَ لَّكُمْ إِن كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ“

اس سے بھی آگے بڑھ کر فرمایا گیا ہے، اگر مقرض اپنا قرضہ ادا کرنے سے واقفاً بالکل عاجز ہو تو بہتر ہے کہ طلبگار ایک عظیم تر انسانی قدم اٹھائے اور اپنے مال سے صرف نظر کر دے اور یہ اس کے لیے ہر لحاظ سے بہتر اور انسانی ہمدردی کا اچھا مظہر ہے اور جو شخص اس عمل خیر کے فوائد سے آگاہ ہو جائے گا وہ واقعیت کی تصدیق کرے گا۔

۲۸۱۔ وَاشْكُوا يَوْمًا تَرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝

ترجمہ

۲۸۱۔ اور اس دن سے ڈرو جب خدا کی طرف چٹ جاؤ گے اور پھر ہر شخص نے جو کچھ انجام دیا ہوگا اسے لوٹا دیا جائے گا اور ان پر ظلم و ستم نہیں ہوگا (بلکہ وہ جو کچھ بھی دیکھیں گے وہ ان کے اپنے اعمال کے نتائج ہوں گے۔

تفسیر

قرآن مجید کا طریقہ ہے کہ جزوی احکام اور اسلامی پروگرام بیان کرنے کے بعد بہت سے مواقع پر آخر کار ایک کلی، عمومی اور جامع اصول بیان کرتا ہے تاکہ احکام کی مزید تاکید ہو جائے اور وہ پوری طرح فکر اور روح کی گہرائیوں میں اتر جائیں لہذا اس آیت میں لوگوں کو قیامت اور بدکاروں کے اعمال کے عذاب کی طرف توجہ دلاتے ہوئے بیدار کیا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ وہ متوجہ رہیں کہ ایک ایسا دن آنے والا ہے کہ انسان کے تمام اعمال بغیر کسی کمی بیشی کے اسے لوٹا دیے جائیں گے اور وہ تمام چیزیں جو عالم ہستی کے دفتر ضبط و ثبت میں محفوظ ہیں، ایک ہی مقام پر اسے دے دی جائیں گی۔ یہ وہ حکم ہوگا جہاں وہ ان اعمال کے برے نتائج سے خوف زدہ ہوگا لیکن یہ توجہ کچھ بویا تھا اس کا حاصل ہوگا اور کسی کی طرف اس پر کوئی ظلم نہ ہوگا بلکہ یہ تو خود انسان ہے جو اپنے اوپر ظلم و ستم روا رکھتا ہے۔ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ۔

ضمناً یہ آیت دوسرے جہان میں انسانی اعمال مجسم ہونے پر ایک اور شاہد ہے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ تفسیر درمنثور میں کئی طریقوں سے منقول ہے کہ یہ پیغمبر اسلام پر نازل ہونے والی آخری آیت ہے اس مضمون کی طرف توجہ کی جائے تو یہ بات بعید بھی نظر نہیں آتی۔ سورہ بقرہ اگرچہ پیغمبر کریم پر نازل ہونے والی آخری سورت نہیں



ہے تاہم یہ بات پہلی بات سے کوئی اختلاف نہیں رکھتی کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ بعض اوقات بعد میں نازل ہونے والی آیات حکیم رسولؐ سے پہلی سورتوں میں شامل کر مٹی گئی ہیں۔

سود خوری کے نقصانات

سود خوری مباشرے کے اقتصادی اعتدال کو تباہ کر دیتی ہے اور دولت و ثروت کے ارتکاز کا سبب بنتی ہے کیونکہ اس کے ذریعے نقطہ ایک طبقہ فائدہ اٹھاتا ہے اور تمام تر اقتصادی نقصان دوسرے طبقے کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ یہ جو ہم سنتے ہیں کہ امیر اور غریب ملکوں میں دن بدن فاصلہ بڑھ کر رہا ہے تو اس کی ایک اہم وجہ سود ہے اس کے بعد خون آشام جنگیں برپا ہوں گی۔

سود خوری ایک قسم کا غیر صحیح اقتصادی مبادلہ ہے جو انسانی جذبول اور رشتوں کو کمزور کر دیتا ہے اور دلوں میں کینے اور دشمنی کا بیج بوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سود خوری نظام اس بنیاد پر استوار ہے کہ سود خور صرف اپنا مالی مفاد پیش نظر رکھتا ہے اور مقروض کے نقصان پر اس کی قطعاً کوئی نظر نہیں ہوتی۔

یہی مقام ہے جہاں مقروض سمجھتا ہے کہ سود خور پیسے کو اسے اور دوسروں کو بے بس کرنے کا ذریعہ بنانے ہوئے ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سود دینے والا اپنی ضرورت کے مامت سود دینے پر تیار ہوتا ہے لیکن وہ اس بے انصافی کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ معاملہ کسی بیباں تک جا پہنچتا ہے کہ مقروض سود خور کے بیخوں کی سخت گرفت شدت سے محسوس کرتا ہے ایسے موقع پر اس بے چارے کا سارا وجود سود خور کو گھسٹ اور نفرت کرتا ہے اور وہ اس کے خون کا پیاسا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ جو کمانی وہ جلان کی بازی لگا کر کرتا ہے وہ سود خور کی جیب میں جا رہی ہے۔ ان حالات میں ایسا بحران پیدا ہوتا ہے کہ بہت سے وحشت ناک جرائم سامنے آتے ہیں۔ کبھی مقروض خود کشی کر لیتا ہے کبھی شدید کرب سے دو چار ہو کر سود خور کو المناک طریقے سے قتل کر دیتا ہے اور کبھی متبرہ اجتماعی بحران عمومی افراتفری اور عوامی انقلاب کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔

تعاون کے رشتوں کی یہی کمزوری سود دینے والے اور سود لینے والے ملک میں بھی واضح طور پر نظر آتی ہے۔ وہ قرض جو دیکھتی ہیں کہ ان کا سرمایہ سود کے نام پر دوسری قوم کی جیب میں جا رہا ہے۔ ایک خاص نفخہ کینے اور نفرت سے اس قوم کو دیکھیں گی۔ انہیں قرض کی ضرورت تو ہے لیکن وہ مستنظر رہتی ہیں کسی مناسب موقع پر اپنے رد عمل کا مظاہرہ کریں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ سود خوری اختلافی نقطہ نظر سے قرض لینے والے کے دل و دماغ پر بہت بڑا اثر مرتب کرتی ہے اور اس کے دل میں اس بات کا کینہ ضرور رہ جاتا ہے۔ اس سے افراد اور قوموں کے درمیان اجتماعی تعاون کا رشتہ ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔

اسلامی روایات میں ایک مختصر سے پر معنی جملے کے ذریعے سود کے برے اخلاقی اثر کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ کتاب وسائل الشیعہ میں سود کی حرمت کی وجہ کے بارے میں ہے کہ ہشام بن سالم کہتا ہے امام صادق علیہ السلام

”سود خوری یا مستور اقتصاد کا معنی خور ہے۔“



نے فرمایا :-

”اَفْعَا حَزَمَ اِلَهِ عَزَّ وَجَلَّ الرَّبُّوْ لِكَيْ لَا يَمْنَعَ النَّاسُ مِنْ اَصْطِفَاعِ

الصَّعْدِ رُفُوْا لِيْ

خدا تعالیٰ نے سود کو حرام قرار دیا ہے تاکہ لوگ ایک کام کرنے سے رک نہ جائیں ۔ سہ

۲۸۲- يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدٰۤىيْتُمْ بِدِيْنٍ اِلَىۤ اٰجَلٍ
مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ۚ وَلْيَكْتُبَ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ
وَلَا يَابَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ
وَلْيُمْلِلِ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا
يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا ۚ فَاِنْ كَانَ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ
سَفِيْهًا اَوْ ضَوِيْمًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُعْلَلَ هُوَ فَلْيُمْلِلْ
وَلِيْهُ بِالْعَدْلِ ۚ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ
فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتَيْنِ مِمَّنْ
تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحَدُهُمَا فَتَدْرِكْ
اِحَدَهُمَا الْاُخْرٰى ۚ وَلَا يَابَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا
وَلَا تَسْمَعُوْۤا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَفِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلَىۤ اٰجَلٍ
ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْسَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَذْنٰۤى اِلَّا
تَرْتَابُوْۤا اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةٌ حَاضِرَةٌ تُدِيْرُوْنَهَا
بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ۚ وَاشْهِدُوْا
اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۚ وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ ۚ وَاِنْ تَفَعَّلُوْا



فَاتَّهَ فُسُوفُ بَكْمَ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ وَيَعْلَمُ اللَّهُ ۚ وَاللَّهُ
بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝

ترجمہ

۲۸۲۔ اے ایمان والو! جب ایک معین مدت کے لیے قرض یا کسی اور معاملے کے لیے ایک دوسرے سے لین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو اور لکھنے والے کو چاہیے کہ وہ عدل سے دستاویز لکھے اور جس شخص کو اللہ نے لکھنے پڑھنے کی قابلیت عطا کی ہے اسے چاہیے کہ وہ لکھنے سے گریز نہ کرے اور جس کے ذمے حق ہے اہل وہ شخص کر دے اور خدا سے ڈرے اور طے شدہ معاملے میں کوئی چیز فرو گزاشت نہ کرے اور اگر قرض لینے والا نادان یا ضعیف ہو یا دیوانہ ہو یا گونگا ہو سنے کی وجہ سے اہل نہ کرنا ہو تو اس کے ولی کو چاہیے کہ اس کی بجائے عدل کو ملحوظ رکھتے ہوئے اہل کر دے اور اپنے مردوں میں سے دو افراد کو اس حق پر گواہ بنائے اور اگر دو مرد نہ ہوں تو اپنے حسب الطہان ایک مرد اور دو عورتیں منتخب کر لو یہ دونوں عورتیں مل کر ایک گواہ ہوں گی اور یہ دو عورتیں اس لیے ہیں تاکہ ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے اور جب گواہوں کو شہادت کے لیے بلایا جائے تو انہیں انکار نہیں کرنا چاہیے اور وہ معاملہ جس کی مدت معین ہے چاہے معذور ہو یا زیادہ اسے لکھنے پر دل تنگ نہیں ہونا چاہیے جو کچھ بھی ہو لکھ لینا چاہیے یہ خدا کے نزدیک عدل کے قریب تر ہے شہادت کے لیے زیادہ سہولت اسی میں ہے اور شک و تردد اور بحث و نزاع کو روکنے کے لیے بھی بہتر ہے۔ ہاں البتہ جو لین دین تم دست بہ دست آپس میں کرتے ہو اس میں نہ بھی لکھا جائے تو کوئی شک نہیں اور نقد خرید و فروخت کے وقت بھی گواہ بنالیا کرو۔ کاتب اور گواہ کو حق کوئی کی وجہ سے کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ اور نہ ان سے سختی کی جانا چاہیے اور اگر ایسا کر دے تو پروردگار کے فرمان سے کفر جائے گا۔ خدا سے ڈرتے رہو اور خدا تمہیں تعلیم دیتا ہے اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

تفسیر

تجارتی دستاویزات

جیسے قرآن نے سود خوری، ذخیرہ اندوزی اور بھل کے خلاف سخت جنگ کی ہے۔ اسی طرح تجارتی اور اقتصادی امور کے لیے تفصیلی قواعد بیان کیے ہیں۔ تاکہ جتنا زیادہ ہو سکے سرمایہ طبیعی رشد حاصل کرے اور کسی قسم کا جھگڑا، اختلاف اور نزاع پیدا نہ ہو۔

محل بحث آیت قرآن حکیم کی طویل ترین آیت ہے۔ اس میں مالی لین دین کے قواعد کے سلسلے میں اٹھارہ احکام



بیان کیے گئے ہیں۔ ذیل میں ہم ان قواعد کو ترتیب وار ذکر کرتے ہیں :

۱۔ جب کوئی شخص کسی کو قرض دے یا کوئی معاہدہ انجام پائے اور طرفین میں سے ایک مقدم ہو جائے تو بعد میں ممکنہ کسی اشتباہ یا نزاع سے بچنے کے لیے معاملے کی ساری شرائط ضبط تحریر میں آجانا چاہئیں۔

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَسْتُمْ بِدِيْنٍ أَوْ بَعْلِ غَسَقٍ
فَاصْكُتُوا“ :

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ آیت میں لفظ ”قرض“ نہیں بلکہ دین استعمال ہوا۔ قرض صرف وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں دو ایسی چیزیں کا تبادلہ ہو جو ایک دوسرے کی مثل ہوں۔ مثلاً نقدی یا جنس قرض کے طور پر لی جائے اور اس سے فائدہ اٹھا کر اس کی مثل واپس کر دی جائے لیکن دین کا دامن وسیع تر ہے کیونکہ جیسا معاہدہ انجام پائے۔ مثلاً صلح، اجارہ، خرید و فروخت وغیرہ اگر ایک طرف سے کچھ دیا جانا ہو تو اسے دین کہتے ہیں۔ اس بناء پر زیر بحث آیت میں تمام معاملات پر محیط ہے جو سلفہ فیسیدہ کے طور پر انجام پاتے ہیں جہاں تک کہ قرض بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے۔

۲۔ اطمینان کے حصول کے لیے اور طرفین میں سے کسی کی ممکنہ بے جا مداخلت سے بچنے کے لیے حکم دیا گیا ہے کہ دستاویز کوئی تیسرا شخص رکھے۔

”وَلْيَكْتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ“ :

اس جملے کے ظاہری مفہوم سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ دستاویز لکھنا واجب ہے۔ لیکن بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے
فَاتَّبِعْ أَمْرَ بَعْضِكُمْ بَعْضًا فَمِنْهُ ذِكْرٌ وَإِذْنٌ مِّنَ اللَّهِ

اگر آپس میں اطمینان ہے کہ آپس کے ذمے حق ہے وہ ادا کر دینا تو تحریر موجود نہ ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تحریر اس صورت میں ضروری ہے جب آپس میں محض اطمینان نہ ہو اور احتمال ہو کہ معاہدہ نزاع اور کشمکش تک پہنچے گا۔

۳۔ کاتب کو چاہیے کہ دستاویز لکھتے وقت حق کو پیش نظر رکھے اور عین واقع کے مطابق لکھے (بالعدل)۔
۴۔ جس شخص کو خدا تعالیٰ نے کھنے پڑھنے کی قابلیت عطا فرمائی ہے اور وہ معاملے کے بارے میں احکام و شرائط سے آگاہ ہے اُسے چاہیے کہ دستاویز لکھنے میں گریز نہ کرے بلکہ اس اجتماعی امر میں طرفین کی مدد کرے۔

”وَلَا يَأْبَ صَكَاتُهُ إِنَّ يَكْتُبُ كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ فَلْيَكْتُبْ“ :

”کَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ“ مندرجہ بالا تفسیر کی روشنی میں دیکھا جائے تو آیہ کا یہ حصہ مزید تاکید اور تشویق کے لیے معلوم ہوتا ہے۔ نیز یہ ایک اور نکتہ کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ جیسے خدا نے اُسے تعلیم دی ہے، اتنی ہی حد تک عدل اور ایمان واری کو ملحوظ رکھنے والا اصطلاح کے مطابق ”بَيْنَهُ وَبَيْنَ اللَّهِ“ دستاویز کو انتہائی سوچ بچار سے ترتیب دے۔

البتہ دستاویز لکھنے کی دعوت قبول کرنا واجب عینی نہیں جیسا کہ اس جملے سے ظاہر ہوتا ہے :



”وَلَا تَسْتَمُوا آتَانَ تَكْتَبُوهُ صَغِيرًا وَكَبِيرًا“ :

یعنی کسی چھوٹی بڑی دستاویز کے لکھنے سے دل تنگ نہ ہوگا۔

۵۔ چاہیے کہ معاملے کے دونوں فریق میں سے ایک دستاویز کی اطلاع کروائے یعنی وہ کہتا جائے تاکہ کاتب لکھتا جائے۔ لیکن طرفین میں سے ایسا کون کرے؟ اس بارے میں آیت کہتی ہے کہ مقررین یعنی جسے حق ادا کرنا ہے وہ ایسا کرے
 (”وَلْيَسْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ“)

ایسی دستاویزات میں ہمیشہ بنیادی اقرار تو مقررین ہی کا ہوتا ہے اور اُسی کے دستخط بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اس لیے جو متن اُس کے اعتراف اور اطلاع کروانے سے تیار ہوگا وہ ایک ایسی بنیاد بن جائے گا جس کا انکار نہیں ہو سکتا۔

۶۔ جس کے ذریعہ واجب الادا بات اُسے چاہیے کہ اطلاع کروائے وقت خدا تعالیٰ کو پیش نظر رکھے ہو کسی چیز کو فراموش نہ کرے اور تمام چیزیں لکھے تاکہ کاتب لکھ لے۔ ”وَلْيَشْهَدْ الشَّاهِدُ رُبَّمَا وَلَا يَنْفَعُ مَنْهُ شَيْعًا“

۷۔ اگر مقررین سفید و نالوان ہوا اپنے مالی امور کی دیکھ بھال نہ کر سکتا ہو اور اپنے نفع و نقصان کو نہ سمجھ سکتا ہو ضعیف و کمزور، کوتاہ فکر، کم عقل اور گونا گونا گونا بات کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو ان صورتوں میں اس کی جگہ اس کا ولی اطلاع کروائے گا اور دستاویز کو ترتیب دینے والا اسے لکھے گا ”فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يَمْلِكَ هُوَ فَلْيَسْلِلِ وَلِيَّهُ“ :

۸۔ ”ولم“ کو بھی چاہیے کہ اطلاع میں عدالت کو مہموزار رکھے اور حق سے انحراف سے بچے وَلْيَسْلِلِ وَلِيَّهُ بِالْعَدْلِ)

۹۔ طرفین کو دستاویز پر دو گواہ بھی بنانا چاہئیں (وَاسْتَشْهَدُوا شَهِيدَيْنِ) ۔

۱۰۔ ۱۱۔ یہ دونوں گواہ بالغ اور مسلمان ہوں (مَنْ رَجُلًا لَكُمْ) (كَم) مسلمان ہونے کا

معنی دیتا ہے کیونکہ ”مَنْ رَجُلًا لَكُمْ“ کا نفی منہی ہے۔ ایسے جو تہذیبی جماعت میں سے ہوں۔

۱۲۔ ایک مرد اور دو عورتیں بھی گواہ ہو سکتے ہیں ”فَإِنْ لَمْ يَكُنْ رَجُلَيْنِ فَمَرْجُلٌ وَ

امْرَأَتَانِ“

۱۳۔ گواہ قابل اعتماد ہونا چاہئیں (”مَنْ تَرْضَوْنِ مِنَ الشَّهَدَاءِ“) اس جملے سے

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گواہ ہر لحاظ سے پسندیدہ ہوں اور اس سے مراد اُن کی عدالت ہی ہے۔ جیسا کہ روایات میں بھی آیا ہے۔

۱۴۔ جب گواہ دوہو تو ان میں سے ہر ایک مستقل گواہی دے سکتا ہے لیکن جب ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تو پھر ان دو عورتوں کو چاہیے کہ ایک دوسرے سے مل کر متفق ہو کر گواہی دیں تاکہ ان میں سے ایک اشتباہ کرے تو دوسری اُسے یاد دلا دے۔

رہا یہ سوال کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر کیوں شمار کی گئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت نرم دل ہوتی ہے



اور ممکن ہے بعض اوقات کسی کے زیر اثر آجائے اس لیے اس کے ساتھ ایک اور دعوت کو شامل کیا گیا ہے تاکہ وہ اسے کسی کے زیر اثر ہونے سے روک سکے "ان تعصل احدہما فتذکر احدہما الآخر" ۱۵۔ قرآن مختوڑا ہوا زیادہ اسے تحریر میں آجنا چاہیے کیونکہ اسلام چاہتا ہے کہ اقتصادی روابط میں کسی قسم کا جبر اور نزاع نہ ہو۔ وہ کہتا ہے قرآن کی کسی کی وجہ سے دشمنی نہ لگنے میں کوتاہی نہیں ہونا چاہیے ("ولا تشعروا ان تکتبوا صغیراً او کبیراً الت اجملہ")

مستی اور خشگی کو سارے کہتے ہیں "لا تشعروا" یعنی غمزدگی نہ ہو جاؤ۔ یہاں قرآن مندرجہ بالا احکام کے فلسفہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ دستاویزات کی تیاری ایک طرف تو عدل و انصاف کی ضامن ہے اور دوسری طرف گواہوں کے لیے شہادت کے وقت تقویت و اطمینان کا باعث ہے اور تیسرا پہلو یہ ہے کہ افراد معاشرہ کے مابین نزاع پیدا ہونے میں رکاوٹ کا کام دیتی ہے "فاللکم اقسط عند اللہ واعطوہم للشہادۃ وادفوا الی متروقاہوا"

۱۶۔ جب معاہدہ نقد بنقد ہو تو کسی سند یا دستاویز کی ضرورت نہیں ہے "الا ان تکون تجارۃ حاضرة تدبرونہما بینکم فلیس علیکم جناح الیٰ تکتبوہما" "تجارۃ حاضرة" کا معنی ہے "نقد معاہدہ" اور "تدبرونہما" کا مطلب ہے دست بہ دست پھیرنا جو کہ نقد معاہدے ہی کی تاکید ہے۔

"فلا جناح" یعنی کوئی حرج نہیں۔ یہ لفظ ظاہر کرتا ہے کہ جب نقد معاہدہ انجام پارتا ہو اس وقت بھی کوئی دستاویز تیار کر لینا بہتر ہے کیونکہ اس طرح ہر طرح کا ممکنہ اشتباہ اور اعتراض ختم ہو جاتا ہے۔

۱۷۔ نقد معاہدے میں اگرچہ تحریر ضروری نہیں البتہ گواہ بنالینا چاہئیں ("واشہدوا اذا تبایعتکم") ۱۸۔ آیت کے آخر میں حکم دیا گیا ہے کہ گواہوں اور کاتب پر کسی قسم کا تشدد اور سختی نہیں کی جانا چاہیے تاکہ وہ حق اور عدالت سے اپنا کام انجام دیں ("ولا یضار کاتب ولا شہید")۔

جو کچھ ہم نے مندرجہ بالا حصے میں کہا ہے اس سے معلوم ہوا کہ "یضار" اصطلاح کے مطابق فعل مجہول ہے یعنی اسے اذیت نہ پہنچائی جائے۔

باقی رہا عدالت کے بارے میں کاتبوں اور گواہوں کے لیے حکم — تو وہ آیت کی ابتداء میں آچکا ہے اس لیے ضرورت نہیں کہ "لا یضار" کو فعل معلوم سمجھیں اور اس کا معنی یہ لیں کہ "وہ اذیت نہ پہنچائیں" مندرجہ بالا حکم کے بعد تاکید ہے کہ اگر کوئی شخص حق گوئی کی بناء پر گواہوں اور کاتبوں کو اذیت پہنچائے تو وہ فسق و گناہ کا مرتکب قرار پائے گا اور ایسا کرتا ہنگامی خدا کے تعاضوں کے منافی ہے ("وان تفعلو فانتہ فسوق بکم")۔

یہ تمام احکام بیان کرنے کے بعد آخر میں لوگوں کو تقویٰ و پرہیزگاری اور ادا امر الہی کی اطاعت کی دعوت دی گئی ہے ("واتقوا اللہ")۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ جو چیزیں تمہاری مادی اور معنوی زندگی کے لیے ضروری ہیں،



خدا تعالیٰ تمہیں ان کی تعلیم دیتا ہے۔ ("ويعلمكم الله") وہ لوگوں کے فائدے اور نقصان سے آگاہ ہے اور جن چیزوں میں ان کی بہتری اور صلاح ہے وہی ان کے لیے مقرر کرتا ہے ("والله بكل شيء عليم")۔
 ضمنی طور پر ("واقتوا الله وبعلمكم الله") سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا پرستی، آگاہی، روشن فکری اور علم و دانش میں اضافے پر تقویٰ اور پرہیزگاری گہرا اثر مرتب کرتی ہے اور جب انسان کا دل پاک ہو جاتا ہے تو وہ آئینے کی طرح حقائق کو اپنے اندر منعکس کر دیتا ہے۔

۲۸۳۔ وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَىٰ سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهْنِ مَقْبُوضَةً فَإِنْ آمَنْ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ فَلْيُؤْذِ الَّذِي أُؤْثِرَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ إِيَّاهُمْ فَتْنَةٌ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ۝

ترجمہ

۲۸۳۔ اور اگر تم سفر میں ہو اور دستاویز لکھنے کے لیے کوئی کاتب میسر نہ آئے تو کچھ رہن رکھ لو (اور رہن کے طور پر دی گئی چیز قرض دینے والے کے قبضے میں رہنی چاہیے) اور اگر تم ایک دوسرے پر اکا مل (ایمان رکھتے ہو) تو پھر رہن کی بھی ضرورت نہیں (اور جسے امین سمجھا گیا ہے) اور بغیر کسی رہن کے اس نے دوسرے سے کوئی چیز لے لی ہے اسے چاہیے کہ امانت (اور اپنا قرض موقع پر) ادا کرے اور اس اللہ سے ڈرے جو اس کا پروردگار ہے اور شہادت کو نہ چھپاؤ کہ جو شخص اسے چھپائے گا اس کا دل گنہگار ہے اور جو کچھ تم انجام دیتے اللہ اس سے آگاہ اور اس کا عالم ہے۔

تفسیر

یہ آیت دراصل گزشتہ آیت کے مفاہیم کی تکمیل کرتی ہے۔ اس میں چند ایک احکام مزید بیان فرمائے گئے ہیں۔
 ۱۔ اگر لین دین کرتے وقت دستاویز لکھنے والا میسر نہ ہو، جیسا کہ سفر میں پیش آ سکتا ہے تو قرض لینے والا دوسرے کی تسلی کے لیے کوئی چیز گروی کے طور پر دے دے ("وان كنتم على سفر ولم تجدوا كاتباً فمقبوضه")۔



بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ رهن کا قانون سفر سے مخصوص ہے لیکن رگے چلے و لسم تجدوا حکماً کتاباً۔ اکاتب میسر نہ آئے تو سے ظاہر ہوتا ہے کہ سفر کا ذکر مثال کے طور پر ایسے موقع کے لیے آیا ہے جب دستاویز لکھنے والا میسر نہ ہو۔ اس بنا پر وطن میں بھی طرفین صرف رهن پر اکتفا کر سکتے ہیں۔ تفاسیر اہل بیت میں بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ شیعہ و سنی کتب احادیث میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ پیغمبر اسلامؐ نے اپنی زدہ ایک غیر مسلم کے پاس قرض لینے کے لیے رهن کے طور پر رکھی تھی۔

۲۔ رهن حتمی طور پر قرض دینے والے کے پاس رہنا چاہیے لہذا اسے اطمینان رہے قرہنن مقبوضہ تفسیر عیاشی میں ہے کہ امام صادقؑ فرماتے ہیں۔
”لا رهن الا مقبوضہ“

رهن ہی نہیں مگر وہ کہ جو طلب کار کی تحویل میں ہو۔
۳۔ دستاویز لکھنا، گواہ بنانا اور رهن رکھنا سب احکام ایسے مواقع کے لیے مخصوص ہیں جہاں طرفین ایک دوسرے کے بارے میں مکمل طور پر اطمینان نہ رکھتے ہوں ورنہ قرض دینے والے کو کسی دستاویز کی کوئی ضرورت نہیں اور مقرض کو بھی چاہیے کہ وہ اس کے اعتبار کا احترام کرے اور بر محل اس کا حق ادا کر دے اور تقویٰ کو فراموش نہ کرے۔
”فان امن بمعضبکم بعضنا فلیتو الذی اؤتمن امانتہ ولیشوق اللہ ربہ“

۴۔ لین دین کا موقع ہو یا کوئی اور، اصولی طور پر جو لوگ جانتے ہیں کہ کس کا کیا حق ہے ان کی ذمہ داری ہے کہ جب انہیں گواہی کے لیے بلایا جائے تو وہ گواہی کو نہ چھپائیں کیونکہ گواہی کو چھپانا عظیم گناہوں میں شمار ہوتا ہے ”ولا تعسکتوا الشہادۃ“ ومن یحکمتمہا فانہ انتم قلبہ۔

یہ واضح ہے کہ گواہی دینا اس صورت میں ہم پر واجب ہے جب دوسرے اپنی شہادت سے حق کو ثابت نہ کریں اگرچہ کچھ لوگ اپنی گواہی سے حق ثابت کر دیں تو باقی لوگوں پر سے یہ ذمہ داری ساقط ہو جاتی ہے۔ اصطلاح میں گواہی دینا واجب کفائی ہے۔

شہادت کا معنی رکھنا اور موقع کے مطابق اس کا اظہار نہ کرنا، یہ عمل چونکہ دل ہی کی مرضی سے انجام پاتا ہے اس لیے مزید تاکید کے طور پر گناہ کی نسبت دل کی طرف دی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے اس کا دل گناہگار ہے۔ لہذا آیت کے آخر میں امانت اور دیگر حقوق کے بارے میں زیادہ سے زیادہ توجہ اور بیداری کے لیے فرمایا گیا ہے کہ پروردگار تمہارے کردار سے باخبر ہے۔ (واللہ بمعا تعملون علیم۔)

لے ”اؤتمنت“ امن کے ماد سے ہے۔ ان کا معنی ہے اطمینان وغیرہ۔ اس سے مراد وہ مقرض ہے جسے لین بھی لیا ہے۔ دوسرے جگہ

میں امانت سے مراد قرض ہے یعنی اس صورت میں قرض دینا و رکھنا ہے۔ لے۔ ”تکب“ دے سوا ذاتی طور پر دینا (ان کے حق میں دینا)

۲۸۲۔ لَنْ يَنْفَعَكَ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاِنْ تُبَدِّلْ مَا
فِيْ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تَخَفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهٖ اللّٰهُ فَيَغْفِرُ لِمَنْ
يَشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

ترجمہ

۲۸۲۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ کا مال ہے (لہذا) جو کچھ تمہارے دل میں ہے
اُسے ظاہر کر دو یا پوشیدہ رکھو خدا تمہارا حساب اس کے مطابق ہی کرے گا۔ پھر جسے چاہے
گا (اور جو اہل ہوگا) اُسے بخش دے گا اور جسے چاہے گا (اور وہ مستحق ہوگا) اسے عذاب دے گا
اور خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

تفسیر

انسان سے جو گناہ سرزد ہوتے ہیں ان میں سے بعض باطنی ہیں اور بعض ظاہری ہیں اور بعض داخلی اور قلبی ہیں اور بعض
شہادت کو چھپانا اور شرک کرنا وغیرہ۔ مندرجہ بالا آیت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ خدا تعالیٰ صرف ظاہری گناہوں کا محاسبہ نہیں
کرتے بلکہ باطنی اور قلبی گناہوں کا محاسبہ بھی کرتے ہیں۔ اور وہ اس کے عمل سے گزریں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ زمین و آسمان پر حاکم ہے اور
کوئی چیز اس سے مخفی نہیں ہے۔ اور وہی اور قلبی گناہوں کا محاسبہ نہ کر سکتے دے وہ ہیں جو آسمان و زمین اور دنیا کے ظاہر و
باطن سے بے خبر ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ تمام چیزوں کا عالم ہے۔

اس تفسیر سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیت ان بہت سی احادیث سے کوئی اختلاف نہیں رکھتی جن میں فرمایا گیا ہے کہ گناہ
کی نیت گناہ نہیں ہے کیونکہ یہ احادیث ان نامرغیوں کے بارے میں ہیں جو خارجی عمل کا پہلو رکھتی ہیں اور نیت ان کا مقدمہ
اور تہیہ ہے اور یہ احادیث ان گناہوں کے بارے میں نہیں ہیں جو ذاتی طور پر اندہ مدنی اور باطنی پہلو رکھتے ہیں اور قلبی عمل میں
آیت کا ایک اور معنی بھی ہے اور وہ یہ کہ ایک عمل کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں مثلاً انفاق ممکن ہے خدشہ کے لیے ہو یا
شہرت طلبی کے لیے ہو۔ آیت کہتی ہے۔ تم اپنی نیت ظاہر کرو یا چھپائے رکھو خدا اس سے آگاہ ہے اور اس کا محاسبہ
کرے گا۔ درحقیقت اس آیت میں "لَا عَمَلُ الْاَبَالِیْسِیَّةِ" (نیت کے بغیر کوئی عمل نہیں) والی
روایت کی وضاحت کی گئی ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: جہاں وہ چاہتا ہے نعرہ زنیوں سے درگزر فرماتا ہے اور جہاں اس کا ارادہ ہو مزا دیتا ہے
(فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَآءُ) البتہ واضح ہے کہ بخشش و عذاب اور بدایت و ختمات کے
بارے میں خدا کا ارادہ اور مشیت کسی حساب کے بغیر نہیں ہوتے بلکہ وہ اپنی اور قابلیت کی بنا پر ہی ہیں جنہیں انسان



خود حاصل کرتا ہے اور پروردگار ہر چیز پر طاقت و قدرت رکھنے والا ہے۔

۲۸۵۔ اَمِّنَ الرَّسُولُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ
كُلٌّ اَمِّنٌ بِاللّٰهِ وَمَلٰئِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نَقْرَفُ
بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِ وَقَالُوا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا
غُفِرَانَكَ رَبَّنَا وَالْيَاكُفُ الْمَصِيْرُ ۝

ترجمہ

۲۸۵۔ رسول اُس چیز پر ایمان لایا ہے جو اُس کے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے
(اور وہ ایسا رہی رہے کہ اپنی تمام باتوں کی صداقت پر مکمل ایمان رکھتا ہے) اور مومنین بھی
خدا کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اُس کے پیغمبروں کے فرشتوں پر ایمان رکھتے ہیں تم اپنے
رسولوں میں کسی میں کوئی فرق نہیں کرتے اور کہتے ہیں: ہم نے سنا ہے اور ہم اطاعت کرتے ہیں۔
اسے ہمارے پروردگار مغفرت تیری طرف سے ہے اور تیری ہی طرف (ہماری) بازگشت ہے۔

تفسیر

دیگر انسانی راسخوں کے مقابلے میں انبیاء کا ایک امتیاز یہ ہے کہ تمام انبیاء اپنے ہدف و مقصد اور
دین و مکتب پر قطعی و یقینی ایمان رکھتے تھے اور ان کے عقیدے میں کسی قسم کا کوئی تردد نہ تھا۔ قرآن حکیم
لوگوں کو ایسے پیغمبر کی طرف متوجہ کرتا ہے جو اپنے پروردگار سے اپنے مطلب و مدعا کا ادراک رکھتا ہے
ارشاد الہی ہے:۔

فَاٰمَنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ الَّذِيْ اٰتٰىهُنَّ مِنْ بٰلَغَةٍ وَكَلَمَاتِهِ

اللہ اور اس کے اس رسول پر ایمان لے آؤ جو انہیں اس نے کلمات پر ایمان رکھتا ہے۔

زیر بحث آیت میں یہ نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ خالق کائنات اور اس کے تمام پروردگار جو پیغمبر پر نازل
ہوئے ہیں پیغمبر کا ان پر مستحکم اور غیر متزلزل عقیدہ ہے بلکہ مومنین اور جو مکتب پیغمبر کے تربیت یافتہ ہیں وہ بھی

ایسے ہی ہیں۔ ان کے برعکس یہ لوگ ہیں:

يُرِيدُونَ اَنْ يُفْزَقُوا بَيْنَ اَمَّةٍ وَرَسُلَةٍ وَيَتَوَلَّوْنَ ثَوْمَنَ بَعْضٍ
وَنَكْمَرٍ بَعْضٍ

خدا اور اُس کے پیروں کے درمیان تفریق اور اختلاف کے تابع ہیں اور چاہتے ہیں کہ بعض پر ایمان
لے آئیں اور بعض کو انکار کر دیں۔ (نساء - ۱۵۰)

زیر بحث آیت آگے کہتی ہے: وہ ایمان رکھتے ہیں کہ تمام انبیاء ایک ہی ہوتے اور مقصد کے حامل ہیں اور
ایک ہی مقصد کے لیے بھیجے گئے ہیں لہذا سب زبان حال سے کہتے ہیں: (لا نفترق بین احدی
قصبہ ورسلہ) یعنی ہم خدا کے بھیجے ہوئے افراد میں کوئی فرق نہیں کرتے۔
البتہ یہ بات اس امر سے تضاد نہیں رکھتی کہ مذکورہ تمام اویان منسوخ ہو چکے ہیں کیونکہ جیسا کہ ہم کہ چکے ہیں کہ
انبیاء کی تعلیمات مختلف کاموں کی تعلیم کی طرح ہیں جب اعلیٰ کاموں میں ترقی کی جاتی ہے تو پہلی کاموں میں چھوٹ جاتی ہیں
حالانکہ ان کا احترام برقرار رہتا ہے۔

ہندگی کا اعتراف

اہل ایمان ہمیشہ ہندگی اور عبودیت کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں: ہر روز دُعا کرتے ہیں: ہر چیز میں تیری طرف ہمارے
کے لیے جو دعوت اور نذر دیتے ہیں ہم اسے دل و جان سے قبول کرتے ہیں اور تیری پیروی و اطاعت کی منزل میں داخل
ہوتے ہیں۔ "وَقَالُوا سَمِعْنَا وَاطَعْنَا"

لیکن خدایا! آخر ہم انسان ہیں، کبھی ہمارے نفوس میں لغزشوں سے بھی دوچار کر دیتے ہیں لہذا ہم تجھ سے بخشش
کی امید رکھتے ہیں کیونکہ ہم نے ہر حال تیری ہی طرف چنا ہے۔ غفرانک ربنا والہیت المصیر

۲۸۶۔ لَا يَكْلِفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا

مَا اكْتَسَبَتْ رَبَّنَا لَا تَوَاخِذْنَا اِنْ نَسِينَا اَوْ اَخْطَاْنَا

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلٰی الَّذِيْنَ

مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ وَاعْفُ

لنا عن بعض اوقات بھی اور کبھی ہمارے گناہوں میں سے کچھ بھی ہم پر نہ رکھ دے۔ (سورۃ غافر - ۱۷)

میرزا جعفر علی



عَنَّا ۖ وَ اغْفِرْ لَنَا ۖ اِنَّكَ مَوْلَانَا ۚ فَانصُرْنَا
عَلَى الْكَافِرِينَ ۝

ترجمہ

۲۸۶۔ خدا کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں سونپتا (اسی بناء پر انسان جو بھی نیک کام انجام دے اُس نے اپنے لیے انجام دیا ہے اور جو بُرا کام کرے خود اُس کے لیے نقصان دہ ہے) مومنین کہتے ہیں پروردگار! اگر تم بھول جائیں یا خطا کر گزریں تو ہمارا مواخذہ نہ کرنا۔ اے ہمارے رب! کسی سنگین ذمہ داری کا بوجھ ہم پر نہ ڈالنا جیسا کہ اگلاہ و سرکشی کی وجہ سے، ان لوگوں پر ڈالا گیا جو ہم سے پہلے تھے۔ اے ہمارے پروردگار! ایسی سزائیں نہ دے جنہیں ہم برداشت نہیں کر سکتے اور ہمارے گناہوں کے آثار ہم سے دھو ڈال ہمیں بخش دے اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل کر دے تو ہمارا مولا اور سرپرست ہے پس ہمیں کفار کی جماعت پر کامیابی اور کامرانی عطا فرما۔

تفسیر

طاقت کے مطابق ذمہ داری

”وَنُفِخَ“ کا لغوی معنی قدرت اور طاقت ہے۔ اس بناء پر آیت اس عقل حقیقت کی تائید کرتی ہے کہ خدا کی طرف سے عام ذمہ داریاں کبھی بشری طاقت سے ماوراء نہیں ہو سکتیں لہذا کہا جاسکتا ہے کہ یہ آیت تمام احکام کی تفسیر اور مدد بندی کرتی ہے۔ تمام احکام یہ خصوصیت رکھتے ہیں کہ وہ انسانی قدرت و طاقت کے مطابق ہیں۔ ایک حکیم و عادل فقط ایسا ہی قانون بنا سکتا ہے۔

فمنیٰ حور پر اس بات سے اس حقیقت کی پھر تائید ہو جاتی ہے کہ احکام شرعی کبھی حکم عقل کے متافی نہیں ہو سکتے۔ حکم شرع اور حکم عقل ہمیشہ دوش بدوش رہتے ہیں۔



”لہا ما کسبت و علیہا ما اکتسبت“

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ انہی قوانین و احکام پر عمل سے انسانی سرنوشت مربوط ہے اس چھ کے مطابق ہر شخص اپنے نیک و بد عمل کا نتیجہ حاصل کرے گا۔ اس جہان میں اور آئندہ جہاں میں اپنے کئے کا پھل پائے گا۔ اس طرح لوگوں کو ان کی ذمہ داری اور ان کے اعمال کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ اس طرح سے قرآن نے ان انسانوں پر خطہ بطلان کھینچ دیا ہے جن میں لوگوں کو ان کے اعمال سے بری قرار دیا گیا ہے یا بلا وجہ کسی کے اعمال کی جوبلد ہی کا ذمہ دار دوسروں کو قرار دیا گیا ہے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ آیہ شریفہ میں نیک اعمال کے لیے لفظ ”کسب“ اور بُرے اعمال کے لیے لفظ ”اکتساب“ استعمال کیا ہے۔ تعبیر کا یہ اختلاف شاید اس لیے ہے کہ ”کسب“ ان اعمال کے لیے بولا جاتا ہے جو بلا تکلف اور فطرت کے مطابق انجام دیے جاتے ہیں جب کہ ”اکتساب“ ان اعمال کے لیے استعمال ہوتا ہے جو انسانی فطرت کے خلاف ہوں اور یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ نیک اعمال انسانی فطرت کے مطابق ہیں اور بُرے اعمال ذاتی طور پر خلاف فطرت ہیں۔

ان دونوں تعبیروں کے اختلاف کے بارے میں راغب اصفہانی نے ایک اور بات کہی ہے اور وہ بھی قابل غور ہے۔ وہ یہ کہ ”کسب“ ان کاموں کے لیے مخصوص ہے جن کا فائدہ فقط انسان کی اپنی ذات تک محدود نہیں ہوتا بلکہ دوسروں کو بھی پہنچتا ہے، ان اعمال خیر کی طرح جن کا نتیجہ صرف انجا دینے والے شخص کو نہیں پہنچتا بلکہ ممکن ہے کہ اس کے عزیز و اقارب اور دوست احباب بھی اس میں شریک ہوں جب کہ ”اکتساب“ ان مواقع پر بولا جاتا ہے جہاں کام کا اثر صرف کرنے والے تک محدود ہو اور گناہ میں ایسا ہوتا ہے (البتہ توجہ رہے کہ یہ مفہوم اس وقت لیا جاتا ہے جب ”کسب“ اور ”اکتساب“ کو ایک دوسرے کے قہ مقابل استعمال کیا جائے)۔

”ربنا لا تؤاخذنا انت قسینا و اخطائنا“

مومنین چوکر لہا ما کسبت و علیہا ما اکتسبت کے قانون کی روشنی میں سمجھتے ہیں کہ ان کے مستقبل کا انحصار ان کے اپنے اچھے یا بُرے کردار پر منحصر ہے لہذا بارگاہ الہی میں خاص تضرع و زاری کے ساتھ اپنے رب کو پکارتے ہیں، اس ذات کو پکارتے ہیں جو ان کی پرورش میں خاص لطف و کرم فرماتا ہے اور کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار اگر ہم بھول اور غلط اشتباہ سے دوچار ہو جائیں تو اپنی وسیع رحمت سے تو ہماری تضرع سے درگزر اور ہمیں اس کے عذاب سے رافقی بخش۔

خطا کے بدلے سزا

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا ممکن ہے کہ پروردگار کسی کو بھول چوک پر سزا دے کہ اس پر بھی درخواست کی گنجائش پیدا ہو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بعض اوقات بھول چوک انسان کی اپنی بسل انگاری کی وجہ سے جوتی ہے اور مُسَلَّم ہے کہ بھول



چوک کی وجہ سے انسان سے جواب دی اور مسئویت ختم نہیں ہو جاتی۔ جیسا کہ قرآن میں آیا ہے:

”فَذُوقُوا بِمَا نَسِيتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا“

عذابِ خطا کا ذائقہ چکھو کیونکہ تم اس دن کو بھول گئے تھے۔ (سورہ ۱۴۰)

اس سے معلوم ہوا کہ وہ خطائیں جو اپنی پہل انگاری کی وجہ سے سرزد ہوتی ہیں، قابلِ سزا ہیں۔ ایک اور بات جس کی طرف توجہ کرنا چاہیے یہ ہے کہ نسیان اور خطا ایک دوسرے سے واضح طور پر مختلف ہیں لفظ ”خطا“ عام طور پر ایسے کاموں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو غفلت یا انسان کی عدم توجہ کے باعث سرزد ہوتے ہیں۔ مثلاً کوئی شخص شکار کے لیے تیر لگاتا ہے اور اس کے ارادے کے بغیر کسی انسان کو جا لگتا ہے اور وہ زخمی ہو جاتا ہے۔ لفظ ”نسیان“ ایسے کام کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو انسان توجہ سے انجام دے لیکن حقائق سے نا آشنا ہو۔ مثلاً کوئی شخص کسی بے گناہ کو گناہگار سمجھتے ہوئے سزا دے دے۔

”رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اَوْرَثًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا“

”اِصْر“ کا معنی ہے کسی کو روک رکھنا، کسی کو جیسے قید میں رکھنا۔ یہ لفظ برائے سنگین اور بھاری کام کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو انسان کی فعالیت کو روک دے۔ نیز ایسے عہد و پیمان کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جو انسان کو محدود کر دے۔ اسی لیے عذاب اور سزا کو بھی کبھی کبھی ”اِصْر“ کہتے ہیں۔

اس جملے میں مومنین خدا سے دو تقاضے اور کرتے ہیں:

پہلا یہ کہ ان پر دشوار ذمہ داریاں عائد نہ ہوں کیونکہ ایسی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں بعض اوقات اطاعت پروردگار کے خلاف کام ہو جاتا ہے۔ احکام اسلام کے بارے میں ایسی ہی بات پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے۔

”بَعَثْتُ إِلَى الشَّرِيعَةِ السَّهْلَةِ الْيُسْرَى“

میں ایسے دین کے ساتھ مبعوث ہوا ہوں جس پر عمل کرنا سب کے لیے سہی ہے۔

مکن ہے اس موقع پر سوال کیا جائے کہ اگر شریعت کا سہل ہونا بھی چیز ہے تو پھر یہ کدشتہ اقوام میں کیوں نہیں تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جیسے آیات قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ کدشتہ امتوں کے لیے شدید تکالیف اصل شریعت میں نہیں تھیں بلکہ ان کی نافرمانیوں کے بعد سزا کے طور پر انہیں شدائد کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ جیسا کہ نبی اسرائیلؑ پر پے در پے نافرمانیوں کی وجہ سے کچھ مثال گوشتوں سے محروم ہو گئے تھے (انعام ۱۴۰، نساء ۱۴۰)

دوسرا یہ کہ وہ طاقت فرما آرائشوں اور ناقابلِ برداشت منزلوں سے محفوظ رہیں۔ ”رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْنَا مَآلًا طَاقَةً لَّنَا بِهِ“ ”لَا تَحْمِلْ“ کدشتہ جہد میں اور ”وَلَا تَحْمِلْ“ اس جہد میں شاید اسی بنا پر کیونکہ پہلی تعمیر مشکلات کے مواقع کے لیے اور دوسری طاقت فرما مواقع کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

”وَاعْفُ عَنَّا وَارْحَمْنَا“



لغت میں غفو "کا معنی ہے" کسی چیز کے اثر کو محو کرنا " اور زیادہ تر یہ لفظ گناہ کے اثرات کو محو کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ان میں طبعی آثار بھی شامل ہیں اور سزا کے محو ہونے کا مفہوم بھی اس میں شامل ہے "مغفرت" گناہ کے برے میں بننے والی سزا سے صرف نظر کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس بناء پر دونوں لغتوں کے استعمال سے یہ سمجھ آتا ہے کہ مومنین اپنے پروردگار سے چاہتے ہیں کہ وہ لغزشوں کے طبعی اور شکوینی آثار ان کی روح سے محو کر دے تاکہ وہ ان کے برے نتائج میں گرفتار نہ ہوں اور یہ بھی تقاضا کرتے ہیں کہ ان کی معینہ سزائیں سے بھی بچ جائیں اور پھر اس کی وسیع رحمت کی خواہش کرتے ہیں جو تمام چیزوں پر محیط ہے۔

"انت مولنا فنانصروننا علی القوم الکفارین"

پھر اپنی دعا کے آخری حصے میں خدا کو مولا کہہ کر پکارتے ہیں۔ یعنی ایسی ذات جو ان کی سرپرستی اور پرورش کرتی ہے۔ اور چاہتے ہیں کہ وہ انہیں ہر طرح کے دشمنوں کے مقابلے میں کامیاب کرے۔

ان دو آیات میں چونکہ سورہ بقرہ کا خلاصہ بیان ہوا ہے اور خدا تعالیٰ کے حضور تسلیم و رضا کے ادب ہمیں سکھاتے گئے، یعنی اگر اہل ایمان چاہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ ان کی لغزشوں سے درگزر کرے اور مختلف قسم کے دشمنوں کے مقابلے میں انہیں کامیاب کرے تو انہیں چاہیے کہ "سبحنا واطعننا" کے طریقہ کار پر عمل کریں اور کہیں کہ ہم پکارنے والے کی دعوت دل و جان سے قبول کرتے ہیں اور ان کی پیروی کے درپے ہیں اور اس راہ میں کسی جستم اور کوشش میں کوتاہی نہ کریں گے۔ اس کے بعد اللہ سے رکاوٹوں اور دشمنوں پر کامیابی کی خواہش کریں "رب" کے عنوان سے خدا کے نام کا تکرار اس حقیقت کی تکمیل کرتا ہے۔ کیونکہ اس نام کا استعمال اس حقیقت کا اعتراف بھی ہے کہ وہ ذات ہے جو ان کی پرورش کرنے میں خاص لطف و کرم رکھتی ہے۔

اسی لیے رب بنان اسلام نے کئی ایک احادیث میں ہم مسلمانوں کو ان دو آیات کو خاص طور پر پڑھنے کی ترغیب دی ہے اور اس کی تہذیب کا بہت طرح کا ثواب بیان کیا ہے۔ ان احادیث کے مطابق اگر زبان اور دل ان آیات کی تلاوت میں ہم آہنگ ہوں اور ان کے مفہوم کو زندگی کا پروگرام بنایا جائے صرف یہی آیات مرکز دل کو خالق کائنات سے منسلک کرنے کا عامل بن جائیں، روح میں پاکیزگی آجائے اور محرک و فعالیت پیدا ہو جائے۔

سُورَةُ

الْاٰیٰتِ

○ مدینہ میں نازل ہوئی

○ ۲۰۰ آیات ہیں

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

۱۔ اَللّٰهُ

۲۔ اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ

۳۔ نَزَّلَ عَلَيْنَا الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ
وَأَنزَلَ الْتَوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ

۴۔ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَأَنزَلَ الْفُرْقَانَ

ترجمہ

اُس خدا کے نام سے جو مہربان اور بخشنے والا ہے ۔

۱۔ اَلَمْ

۲۔ خدائے یکتا کے علاوہ کوئی معبود نہیں ، وہ زندہ و پایدار اور نگہبانی کرنے والا ہے ۔

۳۔ (وہی ذات ہے) جس نے تم پر حق کے ساتھ کتاب نازل کی ۔ یہ کتاب گذشتہ کتب کی نشانیوں پر منطبق ہوتی ہے اور اس سے قبل تورات اور انجیل کو لوگوں کی ہدایت کے لیے اتارا گیا ۔ نیز حق و باطل میں تمیز کرنے والی کتاب قرآن مجید کو نازل کیا ۔

شان نزول

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اسی سے کچھ زیادہ آیات نجران کے عیسائی ٹائندوں کے بارے میں ہیں جنہیں اسلام کے بارے میں تحقیق کے لیے مدینہ بھیجا گیا تھا ۔

۵۔ جس کچھ آیت ہو کہ صحت و کرم کی ہے ۔ (ترجمہ)



وہ ساتھ افراد تھے۔ ان میں سے چودہ بھران کے اشرف اور مغزین شہر جوتے تھے۔ ان چودہ میں سے تین سردار تھے وہاں کے عیسائی اپنے کاموں اور مشکلات میں اپنی تین سے رجوع کرتے تھے۔ ان میں سے ایک عاقب تھا جسے عبدالمسیح بھی کہتے تھے۔ وہ اپنی قوم کا امیر اور ریس بھی شمار ہوتا تھا۔ اس کی قوم کبھی اس کے نظریے اور رائے کی مخالفت نہیں کرتی تھی۔ دوسرے کا نام سید تھا اسے ایہم بھی کہتے تھے۔ خاطر تواضع اور سفر کے انتظامی امور کی سہ پرستی بھی کرتا تھا اور عیسائیوں کے لیے بہت قابل اعتماد تھا۔ تیسرا شخص ابو عارثہ تھا جو عالم تھا اور نہایت بااثر تھا۔ عیسائیوں نے کئی ایک گرجے اس کے نام کے بنا رکھے تھے۔ اسے تمام مذہبی سچی کتب یاد تھیں۔ ساتھ افراد کا یہ گروہ قید بنی کعب نے لباس میں مدینہ آیا اور مسجد نبوی میں پہنچا۔ اس وقت نبی اکرمؐ مسلمانوں کے ہمراہ نماز عصر اور فرما چکے تھے۔ ان ساتھ افراد نے خوبصورت ذرق برق اور پرکشش لباس پہن رکھے تھے۔ ایک صحابی کے بقول: ہم نے کبھی کوئی ٹائمنڈے ایسے بنے ٹھنے نہیں دیکھے تھے۔ ۱۷

وہ مسجد میں پہنچے تو یہ ان کی نماز کا وقت تھا۔ انہوں نے اپنے مراسم کے مطابق ناقوس بجایا اور مشرق کی طرف رخ کر کے نماز میں مشغول ہو گئے۔ کچھ اصحاب نے انہیں روکنا چاہا لیکن آپؐ نے فرمایا: تم ان سے سروکار نہ رکھو۔ نماز کے بعد عاقب اور سید نبی کریمؐ کی خدمت میں آئے اور آپؐ سے گفتگو کرنے لگے۔ آپؐ نے انہیں دین اسلام قبول کرنے اور بارگاہِ خداوندی میں سر تسلیم خم کرنے کی دعوت دی۔

عاقب اور سید کہنے لگے: ہم آپؐ سے پہلے اسلام لاپچھے ہیں اور بارگاہِ الہی میں سر تسلیم خم کر چکے ہیں۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: تم کس طرح دین حق پر ہو جب کہ تمہارے اعمال بتاتے ہیں کہ تم خدا کے سامنے سر تسلیم جھکانے سے نہیں جو کہ تم خدا کے لیے بیٹے کے قائل ہو اور حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا قرار دیتے ہو۔ صلیب کی پوجا اور پرستش کرتے ہو اور خنزیر کا گوشت کھاتے ہو جب کہ یہ سب امور دین حق کے خلاف ہیں۔

عاقب اور سید نے کہا: اگر حضرت عیسیٰ خدا کے بیٹے نہیں تو پھر ان کا باپ کون تھا؟

نبی کریمؐ نے فرمایا: کیا تم یہ بات مانتے ہو کہ ہر بیٹا باپ سے شبابت رکھتا ہے؟

انہوں نے کہا: ہاں۔

آپؐ نے فرمایا: کیا ایسا نہیں کہ بھلا خدا ہر چیز پر محیط ہے۔ قیوم ہے اور موجودات کو روزی دینا اس کے ذمہ ہے؟

وہ کہنے لگے: ہاں ایسا ہی ہے۔

آپؐ نے فرمایا: کیا حضرت عیسیٰ میں یہ اوصاف تھے؟

انہوں نے کہا: نہیں۔

آپؐ نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ زمین و آسمان کی کوئی چیز خدا سے مخفی نہیں اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے؟

۱۸ یوں کے شاہی کوستان میں ایک مقام مندرجہ ہے۔ مندرجہ سے دس میل دور قبر بھلا کی زمین تھیں۔ جاہلیت کے زمانے میں اس قبیلے کا ایک بت تھا۔ اس کا نام بن قینہ تھا۔ یہ بت لکھا تھا۔ اس قبیلے کی عورتوں نے بت سے محبت کی اور بت کی قوت توی کے بقول بھلا بت کا نام ہے۔



کہنے لگے: ہاں، ہم جانتے ہیں۔

آپ نے فرمایا: جو کچھ حضرت عیسیٰ کو خدا نے بتایا کیا وہ اُس کے علاوہ اپنی طرف سے کسی چیز کو جانتے تھے؟ وہ بولے: نہیں۔

آپ نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ بار خدا وہی ہے جس نے شکم مادر میں حضرت عیسیٰ کو جیسے چاہا بنایا؟ کہنے لگے: ہاں، ایسا ہی ہے۔

آپ نے فرمایا: کیا ایسا نہیں کہ حضرت عیسیٰ کو ان کی دلدلہ بانی بچوں کی طرح جسم میں اٹھائے دیں اور پھر انہیں باقی ماؤں کی طرح جنم دیا اور حضرت عیسیٰ ولادت کے بعد دیگر بچوں کی طرح غذا کھاتے تھے؟ وہ کہنے لگے: ہاں ایسے ہی تھا۔

اس پر آپ نے فرمایا: تو پھر حضرت عیسیٰ خدا کے بیٹے کیسے ہو گئے جب کہ اُس سے کوئی شہادت نہیں رکھتے؟ گفتگو یہاں تک پہنچی تو سب کے سب خاموش ہو گئے۔ اس وقت اس سورۃ کی آیت ۱۷ سے کچھ اوپر آیات نازل ہوئیں ان آیات میں بعض معارف اور کچھ اسلامی پروگراموں کی وضاحت کی گئی ہے۔

تفسیر

یہ سورہ بالفاق مفسرین دو سو آیات پر مشتمل ہے۔ اس کی تمام آیات مدینہ میں نازل ہوئیں۔ آل عمران کے واقعے کی مناسبت سے اس کا نام سورہ آل عمران رکھا گیا ہے۔ یہ واقعہ آیت ۲۲ کے بعد اس سورہ میں موجود ہے۔ اس سورہ کے اہم موضوعات ہیں۔

- ایمان
- اسلام
- اسلام کی حمایت اور وسعت میں استقامت و پامردی،
- یہود و نصاریٰ سے منطقی مقابلہ
- مسلمانوں کے لیے متعدد دینی و تربیتی درس
- اسلام کی پیش رفت اور
- باطل عقائد کی نفی۔

اس سورہ کے مطالب ایک دوسرے سے اس طرح مربوط اور متناسب ہیں گویا سب آیات ایک وقت میں نازل ہوئی ہیں اب اس سورہ کی ایک ایک آیت کی تفسیر بیان کی جاتی ہے۔

الم - کمپیوٹر کے ذریعے حروف مقطعات کی تفسیر



قرآن کے حروف مقطعات کے بارے میں سورہ بقرہ کی ابتداء میں ضروری توضیحات پیش کی جا چکی ہیں۔ اب ان کے تکرار کی ضرورت نہیں۔ یہاں پر ہم ان کے بارے میں ایک قابل توجہ نظریہ پیش کریں گے۔ یہ نظریہ حال ہی میں ایک مصری عالم نے پیش کیا ہے۔ موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ہم اسے یہاں مکمل طور پر بیان کرتے ہیں۔ البتہ اس کی صحت یا کسی قسم کے بارے میں فیصلہ کرنا بہت زیادہ تحقیق کا محتاج ہے جو شاید آئندہ آنے والے لوگوں کے ذمے ہے۔ ہم اسے یہاں فقط ایک نظریے کے طور پر ذکر کرتے ہیں۔

مشہور مصری جملہ "آخر ساعۃ" جو دنیا کا ایک بڑا مجدد شمار ہوتا ہے نے مصری کے ایک مسلمان عالم کی کچھ آیات قرآن مجید کے بارے میں کمپیوٹر کی مدد سے تیار کی گئی عجیب و غریب تحقیق پیش کی ہے۔ اس نے دنیا کے مختلف خطوں میں بسنے والوں کو حیران کر دیا ہے۔ یہ تحقیقات کمپیوٹر کے مصری استاد ڈاکٹر رشاد خلیفہ کی تین سالہ مسلسل کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ ان تحقیقات نے ایک دفعہ پھر اس حقیقت کو ثابت کر دیا ہے کہ یہ عظیم آسمانی کتاب ذہن انسانی کی پیداوار نہیں ہے اور انسان کے بس کی بات نہیں کہ اس کی مثل پیش کر سکے۔

ڈاکٹر رشاد خلیفہ نے یہ تحقیقات امریکی ریاست میسوری کے شہر سائٹ لوئیس میں کی ہیں۔ وہ اب بھی فدا سازی کی ایک امریکی کمپنی میں بطور مشیر کام کرتے ہیں۔

انہوں نے اپنی حیرت انگیز تحقیقات کی ٹیکس کے لیے مدعوں کمپیوٹر سے استفادہ کیا ہے۔ ان کمپیوٹرز پر کام کرنے کا ایک سینٹر کراچی، اڈالہ تھا جو وہاں کے بعض مسلمانوں کی مدد سے ادا کیا گیا۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ فارسی جہاد میں مذکورہ ماسٹران سے مصری خبر نگار کی گفتگو ناقص اور غیر مکمل صورت میں شائع ہوئی ہے تاہم ان طبقہ اس سے پوری حرج بات نہیں سمجھ پایا۔ لہذا ہم نے ضروری سمجھا کہ خبر کے اصلی منبع سے رجوع کیا جائے تاکہ اس بحث کا مکمل تجزیہ و تحلیل کیا جاسکے۔ البتہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اس وقت ہمارا مقصد اس نظریے کی تائید نہیں بلکہ اسے ہم آئندہ تحقیق کرنے والوں کے لیے ریکارڈ پر لانا چاہتے ہیں۔ مذکورہ پروفیسر نے اپنی تمام تر مساعی قرآن کے حروف مقطعات جوق، الم، یس، وغیرہ کی شکل میں پیش کی ہیں۔ اس نے تیمم، حسابات (CALCULATIONS) کی مدد سے ثابت کیا ہے کہ جس سورہ کے شروع میں یہ حروف آتے

ہیں اُس سورہ کے دیگر حروف سے ان کا نزدیک تعلق ہے، وغیرہ کیجئے گا۔

کمپیوٹر سے صرف سورتوں کے حروف کی تعداد اور ان کی نسبت معلوم کرنے کے لیے اصطلاحاً ایک فیصد حروف سے مدد لی گئی ہے نہ یہ کہ اس سے قرآنی آیات کی تفسیر چاہی گئی ہے لیکن یہ مسلم ہے کہ کمپیوٹر کے بغیر یہ بات کسی انسان کے بس کی نہ تھی کہ وہ ماہہا سال تک ان حسابات کو کرتا رہتا۔

اب ہم مذکورہ ماسٹران کے انکشافات پیش کرتے ہیں:-

ڈاکٹر رشاد کہتا ہے:- ہم جانتے ہیں کہ قرآن مجید کی ۱۱۴ سورتیں ہیں۔ ان میں سے ۸۶ مکر میں اور ۲۸ مدنیہ میں نازل ہوئیں۔ ان میں ۲۹ سورتوں کے آغاز میں حروف مقطعات ہیں۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ مجموعی طور پر یہ تمام حروف ۱۴ ہیں جب کہ



عربی حروف ابجد کی تعداد ۲۸ ہے۔ گویا یہ ان کا نصف جوئے۔ حروف مقطعات میں آئے واسے حروف یہ ہیں
ا۔ ج۔ ر۔ س۔ ص۔ ط۔ ع۔ ق۔ ک۔ ل۔ م۔ ن۔ ه۔ ی۔ انہیں بعض اوقات حروف نورانی بھی
کہتے ہیں

ڈاکٹر رشاد مزید کہتا ہے: میں ساہا سال سے جانتا چاہ رہا تھا کہ یہ حروف جو ظاہر ایک دوسرے سے الگ ہیں اور
سورتوں کی ابتدا میں آئے ہیں۔ ان کے معانی کیا ہیں۔ عظیم مفسرین کی تفسیر و آزاد دیکھیں لیکن تسلی نہ ہوئی لہذا خدا سے مدد
مانگی اور مطالعے میں خوب لگا۔

اچانک یہ سوچ پیدا ہوئی کہ شاید ان حروف اور جس سورہ کے شروع میں یہ موجود ہیں اس کے حروف کے درمیان کوئی ربط
پایا جاتا ہو لیکن ۴ نورانی حروف اور ۱۴ سورتوں کے بارے میں تحقیق ہر ایک نسبت کا تعین اور دیگر بہت سے حسابات کمپیوٹر کے
بغیر ممکن نہ تھے لہذا پہلے مذکورہ حروف کو قرآن کی ۱۴ سورتوں میں پیچھے پیچھے کیا گیا اور پھر سورت کے تمام حروف کو ترتیب (سے
کے کمپیوٹر کے سپرد کیا گیا تاکہ ان کی مدد سے آئندہ حسابات کئے جاسکیں۔ یہ کام اور دیگر ابتدائی ضروری امور دو سال کے عرصے
میں انجام پائے۔

اس کے بعد کمپیوٹر پر مذکورہ حسابات کے لیے پورا ایک سال کام کرتا رہا تو بہت ہی دلچسپ تجربہ برآمد ہوا۔ تاریخ اسلام میں پہلی
مرتبہ تعجب انجیز حقائق سے پردہ اٹھا جنہوں نے دیگر پہلوؤں کے علاوہ علم ریاضی کے اعتبار سے حروف قرآن کی نسبت کے بارے سے
میں قرآنی اعجاز کو مکمل طور پر واضح کر دیا۔ کمپیوٹر نے ہمیں بتایا کہ ان چودہ حروف کی ۱۴ قرآنی سورتوں میں ہر ایک سے کیا نسبت ہے
مثلاً حساب کے بعد ہم نے دیکھا کہ ق۔ جو قرآن کے نورانی حروف میں سے ہے۔ سورہ نطق میں اس کا سب سے زیادہ
حتمہ ہے، یہ حتمہ ۶۵۰۰ فیصد ہے اور یہ نسبت قرآن کی سورتوں میں اول نمبر پر ہے (البتہ سورہ ق اس میں شامل نہیں ہے)
اس کے بعد سورہ قیامت ہے جس میں ق کی نسبت ۲۹۰۰ فیصد ہے پھر سورہ الشمس ہے جس میں یہ تناسب ۲۹۰۰ فیصد ہے
جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ سورہ قیامت اور الشمس میں یہ فرق سو میں سے ایک ہزار کا ہے۔ اسی ترتیب سے قرآن کی تمام ۱۴
سورتوں میں سے ہم نسبت معلوم کر سکیں گے۔ اور یہ نسبت اسی ایک حرف کے بارے میں نہیں بلکہ تمام نورانی حروف کے
بارے میں ہر ایک سورت کے تمام حروف کی نسبت ایک ایک کر کے معلوم کی جاسکتی ہے۔

اب ہم ان جاذب نظر نتائج کا ذکر کرنے میں جو ان حسابات (CALCULATIONS) سے سامنے آئے ہیں۔

۱۔ حرف ق کی نسبت سورہ ق میں قرآن کی دوسری سورتوں کے مقابلے میں جہاں نسبت سب سے زیادہ ہے یعنی ۲۳
سالوں کے دوران میں جو دیگر ۱۴ سورتیں نازل ہوئی ہیں، ان میں حرف ق سورہ ق کی نسبت کم استعمال ہوا۔ واقعاً یہ امر بہت
عجیب کن ہے کہ ایک انسان ۲۳ سال کے طویل عرصے میں اپنی گفتگو کے حروف کی تعداد کا اس قدر خیال رکھے اور اس کے باوجود
آزادانہ اور بلا تکلف گفتگو کرتا رہے۔ مسلم ہے کہ یہ کام ایک انسان کے بس سے باہر ہے یہاں تک کہ ایک عظیم ترین ریاضی دان
بھی کمپیوٹر کی مدد کے بغیر اس کا حساب نہیں رکھ سکتا۔

یہ تمام چیزیں نشانہ ہی کرتی ہیں کہ نہ صرف قرآن کی سورتیں اور آیات بلکہ حروف قرآن بھی ایک خاص نظام اور حساب کے

تحت میں اور اس پر حرف خدائی قادر ہے۔

اسی طرح حسابات سے معلوم ہوتا ہے کہ حرف م کی سورہ میں نہ ہی پوزیشن ہے یعنی اس میں اس کی مقدار سورہ کے باقی حروف کی نسبت قرآن کی دیگر سورتوں میں اس کی نسبت سے زیادہ ہے۔

اس طرح سورہ بقرہ کے عدد وہ حرف ن کی سورہ ن والقلم میں نسبت دیگر سورتوں میں اس کی نسبت سے زیادہ ہے لیکن سورہ حجر میں اس کی نسبت سورہ ن والقلم میں اس کی نسبت سے زیادہ ہے۔ اس سلسلے میں یہ امر جاذبِ نظر ہے کہ سورہ حجر ان سورتوں میں سے ہے جن کی ابتداء "ال" سے ہوتی ہے۔ بعد میں ہم دیکھیں گے کہ وہ سورتیں جن کی ابتداء "ل" سے ہوتی ہے وہ سب کی سب ایک سورت شمار ہوں گی اور اگر ہم نے ایسا کیا تو ہمیں مطلوبہ نتیجہ دستیاب ہوگا یعنی ان تمام سورتوں میں حرف ن کی نسبت، اس کی سورہ ن والقلم میں نسبت سے کم ہو جائے گی۔

۲۔ ال میں سے یہ چار حروف سورہ اعراف کی ابتداء میں آتے ہیں اب اگر اس سورہ میں آئے والے تمام ال م میں جمع کئے جائیں تو ہم دیکھیں گے کہ ان کی نسبت اس سورہ کے دیگر حروف کے ساتھ ان کی نسبت دوسری سورتوں میں دیگر حروف سے زیادہ ہے اسی طرح ال ر۔ یہ چار حروف سورہ رعد کی ابتداء میں ہیں ان کی بھی یہی حالت ہے۔ یونہی کہ ھ می م ص۔ یہ پانچ حروف سورہ مریم کے آغاز میں ہیں ان کا بھی یہی حساب ہے۔

یہاں مسئلے کے ایک نئے رخ سے باز سامنا ہوتا ہے کہ ایک جدا حرف ہی اس آسانی کتاب میں ایک خاص نظم کے تحت نہیں بلکہ ایک سے زیادہ حروف بھی اسی حیرت انگیز وضع میں اس میں موجود ہیں۔

۳۔ اب تک تو صرف ایک سورہ کے شروع میں آئے والے حروف کا ذکر تھا لیکن وہ حروف مقطعات جو ایک سے زیادہ قرآنی سورتوں کے آغاز میں آتے ہیں مثلاً ال م یا ال م تو وہ اپنے اندر ایک اور مشکل حساب سموئے ہوئے ہیں۔ اور وہ یہ کہ جن سورتوں میں یہ حروف آتے ہیں، مثلاً ال م چھ سورتوں کے آغاز میں ہے تو ان چھ سورتوں میں ان حروف کے لمبوترے کا تناسب دیگر حروف سے دیکھنا ہوگا۔ ہم دیکھیں گے کہ یہ نسبت ان حروف کی دیگر سورتوں میں ان کی نسبت سے زیادہ ہے یہاں مسئلے نے پھر ایک توجہ طلب صورت اختیار کر لی ہے اور وہ یہ کہ نہ صرف قرآن کی ہر سورت کے حروف ایک معین ضابطے اور حساب کے تحت ہیں بلکہ مشابہ سورتوں کے مجموعی حروف بھی ایک ہی ضابطے اور نظام کے مطابق ہیں۔

ضمنی طور پر یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید کی متعدد سورتیں کیوں ال م یا ال م سے شروع ہوتی ہیں گویا ایسا اتفاقاً اور بلا وجہ نہیں ہے۔

ڈاکٹر رشاد نے پیچیدہ ترین حسابات "ح م" پر مشتمل سورتوں کے باوجود میں پیش کئے ہیں ہم اختصار کے پیش نظر ان سے صرف نظر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر رشاد نے، اس ضمن میں کچھ اور قابل توجہ نکات بھی پیش کئے ہیں جنہیں بعض نئے نتیجہ بخش نکات کے اضافے کے ساتھ ہم قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔



(۱) قرآن مجید کے اصلی رسم الخط کی حفاظت کریں

وہ کہتے ہیں کہ یہ تمام حسابات اسی صورت میں صحیح ہیں جب ہم قرآن کے اصلی اور قدیمی رسم الخط پر بات نہ ڈالیں ورنہ حساب خراب ہو جائے گا۔ مثلاً استحق، زکوٰۃ اور صلوة کی صورت میں لکھیں نہ کہ اسحاق، زکات اور صلات کی شکل میں۔

(۲) قرآن مجید میں عدم تحریف کی ایک اور دلیل

یہ تحقیقات نشاندہی کرتی ہیں کہ قرآن مجید میں ایک نلف بلکہ ایک حرف کی بھی کمی یا زیادتی نہیں ہوئی ورنہ یقینی طور پر اسے حسابات موجودہ قرآن میں یہ نتائج پیش نہ کر سکتے۔

(۳) پر معنی اشارات

قرآن حکیم کی بہت سی سورتیں جن کی ابتدا و حروف مقطعات سے ہوتی ہے ان میں ان حروف کے بعد قرآن کی حقانیت اور عظمت کا ذکر آیا ہے مثلاً "الْقَمْ ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ" یہ بذات خود مذکورہ حروف کے اعجاز قرآن ہونے کی طرف ایک اشارہ ہے۔

حاصل کلام

اس ساری بحث سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ۲۲۱ سال میں پیغمبر اکرم پر نازل ہوئے حروف قرآن بہت دقیق اور منظم حسابات کے حامل ہیں اور الف، با اور دیگر عام حروف کا ہر سورۃ کے مجموعی حروف سے علم ریاضی کے حوالے سے گہرا تعلق ہے ایسے حسابات انسان کمپیوٹر کی مدد کے بغیر نہیں کر سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ دانشمند مذکورہ کی تحقیقات بھی ابتدائی مرحلے میں ہیں لہذا انھیں سے خالی نہیں ہیں۔ ابھی انہیں انہی کے ذریعے یا دیگر دانشمندوں کے ذریعہ پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہیے۔

"اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ"

اللہ بے پناہ دیکتا ہے۔ جاوداں اور قائم رہنے والا مسبود ہے اور تمام چیزیں اسی کے وجود سے وابستہ ہیں۔ اس آیت کی شرح و تفسیر سورہ بقرہ کی آیت ۲۵۵ میں گزر چکی ہے۔

"نَزَّلَ عَلٰیكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرَةَ وَاِلَّا نَجِیْلٌ مِنْ قَبْلِ هٰذِیْ لَلْغٰیصِ"

اس آیت میں پیغمبر اسلامؐ مخاطب ہیں۔ فرمایا گیا ہے کہ وہ خدا پر پائندہ اور قیوم ہے اس نے تم پر ایسا قرآن نازل کیا ہے جس میں حق و حقیقت کی نشانیں ہیں اور یہ نشانیں ان کے علاوہ بھی ہیں جن کی بشارت گذشتہ انبیاء اور آسمانی کتب (تورات، انجیل) نے دی ہے اور گذشتہ انبیاء اور آسمانی کتب نے قرآن اور قرآن لسنے کے بارے میں جو گفتگو کی ہے اس نے اس کی بھی تصدیق کی



ہے۔ وہ وہی خداست جس نے تورات اور انجیل کو نوح بشر کی رہنمائی اور ہدایت کے لئے نازل کیا ہے۔

پنجاہم نکات

۱۔ حق کا مفہوم :- ”حق“ کا معنی اصل میں ”مطابقت“ اور ”ہم آہنگی“ ہے۔ اسی لیے جو چیز واقعیت سے مطابقت رکھتی ہے اسے حق کہتے ہیں۔ یہ جو خدا تعالیٰ کو حق کہتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی ذات مقدس عظیم ترین واقعیت سے کہ جو قابل انکار نہیں۔ واضح تر الفاظ میں۔ حق یعنی وہ ثابت اور مضبوط امر جس میں باطل کے لیے کوئی راستہ نہ ہو۔ عمل بحث آیت میں ”باء“، اصطلاح میں معاجزت کے لیے ہے۔ یعنی اسے پیغمبر خدا نے تم پر ایسا قرآن نازل کیا ہے جو واقعیت کی نشانیوں سے توأم اور ہم آہنگ ہے۔

(۲) تورات کیا ہے؟ ”تورہ“ عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا معنی ہے ”شرعیات اور قانون“۔ یہ لفظ خدا کی طرف سے حضرت موسیٰ بن عمران پر نازل ہونے والی کتاب کے لیے بڑا جانا ہے۔ نیز بعض اوقات عبد عتیق کی کتب کے مجموعے کے لیے اور کبھی کبھی تورات کے پانچوں اسفار کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ یہودیوں کی کتب کے مجموعے کو عبد عتیق کہتے ہیں۔ اس میں تورات اور چند دیگر کتب شامل ہیں۔ تورات کے پانچ حصے میں جنہیں سفر پیدائش، سفر خروج، سفر لویان، سفر اعداد اور سفر تثنید کہتے ہیں۔ اس کے مضمومات یہ ہیں: دین کائنات، انسان اور دیگر مخلوقات کی خلقت،

۱۔ حضرت موسیٰ بن عمران، گذشتہ انبیاء اللہ بنی اسرائیل کے حالات اور
۲۔ اس دین کے احکام کی تشریح۔

عبد عتیق کی دیگر کتابیں دراصل حضرت موسیٰ کے بعد کے مؤرخین کی تحریر کردہ ہیں۔ ان میں حضرت موسیٰ بن عمران کے بعد کے بیٹوں، حکمرانوں اور قوموں کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔

یہ بغیر کتب واضح ہے کہ تورات کے پانچوں اسفار سے اگر صرف نظر کر لیا جائے تو دیگر کتب میں سے کوئی کتاب بھی آسانی کتاب نہیں ہے۔ خود یہودی بھی اس کا دعویٰ نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ حضرت داؤد سے منسوب زبور جیسے وہ مزامیر کہتے ہیں، حضرت داؤد کے مناجات اور پند و نصائح کی تشریح ہے۔ رہی بات تورات کے پانچوں سفروں کی تو ان میں ایسے واضح قرائن موجود ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ وہ بھی آسانی کتاب نہیں ہیں بلکہ وہ تاریخی کتب ہیں جو حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام کے بعد لکھی گئی ہیں کیونکہ ان میں حضرت موسیٰ کی وفات، ان کے دفن کی کیفیت اور ان کی وفات کے بعد کے کچھ حالات مذکور ہیں خصوصاً سفر تثنید کے آخری حصے میں یہ بات وضاحت سے ثابت ہوتی ہے کہ یہ کتاب حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام کی وفات سے کافی مدت بعد لکھی گئی ہے۔

علامہ اوزبی بن کتب میں بہت سی خرافات اور ناروا باتیں انبیاء و مرسلین سے منسوب کر دی گئی ہیں۔ بعض بچکانہ باتیں بھی ہیں جو ان کے خود ساختہ اور جعلی ہونے پر گواہ ہیں نیز بعض تاریخی شواہد بھی نشاندہی کرتے ہیں کہ اصلی تورات غائب ہو گئی اور پھر حضرت



طرح ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب انامہ جیل حضرت سیخ کے سالہا سال بعد لکھی گئی ہیں اور ان میں کوئی بھی کتاب آسمانی نہیں جو حضرت سیخ پر نازل ہوئی ہو۔

- (۵) اعلیٰ رسولاتہ : صدر اول میں حضرت عیسیٰ کے خورسی اور مبلغین کے اعمال۔
- (۶) ۱۴ رسالے : مختلف افراد اور اقوام کے نام پورس کے خطوط۔
- (۷) رسالہ یعقوب : عہد جدید کے ستائیس کتب و رسائل میں سے یہ بیسویں رسالہ ہے۔
- (۸) پطرس کے خطوط : یہ عہد جدید کے ایکسویں اور بائیسویں رسالے پر مشتمل ہیں۔
- (۹) یوحنا کے خطوط : یہ تین رسالوں پر مشتمل ہیں ۲۳، ۲۴ اور ۲۵ رسالوں میں یہی خطوط ہیں۔
- (۱۰) نامہ یسودا : یہ عہد جدید کا چھبیسواں رسالہ۔
- (۱۱) مکاشفہ یوحنا : یہ عہد جدید کا آخری حصہ ہے۔

لہذا عیسائی مؤرخین کی تصریح، نیز انامہ جیل اور عہد جدید کی دیگر کتب و رسائل کے مطابق ان میں سے کوئی بھی آسمانی کتاب نہیں ہے۔ مزید یہ کہ یہ تمام کتب حضرت عیسیٰ کے بعد لکھی گئی ہیں۔ اس گفتگو سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ حضرت سیخ پر نازل ہونے والی آسمانی کتاب درمیان میں سے اٹھ گئی ہے اور آج دستیاب نہیں ہے۔ اس کے کچھ حصے جو حضرت سیخ کے شاگردوں نے اپنی انامہ جیل میں بیان کئے ہیں باعث تاسف ہے کہ ان میں بھی خرافات شامل ہو چکی ہیں۔

دوسری بعض کی یہ بات کہ مسلمانوں کو موجودہ انامہ جیل اور تورات کی صحت میں شک نہیں کرنا چاہیے کیونکہ قرآن نے ان کی تصدیق کی ہے اور ان کی صحت کی گواہی دی ہے تو اس کو جواب جلد اول میں اس آیت کے ذیل میں آچکا ہے۔

”وَأَمْشُوا بِمَا أَنزَلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ“ (بقرہ: ۸۱)

”و انزل الفرقان“

تورات و انجیل کے ذکر کے بعد آیت کے اس حصے میں نزول قرآن کا تذکرہ ہے۔ قرآن کو قرآن کہنے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن نفی میں ”حق کی باطل سے تمیز کا ذریعہ“ کے معنی میں ہے اور بروہ چیز جو حق کو باطل سے ممتاز کر دے اسے فرقان کہتے ہیں۔ اسی لیے جبکہ بدر کے روز کو قرآن نے ”یوم الفرقان“ قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس دن ایک بے سرو سامان چھوٹا سا لشکر اپنے سے کئی گنا بڑے کیل کائنات سے یس اور طاقتور دشمن پر کامیاب دھمکن ہو گیا۔ اس طرح حضرت موسیٰ کے دس مہجرات کو بھی قرآن منہ کہا گیا ہے۔ یہی عقل و خرد اور روشن فکری کو بھی فرقان کہا جاتا ہے۔ محل بحث آیت میں بھی قرآن کو باسی جہت سے فرقان کہا گیا ہے کہ قرآن حق کو باطل سے ممتاز کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

بعض اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے قرآن پوری آسمانی کتاب کا نام ہے جب کہ فرقان اس کی ان آیات کے مجموعے کو کہتے ہیں جن میں عمل احکام، محل و حرام اور انفرادی و اجتماعی منسوبوں کا ذکر ہے۔

۱۔ فرقان: ۱۔ ۲۔ وَنُفِثْنَا مِنْهُ خُمَيْنِ لَنُفِثَنَّاهُ (نحل: ۱۰) ۳۔ تفسیر الفرقان: ۱۔ ۲۔ ۳۔ ۴۔ ۵۔ ۶۔ ۷۔ ۸۔ ۹۔ ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵۔ ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۳۲۔ ۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۶۔ ۳۷۔ ۳۸۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱۔ ۴۲۔ ۴۳۔ ۴۴۔ ۴۵۔ ۴۶۔ ۴۷۔ ۴۸۔ ۴۹۔ ۵۰۔ ۵۱۔ ۵۲۔ ۵۳۔ ۵۴۔ ۵۵۔ ۵۶۔ ۵۷۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ۶۰۔ ۶۱۔ ۶۲۔ ۶۳۔ ۶۴۔ ۶۵۔ ۶۶۔ ۶۷۔ ۶۸۔ ۶۹۔ ۷۰۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۷۳۔ ۷۴۔ ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۷۸۔ ۷۹۔ ۸۰۔ ۸۱۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔ ۸۷۔ ۸۸۔ ۸۹۔ ۹۰۔ ۹۱۔ ۹۲۔ ۹۳۔ ۹۴۔ ۹۵۔ ۹۶۔ ۹۷۔ ۹۸۔ ۹۹۔ ۱۰۰۔ ۱۰۱۔ ۱۰۲۔ ۱۰۳۔ ۱۰۴۔ ۱۰۵۔ ۱۰۶۔ ۱۰۷۔ ۱۰۸۔ ۱۰۹۔ ۱۱۰۔ ۱۱۱۔ ۱۱۲۔ ۱۱۳۔ ۱۱۴۔ ۱۱۵۔ ۱۱۶۔ ۱۱۷۔ ۱۱۸۔ ۱۱۹۔ ۱۲۰۔ ۱۲۱۔ ۱۲۲۔ ۱۲۳۔ ۱۲۴۔ ۱۲۵۔ ۱۲۶۔ ۱۲۷۔ ۱۲۸۔ ۱۲۹۔ ۱۳۰۔ ۱۳۱۔ ۱۳۲۔ ۱۳۳۔ ۱۳۴۔ ۱۳۵۔ ۱۳۶۔ ۱۳۷۔ ۱۳۸۔ ۱۳۹۔ ۱۴۰۔ ۱۴۱۔ ۱۴۲۔ ۱۴۳۔ ۱۴۴۔ ۱۴۵۔ ۱۴۶۔ ۱۴۷۔ ۱۴۸۔ ۱۴۹۔ ۱۵۰۔ ۱۵۱۔ ۱۵۲۔ ۱۵۳۔ ۱۵۴۔ ۱۵۵۔ ۱۵۶۔ ۱۵۷۔ ۱۵۸۔ ۱۵۹۔ ۱۶۰۔ ۱۶۱۔ ۱۶۲۔ ۱۶۳۔ ۱۶۴۔ ۱۶۵۔ ۱۶۶۔ ۱۶۷۔ ۱۶۸۔ ۱۶۹۔ ۱۷۰۔ ۱۷۱۔ ۱۷۲۔ ۱۷۳۔ ۱۷۴۔ ۱۷۵۔ ۱۷۶۔ ۱۷۷۔ ۱۷۸۔ ۱۷۹۔ ۱۸۰۔ ۱۸۱۔ ۱۸۲۔ ۱۸۳۔ ۱۸۴۔ ۱۸۵۔ ۱۸۶۔ ۱۸۷۔ ۱۸۸۔ ۱۸۹۔ ۱۹۰۔ ۱۹۱۔ ۱۹۲۔ ۱۹۳۔ ۱۹۴۔ ۱۹۵۔ ۱۹۶۔ ۱۹۷۔ ۱۹۸۔ ۱۹۹۔ ۲۰۰۔ ۲۰۱۔ ۲۰۲۔ ۲۰۳۔ ۲۰۴۔ ۲۰۵۔ ۲۰۶۔ ۲۰۷۔ ۲۰۸۔ ۲۰۹۔ ۲۱۰۔ ۲۱۱۔ ۲۱۲۔ ۲۱۳۔ ۲۱۴۔ ۲۱۵۔ ۲۱۶۔ ۲۱۷۔ ۲۱۸۔ ۲۱۹۔ ۲۲۰۔ ۲۲۱۔ ۲۲۲۔ ۲۲۳۔ ۲۲۴۔ ۲۲۵۔ ۲۲۶۔ ۲۲۷۔ ۲۲۸۔ ۲۲۹۔ ۲۳۰۔ ۲۳۱۔ ۲۳۲۔ ۲۳۳۔ ۲۳۴۔ ۲۳۵۔ ۲۳۶۔ ۲۳۷۔ ۲۳۸۔ ۲۳۹۔ ۲۴۰۔ ۲۴۱۔ ۲۴۲۔ ۲۴۳۔ ۲۴۴۔ ۲۴۵۔ ۲۴۶۔ ۲۴۷۔ ۲۴۸۔ ۲۴۹۔ ۲۵۰۔ ۲۵۱۔ ۲۵۲۔ ۲۵۳۔ ۲۵۴۔ ۲۵۵۔ ۲۵۶۔ ۲۵۷۔ ۲۵۸۔ ۲۵۹۔ ۲۶۰۔ ۲۶۱۔ ۲۶۲۔ ۲۶۳۔ ۲۶۴۔ ۲۶۵۔ ۲۶۶۔ ۲۶۷۔ ۲۶۸۔ ۲۶۹۔ ۲۷۰۔ ۲۷۱۔ ۲۷۲۔ ۲۷۳۔ ۲۷۴۔ ۲۷۵۔ ۲۷۶۔ ۲۷۷۔ ۲۷۸۔ ۲۷۹۔ ۲۸۰۔ ۲۸۱۔ ۲۸۲۔ ۲۸۳۔ ۲۸۴۔ ۲۸۵۔ ۲۸۶۔ ۲۸۷۔ ۲۸۸۔ ۲۸۹۔ ۲۹۰۔ ۲۹۱۔ ۲۹۲۔ ۲۹۳۔ ۲۹۴۔ ۲۹۵۔ ۲۹۶۔ ۲۹۷۔ ۲۹۸۔ ۲۹۹۔ ۳۰۰۔ ۳۰۱۔ ۳۰۲۔ ۳۰۳۔ ۳۰۴۔ ۳۰۵۔ ۳۰۶۔ ۳۰۷۔ ۳۰۸۔ ۳۰۹۔ ۳۱۰۔ ۳۱۱۔ ۳۱۲۔ ۳۱۳۔ ۳۱۴۔ ۳۱۵۔ ۳۱۶۔ ۳۱۷۔ ۳۱۸۔ ۳۱۹۔ ۳۲۰۔ ۳۲۱۔ ۳۲۲۔ ۳۲۳۔ ۳۲۴۔ ۳۲۵۔ ۳۲۶۔ ۳۲۷۔ ۳۲۸۔ ۳۲۹۔ ۳۳۰۔ ۳۳۱۔ ۳۳۲۔ ۳۳۳۔ ۳۳۴۔ ۳۳۵۔ ۳۳۶۔ ۳۳۷۔ ۳۳۸۔ ۳۳۹۔ ۳۴۰۔ ۳۴۱۔ ۳۴۲۔ ۳۴۳۔ ۳۴۴۔ ۳۴۵۔ ۳۴۶۔ ۳۴۷۔ ۳۴۸۔ ۳۴۹۔ ۳۵۰۔ ۳۵۱۔ ۳۵۲۔ ۳۵۳۔ ۳۵۴۔ ۳۵۵۔ ۳۵۶۔ ۳۵۷۔ ۳۵۸۔ ۳۵۹۔ ۳۶۰۔ ۳۶۱۔ ۳۶۲۔ ۳۶۳۔ ۳۶۴۔ ۳۶۵۔ ۳۶۶۔ ۳۶۷۔ ۳۶۸۔ ۳۶۹۔ ۳۷۰۔ ۳۷۱۔ ۳۷۲۔ ۳۷۳۔ ۳۷۴۔ ۳۷۵۔ ۳۷۶۔ ۳۷۷۔ ۳۷۸۔ ۳۷۹۔ ۳۸۰۔ ۳۸۱۔ ۳۸۲۔ ۳۸۳۔ ۳۸۴۔ ۳۸۵۔ ۳۸۶۔ ۳۸۷۔ ۳۸۸۔ ۳۸۹۔ ۳۹۰۔ ۳۹۱۔ ۳۹۲۔ ۳۹۳۔ ۳۹۴۔ ۳۹۵۔ ۳۹۶۔ ۳۹۷۔ ۳۹۸۔ ۳۹۹۔ ۴۰۰۔ ۴۰۱۔ ۴۰۲۔ ۴۰۳۔ ۴۰۴۔ ۴۰۵۔ ۴۰۶۔ ۴۰۷۔ ۴۰۸۔ ۴۰۹۔ ۴۱۰۔ ۴۱۱۔ ۴۱۲۔ ۴۱۳۔ ۴۱۴۔ ۴۱۵۔ ۴۱۶۔ ۴۱۷۔ ۴۱۸۔ ۴۱۹۔ ۴۲۰۔ ۴۲۱۔ ۴۲۲۔ ۴۲۳۔ ۴۲۴۔ ۴۲۵۔ ۴۲۶۔ ۴۲۷۔ ۴۲۸۔ ۴۲۹۔ ۴۳۰۔ ۴۳۱۔ ۴۳۲۔ ۴۳۳۔ ۴۳۴۔ ۴۳۵۔ ۴۳۶۔ ۴۳۷۔ ۴۳۸۔ ۴۳۹۔ ۴۴۰۔ ۴۴۱۔ ۴۴۲۔ ۴۴۳۔ ۴۴۴۔ ۴۴۵۔ ۴۴۶۔ ۴۴۷۔ ۴۴۸۔ ۴۴۹۔ ۴۵۰۔ ۴۵۱۔ ۴۵۲۔ ۴۵۳۔ ۴۵۴۔ ۴۵۵۔ ۴۵۶۔ ۴۵۷۔ ۴۵۸۔ ۴۵۹۔ ۴۶۰۔ ۴۶۱۔ ۴۶۲۔ ۴۶۳۔ ۴۶۴۔ ۴۶۵۔ ۴۶۶۔ ۴۶۷۔ ۴۶۸۔ ۴۶۹۔ ۴۷۰۔ ۴۷۱۔ ۴۷۲۔ ۴۷۳۔ ۴۷۴۔ ۴۷۵۔ ۴۷۶۔ ۴۷۷۔ ۴۷۸۔ ۴۷۹۔ ۴۸۰۔ ۴۸۱۔ ۴۸۲۔ ۴۸۳۔ ۴۸۴۔ ۴۸۵۔ ۴۸۶۔ ۴۸۷۔ ۴۸۸۔ ۴۸۹۔ ۴۹۰۔ ۴۹۱۔ ۴۹۲۔ ۴۹۳۔ ۴۹۴۔ ۴۹۵۔ ۴۹۶۔ ۴۹۷۔ ۴۹۸۔ ۴۹۹۔ ۵۰۰۔ ۵۰۱۔ ۵۰۲۔ ۵۰۳۔ ۵۰۴۔ ۵۰۵۔ ۵۰۶۔ ۵۰۷۔ ۵۰۸۔ ۵۰۹۔ ۵۱۰۔ ۵۱۱۔ ۵۱۲۔ ۵۱۳۔ ۵۱۴۔ ۵۱۵۔ ۵۱۶۔ ۵۱۷۔ ۵۱۸۔ ۵۱۹۔ ۵۲۰۔ ۵۲۱۔ ۵۲۲۔ ۵۲۳۔ ۵۲۴۔ ۵۲۵۔ ۵۲۶۔ ۵۲۷۔ ۵۲۸۔ ۵۲۹۔ ۵۳۰۔ ۵۳۱۔ ۵۳۲۔ ۵۳۳۔ ۵۳۴۔ ۵۳۵۔ ۵۳۶۔ ۵۳۷۔ ۵۳۸۔ ۵۳۹۔ ۵۴۰۔ ۵۴۱۔ ۵۴۲۔ ۵۴۳۔ ۵۴۴۔ ۵۴۵۔ ۵۴۶۔ ۵۴۷۔ ۵۴۸۔ ۵۴۹۔ ۵۵۰۔ ۵۵۱۔ ۵۵۲۔ ۵۵۳۔ ۵۵۴۔ ۵۵۵۔ ۵۵۶۔ ۵۵۷۔ ۵۵۸۔ ۵۵۹۔ ۵۶۰۔ ۵۶۱۔ ۵۶۲۔ ۵۶۳۔ ۵۶۴۔ ۵۶۵۔ ۵۶۶۔ ۵۶۷۔ ۵۶۸۔ ۵۶۹۔ ۵۷۰۔ ۵۷۱۔ ۵۷۲۔ ۵۷۳۔ ۵۷۴۔ ۵۷۵۔ ۵۷۶۔ ۵۷۷۔ ۵۷۸۔ ۵۷۹۔ ۵۸۰۔ ۵۸۱۔ ۵۸۲۔ ۵۸۳۔ ۵۸۴۔ ۵۸۵۔ ۵۸۶۔ ۵۸۷۔ ۵۸۸۔ ۵۸۹۔ ۵۹۰۔ ۵۹۱۔ ۵۹۲۔ ۵۹۳۔ ۵۹۴۔ ۵۹۵۔ ۵۹۶۔ ۵۹۷۔ ۵۹۸۔ ۵۹۹۔ ۶۰۰۔ ۶۰۱۔ ۶۰۲۔ ۶۰۳۔ ۶۰۴۔ ۶۰۵۔ ۶۰۶۔ ۶۰۷۔ ۶۰۸۔ ۶۰۹۔ ۶۱۰۔ ۶۱۱۔ ۶۱۲۔ ۶۱۳۔ ۶۱۴۔ ۶۱۵۔ ۶۱۶۔ ۶۱۷۔ ۶۱۸۔ ۶۱۹۔ ۶۲۰۔ ۶۲۱۔ ۶۲۲۔ ۶۲۳۔ ۶۲۴۔ ۶۲۵۔ ۶۲۶۔ ۶۲۷۔ ۶۲۸۔ ۶۲۹۔ ۶۳۰۔ ۶۳۱۔ ۶۳۲۔ ۶۳۳۔ ۶۳۴۔ ۶۳۵۔ ۶۳۶۔ ۶۳۷۔ ۶۳۸۔ ۶۳۹۔ ۶۴۰۔ ۶۴۱۔ ۶۴۲۔ ۶۴۳۔ ۶۴۴۔ ۶۴۵۔ ۶۴۶۔ ۶۴۷۔ ۶۴۸۔ ۶۴۹۔ ۶۵۰۔ ۶۵۱۔ ۶۵۲۔ ۶۵۳۔ ۶۵۴۔ ۶۵۵۔ ۶۵۶۔ ۶۵۷۔ ۶۵۸۔ ۶۵۹۔ ۶۶۰۔ ۶۶۱۔ ۶۶۲۔ ۶۶۳۔ ۶۶۴۔ ۶۶۵۔ ۶۶۶۔ ۶۶۷۔ ۶۶۸۔ ۶۶۹۔ ۶۷۰۔ ۶۷۱۔ ۶۷۲۔ ۶۷۳۔ ۶۷۴۔ ۶۷۵۔ ۶۷۶۔ ۶۷۷۔ ۶۷۸۔ ۶۷۹۔ ۶۸۰۔ ۶۸۱۔ ۶۸۲۔ ۶۸۳۔ ۶۸۴۔ ۶۸۵۔ ۶۸۶۔ ۶۸۷۔ ۶۸۸۔ ۶۸۹۔ ۶۹۰۔ ۶۹۱۔ ۶۹۲۔ ۶۹۳۔ ۶۹۴۔ ۶۹۵۔ ۶۹۶۔ ۶۹۷۔ ۶۹۸۔ ۶۹۹۔ ۷۰۰۔ ۷۰۱۔ ۷۰۲۔ ۷۰۳۔ ۷۰۴۔ ۷۰۵۔ ۷۰۶۔ ۷۰۷۔ ۷۰۸۔ ۷۰۹۔ ۷۱۰۔ ۷۱۱۔ ۷۱۲۔ ۷۱۳۔ ۷۱۴۔ ۷۱۵۔ ۷۱۶۔ ۷۱۷۔ ۷۱۸۔ ۷۱۹۔ ۷۲۰۔ ۷۲۱۔ ۷۲۲۔ ۷۲۳۔ ۷۲۴۔ ۷۲۵۔ ۷۲۶۔ ۷۲۷۔ ۷۲۸۔ ۷۲۹۔ ۷۳۰۔ ۷۳۱۔ ۷۳۲۔ ۷۳۳۔ ۷۳۴۔ ۷۳۵۔ ۷۳۶۔ ۷۳۷۔ ۷۳۸۔ ۷۳۹۔ ۷۴۰۔ ۷۴۱۔ ۷۴۲۔ ۷۴۳۔ ۷۴۴۔ ۷۴۵۔ ۷۴۶۔ ۷۴۷۔ ۷۴۸۔ ۷۴۹۔ ۷۵۰۔ ۷۵۱۔ ۷۵۲۔ ۷۵۳۔ ۷۵۴۔ ۷۵۵۔ ۷۵۶۔ ۷۵۷۔ ۷۵۸۔ ۷۵۹۔ ۷۶۰۔ ۷۶۱۔ ۷۶۲۔ ۷۶۳۔ ۷۶۴۔ ۷۶۵۔ ۷۶۶۔ ۷۶۷۔ ۷۶۸۔ ۷۶۹۔ ۷۷۰۔ ۷۷۱۔ ۷۷۲۔ ۷۷۳۔ ۷۷۴۔ ۷۷۵۔ ۷۷۶۔ ۷۷۷۔ ۷۷۸۔ ۷۷۹۔ ۷۸۰۔ ۷۸۱۔ ۷۸۲۔ ۷۸۳۔ ۷۸۴۔ ۷۸۵۔ ۷۸۶۔ ۷۸۷۔ ۷۸۸۔ ۷۸۹۔ ۷۹۰۔ ۷۹۱۔ ۷۹۲۔ ۷۹۳۔ ۷۹۴۔ ۷۹۵۔ ۷۹۶۔ ۷۹۷۔ ۷۹۸۔ ۷۹۹۔ ۸۰۰۔ ۸۰۱۔ ۸۰۲۔ ۸۰۳۔ ۸۰۴۔ ۸۰۵۔ ۸۰۶۔ ۸۰۷۔ ۸۰۸۔ ۸۰۹۔ ۸۱۰۔ ۸۱۱۔ ۸۱۲۔ ۸۱۳۔ ۸۱۴۔ ۸۱۵۔ ۸۱۶۔ ۸۱۷۔ ۸۱۸۔ ۸۱۹۔ ۸۲۰۔ ۸۲۱۔ ۸۲۲۔ ۸۲۳۔ ۸۲۴۔ ۸۲۵۔ ۸۲۶۔ ۸۲۷۔ ۸۲۸۔ ۸۲۹۔ ۸۳۰۔ ۸۳۱۔ ۸۳۲۔ ۸۳۳۔ ۸۳۴۔ ۸۳۵۔ ۸۳۶۔ ۸۳۷۔ ۸۳۸۔ ۸۳۹۔ ۸۴۰۔ ۸۴۱۔ ۸۴۲۔ ۸۴۳۔ ۸۴۴۔ ۸۴۵۔ ۸۴۶۔ ۸۴۷۔ ۸۴۸۔ ۸۴۹۔ ۸۵۰۔ ۸۵۱۔ ۸۵۲۔ ۸۵۳۔ ۸۵۴۔ ۸۵۵۔ ۸۵۶۔ ۸۵۷۔ ۸۵۸۔ ۸۵۹۔ ۸۶۰۔ ۸۶۱۔ ۸۶۲۔ ۸۶۳۔ ۸۶۴۔ ۸۶۵۔ ۸۶۶۔ ۸۶۷۔ ۸۶۸۔ ۸۶۹۔ ۸۷۰۔ ۸۷۱۔ ۸۷۲۔ ۸۷۳۔ ۸۷۴۔ ۸۷۵۔ ۸۷۶۔ ۸۷۷۔ ۸۷۸۔ ۸۷۹۔ ۸۸۰۔ ۸۸۱۔ ۸۸۲۔ ۸۸۳۔ ۸۸۴۔ ۸۸۵۔ ۸۸۶۔ ۸۸۷۔ ۸۸۸۔ ۸۸۹۔ ۸۹۰۔ ۸۹۱۔ ۸۹۲۔ ۸۹۳۔ ۸۹۴۔ ۸۹۵۔ ۸۹۶۔ ۸۹۷۔ ۸۹۸۔ ۸۹۹۔ ۹۰۰۔ ۹۰۱۔ ۹۰۲۔ ۹۰۳۔ ۹۰۴۔ ۹۰۵۔ ۹۰۶۔ ۹۰۷۔ ۹۰۸۔ ۹۰۹۔ ۹۱۰۔ ۹۱۱۔ ۹۱۲۔ ۹۱۳۔ ۹۱۴۔ ۹۱۵۔ ۹۱۶۔ ۹۱۷۔ ۹۱۸۔ ۹۱۹۔ ۹۲۰۔ ۹۲۱۔ ۹۲۲۔ ۹۲۳۔ ۹۲۴۔ ۹۲۵۔ ۹۲۶۔ ۹۲۷۔ ۹۲۸۔ ۹۲۹۔ ۹۳۰۔ ۹۳۱۔ ۹۳۲۔ ۹۳۳۔ ۹۳۴۔ ۹۳۵۔ ۹۳۶۔ ۹۳۷۔ ۹۳۸۔ ۹۳۹۔ ۹۴۰۔ ۹۴۱۔ ۹۴۲۔ ۹۴۳۔ ۹۴۴۔ ۹۴۵۔ ۹۴۶۔ ۹۴۷۔ ۹۴۸۔ ۹۴۹۔ ۹۵۰۔ ۹۵۱۔ ۹۵۲۔ ۹۵۳۔ ۹۵۴۔ ۹۵۵۔ ۹۵۶۔ ۹۵۷۔ ۹۵۸۔ ۹۵۹۔ ۹۶۰۔ ۹۶۱۔ ۹۶۲۔ ۹۶۳۔ ۹۶۴۔ ۹۶۵۔ ۹۶۶۔ ۹۶۷۔ ۹۶۸۔ ۹۶۹۔ ۹۷۰۔ ۹۷۱۔ ۹۷۲۔ ۹۷۳۔ ۹۷۴۔ ۹۷۵۔ ۹۷۶۔ ۹۷۷۔ ۹۷۸۔ ۹۷۹۔ ۹۸۰۔ ۹۸۱۔ ۹۸۲۔ ۹۸۳۔ ۹۸۴۔ ۹۸۵۔ ۹۸۶۔ ۹۸۷۔ ۹۸۸۔ ۹۸۹۔ ۹۹۰۔ ۹۹۱۔ ۹۹۲۔ ۹۹۳۔ ۹۹۴۔ ۹۹۵۔ ۹۹۶۔ ۹۹۷۔ ۹۹۸۔ ۹۹۹۔ ۱۰۰۰۔ ۱۰۰۱۔ ۱۰۰۲۔ ۱۰۰۳۔ ۱۰۰۴۔ ۱۰۰۵۔ ۱۰۰۶۔ ۱۰۰۷۔ ۱۰۰۸۔ ۱۰۰۹۔ ۱۰۱۰۔ ۱۰۱۱۔ ۱۰۱۲۔ ۱۰۱۳۔ ۱۰۱۴۔ ۱۰۱۵۔ ۱۰۱۶۔ ۱۰۱۷۔ ۱۰۱۸۔ ۱۰۱۹۔ ۱۰۲۰۔ ۱۰۲۱۔ ۱۰۲۲۔ ۱۰۲۳۔ ۱۰۲۴۔ ۱۰۲۵۔ ۱۰۲۶۔ ۱۰۲۷۔ ۱۰۲۸۔ ۱۰۲۹۔ ۱۰۳۰۔ ۱۰۳۱۔ ۱۰۳۲۔ ۱۰۳۳۔ ۱۰۳۴۔ ۱۰۳۵۔ ۱۰۳۶۔ ۱۰۳۷۔ ۱۰۳۸۔ ۱۰۳۹۔ ۱۰۴۰۔ ۱۰۴۱۔ ۱۰۴۲۔ ۱۰۴۳۔ ۱۰۴۴۔ ۱۰۴۵۔ ۱۰۴۶۔ ۱۰۴۷۔ ۱۰۴۸۔ ۱۰۴۹۔ ۱۰۵۰۔ ۱۰۵۱۔ ۱۰۵۲۔ ۱۰۵۳۔ ۱۰۵۴۔ ۱۰۵۵۔ ۱۰۵۶۔ ۱۰۵۷۔ ۱۰۵۸۔ ۱۰۵۹۔ ۱۰۶۰۔ ۱۰۶۱۔ ۱۰۶۲۔ ۱۰۶۳۔ ۱۰۶۴۔ ۱۰۶۵۔ ۱۰۶۶۔ ۱۰۶۷۔ ۱۰۶۸۔ ۱۰۶۹۔ ۱۰۷۰۔ ۱۰۷۱۔ ۱۰۷۲۔ ۱۰۷۳۔ ۱۰۷۴۔ ۱۰۷۵۔ ۱۰۷۶۔ ۱۰۷۷۔ ۱۰۷۸۔ ۱۰۷۹۔ ۱۰۸۰۔ ۱۰۸۱۔ ۱۰۸۲۔ ۱۰۸۳۔ ۱۰۸۴۔ ۱۰۸۵۔ ۱۰۸۶۔ ۱۰۸۷۔ ۱۰۸۸۔ ۱۰۸۹۔ ۱۰۹۰۔ ۱۰۹۱۔ ۱۰۹۲۔ ۱۰۹۳۔ ۱۰۹۴۔ ۱۰۹۵۔ ۱۰۹۶۔ ۱۰۹۷۔ ۱۰۹۸۔ ۱۰۹۹۔ ۱۱۰۰۔ ۱۱۰۱۔ ۱۱۰۲۔ ۱۱۰۳۔ ۱۱۰۴۔ ۱۱۰۵۔ ۱۱۰۶۔ ۱۱۰۷۔ ۱۱۰۸۔ ۱۱۰۹۔ ۱۱۱۰۔ ۱۱۱۱۔ ۱۱۱۲۔ ۱۱۱۳۔ ۱۱۱۴۔ ۱۱۱۵۔ ۱۱۱۶۔ ۱۱۱۷۔ ۱۱۱۸۔ ۱۱۱۹۔ ۱۱۲۰۔ ۱۱۲۱۔ ۱۱۲۲۔ ۱۱۲۳۔ ۱۱۲۴۔ ۱۱۲۵۔ ۱۱۲۶۔ ۱۱۲۷۔ ۱۱۲۸۔ ۱۱۲۹۔ ۱۱۳۰۔ ۱۱۳۱۔ ۱۱۳۲۔ ۱۱۳۳۔ ۱۱۳۴۔ ۱۱۳۵۔ ۱۱۳۶۔ ۱۱۳۷۔ ۱۱۳۸۔ ۱۱۳۹۔ ۱۱۴۰۔ ۱۱۴۱۔ ۱۱۴۲۔ ۱۱۴۳۔ ۱۱۴۴۔ ۱۱۴۵۔ ۱۱۴۶۔ ۱۱۴۷۔ ۱۱۴۸۔ ۱۱۴۹۔ ۱۱۵۰۔ ۱۱۵۱۔ ۱۱۵۲۔ ۱۱۵۳۔ ۱۱۵۴۔ ۱۱۵۵۔ ۱۱۵۶۔ ۱۱۵۷۔ ۱۱۵۸۔ ۱۱۵۹۔ ۱۱۶۰۔ ۱۱۶۱۔ ۱۱۶۲۔ ۱۱۶۳۔ ۱۱۶۴۔ ۱۱۶۵۔ ۱۱۶۶۔ ۱۱۶۷۔ ۱۱۶۸۔ ۱۱۶۹۔ ۱۱۷۰۔ ۱۱۷۱۔ ۱۱۷۲۔ ۱۱۷۳۔ ۱۱۷۴۔ ۱۱۷۵۔ ۱۱۷۶۔ ۱۱۷۷۔ ۱۱۷۸۔ ۱۱۷۹۔ ۱۱۸۰۔ ۱۱۸۱۔ ۱۱۸۲۔ ۱۱۸۳۔ ۱۱۸۴۔ ۱۱۸۵۔ ۱۱۸۶۔ ۱۱۸۷۔ ۱۱۸۸۔ ۱۱۸۹۔ ۱۱۹۰۔ ۱۱۹۱۔ ۱۱۹۲۔ ۱۱۹۳۔ ۱۱۹۴۔ ۱۱۹۵۔ ۱۱۹۶۔ ۱۱۹۷۔ ۱۱۹۸۔ ۱۱۹۹۔ ۱۲۰۰۔ ۱۲۰۱۔ ۱۲۰۲۔ ۱۲۰۳۔ ۱۲۰۴۔ ۱۲۰۵۔ ۱۲۰۶۔ ۱۲۰۷۔ ۱۲۰۸۔ ۱۲۰۹۔ ۱۲۱۰۔ ۱۲۱۱۔ ۱۲۱۲۔ ۱۲۱۳۔ ۱۲۱۴۔ ۱۲۱۵۔ ۱۲۱۶۔ ۱۲۱۷۔ ۱۲۱۸۔ ۱۲۱۹۔ ۱۲۲۰۔ ۱۲۲۱۔ ۱۲۲۲۔ ۱۲۲۳۔ ۱۲۲۴۔ ۱۲۲۵۔ ۱۲۲۶۔ ۱۲۲۷۔ ۱۲۲۸۔ ۱۲۲۹۔ ۱۲۳۰۔ ۱۲۳۱۔ ۱۲۳۲۔ ۱۲۳۳۔ ۱۲۳۴۔ ۱۲۳۵۔ ۱۲۳۶۔ ۱۲۳۷۔ ۱۲۳۸۔ ۱۲۳۹۔ ۱۲۴۰۔ ۱۲۴۱۔ ۱۲۴۲۔ ۱۲۴۳۔ ۱۲۴۴۔ ۱۲۴۵۔ ۱۲۴۶۔ ۱۲۴۷۔ ۱۲۴۸۔ ۱۲۴۹۔ ۱۲۵۰۔ ۱۲۵۱۔ ۱۲۵۲۔ ۱۲۵۳۔ ۱۲۵۴۔ ۱۲۵۵۔ ۱۲۵۶۔ ۱۲۵۷۔ ۱۲۵۸۔ ۱۲۵۹۔ ۱۲۶۰۔ ۱۲۶۱۔ ۱۲۶۲۔ ۱۲۶۳۔ ۱۲۶۴۔ ۱۲۶۵۔ ۱۲۶۶۔ ۱۲۶۷۔ ۱۲۶۸۔ ۱۲۶۹۔ ۱۲۷۰۔ ۱۲۷۱۔ ۱۲۷۲۔ ۱۲۷۳۔ ۱۲۷۴۔ ۱۲۷۵۔ ۱۲۷۶۔ ۱۲۷۷۔ ۱۲۷۸۔ ۱۲۷۹۔ ۱۲۸۰۔ ۱۲۸۱۔ ۱۲۸۲۔ ۱۲۸۳۔ ۱۲۸۴۔ ۱۲۸۵۔ ۱۲۸۶۔ ۱۲۸۷۔ ۱۲۸۸۔ ۱۲۸۹۔ ۱۲۹۰۔ ۱۲۹۱۔ ۱۲۹۲۔ ۱۲۹۳۔ ۱۲۹۴۔ ۱۲۹۵۔ ۱۲۹۶۔ ۱۲۹۷۔ ۱۲۹۸۔ ۱۲۹۹۔ ۱۳۰۰۔ ۱۳۰۱۔ ۱۳۰۲۔ ۱۳۰۳۔ ۱۳۰۴۔ ۱۳۰۵۔ ۱۳۰۶۔ ۱۳۰۷۔ ۱۳۰۸۔ ۱۳۰۹۔ ۱۳۱۰۔ ۱۳۱۱۔ ۱۳۱۲۔ ۱۳۱۳۔ ۱۳۱۴۔ ۱۳۱۵۔ ۱۳۱۶۔ ۱۳۱



۴۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِآيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ
وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُوْا نِقَمٍ ۝ ۷

ترجمہ

۴۔ جو لوگ آیاتِ الہی کے منکر ہو گئے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے اور
خدا بدکاروں اور سرکش کافروں کو عذاب دینے کی قدرت رکھتا ہے اور وہ انتقام لینے
والا ہے۔

تفسیر

اتمامِ حجت۔ خدا کی طرف سے آیات کے نزول اور انبیاء کے دعویٰ کی صداقت پر عقل و فطرت کی گواہی کے بعد بلاشبہ
انہیں قبول کر لینا چاہیے۔ لہذا جو لوگ ان تمام امور کے باوجود مخالفت کرتے ہیں تو اس کا سبب بے رحمی اور سرکشی
کے علاوہ کچھ نہیں اور عقل و وجدان انہیں مستحق عذاب قرار دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس آیت میں منکرین
آیات کو شدید اور دردناک عذاب کی تہدید کرتا ہے۔
”وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُوْا نِقَمٍ“

اُذت میں ”عزیز“ ہر مشکل چیز کے معنی میں ہے۔ وہ زمین جسے عبور کرنا سخت مشکل ہو اُسے
”عزیز“ کہتے ہیں۔ جو چیز کمیابی کی وجہ سے مشکل سے ملتی ہو اُسے بھی ”عزیز“ کہتے ہیں اور اُس کی وجہ
یہ ہے کہ چونکہ کوئی شخص اس پر غلبہ کی قدرت نہیں رکھتا اور ہر کوئی اس کا ارادہ کر کے رہ جاتا ہے۔

کافروں کو آگاہ کرنے کے لیے کہ یہ تہدید اور دھمکی بالکل حقیقی اور حتمی ہے اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ خدا قادر ہے
اس لیے کوئی شخص اس کی دھمکیوں پر عمل درآمد کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا کیونکہ جیسے وہ رحیم اور مہربان ہے جو لوگ حجت
کے قابل نہیں اُن کے لیے اس کے پاس عذاب شدید ہے اور ان کے لیے وہ صاحبِ انتقام ہے۔

آج کی اصطلاح میں ”انتقام“ زیادہ تر ایسے مواقع پر استعمال ہوتا ہے جہاں لوگ خلاف ورزیوں کے مقابلے میں
منافع نہیں کرتے یا دوسرے اشتباہات کی بناء پر ویسا ہی بدلہ لیتے ہیں اور دو گزر کرنے کو درست نہیں سمجھتے۔ یہ
صفت مسلمان پسندیدہ نہیں ہے کیونکہ بیت سے مقامات پر ویسا ہی بدلہ لینے کی بجائے انسان کو غفور و درگزر کا راستہ
اختیار کرنا چاہیے لیکن حقیقت میں انتقام لغوی طور پر اس معنی میں نہیں ہے بلکہ گناہگار کو سزا دینے کے معنی میں ہے
اور مسلم ہے کہ ضرور سنگدلوں اور گناہگاروں کو سزا دینا نہ صرف پسندیدہ کام ہے بلکہ ان سے صرف نظر کرنا عدالت و حکمت کے



نکات ہے۔

۵۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰی عَلَیْهِ شَیْءٌ فِی السَّمٰوٰتِ وَفِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَاءِ ۝

ترجمہ

۵۔ زمین و آسمان میں کوئی چیز بھی خدا پر مخفی نہیں رہتی (اس لیے اُن کی تدبیر کرنا بھی اُس کے لیے مشکل نہیں ہے)۔

تفسیر

یہ آیت درحقیقت گزشتہ آیات کے مفہیم کی تکمیل کرتی ہے کیونکہ ہم گزشتہ آیات میں پڑھ چکے ہیں کہ خدا جادوں اور قیوم ہے۔ جہاں ہستی کی تدبیر اور انتظام اُس کے ہاتھ میں ہے۔ مسلم ہے کہ یہ کام قدرت و علم کا محتاج ہے لہذا گزشتہ آیت کے آخر میں اُس کی قدرت مطلقہ کی طرف اشارہ ہوا ہے اور یہ آیت اُس کے بے پایاں علم کی طرف اشارہ کرتی ہے اور کہتی ہے: زمین و آسمان کی کوئی چیز اللہ کے لیے مخفی اور مستور نہیں۔ یہی مضمون قرآن کی دیگر نکتہ سی آیات میں بھی آیا ہے۔

پروردگار کے وسعت علم کی دلیل واضح ہے کیونکہ وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اُس لیے کہ اس کا وجود بے پایاں و غیر محدود ہے کوئی جگہ اس سے خالی نہیں ہے لہذا اگرچہ وہ محسوس و متعام نہیں رکھتا ہے تمام چیزوں پر محیط ہے۔ خدا کا یہ احاطہ وجودی اور ہر جگہ پراس کے حاضر ہونے کا حتمی نتیجہ یہ ہے کہ تمام چیزوں اور ملکوں کے متعلق اس کا علم کامل ہے اور وہ بھی علم حضوری نہ کہ علم حصولی ہے۔

۶۔ هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُکُمْ فِی الْاَرْحَامِ کَیْفَ یَشَآءُ ۚ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۝

ترجمہ

۶۔ وہ ذات ہے جو مائوں کے رحم میں جیسی چاہتا ہے تمہاری صورت بناتا ہے (اس لیے)

خدا جو ضرور کا مطلب ہے کہ وہی کا علم ہے اس کی ذات جامع کے ساتھ معجز پر عین علم حصولی میں مصمم کی شکل و صورت اور نقش و نگار۔ اس معجز پر عین۔ مثلاً ایسی ذات کے متعلق ہر طرح کی بات کہی جاسکتی ہے لیکن ذاتی حقائق کے بارے میں جلدی علم حصولی ہے کہ وہی ذات ہے۔ مثلاً توں۔ مثلاً خدا کا علم ہر شے پر مشتمل ہے اور وہی ہے۔



اُس توانا اور حکیم خدا کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے۔

تفسیر

اس آیت میں خدا کی قدرت، دانائی اور حکمت کا شاہکار بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ شکم مادر میں انسان کی صورت بناتا ہے، واقعاً یہ امر تعجب خیز اور حیرت انگیز ہے کہ رحم کے اندر خدا انسان کے مختلف خدا و خل بناتا ہے طرح طرح کی استعداد پیدا کرتا ہے، کئی قسم کی صفات عطا کرتا ہے اور جبلت و سرشت کی تشکیل کرتا ہے۔

جنین کے مراحل - تخلیق کا شاہکار

علم جنین شناسی کی ارتقاء نے آج کی دنیا میں اس آیت کے مفہوم کی عظمت کو بہت اجاگر کر دیا ہے۔ ابتدا میں جنین ایک خلیے (CELL) پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس وقت اس کی کوئی شکل و صورت ہوتی ہے نہ اعضا و جوارح۔ اُس میں کوئی طاقت و توانائی بھی نہیں ہوتی۔ پھر وہ عجیب سرعت سے رحم کے غرق خانہ میں ہر روز نئی شکل اور نیا نقش و نگار اپناتا ہے۔ جیسے نقش و نگار کے ماہرین اس کے پاس بیٹھے ہیں اور شب و روز اس پر کام کر رہے ہیں اور اس ناچیز ذرے سے تھوڑے ہی عرصے میں ایک انسان بنا ڈالتے ہیں۔ وہ انسان جس کا ظاہر بہت ہی آراستہ و پیراستہ ہوتا ہے اور اس کے وجود کے اندر صاف ستھری، پیچیدہ و دقیق اور حیرت انگیز کارخانے نظر آنے لگتے ہیں۔ اب اگر مراحل جنین کی فلم لی جائے (جیسا کہ لی بھی گئی ہے) اور انسان کی آنکھوں کے سامنے یہ مناظر یکے بعد دیگرے گزرتے رہیں تو انسان کو عظمت خلقت اور قدرت خالق سے ایک نئی آشنائی ہوگی اور وہ بے اختیار کہہ اُٹھے گا۔

۵۔ زینبہ سانش، آں آفرید گاری است

کار و جنین دل آویز، نقشی زما و طینی

وہ خلقائق تریف ہے کہ جو ایسا دلآویز نقش پائی اور مٹی سے بنا دیا ہے۔

اور تعجب کی بات ہے کہ یہ تمام نقش و نگار پانی پر ہیں جس کے متعلق مشہور ہے کہ اس پر نقش و نگار نہیں ہو سکتے!

۶۔ کہ کردہ است در آب صورت گری؟

یہ کون ہے کہ جس نے پانی پر صورتیں بنائی ہیں؟

یہ امر قابل توجہ ہے کہ انعقاد و نطفہ کے بعد جب جنین اپنی پہلی شکل اختیار کر لیتا ہے تو تیزی سے تقسیم و افزائش کے عمل سے گزرتا ہے اور پھر شدت قوت کے ایک پھل کی طرح ہو جاتا ہے جس کے چھوٹے چھوٹے دانے ایک دوسرے سے ملے جمتے ہیں۔ اُسے مرولا کہتے ہیں۔ عین اس پیش رفت کے موقع پر خون کا ایک لوتھڑا جسے جفت کہتے ہیں اس کے قریب ارتقائی حالت میں ہوتا ہے۔ ایک طرف سے جفت دو شریانوں اور ایک ورید کے ذریعے مل کے دل سے بلا ہوتا ہے اور دوسری طرف بندناف کے ذریعے جنین سے مربوط ہوتا ہے اور جنین خون جفت سے غذا حاصل کرتا ہے کیونکہ غذائی مواد خون جنت



میں موجود ہوتا ہے۔ غذا ملنے، ارتقائی سفر طے کرنے اور غلیوں کا باہر کی طرف رخ کرنے سے سروا کا اندرونی حصہ آہستہ آہستہ خالی ہو جاتا ہے جسے بلا سٹولا کہتے ہیں۔ زیادہ وقت نہیں گزرتا کہ بلا سٹولا کے غلیوں کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے اب بلا سٹولا دو تہوں والے تھیلے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پھر وہ اپنے اندر کی طرف سکڑنا شروع کر دیتا ہے جس کے نتیجے میں بچہ دو حصوں یعنی سینہ اور شکم میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ اس مرحلے تک تمام غلیے ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں اور ظاہراً ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس مرحلے کے بعد جنین کی صورت بننے لگتی ہے اور اس کے اجزاء میں آئندہ اجسام پانے والے کاموں کی مناسبت سے تغیر آنے لگتا ہے۔ نئے نئے بائے بننے لگتے ہیں اور نئی مشینیں حرکت میں آ جاتی ہیں اور غلیوں کا ایک ایک گروپ بن کر کسی ایک مشین کو اپنے ذمے لے لیتا ہے مثلاً اعصاب کی مشین، گردشِ خون اور معدے کا عمل وغیرہ اس کے نتیجے میں جنین رحم کے مخفی خانے میں ایک سوزوں انسان کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

”کامل جنین اور اس کے مختلف مراحل کی تفصیل انشاء اللہ سورہ مومنون کی آیت ۱۲ کے ذیل میں پیش کی جائے گی۔“
ابتداءً سورہ میں جو شانِ نزول بیان کی گئی ہے اسے نگاہ میں رکھیں تو اس آیت کا مقصد واضح ہو جاتا ہے اس میں حضرت عیسیٰ کی پیدائش اور مسلمانوں کے عقائد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب خود عیسائی قبول کرتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ حکمِ مادر میں پروان چڑھے اور انہوں نے خود اپنے تئیں پیدا نہیں کیا لہذا وہ کسی پیدا کرنے والے کی مخلوق ہیں کہ جس نے عالمِ رحم میں اس طرح سے ان کی ہمت و صورت بنائی ہے۔ اس لیے کیسے ممکن ہے کہ حضرت مسیحؑ خدا ہوں۔

”لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ“

اس جملے میں تاکید کی گئی ہے کہ حقیقی معبود صرف خدا ہے قادر و علیم ہے جو نہ صرف رحمِ مادر میں پانی کے قطرے پر خوبصورت اور نئی نئی شکلیں بناتا ہے بلکہ اس کی قدرت و حکمت پوری کائنات پر محیط ہے اس لیے حضرت مسیحؑ جیسی مخلوق کو کس طرح معبود قرار دیا جاسکتا ہے وہ مخلوق کہ جو اپنے سارے وجود اور ہستی میں اور تمام مراحل میں اس کی قدرت و حکمت کی محتاج ہے۔

۷۔ هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ۗ



وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آلِهِمْ وَنُسُلِهِمْ غَافِلُونَ ۝
عِنْدَ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ۝

ترجمہ

۷۔ وہ ذات وہ ہے کہ جس نے تم پر کتاب نازل کی جس کی بعض آیات محکم (صریح اور واضح) ہیں جو اس کتاب کی بنیاد ہیں (اور جو پیچیدگی دیگر آیات میں نظر آئے وہ ان کی طرف رجوع کرنے سے برطرف ہو جاتی ہے) اور کچھ آیات متشابہ ہیں (یہ وہ آیات ہیں جن میں بلند سطح کے مطالب بیان کئے گئے ہیں اور کچھ دیگر پہلو بھی ہیں جن کے باعث پہلی نظر میں ان میں مختلف احتمالی معانی دکھائی دیتے ہیں لیکن محکم آیات کی تفسیر کی طرف توجہ کرنے سے یہ آیات بھی اہل نظر پر واضح ہو جاتی ہیں) لیکن جن کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں تاکہ فتنہ انگیزی کرتے رہیں (اور لوگوں کو گمراہ کریں) اور اس کی (غلط) تفسیر کرنا چاہتے ہیں حالانکہ ان کی تفسیر اللہ اور علم میں راسخ لوگوں کے علاوہ کوئی نہیں جانتا اور یہ (راسخون فی العلم) وہی ہیں جو (فہم وادراک رکھتے ہیں) تمام آیات قرآنی کے اسرار و رموز سے آگاہ ہیں اور الہی علم و دانش کے سبب کہتے ہیں کہ ہم ان سب پر ایمان رکھتے ہیں، سب کچھ ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے اور دانشمند لوگوں کے سوا کوئی تذکر نہیں کرتا (اور ان کے علاوہ کوئی ادراک حقیقت نہیں کر سکتا)

شان نزول

تفسیر نور الثقلینؑ میں معانی الاخبار کے حوالے سے امام باقر علیہ السلام سے ایک حدیث منقول ہے کہ

یہودیوں کے چند افراد حمی بن اخطب اور اس کے بھائی کے ہمراہ پیغمبر اسلامؐ

کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حروف مقطعات میں م کی بنیاد پر کہنے لگے کہ

ابجد کے حساب سے الف سادس ہے ایک کے نام برابر ہے ۲۰ کے



● "لیر ککشل شو"۔

● "اللہ عالق ککل شو"۔

● "للتکر مثل حظ الاثنتین"۔

اور ایسی ہی دیگر ہزاروں آیات ہیں جو عقائد، احکام، مواظظ اور تاریخ کے بارے میں ہیں اور سب کی سب "محکمات" ہیں۔

یہ "محکمات" قرآن میں "الم الکشف" کے نام سے موسوم ہیں یعنی یہی وہ آیات ہیں جنہیں اصل مرجع، مفسر اور دیگر آیات کی وضاحت کرنے والی کہا جاسکتا ہے۔

لفظ "متشابهہ" سے دراصل ایسی چیز مراد ہے جس کے مختلف حصے ایک دوسرے سے شبہت رکھتے ہوں۔ اسی لیے وہ جتنے اور کلمات جس کے معانی پیچیدہ ہوں اور بعض اوقات ان کے بارے میں مختلف احتمالات پیدا ہو جائیں "متشابهہ" کہلاتے ہیں۔ مثلاً شبہات قرآن سے ایسی ہی آیات مراد ہیں۔ یعنی وہ آیات جن کے معانی پہلی نظر سے پیچیدہ ہیں اور ابتداء میں ان میں کئی احتمالات دکھائی دیتے ہیں۔ اگرچہ آیات حکمت کی طرف توجہ کرنے سے ان کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

مفسرین نے "محکمات" اور متشابهہ کے بارے میں اگرچہ بہت سے احتمالات پیش کیے ہیں لیکن ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ ان دونوں الفاظ کے اصل معانی سے بھی مطابقت رکھتا ہے اور شان نزول اور اس آیت کے ذیل میں وارو ہونے والی روایات جن میں ان کی تفسیر بیان کی گئی ہے کے بھی مطابق ہے۔ نیز خود عمل بحث آیت سے بھی مطابقت رکھتا ہے۔ کیونکہ مذکورہ آیت میں ہے کہ خود غرض لوگ متشابهہ آیات کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں واضح ہے کہ ایسے لوگ اپنی آیات سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں جن کی پہلی نظر میں متعدد تفاسیر ہو سکتی ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ متشابهہ کا وہی مفہوم ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔

متشابهہ آیات کے لیے ہم ان آیات کے نمونے پیش کرتے ہیں جو صفات خدا اور مساوہ قیامت کی کیفیت سے مرکب ہیں مثلاً:

● "ید اللہ فوق ایدہم"۔

خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے۔

یہ قدرت خدا کے بارے میں ہے۔

● "واللہ مسصیع علیم"۔

خدا سنے والا اور جاننے والا ہے۔

یہ علم الہی کی طرف اشارہ ہے۔

● "ونضع السوازن القسط لیوم القیامة" (الانبیاء: ۴۷)



قیامت کے دن ہم عزالت کے ترازو مقرر کریں گے،

یہ اعلان کے ناپ تول کے ذریعے کے متعلق ہے۔

واضح ہے کہ خدا کا تو کسی خاص عضو کے مفہوم میں نہیں ہے۔ یونہی اس کا سنا بھی کسی کلن کے ویسے سے نہیں ہے اور نہ ہی اعمال کو تو بننے کے لیے اس کے پاس کوئی ایسا ترازو ہے جس کے ہم عادی ہیں بلکہ یہ سب قدرت و علم اور اعمال کی قدرت و قیمت کے مفہیم کی طرف اشارہ ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ محکم اور متشابہ قرآن میں ایک اور مفہوم کے لیے بھی استعمال ہوئے ہیں۔ سورہ جود کے شروع میں ہے:

”کُتِبَ الْحِكْمُتُ اٰیٰتِہٖ“

اس آیت میں تمام آیات قرآن کو محکم کہا گیا ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ آیات قرآن ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور باہم پیوستہ ہیں۔

سورہ الزمر آیہ ۲۳ میں ہے:

”کُتِبْنَا مُتَشٰبِہًا“

یعنی — وہ کتاب کہ جس کی تمام آیات متشابہ ہیں

یہاں متشابہ سے مراد یہ ہے کہ اس کتاب کی آیات درستی اور حقیقت کے لحاظ سے ایک دوسرے کی مانند ہیں۔

محکم اور متشابہ کے بارے میں جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی جو بات حقیقت کے لیے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں کہ وہ اپنے پروردگار کے ارشادات کو سمجھنے کے لیے تمام آیات کو ایک جگہ پر رکھے اور اگر کچھ آیات کے ظواہر میں پہلی نظر میں کوئی ابہام یا پیچیدگی دکھائی دے تو دوسری آیات کو سامنے رکھتے ہوئے اسے دور کرے اور اس طرح ان آیات کی حقیقت تک پہنچے۔ آیات محکمات درحقیقت بڑی شاہد ہوں کی مثل ہیں اور متشابہات ذیلی اور چھوٹے راستوں کی مانند ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر انسان کبھی چھوٹے اور ذیلی راستوں کے بارے میں حیران و سرگرداں ہو تو وہ کوشش کرتا ہے کہ وہ پہلے شاہدہ تک پہنچ جائے اور وہاں سے اپنے راستے کا پھر سے صحیح طریقے سے تعین کرے۔ محکمات کو ام الکتاب قرار دینا بھی اس حقیقت کی تائید کرتا ہے کیونکہ لفظ ”ام“ لغت میں برجستگی اصل اور اساس کے معنی میں ہے حال کو ام کہنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ خاندان کی جڑ ہوتی ہے اور حوادث و مشکلات میں وہی اولاد کی پناہ گاہ بھی ہوتی ہے۔ اس لیے محکمات دیگر آیات کے لیے اساس، جڑ اور مال کی حیثیت رکھتی ہیں۔

۲۔ قرآن کی کچھ آیات متشابہ کیوں ہیں

اس کے باوجود کہ قرآن نور، روشنی اور حق ہے، ایک واضح کلام ہے اور تمام لوگوں کی ہدایت کے لیے آیا ہے



اس میں متشابہ آیات کیوں ہیں اور بعض آیات کے مغایر ایسے وچیدہ کیوں ہیں کہ فتنہ انگیز لوگوں کے لیے غلط مقاصد کے حصول کا سبب بنتے ہیں۔

یہ موضوع بہت اہمیت کا حامل ہے اور گہرے غور و فکر کا مقتضی ہے۔ جو سکتا ہے مجبوری طور پر مندرجہ ذیل درجہ قرآن میں آیات متشابہات کا سبب اور راز ہوں۔

۱۔ انسانوں کی گفتگو میں استعمال ہونے والے الفاظ اور جیسے روزِ مرد کی ضروریات کے ماتحت ہوتے ہیں اس لیے جب ہم انسان کی محدود مادی زندگی کے دائرے سے باہر نکلیں اور مثلاً خالق کائنات کے بارے میں گفتگو کریں جو ہر جہت سے لامحدود ہے تو ہمیں نظر آئے گا کہ ہمارے الفاظ ابنِ معانی کے لیے سلیپے اور قالبِ کلام نہیں دیتے تاہم ہم وہی الفاظ استعمال کرنے پر مجبور ہیں مگر یہ الفاظ مختلف پہلوؤں سے ناقابل اور نارسا ہیں۔ الفاظ کی یہی نارسانی متشابہات قرآن کے اہم حصے کا سرچشمہ ہے۔ یہ آیات اسی مفہوم کے اور اک کے لیے ضرور ہیں

”یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا عَلٰی صٰلِحِیْمٍ“

”الْمُزَحِّضِ عَلٰی الصِّرَاطِ الْمُسْتَقِیْمِ“

”الْحَبِیْبِ الْمُنِیْمِ“

ان آیات کی تفسیر اپنے مقام پر آنے کی۔ سبب و بعیر جیسی تعبیرات بھی اسی قبیل سے ہیں۔ ان کی تفسیر آیاتِ محکمات کی طرف رجوع کرنے سے اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔

۲۔ بہت سے حقائق دوسرے جہاں یا عالمِ مادر سے جیسے سے مراد ہیں۔ یہ حقائق ہماری فکر و نظر کے افق سے دور ہیں۔ زمین و مکان کی قید میں محدود ہونے کی وجہ سے ہم ان کی گہرائی کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہمارے افکار کی نارسانی اور ان معانی کے افق کی جندی بعض آیات کے متشابہ ہونے کا دوسرا سبب ہے۔ اس کی مثال بعض وہ آیات ہیں جن کا تعلق قیامت وغیرہ سے ہے۔

یہ یا علی اس طرح ہے جیسے کوئی شخص کسی بچے کو عالمِ جنین میں اس دنیا سے ملاتے بنا چاہے۔ اگر بات نہ کر سکے تو بڑی کوتاہی ہے اور اگر کچھ کہے تو مجبوراً مطالب کو سرسبز اور اجمالی صورت میں ادا کرے گا۔ کیونکہ سننے والا اس حالت میں زیادہ استعداد نہیں رکھتا۔

۳۔ قرآن میں متشابہات کا ایک مقصد یہ ہے کہ لوگوں کی فکر و نظر کو زیادہ سے زیادہ کام میں لایا جاسکے اور فکری تحریک پیدا ہو۔ ہمیشہ پیچیدہ فکری مسائل مفکرین کے افکار کی تقویت کے لیے پیش کیے جاتے ہیں تاکہ وہ مسائل کے حل کے لیے زیادہ سے زیادہ فکر و تدبیر اور تحقیق و جستجو سے کام لے سکیں۔

۴۔ ایک اور نکتہ جو قرآن میں متشابہات کی موجودگی کے لیے ہے اور اہل بیت علیہم السلام کی روایات بھی جس کی تائید کرتی ہیں یہ ہے کہ قرآن میں ایسی آیات خفائی پیشواؤں، پیغمبر اکرمؐ اور ان کے اوصیاء کی شدید احتیاج کو واضح کرتی ہیں اور یہ اس طرح کہ احتیاج عملی لوگوں کو مجبور کرے کہ وہ ان کی جستجو اور تلاش کریں اور عملی طور پر ان کی پیروی تسلیم کریں۔ اس



طرح دیگر علوم اور دیگر مشکلات میں بھی اپنی سے راہنمائی حاصل کریں۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے درسی کتب میں کچھ مسائل کی تشریح معلم اور استاد کے ذمے کی جاتی ہے تاکہ طالب علم استاد سے اپنا رابطہ منقطع نہ کرے اور یوں اس ضرورت کے ماتحت تمام چیزوں میں اس کے افکار سے راہنمائی حاصل کرے۔ درحقیقت ایسی روایات قرآن کے بارے میں پیغمبر اسلامؐ کی مشہور وصیت کا مصداق ہیں :

”اَف تَارِكُ فِیْكُمْ الثَّقَلِیْنِ کِتَابُ اللّٰہِ وَ اَہْلُ بَیْتِیْ وَ اَنْتُمْ مَالِیْنَ
یَعْتَرِقُ حَقِّیْ یُورِثُ عَلٰی الْحَوَاضِ“

• یعنی میں نے تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑ دی ہیں : خدا کی کتاب اور اپنے اہل بیت اور یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ قیامت کے دن کوڑے کے مارے ہو تک پہنچیں گے۔

۲۔ تاویل کے کہتے ہیں

”تاویل“ کے معنی کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے لیکن حقیقت کے نزدیک یہ ہے کہ ”تاویل“ کا اصل معنی معنی ہے ”کسی چیز کو پشیمان“ اس لیے ہر کام یا بات کو اس کے آخری مقصد اور ہدف تک پہنچانے کو ”تاویل“ کہتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص کچھ اقدام کرتا ہے جس کا اصل ہدف واضح نہیں ہے لیکن آخر میں اسے معین کر دے تو اس چیز کو ”تاویل“ کہیں گے جیسے حضرت موسیٰ اور ایک عالم کے واقعے میں ہے کہ عالم نے سفر کے دوران میں ایسے کام انجام دیے جن کا مقصد واضح نہیں تھا مثلاً کشتی میں سوار کیا، اس پر حضرت موسیٰ پریشان ہوئے لیکن جب اس عالم نے اختتام سفر پر اپنا مقصد بیان کیا اور کہا میرا مقصد تو کشتی کو غاصب و ظالم بادشاہ سے نجات دلانا تھا اور مزید کہا۔

”ذَلَلْتُ تَاوِیْلَ مَا لَمْ قَطَعَ عَلَیْہِ صَبْرًا“

یہی وہ مقصد تھا جس پر تم صبر نہ کر سکے : الکافی ص ۱۰۰

یونہی اگر کوئی شخص کوئی خواب دیکھے جس کا نتیجہ واضح نہ ہو۔ پھر کسی سے پوچھنے پر یا کوئی منظر دیکھنے سے اسے اس خواب کی تفسیر معلوم ہو جائے تو اسے تاویل کہا جائے گا۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام نے جو مشہور خواب دیکھا جب وہ خارجی دنیا میں عمل میں آیا اور اصطلاح کے مطابق استبداد کی طرف پلٹ آیا تو آپؑ نے فرمایا۔

”هٰذَا مَا وِیْلٌ دَوَّیْبِیْ مِنْ قَبْلِ“

یہ اس خواب کی ابتدا اور نتیجہ ہے جو میں نے دیکھا تھا : یوسف ص ۱۰۱

اس طرح جب کوئی انسان ایسی بات کہے کہ جس میں مخصوص مقابیم و اسرار مخفی ہوں تو اس کے حقیقی مقامد کو تاویل کہیں گے۔

محل بحث آیت میں بھی ”تاویل“ سے یہی مراد ہے یعنی قرآن میں کچھ ایسی آیات ہیں جن کے معانی و اسرار

گہر سے ہیں البتہ خوف انکار اور غاصد اغراض رکھنے والے لوگ اس کی غلط تفسیر اور معنی گھڑتے ہیں اور اپنے آپ کو یا دوسروں کو غافل رکھنے کے لیے اس سے کام لیتے ہیں۔

اس بناء پر "ابتغاء تاویده" سے مراد یہ ہے کہ وہ آیت کی "تاوید" اس کی اصل صورت کے علاوہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں ابتغاء تاویده علی خلاف الحق؛

جیسا کہ ہم آیت کی شان نزول میں پڑھ چکے ہیں کہ کچھ یہودیوں نے قرآن کے حروف مقطعات سے خط فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کا معنی یہ کر دیا کہ دین اسلام کی مدت کم ہے۔

اس طرح عیسائیوں نے "زفوح قینہ" سے حدیث عیسیٰ کی الوہیت پر استدلال شروع کر دیا۔

یہ تمام چیزیں "تاوید بغیر حق" اور آیت کو غیر واقعی اور غلط ہدف و مقصد کی طرف پھیرنے کے مفہوم میں داخل ہیں۔

۴۔ "راسخون فی العلم" کون ہیں

یہ تفسیر قرآن مجید میں دو مقامات پر استعمال ہوئی ہے۔ ایک تو اسی مقام پر اور دوسرا سورہ نساء آیہ ۱۶۲ میں جہاں فرمایا گیا ہے۔

"لكن الراسخون في العلم منهم والمؤمنون"

يؤمنون بما انزل، ليلت دعاء منزل من قبلات

"ہم میں داخل ہیں ان میں سے اور اہل ایمان بھی، اس پر ایمان رکھتے ہیں جو کہ تم پر نازل ہوا اور جہاں تم سے پہلے نازل ہوا ہے۔"

اس لفظ کے لغوی معنی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو علم و دانش میں ثابت قدم اور صاحب نظر ہیں۔

البتہ اس لفظ کا ایک وسیع مفہوم ہے جس میں تمام علماء اور مفکرین شامل ہیں تاہم ان میں کچھ ایسے ممتاز افراد ہیں جن میں ایک مخصوص درخشندگی اور روشنی ہوتی ہے جو طبعاً اس لفظ کے درجہ اول کے معادینق قرار پاتے ہیں اور جب کسی یہ لفظ ادا ہو۔ سب سے پہلے نگاہیں انہی کی طرف اٹھتی ہیں۔

یہ جو کئی ایک روایات میں "راسخون فی العلم" سے غیر اسلام اور آئمہ بدیہیم لفظ راویسے گئے ہیں تو اس کی یہی وجہ ہے۔

ہم کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ قرآن کی آیات اور الفاظ وسیع مفہیم رکھتے ہیں۔ بہر حال اس کے معادینق میں سب سے پہلے اس مفہوم کے

غیر معمول اور فوق العادہ ثابت رکھنے والے مفہوم ہی آتے ہیں یہاں تک کہ بعض روایات اس کی تفسیر میں فقہاء بھی کا نام آتا ہے۔ اصول کافی میں امام باقرؑ یا امام صادقؑ سے روایت ہے۔ فرمایا:

رسول خدا راسخون فی العلم میں سب سے بندہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی آپؐ پر نازل فرمایا آپ اس کی

تاویل و تنزیل سے واقف تھے۔ خدا نے آپؐ پر کوئی ایسی چیز نازل نہیں کی جس کی تاویل آپؐ کو نہ سکھائی ہو اور آپ کے

اوصیا بھی قرآن کی سب تاویل و تنزیل کو جانتے ہیں اس سلسلے میں بہت سی روایات ہیں اصول کافی اور دیگر کتب احادیث میں موجود ہیں جنہیں



نورِ فاشلین اور البرسان کے مومنین نے اس آیت کے ذیل میں جمع کیا ہے اور جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ راسخون فی العلم سے جہاں جہاں بتبرائے اللہ اور ائمہ بدعتی مراد لیے گئے ہیں وہاں اس کے وسیع مفہوم کی نفی نہیں ہو جاتی۔ اسی لیے ابن عباس سے منقول ہے وہ کہتے ہیں:

میں بھی راسخون فی العلم میں سے ہوں۔

ابن جریر شمس قرانی اسرار و تاویل سے اپنے علم کے مطابق ہی لکھا ہوگا اور جن کے علم کا سرچشمہ پروردگار کا علم ہے کنار ہے یقیناً وہ تمام اسرارِ قرآن اور تمام تر تاویلاتِ قرآن سے آشنا ہیں جب کہ ان کے علاوہ دوسرے لوگ تو کچھ اسرار سے واقف ہیں یہاں مفسرین الدلائل ایک اہم بحث کرتے ہیں وہ یہ کہ کیا ”راسخون فی العلم“ ایک مستقل جملے کی ابتداء ہے یا عطف سے ”الان الله“ سے منسلک ہے۔

دوسرے لفظوں میں: کیا آیت کا معنی یہ ہے کہ:

قرآن کی تاویل خدا اور راسخون فی العلم کے علاوہ کوئی نہیں جانتا....

یا اس کا مفہوم یہ ہے کہ

قرآن کی تاویل صرف اللہ ہی جانتا ہے، باقی رہے راسخون فی العلم تو وہ کہتے ہیں اگرچہ آیات متشابہ کی تاویل میں معصوم نہیں تاہم ہم ان کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں اور وہ سب جاد سے پروردگار کی طرف سے ہیں۔

ان دونوں نظریات کے طائداروں نے اپنے اپنے موقف کی تائید کے لیے شواہد پیش کئے ہیں لیکن جو چیز آیت میں موجود قرآن اور مشہور روایات سے ہم آہنگ ہے یہ ہے کہ ”نستراسخون فی العلم“ کا عطف ”ان الله“ پر ہے اور یہ آپس میں منسلک ایک ہی جملہ ہے کیونکہ:

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ بہت بعید ہے کہ قرآن میں کچھ ایسی آیات بھی ہوں کہ جن کے اسرار خدا تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہ جانتا ہو۔ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا یہ آیات لوگوں کی قربیت اور ہدایت کے لیے نازل نہیں ہوئیں، اگر اسی لیے نازل ہوئی ہیں تو پھر کیسے ممکن ہے کہ خود پیغمبر اکرم کہ جن پر قرآن نازل ہوا ہے وہ ان کے معانی اور تاویل سے بے خبر ہوں کیونکہ یہ تو بالکل اسی طرح ہوگا کہ ایک شخص کوئی ایسی کتاب کہے کہ جس کے بعض جملوں کا مفہوم خود اس کے علاوہ کوئی نہ سمجھ سکے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مرحوم طبرسی مجمع البیان میں کہتے ہیں:

کبھی نہیں دیکھا کہ مفسرین اور علماء اسہم کسی آیت کی تفسیر پر بحث کرنے میں احتراز کریں

۱۔ یہ کہیں کہ یہ آیت ان آیات میں سے ہے کہ جس کے حقیقی معنی خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا

بلکہ ہر ایک قرآن کے سرور و معانی معصوم کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر مقصد یہ ہے کہ راسخون فی العلم جس چیز کو نہیں جانتے اس کے سامنے سر تسلیم خم

کرتے ہیں تو پھر زیادہ مناسب یہ تھا کہ کہا جاتا کہ ایسا کہ میں راسخ وہ لوگ ہیں، کیونکہ علم میں راسخ جو تاویل قرآن سے آگاہی سے مناسب رکھتا ہے نہ کہ عدم آگاہی اور سر تسلیم خم سے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ بہت سی روایات جو اس آیت کی تفسیر میں منقول ہیں سب کی سب تائید کرتی ہیں کہ راسخون فی العلم وہ لوگ ہیں جو آیات قرآنی کی تاویل کو جانتے ہیں۔

ان دلائل کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ عطف لفظ "اللہ" پر ہے اور راسخون فی العلم نئے جملے کا آغاز نہیں ہے۔

توجیز باقی رہ جاتی ہے وہ پنج ہلوانہ کے خطبہ "اشباح" کا ایک جملہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ راسخون فی العلم آیات کی تاویل سے ناواقف ہیں اور وہ اپنے مجزواتواری کا اعتراف کرتے ہیں:

"واعلم ان الراسخين في العلم هم الذين اغناهم عن اقتحام السدد المضروبة دون الغيوب لاقتدار بجملة ما جهلوا تفسيره من الضيق المحجوب؟

اور جن لوگ راسخین فی العلم وہ ہیں جو اسرار ضیق کے مقابلے میں احزاب جزا کرتے ہیں اور وہ ان اسرار کی تفسیر سے عاجز ہیں، اس پر نے انہیں اس سے کہ وہ مشرک و کاشف سے بے نیاز کر دیا ہے۔ سنہ

یہ جملہ بعض ان روایات سے متفق معلوم نہیں ہوتا جو خود حضرت امیر المومنین سے ہی منقول ہیں اور جن میں آپ نے راسخون فی العلم کا عطف "اللہ" پر قرار دیا ہے اور انہیں قرآنی تاویل سے آگاہ بتایا ہے اور پھر مندرجہ بالا دلائل پر بھی یہ منطبق نہیں بلکہ ابنا ضروری ہے کہ خطبہ اشباح کے اس جملے کی ایسی توجہ کی جائے جو ہر است پاس موجود دیگر مدارک سے اختلاف نہ رکھتی ہو۔

آیت کی تفسیر کے سلسلے میں نتیجہ کلام

زیر بحث آیت کی تفسیر کے ضمن میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی آیات دو قسم کی ہیں:

۱۔ ایک وہ کہ جن کا مفہوم اس طرح واضح اور روشن ہے کہ ان سے کسی قسم کے انکار، ان کی توجہ اور ان سے غلط فائدہ اٹھانے کی باکل گنجائش نہیں ہے۔ انہیں محکمات کہتے ہیں۔

دوسری قسم کی آیات وہ ہیں جن کے مطالب کی سطح بلند ہے یا ان میں ایسے عوامل کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے

۱۔ پنج ہلوانہ

۲۔ تفسیر المفسرین ۵۔ ۱۔ حاشیہ کی طرف رجوع فرمائی۔ ۲۔ جملہ پنج ہلوانہ کا یہ جو درجہ راسخون فی العلم کے علم کی عظمت پر روشنی کرتا ہے کہ وہ اپنے علم کی بدولت اللہ تعالیٰ کے دستِ علم کو اپنے ذہن میں اور ان کے سامنے اپنے گزرا جاتا کہتے ہیں۔ ۳۔ یہ ہے کہ یہ جو قرآن مجید کا مفسر فی العلم کے تاج قرآن سے ناواقف ہونے کے کسی مفہوم کو تائید میں لانا شروع



کہ جو ہماری دسترس سے باہر ہیں مثلاً عالم غیب، جہان حشر و نشر اور صفات خدا وغیرہ۔ ان آیات کا حقیقی معنی اسرار اور ان کی کذب و حقیقت کا ادراک مخصوص علی ربانیت کے تحت آتا ہے۔ انہیں متشابہات کہتے ہیں۔

منوف اور کچھ روایات و عموماً کوشش کرتے ہیں کہ آیات متشابہات سے غلط مقصد حاصل کریں ان کی خلاف تہی تفسیر میں مال لولوں میں فتنہ اچھڑی کریں اور انہیں راہ حق سے گمراہ کریں۔ لیکن اللہ تعالیٰ اور راستہ میں فی العلم ان آیات کے اسرار کو جانتے ہیں اور لوگوں کے سامنے ان کی تشریح کرتے ہیں۔ وہ اپنے وسیع علم کی روشنی میں آیات متشابہات کا آیات نکات کی طرف ادراک کرتے ہیں اور اس بلکہ سب کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تمام آیات ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں کیونکہ سب آیات چاہے حکم ہوں یا متشابہ ان کے علم و دانش کے سامنے واضح اور روشن ہیں۔

”یَقُولُونَ امْتَابِهِ حَكْلٌ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا“

علم میں راسخ ہونا سبب بنتا ہے کہ انسان اسرارِ قرآن سے زیادہ سے زیادہ آگاہ ہوتا ہے البتہ جو علم و دانش کے لحاظ سے پہلے درجے پر فائز ہیں یعنی پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ جعفری علیہم السلام تو وہ تمام اسرار سے آگاہ ہیں جبکہ باقی لوگ اپنے علم و فہم کی مقدار کے برابر ان میں سے کچھ چیزیں جانتے ہیں یہی وجہ ہے کہ علماء بھی خدا کے بھیجے ہوئے معلمین سے اسرارِ سرآں حاصل کرنے کے درپے رہتے ہیں۔

”وَمَا يَذْكُرُ إِلَّا أُولَٰئِكَ“

یہ جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ ان حقائق کو صرف صاحبان عقل و خرد اور اہل فکر و نظر ہی جانتے ہیں۔ یہی لوگ سمجھتے ہیں کہ قرآن میں محکم و متشابہ آیات کیوں موجود ہیں اور یہی لوگ سمجھتے ہیں کہ آیات متشابہ کو محکم آیات کے سامنے رکھ کر معانی معلوم کئے جاتے ہیں۔ اسی لیے امام علی بن موسیٰ علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے فرمایا:

”مَنْ رَدَّ مِثَابَهُ الْعِتْرَةِ إِلَىٰ مَحْكَمَةِ هَدًى إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ“

جو شخص آیات متشابہ کو آیات محکم کی طرف پٹا ہے اُس نے سید سے راستے کی طرف ہدایت حاصل کی ہے۔

۸۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ

رَحْمَةً ۖ إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ ۝

۹۔ رَبَّنَا إِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ

لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ۝



ترجمہ

۸۔ (راستخیز فی العلم کہتے ہیں) اپنے واسطے ہمارے دلوں کو سیدھے رہنے کی ہدایت کے بعد منوف نہ کر دے اور اپنی طرف سے ہم پر رحمت فرما کیونکہ تو ہی بخشنے والا ہے۔

۹۔ اے ہمارے پروردگار! تو لوگوں کو اس دن جمع کرے گا جس میں کوئی شک و تردد نہیں ہے کیونکہ اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا، ہم تجھ پر تیری رحمت بے پایاں پر اور خشن و نشر اور قیامت کے وعدے پر ایمان رکھتے ہیں۔

تفسیر

ممکن ہے کہ آیات متشابہ اور ان کے حقیقی اسرار و رموز لوگوں کے لیے مقام لغزش جو جہاں ہذا اہل ایمان، راستخیز فی العلم اور صاحبان فکر و نظر آیات کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے اپنے علمی سر راستے سے کام لینے کے علاوہ اپنے خدا کی پناہ اور سہارا بھی حاصل کرتے ہیں اور یہ دونوں آیات جو راستخیز فی العلم کی زبان سے نقل ہوئی ہیں اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ علم میں راسخ، آگاہ اور فکر و نظر کے حامل لوگ ہمیشہ اپنے قلب و روح کی حفاظت کرتے رہتے ہیں تاکہ وہ ٹیڑھے راستوں کی طرف مائل نہ ہوں اور وہ اس راہ میں خدا سے مدد طلب کرتے ہیں کیونکہ بہت سے لوگ علمی غرور و تکبر کے باعث شکست سے ہلکنار ہو گئے ہیں اور کج راستوں میں سرگرداں ہیں کیونکہ وہ خالق کی عظمت، اپنی خلقت اور اپنی کم علمی کو فراموش کر بیٹھے ہیں اور اپنے پروردگار کی ہدایت سے محروم ہو گئے ہیں۔ لیکن اہل ایمان اور صاحبان فکر و نظر کہتے ہیں ”رہبنا لا تزعج قلوبنا.....“

علاوہ انہیں افکار و نظریات کو کنٹرول کرنے کے لیے معاد اور قیامت کے اعتقاد سے بڑھ کر کوئی چیز مؤثر نہیں۔ راستخیز فی العلم مبداء و معاد کے عقیدے کے ذریعے اپنے افکار کو اعتدال پر رکھتے ہیں۔ وہ عدسے گزرے ہوئے رجحانات اور جذبات سے اجتناب کرتے ہیں کیونکہ یہ لغزش کا سبب بنتے ہیں۔ اس طرح وہ ایکسٹرا اور بے مزاحم نظر و نظر کے ذریعے صحیح راستے کو دیکھتے ہیں اور اس پر چلتے ہیں۔

ہاں ایسے ہی افراد آیات الہی سے مکمل طور پر استفادہ کر سکتے ہیں۔

درحقیقت پہلی آیت مبداء کے بارے میں ان کے کامل ایمان کی طرف اشارہ ہے اور دوسری آیت معاد کے بارے میں ان کے راسخ عقیدے کا اظہار ہے۔



۱۰۔ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوا لَنْ تُفْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلاَ
اَوْلَادُهُمْ مِّنْ اِلٰهِ شَیْئًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ
المثابره ○

۱۱۔ كَذٰبِ اِلٍ فِرْعَوْنُ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ كَذَّبُوْا
بِآیٰتِنَا ۚ فَآخَذْنٰهُمْ اِلٰهُهُم بِذُنُوْبِهِمْ ۚ وَاِنَّهُمْ لَشٰدِیْدُ
الْعِقَابِ ○

ترجمہ

۱۰۔ جو لوگ کافر ہو گئے ہیں انہیں مال و دولت اور اولاد خدا سے بے نیاز نہیں کر
سکتے اور وہ انہیں اس کے عذاب سے نہیں چھڑا سکتے اور وہ (جہنم کی) آگ کا
ایندھن ہیں۔

۱۱۔ (انکارِ حقائق اور تحریف میں) ان کی عادت آل فرعون اور ان سے پہلے لوگوں کی طرح
ہے، انہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور خدا نے ان کے گناہوں کے باعث ان
کی گرفت کی اور خدا شدید العقاب ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں محکم اور متشابہ آیات کے ساتھ کفار، منافقین اور مومنین کے رویے کی تشریح کی گئی ہے۔
اس کے بعد اب فرمایا گیا ہے: اگر بٹ دھرم کافر یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا مال و دولت اور آل و اولاد دوسرے جہاں میں
انہیں بچا سکتے ہیں تو وہ سخت اشتباہ میں ہیں۔ ممکن ہے یہ اس جہاں میں وقتی طور پر کچھ حوادث کے مقابلے میں
انسان کے کام آجائیں لیکن پروردگار کے مقابلے میں اس دنیا میں اور دوسرے جہاں میں ان کی کوئی حیثیت نہیں
لہذا یہ چیزیں کسی غرور اور جبرأت گناہ کا باعث نہیں بننا چاہئیں۔ آیت کے آخر میں کہا گیا ہے وہ جلاؤاٹنے والی آگ



ترجمہ

۱۲ — جو کافر ہو گئے ہیں ان سے کہہ دیجئے، جنگ احد کی وقتی فتح پر خوش نہ ہو جاؤ، عتقرب تم مغلوب ہو جاؤ گے اور پھر آخرت میں جہنم کی طرف محشور ہو گے اور وہ کس قدر بُری جگہ ہے۔

شان نزول

جنگ بدر اور اس میں مسلمانوں کی کامیابی کے بعد بعض یہودی کہنے لگے جس رسول اُمتی کی تعریف و توصیف ہم نے اپنی مذہبی کتاب تورات میں پڑھی ہے کہ وہ کسی جنگ میں مغلوب نہیں ہوگا وہ یہی پیغمبر ہے۔ اس پر بعض دوسرے کہنے لگے جلدی نہ کرو، دوسری جنگ اور کوئی اور واقعہ پیش آئیے دو، پھر فیصلہ کرنا۔ جب جنگ احد میں مسلمانوں کو شکست ہوئی تو وہ کہنے لگے: بخدا یہ وہ پیغمبر نہیں جس کی بشارت ہماری کتاب میں دی گئی ہے۔

اس واقعے کے بعد صرف یہی نہیں کہ مسلمان نہ ہوئے بلکہ ان کے رویے میں مزید سختی آگئی اور وہ مسلمانوں سے اور دور ہو گئے یہاں تک کہ انہوں نے رسول خدا سے جو لڑائی جھگڑا نہ کرنے کا معاہدہ کر رکھا تھا اُسے بھی معینہ دت سے پہلے توڑ دیا۔ کعب بن اشرف کی ہمارے ہی میں ان کے ساتھ سوار مکہ پہنچے اور اسلام کے خلاف جنگ کیے مشرکین سے معاہدہ کر کے مدینہ واپس آ گئے۔

اس دوران میں مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں انہیں دندان شکن جواب دیا گیا اور کہا گیا کہ نتیجہ تم کام کے انجام پر اخذ کرنا اور یہ جان لو کہ تم سب مغلوب ہو جاؤ گے۔

تفسیر

ایک صریح پیش گوئی

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مراحت سے بشارت دی ہے کہ وہ تمام دشمنوں پر فتح یاب ہوں گے نیز کفار سے کہا گیا ہے کہ تم اس دنیا میں بھی شکست کھاؤ گے اور مغلوب ہو گے اور دوسرے جہاں میں بھی تمہارا انجام بہت بُرا ہوگا۔

آیت کی شان نزول کو دیکھیں تو یہ آیت جنگ احد کے بعد نازل ہوئی ہے۔ جب مسلمان ظاہری طور پر



اپنی طاقت اور اثر کو چھپاتے تھے جب کہ دشمنان اسلام پیسے باجی اتھاوا اور سپاہیوں کی وجہ سے دیدنی قدرت و طاقت حاصل کر چکے تھے ایسے میں مستقبل قریب کے بارے میں "ستغلبون" تم غلبہ مند ہو جاؤ گے، کہہ کر ایک مریخ پیشین گوئی کی گئی ہے۔ اس لیے اس آیت کو اہل قرآن و ان آیات میں شمار کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس میں آئندہ امر کے بارے میں ایک واضح خبر دی گئی ہے اور وہ ان حالات میں جب کہ کافروں اور یہودیوں پر مسلمانوں کی کامیابی بالکل واضح نہ تھی۔

زیادہ وقت نہیں گزر سکا کہ آیت کی صداقت ثابت ہوئی، مدینہ کے یہودی بنی قریظہ اور بنی نضیر تباہ و برباد ہو گئے اور جنگ خیبر میں ان کی طاقت کا اہم ترین مرکز ختم ہو گیا۔ اور مشرکین مکہ بھی فتح مکہ کے بعد ہمیشہ کے لیے مغلوب ہو گئے۔

۱۲۔ فَذَكَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَأُخْرَى كَافِرَةٌ يَرَوْنَهُم مِّثْلَهُمْ رَأَى الْعَيْنِ ۚ وَاللَّهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهِ مَن يَشَاءُ ۚ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ ۝

ترجمہ

۱۲۔ جب دو گروہ (جنگ بدر میں) آمنے سامنے آئے تو اس میں تمہارے لیے نشانی اور درس عبرت تھا۔ ایک گروہ ایمان میں جنگ کر رہا تھا اور دوسرا کافروں کا گروہ تھا جو شیطان اور بتوں کی راہ میں مشغول جنگ تھے، ان (کافروں) کو (مومنین) اپنی تعداد سے دو گنا نظر آ رہے تھے (اور یہ بھی ان کی وحشت و شکست کا ایک عامل بن گیا) اور خدا جسے چاہتا ہے (اور اہل سمجھتا ہے) اپنی مدد سے اس کی تائید کرتا ہے اور اس میں صاحبانِ نظر کے لیے عبرت ہے۔

شان نزول

یہ آیت جنگ بدر کی صورت حال کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جیسا کہ مفسرین نے بیان کیا ہے کہ جنگ



میں مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ تھی۔ ان میں ستر مہاجر تھے اور دو سو پچیس انصار۔ مہاجرین کا پرچم حضرت علیؓ کے ہاتھ میں تھا اور انصار کے پرچم ہر ذرا سعد بن عبادہؓ تھے اس عظیم معرکے کے لیے ان کے پاس صرف ستر اونٹ، دو گھوڑے، چھ زبردیں اور آٹھ تلواریں تھیں۔ دوسری طرف دشمن کی فوج بہتر افراد سے متجاوز تھی۔ اس کے پاس کافی دوائی اسلحہ تھا اور ایک تو گھوڑے تھے۔ اس جنگ میں بائیس مسلمان شہید ہوئے۔ ان میں چوہ مہاجر اور آٹھ انصار تھے دشمن کے ستر افراد مارے گئے اور ستر ہی قیدی ہوئے۔ اس طرح مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور یوں مکمل کارروائی کے ساتھ وہ مدینہ کی طرف پلٹ آئے۔ زیر نظر آیت واقعہ بدر ہی کا ایک پہلو بیان کرتی ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں کفار کو تنبیہ کی گئی تھی کہ وہ مال و ثروت اور کثرتِ تعداد پر مغرور نہ ہوں۔ اس آیت میں اس سلسلے کا ایک زندہ شاہد بیان کیا گیا ہے اور انہیں دعوت دی گئی ہے کہ وہ جنگ بدر کے تاریخ ساز واقعے سے درسِ عبرت حاصل کریں۔

”قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ لِقَاتٍ.....“

وہ اس بات سے کیوں عبرت حاصل نہیں کرتے کہ جنگی ساز و سامان سے عاری ایک چھوٹا سا لشکر لیکن پختہ ایمان والوں پر مشتمل اپنے سے کئی گنا بڑے جنگی وسائل سے آراستہ لشکر پر فتیاب ہو گیا۔ اگر مال و دولت اور کثرتِ تعداد بغیر ایمان کے اثر انداز ہو سکتی تو جنگ بدر میں اپنا اثر دکھاتی جبکہ وہاں تو نتیجہ برعکس رہا۔

”مِير وَنَهْمٍ مِّثْلِهِمْ رَأَيْتَ نَعِينُ“

آیت کے اس حصے میں فرمایا گیا ہے: میدانِ جنگ میں کافروں کو زمین اپنی تعداد سے دو گنا دکھائی دیتے تھے یعنی اگر ان کی تعداد ۳۳ تھی تو وہ چھ سو سے زیادہ دکھائی دیتے تھے۔ سہ

یہ مسلمانوں کی کامیابی کے لیے خدائی اعزاز تھی کیونکہ خدا اپنے مہاجر اور مومن بندوں کی کئی طرح سے مدد کرتا ہے ایسا ظاہری پہلو ہے جسے بھی نظری اور طبیعی نظر آتا ہے کیونکہ جب جنگ شروع ہوئی تو مسلمانوں نے دشمنوں پر گمراہی مگر نہیں لگائیں اس لیے کہ وہ قوتِ ایمان اور تربیتِ اسلامی سے آراستہ تھے۔ دشمنوں نے یہ دیکھا تو وہ اتنے مرعوب اور حشت زدہ ہوئے کہ سمجھنے لگے کہ مسلمانوں کے ساتھ اتنی ہی طاقت اور آملی ہے اور پہلی قوت سے دو گنا طاقت سے وہ میدانِ جنگ پر تابع ہو گئے ہیں جب کہ دشمنانِ اسلام جنگ شروع ہونے سے پہلے اس نتیجے کا خیال تک بھی نہ کر سکتے تھے اور مسلمان ان کو اصل تعداد سے بھی کم لگتے تھے۔

سورہ انفال کی آیت ۲۴ میں بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوا ہے اور وہ آیت مندرجہ بالا تفسیر کی تائید کرتی ہے

سہ یہ تفسیر اس نظریے کی تائید ہے کہ بیرونِ کفار کے بارے میں ہے اور ہم کی ضمیر کا اشارہ مسلمانوں کی طرف ہے۔ یہی آیت کا واضح مفہوم ہونا ہے مگر بعض

ضمیر غیبی نے ضمیروں کے درجے کے بارے میں اور کثرت بھی بیان کی ہے۔



”وَ اذِیْرَیْکُمْ وَ هُمْ اِذِ التَّقِیْمِ فِیْ اَعِیْنِکُمْ قَلِیْلًا وَ یَعْتَلِکُمْ فِیْ اَعِیْنِهِمْ لِیَقْضِیَ اللّٰهُ اَمْرًا کَانَ مَفْعُوْلًا“

و وقت یاد کرو جب میدان جنگ میں اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کو تباہی تعداد کم کر کے دکھائی تاکہ وہ اس جنگ سے مدد نہ پھریں جس کا انہم ان کی شکست ہے اور انہیں بھی تباہی نظروں کو کر کے دکھایا تاکہ اس تاریخی اور فیصلہ کن جنگ میں شکست ان میں کھڑ نہ ہوں بلکہ شروع شروع ہی سے دگر گریں ہو گئیں اور مسلمان جتنے دشمن کو اس سے زیادہ نخواستہ گئے اور یہ بنی دشمنوں کی شکست کا ایک ماں تھا۔

بعد کی تاریخی جنگ کے بارے میں سورہ انفال کی آیہ ۱۳ سے لے کر ۲۵ تک کی تفسیر میں انشاء اللہ تفصیل سے بحث کریں گے۔

وَ اَللّٰهُ یُوْنِیْدُ بِنَصْرِہٖ مِنْ یَشَآءُ۔

اس جے میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ خدا جے چاہتا ہے غلبہ اور کامیابی عطا کرتا ہے البتہ جیسا کہ ہم متعدد مرتبہ کہ چکے ہیں کہ مشیت الہی بغیر کسی وجہ اور بنیاد کے عمل میں نہیں آتی بلکہ ہمیشہ اس کی کوئی حکمت و مصلحت ہوتی ہے اور یہ لوگوں کی اہلیت کی حدود میں محدود ہوتی ہے یعنی جو تائید کی لیاقت رکھتے ہیں انہی کی تائید کی جاتی ہے یہ بات قابل توجہ ہے کہ بعد کے تاریخی واقعے میں تائید الہی اور مسلمانوں کی کامیابی کے دو پہلو تھے۔ ایک یہ فوج لٹا سے کامیابی تھی اور دوسری منطق پہلو سے۔ فوجی کامیابی اس لٹا سے تھی کہ ایک چھوٹا سا لشکر جس کے پاس بلی ساز ہتھیار نہیں تھا ایسے لشکر پر غالب آگیا جو تعداد میں کئی گنا زیادہ تھا اور بے پناہ ساز و سامان سے لیس تھا اور منطق کامیابی اس حوالے سے تھی کہ خدا تعالیٰ نے جنگ جو سنہ سے پہلے ہی مصلحت سے مسلمانوں کو اس میں کامیابی کی شہرہ دست دی تھی۔

”اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَةً لِّاُولِیْ الْاَبْصَارِ“

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ چشم بصیرت رکھتے ہیں اور حقائق کو صحیح طور پر دیکھتے ہیں وہ اہل ایمان کی اس کامیابی کو اس حوالے سے دیکھتے اور پہچانتے ہیں کہ کامیابیوں اور کامیابیوں کا اصل سرمایہ ایمان اور صرف ایمان ہے اور پھر وہ اس سے درس عبرت حاصل کرتے ہیں۔

۱۴۔ زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِیْنَ
وَالْقَنَاطِیْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِیْضَةِ وَالْخِیْلِ
الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۚ ذٰلِکَ مَتَاعُ الْحَیْوَۃِ
الدُّنْیَا ۗ وَ اَللّٰهُ عِنْدَہٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۝



ترجمہ

۱۴۔ اُمادی چیزوں میں سے عورتیں، اولاد اور مال جو سونے چاندی کے ڈھیروں پر مشتمل ہو منتخب گھوڑے، جانور اور زراعت لوگوں کی نظر میں پسندیدہ بنا دیے گئے ہیں تاکہ اُن کے ذریعے اُن کی آزمائش اور تربیت ہو لیکن یہ چیزیں اگر انسان کے اصلی مقاصد کے لیے ذریعہ نہیں پھر بھی اپست اُمادی زندگی کا سرمایہ ہیں اور انجام نیک (اور عالی زندگی) خدا کے پاس ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں بتایا گیا ہے کہ انسان کا حقیقی سرمایہ ایمان ہے نہ کہ مال و دولت اور کثرت اولاد و افراد۔ اب یہ آیت اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے کہ بیوی بچے اور مال و ثروت اس جہان کی مادی زندگی کے لیے سرمایہ ہیں۔ یہ انسان کا اصلی مقصد اور جہت نہیں ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ ان وسائل کے بغیر روحانی و معنوی سعادت کی راہ بھی طے نہیں کی جاسکتی لیکن اس راہ میں ان سے کام لینا اور چیز ہے اور وسیلہ نہ سمجھتے ہوئے، ان سے وابستگی اور ان کی پرستش دوسری چیز ہے۔ اس آیت میں چند قابل توجہ نکات ہیں جن کا ہم ذیل میں ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ امور مادی کو کس نے زینت دی ہے

”زینت لفتاح حب الشهوات.....“ یہ جملہ فعل مجہول کی شکل میں ہے اس میں کہا گیا ہے، بیوی بچوں اور مال و دولت سے لگاؤ اور ان سے محبت کو لوگوں کی نگاہ میں پسندیدہ بنا دیا گیا ہے یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ پسندیدہ بنانے والا اور انہیں لوگوں کی نظروں میں زینت دینے والا کون ہے بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہ شیطان ہوا و ہوس ہے جو انہیں لوگوں کی نگاہوں میں پسندیدہ بناتی ہے وہ سورہ نمل کی آیت ۴۴ سے استدلال کرتے ہیں جس میں فرمایا گیا ہے:

سلا، شہوات، شہوت کی جمع ہے جس کا معنی ہے کسی چیز سے شدید لگاؤ اور تعلق رکھنا۔ لیکن شہوت

بالآیت میں، شہوات، مشتقات کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور شہوات، ان چیزوں کو کہتے

ہیں جن سے تعلق اور لگاؤ ہو۔



”وَزَيْنٌ نُّهَمُ الشَّيْطَانِ اَعْمَالِهِمْ“

اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کی ننگاہ میں زینت دی ہے۔

ایسی اور بھی آیات موجود ہیں۔

لیکن یہ استدلال صحیح معلوم نہیں ہوتا کیونکہ محل بحث آیت میں اعمال کے بارے میں گفتگو نہیں ہے۔ بلکہ اس میں مال، عورتوں اور اولاد کے بارے میں گفتگو ہے۔

آیت کی صحیح تفسیر یہی معلوم ہوتی ہے کہ زینت دینے والا خدا ہی ہے اور یہ قوت اُس نے انسان کی فطرت و طبیعت میں ودیعت کی ہے۔ کیونکہ خدا ہی انسان میں اولاد اور مال و دولت کی محبت پیدا کرتا ہے تاکہ اُسے اُڑنے اُسے کمال و ارتقاء عطا کرے اور تربیت کے راستے میں آگے لے جائے۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے۔

”ثَا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِينَةً لِّهَا“

لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا“ :

ہم نے زمین کی تمام چیزوں کو ان کے لیے زینت بنایا ہے تاکہ انکی اخلاق

تربیت ہو سکے۔ یعنی اس محبت و دوستی سے صرف سعادت، اصلاح اور تعمیر

کے لیے فائدہ، نمایاں نہ یہ کہ فقر و فساد اور تباہی و بربادی کے لیے انہیں

کام میں لائیں۔ (کہف - ۷۰)

یہ امر قابل ذکر ہے کہ زیر نظر آیت میں پہلے ازدواج اور اولاد کا ذکر ہے۔ آج کے ماہرین نفسیات بھی کہتے ہیں کہ جنسی پہلو انسان کے قوی ترین غرائز اور اُردوئی تقاضوں میں سے ہے۔ انسان کی تاریخ اور دور حاضر بھی اس بات کی تائید کرتا ہے کہ بہت سے معاشرتی حواث کا سرچشمہ اسی انسانی خواہش سے اٹھنے والے طوفان تھے۔ اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ زیر بحث آیت اور ایسی دوسری آیات بڑی بچوں اور مل و دولت سے مقصد مل محبت اور لگاؤ کی مذمت نہیں کرتیں کیونکہ معنوی اور روحانی مقاصد و اہداف کی پیش رفت مادی وسائل کے بغیر ممکن نہیں۔ علاوہ ازیں قانون شریعت کبھی قانون فطرت سے متضاد نہیں ہو سکتا اور قانون فطرت قابل مذمت نہیں ہوتا ہاں البتہ ایسا عشق و محبت جو افراط کی حد کو پہنچ جائے۔ بہ الفاظ دیگر پرستش و عبادت بن جائے وہ قابل مذمت ہے۔

۲۔ ”القناطیر المقنطرة“ اور ”الغیل المسومة“ سے کیا مراد ہے

”قناطیر“ ”قنطار“ کی جمع ہے۔ ”قنطار“ کا معنی ہے ”مکمل چیز“۔ بعد ازاں یہ لفظ زیادہ مال کے لیے استعمال ہونے لگا۔ پُل کو ”قنطرة“ اس کی مفہومی کے پیش نظر اور باہوش افراد کو ”قنطر“ اُن کی فکر و نظر کے استحکام کی وجہ سے کہتے ہیں۔ ”مقنطرة“ اسم مفعول ہے اس کا معنی ہے ”کسی گنا“ اور ”مکر“۔ یہ دونوں الفاظ کا اُکھا ذکر تاکید کے لیے ہے۔ جیسے آج کل فارسی میں کہتے



ہیں: خاکس صاحب آف وائٹ سی یا شدہ، انہیں شخص ہزاروں اور ہزاروں کا نامک ہے، یعنی اس کے پاس بہت مال و دولت ہے بعض نے "قنطار" کے لیے ایک معین حد بیان کی ہے اور کہا ہے کہ "قنطار" ستر ہزار سونے کے تیار ہوتے ہیں۔ پھر نے ایک لاکھ دینار بتایا ہے اور بعض بارہ ہزار دینار بتاتے ہیں اور کچھ کے نزدیک "قنطار" سونے چاندی کے سکوں سے بھری ہوئی تھیلی کو کہتے ہیں۔

ایک روایت جو امام باقر اور امام صادق علیہما السلام سے منقول ہے کے مطابق قنطار سونے کی وہ مقدار ہے جو ایک کائے کی گھال کو بھر دے۔

حقیقت میں اس کا ایک وسیع مفہوم ہے اور وہ ہے زیادہ اور کثیر مال۔

"نخیل" اسم جمع ہے اور اس کا معنی "گھوڑے" اور گھڑسوار: دونوں بیان کئے گئے ہیں البتہ زیر نظر آیت میں اس سے مراد "گھوڑے" ہی ہے۔

"مردمہ" دراصل "مستانہ" کے معنی میں ہے۔ مستانہ ہونا یہاں جبر اور جبروت کے متناسب ہونے کے لحاظ سے ہے یا تربیت یافتہ ہونے اور میدان جنگ میں سواری کے لیے آمادہ ہونے کے حوالے سے ہے۔ اس مطالبے سے یہ نتیجہ نکلا کہ محل بحث آیت میں چھ چیزوں کی نشاندہی کی گئی ہے جو زندگی کا اہم سرمایہ

ہیں اور وہ یہ ہیں:

- (۱) بیوی
 - (۲) اولاد
 - (۳) مال و دولت
 - (۴) بہترین سولہاں اور گھڑی ضرورت کے جانور "انعام"
 - (۵) زراعت اور فصلیں
- یہ سب مادی زندگی کے بنیادی ارکان ہیں۔

۳۔ دنیا کی متاع حیات سے کیا مراد ہے

متاع ایسی چیز کہتے ہیں جس سے انسان نفع اندوز ہوتا ہو اور حیات دنیا سے مراد پست زندگی ہے اس بناء پر "متاع العینۃ الدنیا" کا معنی یہ ہوگا کہ اگر کوئی شخص ان چھ امور سے بنیادی ہدف کے طور پر عشق کرے اور انہیں راہ حیات میں وسیلہ نہ سمجھے تو اس نے اپنے آپ کو پست زندگی کے سپرد کر دیا۔

حیات دنیا، پست زندگی اور اصل اس زندگی کے ارتقاء اور تکامل کی طرف اشارہ ہے اس طرح اس جہاں کی زندگی تو پہلا مرحلہ بن جاتی ہے اسی لیے آیت کے آخر میں اعلیٰ ترین زندگی جو انسان کے انتظار میں ہے، کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:



”وَاللّٰهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الْعَاقِبَةِ“

یعنی ۔ ایک اچھی قوم خدا کے پاس ہے ۔

۱۵۔ قُلْ اَوْفُوا بِعَهْدِكُمْ بِغَيْرِ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۚ لِلَّذِيْنَ اٰتَمَتُوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّتْ تَجْرِيْٓ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَنْزَلَ وَاُجَّ مُمْطَهْرَةٌ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعٰبِدِيْنَ ۝

۱۶۔ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اٰتِنَا اٰمَنًا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝

۱۷۔ الصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقَنِيَّتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَفْزِرِيْنَ بِالْاَسْعَاسِ ۝

ترجمہ

۱۵۔ کہہ دیجئے: کیا تمہیں ایسی چیز سے آگاہ کروں جو اس (مادی سرمائے) سے بہتر ہے جنہوں نے پرہیزگاری اختیار کی ہے (اور مادی سرمائے سے شرعی طریقے سے اور حق و عدالت کو ملحوظ رکھتے ہوئے استفادہ کیا ہے) ان کے پروردگار کے پاس (دوسرے جہان میں) ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور پاکیزہ بیویاں (جو ہر ناپاکی سے منزہ ہیں) اور خوشنودی خدا انہیں نصیب ہوگی اور خدا (بندوں کے امور کو) دیکھنے والا ہے۔

۱۶۔ وہی لوگ جو کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! ہم ایسا ن لے آئے ہیں، پس ہمیں بخش دے اور آگ کے عذاب سے بچائے۔



۱۷۔ وہی جو مشکلات کے مقابلے میں، اطاعت کی راہ میں اور ترک گناہ کے راستے میں) پامردی اور استقامت دکھاتے ہیں، اس پر پورے ہیں۔ (خدا کے حضور) خضوع کرتے ہیں (اس کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں اور اوقاتِ سحر میں (اور عبادتِ آخر شب میں) استغفار کرتے ہیں۔

تفسیر

ان میں پہلی آیت انسانی تعامل و ارتقا کے لیے بندی کی راہوں کو واضح کرتی ہے۔ اسی طرف گذشتہ آیت کے آخر میں اشارہ ہوا تھا اس آیت میں فرمایا گیا ہے: ”کیا تمہیں اس چیز کی خبر دوں جو معدودہ مادی اور پست زندگی سے بالاتر اور بہتر ہے وہ جہانِ ابدی کی زندگی ہے جو پرہیزگار اور خوددار افراد کے انتظار میں ہے جس میں تمام اس جہان کی نعمتیں موجود ہیں لیکن وہ زیادہ کامل صورت میں ہیں اور عیب و نقص سے پاک ہیں۔ وہاں ایسے باغات ہیں جن کے درختوں کے نیچے اس جہان کے برعکس پانی بہتا رہتا ہے اور منقطع نہیں ہوتا۔“

”جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ“

اس جہان کی نعمتیں تو بہت جلد گزر جاتی ہیں اور ناپائیدار ہیں لیکن وہاں کی نعمتیں ابدی ہیں خلد بین فیہا اکل جہاں کی بیویاں یہاں کی حسین عورتوں کے برعکس جہانی و روحانی اعتبار سے بہت پاکیزہ ہوں گی اور ان میں کوئی لہاکی و تیرگی نہیں ہوگی ”وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسُخِّرَ بِهِ نَبَاتٍ لَبِيبًا حُمْرًا وَمُتَشَابِهًا خَضِرًا“

یہ سب چیزیں پرہیزگاروں کے انتظار میں ہیں اور ان تمام سے بالاتر معنوی نعمتیں ہیں جو تصور سے ماوراء ہیں جنہیں آیت میں ”رَحْمَتًا مِنْ رَبِّكَ“ (یعنی — خوشنودیِ خدا) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ آیت ”أَوْ مُتَشَابِهًا“ سے شروع ہوتی ہے جس کا معنی ہے ”کیا تمہیں آگاہ کروں“ ایک طرف یہ جموں استغناء میں ہے جو انسان کی بیدار فطرت سے جواب طلب کرتا ہے تاکہ سفینے واسطے پر اس کا اثر زیادہ بگرا ہو اور دوسری طرف سے یہ لفظ ”اشباء“ کے مارہ سے ہے اور خبر دینے کے معنی میں لیا گیا ہے جو عموماً اہم ترین اور قابلِ توجہ خبروں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

در حقیقت قرآن اس آیت میں صاحبِ ایمان افراد کو خبر دیتا ہے کہ اگر وہ غیر شرعی لذتوں، سرکشی اور گناہ آلود ہوس سے صرف نظر کر لیں تو اس کا معنی لذت سے محرومی نہیں ہوگا کیونکہ وہ راہِ سعادت میں جائز لذات حاصل کر سکنے کے علاوہ دوسرے جہاں کی لذتوں سے بھی بہرہ مند ہوں گے جو اس جہاں کی لذتوں کی طرح ہیں لیکن بلند تر ہیں ہیں اور ہر نقص و عیب سے مبرا بھی۔



کیا جنت میں مادی لذتیں بھی ہیں

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مادی لذتیں اسی دنیا میں منحصر ہیں اور اخروی دنیا میں ان کا نام و نشان نہیں ہوگا اور یہ جو آیات قرآنی میں باغات، بہشت، طرح طرح کے پھل اور میوے، جدی پانی اور بہترین بیویوں کا تذکرہ ہے۔ یہ معنوی مقامات والعمات کے ایک سلسلے سے کنایہ ہیں اور یہ تعبیری "کَلِمَ لَاسْمَ عَلٰی قَدَرِ عَقُولِهِمْ" یعنی — لوگوں سے ان کے فکری میدان کے مطابق بات کرو۔ کے مصداق بیان فرمائی گئی ہیں۔

اس خیال کا جواب یہ ہے کہ جب بہت سی صریح آیات قرآنی کے پیش نظر معاد جسمانی ثابت ہو چکا ہے تو ضروری ہے کہ جسمانی اور روحانی تقاضوں کے مطابق نعمتیں بھی ہوں البتہ ان کی سطح ضرور بلند ہونی چاہیے اور اتفاق کی بات ہے کہ اس آیت میں دونوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ معاد جسمانی کی طرف بھی اشارہ ہے اور روح اور معاد ارواح کی مناسبت سے بھی اشارہ موجود ہے۔

جو لوگ اس جہان کی تمام نعمتوں کو معنوی نعمتوں کے لیے کنایہ سمجھتے ہیں وہ دراصل آیات قرآنی کے ظاہری مفہیم میں تاویل بھی کرتے ہیں اور وہ معاد جسمانی اور اس کے لوازمات کو بھی بالکل فراموش کیے ہوئے ہیں۔

"وَاللّٰہُ بِصَدْرِکَ بِالْبَصَادِ" یعنی — خدا اپنے بندوں کی کیفیت کو دیکھتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ جلد اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہو کہ خدا تعالیٰ دوسرے جہان میں انسانی جسم و روح کے تقاضوں سے آگاہ ہے اور وہ ان تقاضوں کو بطریق احسن پورا کرے گا۔

"الَّذِیْنَ یَعْتَوِلُوْنَ رِبْعَنَا اَمْنًا....."

گذشتہ آیت میں بتایا گیا تھا کہ پرہیزگار آفت کی نعمتوں سے مالا مال ہیں۔ اس آیت میں اور بعد والی آیت میں پرہیزگاروں کا تعارف کر دیتے ہوئے ان کی چھ نمایاں صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔

۱۔ وہ دل و جان سے اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہیں اور ایسا کرنے ان کا دل روشن کر دیا ہے، اسی لیے وہ سختی سے اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہیں اور وہ اپنے گناہوں کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ "وَهُ حَتُّا سَے گناہوں کی بخشش طلب کرتے ہیں اور دوزخ سے نہات کی خواہش کرتے ہیں۔" "فَاَعْرِضْنَا ذُنُوبَنَا وَفَعْنَا عَذَابَ الْمَآءِ"۔

۲۔ اپنے معاملات میں ممبر و استقامت سے کام لیتے ہیں اور انہیں انجام تک پہنچاتے ہیں۔ گناہ کو ترک کرتے ہیں اور انفرادی و اجتماعی مشکلات کا سینہ تان کے مقابلہ کرتے ہیں ("وَالْعَظِیْمِیْنَ")۔

۳۔ سچ بولتے ہیں، صحیح کردار کے مالک ہیں، جن چیزوں کا دل سے اعتقاد رکھتے ہیں انہی پر عمل کرتے ہیں اور وہ نفاق، جھوٹ، مکر و فریب اور خیانت سے دور رہتے ہیں ("وَالْعَظِیْمِیْنَ")۔

۴۔ خدا کی بندگی اور عبودیت کی راہ میں ہمیشہ خضوع اور فروتنی سے کام لیتے ہیں ("وَالْعَظِیْمِیْنَ")۔

یہ آیت کا معنی خدا کے سامنے خضوع جو ہے، اس کا معنی دنیا میں روم و ستور بھی ہے۔



۵۔ مال ہی نہیں بلکہ جو بھی مادی و مادیاتی اُممیں انہیں میسر میں وہ انہیں راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں اور اس طرح سے اجتماعی و معاشرتی مشکلات اور بیماریوں کا مداوا کرتے ہیں۔

۶۔ وقتِ سحر اور آخر شب یعنی جب سکون اور مخصوص منقاد غلوں کا ماحول تمام جگہاں پر محیط ہو۔ جب بے غیر لوگ خواب غفلت میں ہوں اور صیغی غند سو رہے ہوں۔ جب سستی دنیا کا شور و شین خاموش ہو چکا ہو اور وہاں خدا کے افکار اور زندہ دلوں میں عالم بستی کی اصلی قہریں نمایاں ہو رہی ہوں وہ یا خدا کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں اُس کی با عظمت بارگاہ میں استغفار اور طلب بخشش کرتے ہیں۔ پھر درکار کے فوراً مجال کے پرتو میں خود جوتے ہیں اور ان کے وجود کے سب ذرات باجم زہد توحید گنگنا رہے جوتے ہیں۔ (”وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِالْأَسْحَارِ“) امام صادق علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

جو شخص نماز وتر میں یہ مرتبہ: ”اَسْتَغْفِرُ اللهَ زَلَّتْ اَنْفُوبِ الْاَسْحَارِ“ پڑھے اور ایک سال تک اس نعل کی پابندی کرے خدا تعالیٰ اسے وقتِ سحر استغفار کرنے والوں (یعنی ”اَلْمُسْتَغْفِرِينَ بِالْاَسْحَارِ“) میں سے قرار دے گا اور یقیناً اسے اپنی غلو بخشش سے فوارے گا۔

سحر کیا ہے

سحر ”ابر و زن“ بشر اور اصل پوشیدہ اور پنهان ہونے کے معنی میں ہے۔ رات کے آخری حصے میں چونکہ تمام چیزوں پر ایک خاص قسم کی پوشیدگی غالب آ جاتی ہے لہذا اس کا نام سحر رکھ دیا گیا ہے۔ لفظ ”سحر“ ”ابر و زن“ ”سحر“ انہی ایسے مادہ سے ہے۔ ”سنا سحر“ اور جادو گر چونکہ ایسے کام کرتا ہے جن کے اسرار دوسروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں اُس سے اس کے اس عمل کو ”سحر“ کہتے ہیں۔

اہل عرب انسان اور حیوان کی سانس کی نالی کو بھی بعض اوقات ”سحر“ کہتے ہیں اور یہ بھی اندر والے حصے کے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ شب و روز کے اوقات میں سے صرف وقت ”سحر“ کا تذکرہ کیوں ہے جب کہ بارگاہِ الہی میں ہر حالت میں توبہ و استغفار مطلوب ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ سحر وہ وقت ہے کہ جب سکون، آرام اور خاموشی ہوتی ہے، مادی کام منقطع ہوتے ہیں اور استراحت کے بعد نشاط اور خوشی کا ایک عالم ہوتا ہے یہ صورت حال اور ماحول انسان کو زیادہ سے زیادہ بارگاہِ الہی میں توبہ و انابت کے لیے آمادگی بخشتا ہے۔

تجربے سے اس کیفیت کو آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے یہاں تک کہ بہت سے علماء اور دانشور علمی مسائل کے حل کے لیے اسی وقت سے استفادہ کرتے ہیں کیونکہ وقت ”سحر“ انسانی فکر و روح کا چراغ و دیگر اوقات کی



نسبت زیادہ روشن اور درخشندہ ہوتا ہے۔ عبادت و استغفار کی روح توجہ اور حضور قلب ہے لہذا لمحات بکھر میں عبادت و استغفار زیادہ گراں بہا اور عزیز تر ہے۔

۱۸۔ شَهِدَ اللّٰهُ اَنْهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْعَلَمٰتُکُمْ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

ترجمہ

۱۸۔ خدا (جہاں ہستی کے اکیلے نظام کو ایجاد کر کے گواہی دیتا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے اور فرشتے اور اہل علم و دانش سب ایک طرح گواہی دیتے ہیں، اس عالم میں کہ خدا تعالیٰ عالم ہستی میں عدالت قائم کیے ہوئے ہے (اور یہ عدالت بھی اُس کی ذات کی یکتائی کے لیے نشانی ہے، اس لیے تم بھی ان سب کے ساتھ ہم آواز ہو کر کہو کہ اُس کے علاوہ کوئی معبود نہیں جو کہ غالب و توانا بھی ہے اور حکیم و دانا بھی۔

تفسیر

اس آیت میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی ذات کی یکتائی خود پروردگار کی شہادت ہے، پھر علم کی گواہی اور پھر علماء، دانشور اور ان لوگوں کی شہادت ہے جو نور علی نور سے عالم دنیا کے حقائق پر نظر آتے ہیں۔
 (”شَهِدَ اللّٰهُ اَنْهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْعَلَمٰتُکُمْ وَاُولُوا الْعِلْمِ“)
 یہاں چند امور کی طرف توجہ ضروری ہے۔

۱۔ خدا کی اپنی یکتائی پر شہادت سے کیا مراد ہے

خدا تعالیٰ کی شہادت سے مراد علی اور فعلی شہادت ہے نہ کہ قولی یعنی خدا تعالیٰ نے جہاں آفرینش کو پیدا کیا۔ اس میں ایک ہی نظام قائم ہے۔ ہر جگہ اس کے قوانین ایک سے ہیں اور اس کا ایک ہی پروگرام ہے۔ حقیقت میں ایک اکیلا اپنے سے وابستہ یکساں نظام بذات خود نشاندہی کرتا ہے کہ پیدا کرنے والا اور معبود اس جہاں میں ایک سے زیادہ نہیں اور سب مخلوقات کا ایک ہی منبع اور سرچشمہ ہے۔ اس بنا پر ایک ہی نظام کی ایجاد، ذات الہی کی یگانگت اور یکتائی پر ایک شہادت ہے۔



دوسری طرف فرشتوں اور علماء کی شہادت قوی پہنچا رہی ہے کیونکہ ان میں سے ہر کوئی حسب حال کلام کے ذریعہ اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے۔ ایک لفظ کے مختلف معانی کی اور بھی بہت سی مثالیں آیات قرآنی میں موجود ہیں۔

”ایماناً ملنا و مکتباً کتبنا یصنعت علیٰ الشیخ“

یعنی — اللہ اور اس نے فرشتے پیغمبر پر درود بھیجتے ہیں۔ (احزاب - ۵۰)

اس میں خدا کی طرف سے درود بھیجنے اور ملائکہ کی طرف سے درود بھیجنے کے اور معنی ہیں۔ خدا کی طرف سے رحمت بھیجنا ہے اور فرشتوں کی طرف سے رحمت بھیجنے کا تقاضا ہے۔ البتہ فرشتوں اور علماء کی گواہی عمل پہنچانے میں بھی فرق رکھتی ہے کیونکہ وہ صرف اسی کی پرستش کرتے ہیں اور کسی اور معبود کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے۔

۲۔ قیام بالقسط کیا چیز ہے۔

اولی اصطلاح کے مطابق ”شہد“ فعل ہے۔ اس کا فاعل ”اقلہ“ ہے اور قاضیاً بنا بالقسط اس سے حال ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ اپنی یکتائی کی گواہی دینے میں دیتا ہے کہ عالم ہستی میں عدالت قائم کیے ہوئے ہے اور فاعلاً یہ جملہ اس کی شہادت کی دلیل ہے کیونکہ عدالت کی حقیقت یہ ہے کہ درمیانہ اور مستقیم راستہ انتخاب کیا جائے جو ہر قسم کے افراط و تفریط اور انحراف سے دور ہو اور ہم جانتے ہیں کہ درمیانہ اور مستقیم راستہ ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے اور ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ سورہ النہم کی آیت ۱۵۲ میں ہے:

”و ان هذا صراطی مستقیماً ف تبعوه ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ“

اور یہ میرا سیدھا راستہ ہے۔ پس اسی کی تابانی کرو اور دوسرے راستوں

کے پیچھے نہ لگو کہ وہ تمہیں اس کے راستے سے بھٹا دیں گے۔

اس آیت میں خدا کے ایک راستے کا ذکر ہے اور مغرب اور مچھنے جوئے متعدد راستے بتانے لئے ہیں کیونکہ ”صراط مستقیم“ مفرد ہے اور کچھ راستوں کا ذکر جمع کے صیغے سے کیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عدالت ہمیشہ ایک ہی نظام سے ہوتی ہے اور ایک ہی نظام کا ہونا مبداء و مادہ کا پتہ دیتا ہے۔ اس لیے عالم آفرینش میں حقیقی عدالت اپنے اصلی مفہوم میں پیدا کرنے والے کی یکتائی پر دلیل ہے۔ غور کیجئے گا۔

۳۔ علماء کی حیثیت و وقعت

اس آیت میں حقیقی علماء کو فرشتوں کا ہم قدر قرار دیا گیا ہے اور یہ بات دوسروں کی نسبت علماء کے امتیاز کو ظاہر کرتی ہے آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علماء کا امتیاز یہ ہے کہ وہ اپنے علم کے ذریعے حقائق پر مطلع ہوتے ہیں اور اس طرح سے خدا کی یگانگت کا اعتراف کرتے ہیں جو سب سے بڑی حقیقت ہے۔



واضح ہے کہ آیت تمام علماء کے بارے میں ہے اور وہ روایات جو اس آیت کے ذیلی میں وارد ہوئی ہیں ان میں جو ”اولوا النعم“ سے آخر اظہار مبادیآ گیا ہے تو وہ اس کی توسیع ہے کہ وہ حضرات اولوا النعم کے واضح ترین مصداق ہیں۔

مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں جابر بن عبد اللہ انصاری کی وساطت سے پیغمبر اسلام کا ایک فرمان نقل کیا ہے، آپ نے فرمایا:

”سَاعِدَةُ مَنْ عَادَنِي يَتَكَ، عَلَى فَرْشِهِ يَنْظُرُ فِى عَمَمِهِ خَيْرٌ
مَنْ عِبَادَةِ الْعَابِدِ سَبْعِينَ عَامًا“

طاہر لی وہ ایک ساعت میں میں ۷۰ بار جو میں خود نظر کرنے سے بہتر

پر عبادت کیا۔ غائب کی سرنگ کی سات سے بہتر ہے۔

آیت میں ”لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ“ کے سبب قائل ہے یہ تکرار کیا اس طرف اشارہ ہے کہ جیسے بتداء میں خدا دشمنوں اور علماء کی شہادت آئی ہے اس طرت جو شخص بھی کسے سے چاہیے کہ وہ بھی اپنی شہادت کے ساتھ ہم آواز ہو جائے اور مسجد کی وحدت کی گواہی دے۔

لا الہ الا اللہ خدا کے حق کی ادائیگی ہے اور اس کی توحید کا اظہار ہے لہذا ”تکبیر“ و ”حکیم“ دو اسماء الہی پر ختم ہوا ہے کیونکہ عدالت کا قیام قدرت و حکمت کا محتاج ہے اور وہ خدا ہی ہے جو ہر چیز پر قادر ہے اور تمام چیزوں سے آگاہ ہے اس لیے وہی جہاں بستی میں عدالت قائم رکھ سکتا ہے۔

یہ آیت ان آیات میں سے ہے جن پر رسول اکرمؐ نے ہمیشہ خصوصی نظر رکھی اور آپؐ پر بدلتے مواقع پر اس کی تلاوت فرماتے رہے۔ زمیر بن حوام کا کہنا ہے:

”خود کی بات میں آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر تھا، میں نے سنا کہ آپؐ ہم پر اس

آیت کی تلاوت کرتے تھے۔“

۱۹۔ اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ اِلَیْسَ لَہُمْ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اَوْتُوا
الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَہُمْ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَہُمْ وَمَنْ
يَكْفُرْ بِآيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ○

ترجمہ

۱۹۔ اللہ کے نزدیک دین اسلام (اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنا) ہے۔ جن کے پاس

سہ نسخہ کلام تھا،



آسانی کتاب حق انہوں نے علم و آگاہی کے بعد بھی اختلاف پیدا کیا اور وہ بھی اپنے درمیان ظلم و ستم کی بناء پر اور جو آیات خدا نے کفر اختیار کرے تو خدا اس کا محاسبہ کرے گا کیونکہ خدا سیریح الحساب ہے۔

تفسیر

حق کے سامنے تسلیم خم کرنا ہی روح دین ہے

”دین“ کا معنی ہے ”جزاء“، ”پاش“، ”علم کی اطاعت“ اور ”پیروی“۔ مذہبی اصطلاحات میں دین عبارت ہے ان عقائد، قوانین اور آداب سے جن کے ذریعے انسان دنیا و آخرت کی سعادت و خوش بختی تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ نیز انفرادی و اجتماعی اور اخلاقی و تربیتی لحاظ سے صحیح راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔

”اسلام“، ”تسلیم“ کے معنی میں ہے اور یہاں مراد خدا کے سامنے تسلیم ہونا ہے۔ اس لیے ”اِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ“ کا معنی یہ ہوگا کہ بارگاہ الہی میں حقیقی دین اُس کے فرمان اور حقیقت کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے اور دراصل روح دین تمام ادوار میں حقیقت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے علاوہ کسی دوسری چیز کا نام نہیں البتہ چونکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دین و آئین اس کا اعلیٰ ترین نمونہ تھا اس لیے اس کے لیے اسلام کے نام کا انتخاب ہوا۔

بیچ البلاغہ کے کلمات فقار میں حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کا اس حقیقت کے بارے میں عمیق اور گہرے مفہوم پر مبنی یہ تبد مقصد کو واضح کرتا ہے:

”لا فسن الاسلام نسبة لم ينسبها احد قبلي
الاسلام هو التسليم، والثنية هو اليقين،
واليقين هو التصديق، والتصديق هو الاقتدار،
والاقتدار هو الاداء، والاداء هو العمل“

اس عبارت میں امام علیہ السلام نے پہلے فرمایا ہے:

”میں چاہتا ہوں اسلام کی ایسی تفسیر بیان کروں جو کسی نے نہ کی ہو۔“

اس کے بعد آپ نے اسلام کے چار مرحلے بیان فرمائے ہیں جو یہ ہیں:

۱۔ اسلام حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے۔



- ۲۔ تسلیم یقین کے بغیر ممکن نہیں، کیونکہ یقین کے بغیر تسلیم اندھا دھند تسلیم ہے، عامانہ نہیں۔
- ۳۔ یقین تصدیق کا دوسرا نام ہے، یعنی علم و دانائی کوئی نہیں، خدا اس کے ساتھ اعتقاد اور تصدیق قلب ضروری ہے۔
- ۴۔ تصدیق ہی قول ہے، یعنی قلب و روح سے تصدیق کافی نہیں بلکہ جرأت و جہت سے اس کا اظہار بھی کرنا چاہیئے۔
- ۵۔ اقرار ذمہ داری کو پورا کرنا ہے، اقرار قول زبان میں محدود ہوتا ہے، اصل تو مسؤلیت اور ذمہ داری کو قبول کرنا ہے۔
- ۶۔ مسؤلیت کو قبول کرنا اور ایسی اور عمل ہی کو کہتے ہیں۔

اور وہ لوگ جو اپنی قوت و توانائی کو فقط لکھتے، بیانات، جملوں اور کافروں ہی میں صرف کر کے رہ جاتے ہیں اور باتوں سے آگے نہیں بڑھتے وہ نہ اپنی ذمہ داری کو قبول کیے ہوئے ہیں اور نہ نوح اسلام سے واقف ہیں۔

اسلام کے تمام پہلوؤں کو مد نظر رکھنے والی یہ واضح ترین تفسیر ہے۔

”وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ اُولَئِكَ اَلْحُكْمَ اَلَا مَوْنٌ بَعْدَ مَا جَاءَتْهُمْ

اَلْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ“

اس جگہ میں قرآن نے مذہبی اختلافات کے سرچشمے کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے: وہ لوگ جو حقیقت سے گماہ تھے اس کے باوجود انہوں نے دین خدا میں اختلاف پیدا کیا ان کے اس عمل کا سبب طفیلان، سسر کشی، ظلم و ستم اور حسد کے علاوہ کچھ نہیں تھا کیونکہ ہر آسانی دین ہمیشہ واضح مدارک سے منسلک ہوتا ہے جن کی وجہ سے متلاشیان حقیقت کے لیے کوئی ایسا باقی نہیں رہتا۔ مثلاً پیغمبر اسلام کے لیے واضح معجزات، کھلی نشانیاں اور روشن دلائل کے علاوہ جو آپ کے دین میں موجود تھے اور آپ کی حقانیت کے گواہ تھے، گذشتہ کتب آسمانی میں مذکور آپ کے اوصاف اور نشانیاں بھی موجود تھیں اور ان کتب کے کچھ حصے ان کے پاس تھے بھی اور انہی کے پیش نظر ان کے علاوہ آپ کے پیغمبر سے قبل آپ کے پیغمبر کی بشارت دیا کرتے تھے لیکن آپ کی بعثت کے بعد انہیں اپنے فائدہ مندرجہ خطریں نظر آئے اس لیے ظلم و ستم اور طفیلان و سسر کشی کی راہ اختیار کرتے ہوئے انہوں نے وہ سب کچھ پس پشت ڈال دیا۔

”فَمَنْ يَكْفُرْ بِآيَاتِ اَللّٰهِ فَاِنَّ اَللّٰهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ“

آیات کے آخر میں ایسے لوگوں کا مال کا بیان کیا گیا: وہ لوگ جو آیات الہی کو ٹھکراتے ہیں، اپنے اعمال کا مکمل نتیجہ حاصل کریں گے، خدا تعالیٰ ان کے اعمال کا بہت جلد حساب کرے گا۔

سرلیح الحساب کے مفہوم کے بارے میں اسی جلد میں سورہ بقرہ کی آیت ۲۰۲ کے ذیل میں بحث کی جا چکی ہے، اس سے رجوع فرمائیے۔

مذہبی اختلافات کا سرچشمہ

ضمنی طور پر اس آیت سے ایک جانب نظریات معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ زیادہ تر مذہبی اختلافات کا سرچشمہ



جہالت، نادانی اور بے خبری نہیں ہے بلکہ، سرکشی، علم، انحراف حق اور ذاتی مفادات ہی اس کی بیشتر وجوہات ہوتی ہیں۔ اگر سب لوگ علما اور علماء خصوصاً تعصب، کینہ پروری، جنگ نفرتی، ذاتی مفادات، دراپنے حقوق سے تجاوز سے باز رہیں اور حقیقت شناسی اور عدالت سے کام لیتے ہوتے احکام الہی کا مطالعہ کریں تو انہیں شاہزادہ حق بیت ہی واضح دکھائی دے گی اور انحراف بہت تیزی سے حل ہو جائیں گے۔

یہ آیت درحقیقت ان لوگوں کا دندان شکن جواب ہے جو کہتے ہیں کہ مذہب لوگوں میں اختلاف پیدا کرتا ہے اور اس کی وجہ سے تاریخ میں بہت سی خون ریزیوں ہوئی ہیں۔ یہ لوگ دراصل "مذہب" اور "مذہبی" تعصبات اور انحرافی افکار میں فرق نہیں کر پاتے کیونکہ اگر مذہب کے احکام و قوانین کا مطالعہ کریں تو جہم دیکھیں گے کہ سب ایک ہی ہدف اور مقصد کے درپہ ہیں اور سب سعادت، بشر کے لیے آئے ہیں اگرچہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ سلسلہ تکمیل تک پہنچا ہے۔

آسمانی ادیان اصل میں آسمان سے برسنے والے بارش کے قطروں کی طرح ہیں۔ بارش کے سب قطرے حیات بخش ہیں لیکن وہ شور و در اور تیغ زمینوں پر پڑتے ہیں تو مختلف رنگوں اور نالیقوں میں بدل جاتے ہیں اور ان اختلاف کا بارش سے تعلق نہیں بلکہ ان کا تعلق تو زمینی کثافتوں اور لوہیوں سے ہے۔

ادیان کے سلسلہ تکمال پر آخری بات یہ ہے کہ ان میں سے آخری دین کامل تر ہے۔

۲۰۔ فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسَلَمْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ
أَتَّبَعَنِ ۖ وَقُلْ لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ ۖ أَسَلَمْتُ
فَإِنْ أَسَلَمُوا فَحَدِّثُوا ۚ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ
الْبَلَاغُ ۚ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ۝

ترجمہ

۲۰۔ اگر وہ تم سے گفتگو اور جھگڑے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں (تو ان سے مجادلہ نہ کرو) اور کہہ دو! میں اور میرے پیروکار خدا کے (اور اس کے فرمان کے) سامنے تسلیم ہیں اور جو اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) ہیں اور جو ان پڑھے (مشرکین) ہیں ان سے کہہ دو کیا تم بھی تسلیم ہوئے ہو؟ اگر وہ (فرمان خدا اور منطق حق کے سامنے) تسلیم خم کر دیں تو ہدایت پالیں اور اگر



روگردانی کریں (تو تم پریشان نہ ہو کیونکہ تم پر تو ابلاغ رسالت کی ذمہ داری) ہے اور خدا بندوں کے (عقائد و اعمال) دیکھتا ہے۔

تفسیر

لغت میں ”مباحثہ“ بحث، مباحثہ، گفتگو، استدلال اور کسی عقیدے کے دفاع کو کہتے ہیں۔ یہ ظنی امر ہے کہ ہر دین کے طرفدار اپنے عقیدہ اور عقیدے کا دفاع کرتے ہیں اور اس سلسلے میں اپنے آپ کو حقدار قرار دیتے ہیں اس لئے اسے قرآن رسول اللہ سے کہتا ہے، جو سکتا ہے اہل کتاب (یہود و نصاریٰ وغیرہ) تم سے بحث کریں اور کہیں کہ ہم حق کے سامنے تسلیم ہیں اور حق کی طرفداری کے معنی میں اسلام کے پیروکار ہیں، یہاں تک کہ وہ اس بارے میں اپنی استقامت و پائنداری کا مظاہرہ کریں جیسا کہ نجران کے مسائیلوں نے بھی پیغمبر اسلام سے ایسی ہی گفتگو کی تھی۔

مندرجہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسلام کو یہ حکم نہیں دیا کہ اہل کتاب سے بحث مباحثہ اور گفتگو ہی نہ کی جائے بلکہ یہاں ایک اور حکم دیا گیا ہے جس کے مطابق جب بحث آخری مرحلے تک پہنچ جائے تو اس وقت نہ ان کی رہنمائی کی ضرورت ہے نہ محامضت و مجادلہ کی۔ تبصرین راستہ یہ ہے کہ انہیں کہیں کہ میں اور میرے پیروکار خدا کے سامنے تسلیم کئے ہوئے ہیں اور حق کے پیروکار ہیں اور پھر مشرکین سے کہیں کہ اگر وہ بھی خدا کے سامنے تسلیم ہیں اور پھر حق میں تو انہیں چاہیے کہ منطقی گفتگو کے سامنے سر جھکا دیں اور اس صورت میں ان سے بحث و مباحثہ اور گفتگو کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اس مقام پر گفتگو بے عمل اور بے اثر ہے اور تبلیغ رسالت کے علاوہ کوئی چیز تم پر لازم نہیں ہے۔ ”فان اسلموا فقد اهتدوا“ وان قولوا فاقضوا علیک السلام۔“

خدا تعالیٰ اپنے بندوں کے اعمال و افکار کو دیکھتا ہے۔ ”واللہ بصیر“ بالعباد۔“

اس مقام پر چند نکات قابل توجہ ہیں:

۱۔ آیت سے منہی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ایسے بحث و حرم افراد سے بحث مباحثے سے پرہیز کرنا چاہیے جو صحیح منطق کو تسلیم نہیں کرتے۔

۲۔ ”ایقینت“ سے اس آیت میں مراد ”مشرکین“ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا ذکر بھی کتاب و یسود و نصاریٰ کے مقابلے میں آیا ہے اور ان کے پاس کوئی آسمانی کتاب نہیں تھی کہ جس کی وجہ سے وہ پڑھنے لکھنے پر مجبور ہوتے۔

۳۔ اس آیت سے مکمل طور پر واضح ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام کا طریق کار فکر و نظر اور عقیدہ مٹوانا نہیں تھا، بلکہ آپ کی کوششیں ہوتی تھیں کہ لوگوں پر حقائق آشکار ہو جائیں اور پھر انہیں ان کی حالت پر تھپڑ دیا جائے تاکہ وہ خود حق کی پیروی کے لیے عزم مصمم کریں۔



۲۱۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِآيَاتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيْنَ
 بِغَيْرِ حَقٍّ ۚ وَيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَأْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ
 النَّاسِ ۚ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝
 ۲۲۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ
 وَمَالُهُمْ مُّنتَصِرٍ ۝

ترجمہ

۲۱۔ جو لوگ آیاتِ خدا سے کفر کرتے ہیں انبیاء کو ناحق قتل کرتے ہیں اور عدل کا حکم دینے والوں کو بھی قتل کر دیتے ہیں انہیں دردناک عذاب کی بشارت دیجئے۔
 ۲۲۔ وہ ایسے لوگ ہیں جن کے نیک اعمال (اور عظیم گناہوں کی وجہ سے) دنیا اور آخرت میں تباہ ہو گئے ہیں اور ان کا کوئی یا اور مددگار (اور شفاعت کرنے والا) نہیں ہے۔

تفسیر

ان دو آیتوں میں پہلے ان تین عظیم گناہوں کا ذکر ہے:

۱۔ آیاتِ الہی سے کفر اختیار کرنا۔

۲۔ انبیاء کو ناحق قتل کرنا اور

۳۔ انبیاء و مرسلین کے پروگرام کی حفاظت کرنے والوں اور لوگوں کو عدل و انصاف کا حکم دینے والوں کو بھی قتل کر دینا۔

اس کے بعد ان کے لیے تین سزاؤں اور بدبختیوں کا تذکرہ ہے جو یہ ہیں:

۱۔ ”فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ“ (انہیں دردناک عذاب کی بشارت دیجئے) اس جگہ میں ان کے لیے سخت سزا کا ذکر ہے۔

۲۔ بعد والی آیت میں ہے: ”اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا



والا مخررة ۱۰۔ (یعنی ان لوگوں کے اعمال اس دنیا میں اور آخرت میں نابود اور اکارت ہو جائیں گے) اس جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو نیک اعمال وہ انجام دے چکے ہیں وہ بھی ان کے عظیم گناہوں سے متاثر ہوں گے اور اپنی تاثیر کھو بیٹھیں گے اور ضائع ہو جائیں گے۔

۳۔ آخر میں مزید کہا گیا ہے کہ انہیں جتنی سخت سزا اور شدید عذاب کے مقابلے میں کوئی بھی شخص ان کی حمایت کرنے والا نہیں ہوگا یعنی وہ شفاعت کرنے والوں کی شفاعت سے بھی محروم رہیں گے۔ ”و ما لهم من نصيرين“ جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۶۱ کے ذیل میں ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ آیت یہودیوں کی عجیب تاریخ کی طرف اشارہ کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ وہ آیات الہی کے انکار کے علاوہ انبیاء کو قتل کرنے میں بھی بڑی جسارت کا مظاہرہ کرتے تھے اور ان مجاہدوں کو بھی سرت کے گھاٹ اتار دیتے تھے جو انبیاء کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے تھے لیکن منہم ہے کہ یہ حکم اور سزا ان کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ ان تمام اقوام کے بارے میں ہے جو ان جیسے اعمال و اعمال بجالاتی ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ اہل عدل انبیاء کے ساتھ ساتھ : آیت میں عدالت کا حکم دینے والوں اور نیک کاموں اور حق کی دعوت دینے والوں کا تذکرہ انبیاء کے ساتھ ساتھ آیا ہے۔ خدا سے کفر کرنے والوں نیز انبیاء اور اہل عدل کو قتل کرنے والوں کو ایک سلح پر قرار دیا گیا ہے اور یہ چیز واضح کرتی ہے کہ اسلام نے معاشرے میں عدالت کے قیام کے لیے کس قدر اہتمام کیا ہے۔ دوسری آیت سے ایسے صالح افراد کو قتل کرنے والوں کے لیے شدید عذاب اور سزا کا پتہ چلتا ہے ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ ”حبط“ سب گناہوں کے لیے نہیں بلکہ ایسے شدید اور سخت گناہوں کے بارے میں ہے جو نیک اعمال کو بھی مٹا دیتے ہیں۔

علاوہ ازیں ایسا شخاص کی شفاعت سے محرومی ان کے گناہوں کی شدت کے بارے میں ایک اور دلیل ہے۔
۲۔ ناحق قتل ”بغیر حق“ سے یہ مراد نہیں کہ حق کے ساتھ پیغمبروں کو قتل کیا جاسکتا ہے بلکہ مراد ہے کہ انبیاء کا قتل ہمیشہ ناحق اور ظالمانہ فعل ہے۔ اصطلاح میں ”بغیر حق“ کے الفاظ ”قید تو مضمی“ کے طور پر ہیں اس لیے تاکید کے لیے ہیں۔

۳۔ ”بشارت“ کا مفہوم ”بشدت“ کا لفظ دراصل نشانہ انگیز خبروں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور ان کا اثر انسانی بشر اور صورت پر ظاہر ہوتا ہے۔ قرآن کی اس آیت میں اور دیگر آیات میں عذاب کے موقع پر اس لفظ کا استعمال درحقیقت ایک قسم کی تنبیہ ہے اور گنہگاروں کے افکار و نظریات پر استنباہ ہے ایسی گفتگو چارے روزمرہ میں بھی مروج ہے۔ جب کوئی بڑا کام انجام دیتا ہے تو مسرور و خوش اور استہزاء کے طور پر کہتے ہیں : ہم تجھے اس کا اجر اور بدلہ دیں گے۔“



۲۳۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ
يَدْعُوْنَ اِلَى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلٰٓى
فَرِيقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝

۲۴۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَيَّامًا
مَّعْدُوْدٰتٍ ۖ وَغَرَبَهُمْ فِىْ دِيْنِهِمْ مَا كَانُوْا
يَفْتَرُوْنَ ۝

۲۵۔ فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنَاهُمْ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِیْهِ ۖ وَوُفِیَتْ
كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ

۲۳۔ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کے پاس (آسمانی) کتاب کا کچھ حصہ ہے اور ان
میں فیصلے کے لیے انہیں کتابِ خدا کی طرف دعوت دی گئی ہے لیکن (علم و آگہی کے
باوجود) ان میں سے ایک فریق نے روگردانی کی جب کہ وہ (قبولِ حق سے) اعراض کیے
ہوئے تھے۔

۲۴۔ (ان کا) یہ (عمل) اس بنا پر تھا کہ وہ کہتے تھے کہ چند دن کے سوا (جہنم کی) آگ ہم تک نہیں
پہنچے گی (اور دوسری قوموں سے ہمارے امتیاز کی وجہ سے ہمیں بہت ہی محدود سزا ملے
گی) اور خدا پر باندھے گئے، اس افتراء نے انہیں بہت مغرور کر دیا تھا۔

۲۵۔ پس اس وقت کیا حالت ہوگی جب اُس (قیامت کے دن جس میں کوئی شک نہیں



سب جمع ہوں گے ہم انہیں اور ہر شخص کو جو کچھ انہوں نے اپنے اعمال کے ذریعے اکٹھا کیا ہے - دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں ہوگا بلکہ وہ اپنے اعمال کی فصل ہی کاٹیں گے۔

شانِ نزول

تفسیر مجمع البیان میں ابن عباس سے منقول :

رسول اللہ کے زمانے میں خیبر کے یہودیوں میں سے ایک عورت اور ایک مرد زمانے محمد ﷺ کے مرتکب ہوئے۔ باوجودیکہ تورات میں ایسے شخص کو سنگ مار کرنے کا حکم تھا، چونکہ یہ مرد عورت اشرف میں سے تھے اس لیے ان پر یہ حکم جاری کرنے میں توقف برتا گیا اور تجویز ہوا کہ پیغمبر اسلام سے رجوع کیا جائے اور ان سے فیصلہ حاصل کیا جائے۔ انہیں توقع تھی کہ آپ کی طرف سے کم سزا معین ہوگی لیکن رسول اللہ نے بھی ان کے لیے وہی سزا معین فرمائی۔ اس فیصلے پر بعض یہودیوں اور ان کے ڈیروں میں سے بعض نے اعتراض کیا اور اس بات کا انکار کر دیا کہ یہودی مذہب کے مطابق یہ فیصلہ درست ہے۔

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا : یہ موجودہ تورات ہی تمہارے اور میرے درمیان فیصلہ کر دے گی۔

انہوں نے قبول کر لیا۔ ابن مسریٰ ان کا ایک عالم تھا۔ اسے مذک سے مدنیہ بلایا گیا تھا۔ پیغمبر اکرمؐ نے اسے پہچان لیا اور فرمایا : تو ابن مسریٰ ہے؟ اس نے عرض کیا : جی ہاں۔

آپؐ نے فرمایا : کیا تم یہودیوں میں اعلم علماء ہو؟ اُس نے کہا : وہی کہتے ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ نے حکم دیا کہ اس کے سامنے تورات کا وہ حصہ رکھا جائے جس میں سنگسار کرنے کا حکم ہے۔

وہ چونکہ پیٹھ سے باخبر تھا اس لیے جب تورات کی اس آیت تک پہنچا تو اس پر ہاتھ رکھ دیا اور اُس کے بعد کے جیسے پڑھ دیے۔

عبدا اللہ بن سلام جو پیٹھ یہودی علماء میں سے تھا اور مسلمان ہو گیا تھا، دال



موجود تھا۔ وہ ابن مسریہ کی اس پردہ پوشی پر متوجہ ہو کر فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور اس کا اقداس مجھے سے بٹا دیا اور متنِ تورات میں سے اسے پڑھا اور کہا کہ تورات کہتی ہے: یہودیوں کے لیے ضروری ہے جب کوئی عورت اور مرد زمانے محض کے ترکیب ہوں اور ان کے جرم کا کافی ثبوت موجود ہو تو انہیں سنگسار کر دیا جائے۔

اس کے بعد پیپر اکرم نے حکم دیا کہ ان کے دین کے مطابق مذکورہ سزا ان دو مجرموں پر جلدی کی جائے۔

اس پر یہودیوں کی ایک جماعت سیخ پا ہو گئی، زیرِ نظر آیت اسی کیفیت کے بارے میں تامل ہوئی ہے۔

تفسیر

ان آیات میں صراحت سے اہل کتاب کی چند خیانتوں کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ کیسے حید ہوئی اور بے ضابطہ مطالب کے ذریعے حدودِ الہی کے نفاذ سے بغاوت کرتے تھے۔ ملاحظہ فرمائیے کہ اس موجود آسانی کتاب صراحت سے حکم بیان کر چکی ہوتی تھی کہ اپنی مذہبی کتاب میں موجود حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔ ”السم شر الی الذین اوتوا نصیباً من الکتاب یدعون الی کتب اللہ ینحکم بینہم“

لیکن انہوں نے صریحاً اس کی مخالفت کی اور مخالفت بھی ایسی جسے اعراض، سرکشی اور احکامِ خدا پر نکتہ چینی کہا جاتا ہے۔ ”ثم یتولّٰ فریقاً منہم وہم فعدّ ضلّٰت“

”اوتوا نصیباً من الکتاب“ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جو تورات اور انجیل یہود و نصاریٰ کے پاس موجود تھی وہ ساری حقیقی تورات اور انجیلِ نجات تھی بلکہ یہ تو اس کا صرف ایک حصہ تھا اور ان دونوں آسانی کتابوں کا بیشتر حصہ یا غائب تھا یا پھر تحریف شدہ تھا۔

اس آیت کی قرآن کی دیگر آیات بھی تائید کرتی ہیں، نیز تاریخی شواہد بھی اس کے مؤید ہیں۔

دوسری آیت میں ان کی مخالفت اور روگردانی کی وجہ بیان کی گئی ہے کہ ان کی ایک باطل اور غلط فکر تھی اور وہ یہ کہ وہ ایک جند اور ممتاز خاندان سے ہیں۔ آج بھی وہ ایسا ہی سمجھتے ہیں اور بہت سی تحریروں ان کی نسل پرستی کی شاہد ہیں۔ ان کا اعتقاد تھا کہ پروردگارِ عالم سے ان کا ایک خاص تعلق ہے یہاں تک کہ وہ اپنے تئیں خدا کے بیٹے کہتے تھے۔

اس وقت موجود تورات میں سفرِ ہریان کی بیسویں فصل کے دسویں جے میں ہے: ”اور ج شخص کسی غیر کی محبت سے ناکرے اس شخص اپنے ہمنام کی بری سے ناکرے تو جاپیہ کو زانی اور زانیہ کو قتل کر دیا جائے۔“

اس حدیث میں اگرچہ مسلک کا حکم صراحت سے نہیں ہے لیکن انہیں قتل کر دینے کی اصل سزا حکم ہے۔ لیکن یہ پیپر اکرم کے فلسفے کے منہر میں وہ حدیث



جیسا کہ سورہ مائدہ آیہ اٹھارہ میں دن کی زبان سے قرآن نے نقل کیا ہے۔
 ”تَحْسُنُ آيَاتِنَا لِلَّذِينَ لَا يَرْجُوْنَ اِلٰهًا غَيْرًا عَلٰى“

ہم اللہ کے پیش اور اس کے خاص دوست ہیں۔

اسی لیے وہ خدائی سزا کے مقابلے میں ایک قسم کی معنویت کے قائل تھے اور سمجھتے تھے کہ اس سے محفوظ رہیں گے اور اس امر کو خدا کی طرف بھی منسوب کرتے تھے لہذا ان کا اعتقاد تھا کہ دن میں سے گزرتے ہوئے افراد بھی قیامت میں چند دنوں کے سوا عذاب میں مبتلا نہیں ہوں گے۔ جیسا کہ محل بحث آیت میں بھی ہے:

”فَالَّذِيْنَ تَحْتَسِبُ النَّارُ اَنْ اِلٰهًا مَا تَعْبُدُوْا اِلٰهًا“

ان دایم معدود سے مراد یا تو وہ چالیس دن تھے جن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عدم موجودگی میں انہوں نے گوسلہ پرستی شروع کر دی تھی۔ یہ ایسا گناہ تھا کہ وہ خود بھی اس کا انکار نہیں کر سکتے تھے یا پھر اس سے مراد ان کی زندگی کے معدود اور گنے چنے دن تھے کہ جن میں انہوں نے بہت زیادہ واضح اور ناقابل انکار گناہوں کا ارتکاب کیا تھا اور وہ خود بھی ان گناہوں کی توجیہ اور پردہ پوشی نہ کر سکتے تھے۔

خدا کی طرف منسوب یہ جو بڑے اور جعلی امتیازات رفتہ رفتہ ان کے عقائد کا بزہن گئے جس سے وہ مغرور ہو گئے تھے یہاں تک کہ احکام خدا کی مخالفت اور قانون شکنی میں بھی بے باک ہو گئے تھے۔ ”و غرہم ف دیٰ نہم قہاکا نوا یفتروہن“۔

تیسری آیت میں قرآن ان تمام باطل خیالات پر خط بطلان کھینچتا ہے اور کہتا ہے: ایک روز یقیناً پروردگار کی بارگاہ عدل میں دیگر انسانوں کی طرح پیش ہوں گے اور ہر شخص اپنے اعمال کا سامنا کرے گا چونکہ وہ اپنے ہی اعمال کا سامنا کریں گے اور اپنے ہی اعمال کا فیصلہ پائیں گے اس لیے انہیں جو بھی ملے گی اس میں ان پر کسی قسم کا ظلم و ستم نہیں ہوگا کیونکہ یہ تو سب ان کے لیے کا حاصل ہوگا۔ ”و وقیت کل نفس ما حکمت وہم لا یظلمون“۔

”ما حکمت“ سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ قیامت کے دن کی جزا و سزا اور دوسرے جہنمی کی خوش بختی و بد بختی صرف انسانی اعمال سے وابستہ ہے اور اس میں کوئی اور چیز موثر نہیں ہے۔ اس حقیقت کی طرف بہت سی آیات مجیدہ میں اشارہ ہوا ہے۔

دو سوال اور ان کا جواب

کیا یہ ممکن ہے کہ انسان کوئی جھوٹ بولے یا خدا پر افترا باندھے اور پھر خود ہی اس کے زیر اثر آجائے اور اس کے نتیجے میں مغرور ہو جائے جیسا کہ زیر نظر آیات میں طرہا گیا ہے؟ کیا یہ باور کیا جاسکتا ہے؟
 اس سوال کا جواب کوئی زیادہ مشکل نہیں ہے کیونکہ وجدان کو دھوکا اور فریب دینے کا مسند آجکل نفسیات کے

مسئلہ مسائل میں سے ہے بعض اوقات قوت فکر و نظر و مدین کو غافل کر دیتی ہے اور حقیقت کے چہرے کو بگاڑ دیتی ہے۔ ہم نے بار بار دیکھا ہے کہ بڑے بڑے گناہوں مثلاً قتل، چوری یا طرح طرح کی بُری عادات میں ملوث افراد اپنے اعمال کی تباہی کو اچھی طرح جاننے کے باوجود وجدان کی جھوٹی تسکین کے لیے کوشش کرتے ہیں۔ وہ لوگوں پر کئے گئے ظلم کا انہیں مستحق قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں یا اپنی ضروریات عادات کی توجہ دیتے ہیں۔ زندگی کی تباہیوں اور معاشرے کی طاقت فرما مشکلات کا نام لے کر اپنے لیے منیات کے استعمال کو درست ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

علاوہ انہیں یہ جھوٹے امتیازات اہل کذاب کی گزشتہ نسلیں نے گھڑے تھے اور بعد کی نسلیں جو اس سے آگاہ نہیں تھیں انہوں نے اسے بلا تحقیق صحیح عقیدت کے طور پر اپنایا۔

۲۔ یہ بھی سوال کیا جاسکتا ہے کہ متعدد عذاب اور سزا کا عقیدہ تو مسلمانوں میں بھی موجود ہے کیونکہ ہذا عقیدہ ہے کہ حقیقی مسلمان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عذاب الہی میں مبتلا نہیں رہیں گے اور اگر ان کا ایمان ان کی نجات کا سبب بنے گا۔

توجہ رہے کہ ہذا یہ عقیدہ ہرگز نہیں کہ ایک گنہگار اور طرح طرح کے جرائم میں آلود مسلمان صرف چند دن عذاب الہی میں مبتلا رہے گا بلکہ ہذا عقیدہ یہ ہے کہ وہ سالانہ سال تک گزشتہ سزا سے بچے گا اور اس کی سزا کی اصل مدت خدا تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ ممکن ہے اسکے ایمان کی وجہ سے اس کی سزا دائمی اور ابدی نہ ہو اور اگر واقعی مسلمانوں میں کچھ ایسے افراد ہوں جو یہ سمجھتے ہوں کہ عذاب الہی کا یہ عقیدہ الہی ہے اور اگر وہ اس کی سزا سے بچیں گے تو وہ اس پر انہیں چند روز کے علاوہ سزا نہیں ہوگی تو وہ بہت بڑے اشتباہ کا شکار ہیں اور روج اسلام اور تعلیمات اسلامی سے دور ہیں۔

ہم اس معاملے میں مسلمانوں کے لیے امتیاز کے قائل نہیں بلکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ برامت کے افراد جو اپنے اپنے زمانے کے پیغمبر پر ایمان رکھتے تھے مگر کسی گناہ کے مرتکب ہوئے ہوں تو وہ بھی اس قانون کے تحت آتے ہیں چاہے وہ کسی قوم یا قبیلہ سے ہوں جب مذہب ہی اسرافیل کے لیے اس امتیاز کے قائل ہیں اور دیگر اقوام عالم کے لیے وہ ایسے کسی قانون کو نہیں مانتے۔

قرآن اُن کے اس جھوٹے امتیاز کا جواب دیتے ہوئے سورہ مائدہ کی آیت ۱۸ میں کہتا ہے۔

”وَبَلَّغْنَاكَ بَشَرًا مِّنْ خَلْقٍ“

ترجمہ: ”تو ہمیں ایک انسان کی طرح جو

۲۶۔ قُلِ اَللّٰهُمَّ مَلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ
وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ
مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْغَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝



۲۷۔ تَوَلَّجُ اللَّيْلَ فِي الشَّهَارِ وَتَوَلَّجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ
وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ
الْحَيِّ وَتَرْتَفُتُ مَنْ تَشَاءُ بِفِئْرِ حِسَابٍ ۝

ترجمہ

۲۷۔ کیجیے بارگاہِ حکومتوں کا مالک تو ہے، تو ہی جسے چاہتا ہے کہ حکومت بنجھتا ہے
اور جس سے چاہتا ہے حکومت لے لیتا ہے جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت
دیتا ہے، تمام خوبیاں تیرے ہاتھ میں ہیں کیونکہ تو ہر چیز پر قادر ہے۔

۲۷۔ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے، مردہ سے زندہ کو اور زندہ سے
مردہ کو نکالتا ہے اور جسے چاہتا ہے بے حساب روزی دیتا ہے۔

شان نزول

مشہور مفسر طبرسی نے مجمع البیان میں اس سئلے میں دو شان نزول بیان کی ہیں اور ہر دو ایک ہی حقیقت کی نشاندہی
کرتی ہے۔ ذیل میں دونوں شان نزول پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ پیغمبر اکرمؐ نے مکہ فتح کر لیا تو مسلمانوں کو خوشخبری دی کہ بہت جلد ایران اور روم بھی پرچم اسلام کے نیچے ہوں گے۔ یہ
بات سنی تو منافقین کہ جن کے دل ابھی نورانیان سے روشن نہیں ہوئے تھے اسے مبالغہ آمیز سمجھنے لگے اور تعجب سے
کہنے لگے۔

محمدؐ نے مدینہ اور مکہ کو کافی نہیں سمجھا اور ایران و روم کی لالچ بھی رکھتا ہے۔

اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں۔

۲۔ جب پیغمبر اکرمؐ مدینہ کے باہر مسلمانوں کے ساتھ خندق کھود رہے تھے، مسلمان نہایت نظم و نسق اور انہماک
سے دستوں میں منقسم ہو کر خندق کھودنے میں مصروف تھے تاکہ دشمن کے آنے سے پہلے یہ دفاعی کام پایہ تکمیل کو پہنچ
جائے۔ اچانک خندق میں سے ایک سفید اور سخت پتھر نکلا جسے مسلمان جڑانے اور توڑنے میں ناکام ہو گئے۔ مسلمان
پیغمبر اکرمؐ کے پاس آئے اور عاجزیانہ کیا۔ آنحضرتؐ خندق میں اترے، مسلمان سے کدال لی اور زور سے پتھر پر مار دی۔



کدال پتھر پرگی تو ایب شعلہ نکلا۔ اس پر پیغمبر اکرمؐ نے کامیابی کی تکبیر بلند کی۔ مسلمان بھی آپؐ کے ہم آواز ہوئے اور ہر طرف سے تکبیر بلند ہوئی۔ نبی اکرمؐ نے دوسری دفعہ کدال پتھر پر ماری تو پھر شعلہ نکلا اور کچھ پتھر ٹوٹ گیا۔ پیغمبر اکرمؐ اور مسلمانوں نے پھر تکبیر بلند کی، تکبیر کی آواز سے فضا کو بج اٹھی۔ آپؐ نے تیسری مرتبہ کدال جند کی اور باقی پتھر پر زور سے ماری پھر شعلہ نکلا جس سے چاند ہلکے طرف چنک پھیلی اور باقی پتھر بھی ٹوٹ گیا اور پھر تیسری مرتبہ تکبیر کی آواز خندق میں گونجی۔

مسلمان نے عرض کیا: آج میں نے آپؐ سے یہ عجیب و غریب چیز دیکھی ہے

پیغمبر اکرمؐ نے خدا شاد فرمایا: پہلی مرتبہ شعلہ نکلا تو اس میں میں نے جبرائیلؑ کے محلات دیکھے اور میرے بھائی جبرائیلؑ نے مجھے بشارت دی کہ وہ پریم، اسد، کے نیچے آئیں گے۔ دوسرے شعلے میں میں نے روم کے محلات دیکھے اور جبرائیلؑ نے بشارت دی کہ وہ میرے پیرو ہوں گے قبضے میں آئیں گے اور تیسرے شعلے میں میں نے منشاء اور حین کے محلات دیکھے اس پر جبرائیلؑ نے بشارت دی کہ مسلمان انہیں بھی فتح کر لیں گے۔ اسی بیٹے میں نے تکبیر کہی۔ اسے مسلمانو! تمہیں بدلہ ہو۔ مسلمان تو خوشی سے پھوٹے نہیں ساتے تھے اور خدا کا شکر ادا کرتے تھے لیکن منافقین کے چہرے بڑھ گئے اور وہ منہم ہو گئے۔ وہ اعتراض کرنے لگے: کیسی غلط آرزو ہے اور کیسا کمال وعدہ ہے ملائکہ اس وقت تو انہوں نے اپنی جان کے خطرے سے دفاعی حالت اختیار کر رکھی ہے، خندق کھود رہے ہیں، اس چھوٹے دشمن سے بھی جنگ کے قابل نہیں ہیں اور سر میں دنیا کے عظیم ملکوں کی فتح کا سوا سلیا ہوا ہے۔

اس موقع پر مثل بحث آیات نازل ہوئیں جن میں ان منافقین کو جواب دیا گیا ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں مشرکین اور اہل کتاب کے بارے میں گفتگو تھی کہ وہ کیسے ملک اور عزت کو اپنے لیے مخصوص مانتے ہیں اور خود کو اسلام سے بے نیاز سمجھتے ہیں۔ اب ان آیات میں خداوند عالم ان کے اس زعمِ باطل کو غلط ثابت کرتا ہے اور فرماتا ہے: خدا ہی ہر ملک و سلطنت کا مالک ہے، خیر و بیکاری اس کے قبضے میں ہے، وہ قدرتِ مطلقہ ہے اور ہر حالت میں اسی کی پناہ حاصل کرنا چاہیئے۔

موجودات کا حقیقی مالک وہی ہے جو ان کا خالق و پروردگار ہے، جیسا کہ سورہ مومن کی آیت ۶۱ میں ہے:

”ذَٰلِكُمْ اِلٰهُكُمْ مَّرِيكُكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ“

یہ خدا جو تمہارا پروردگار ہے۔ تمام چیزوں کا خالق ہے

وہ وہی ہے جو جسے چاہتا ہے ملک و سلطنت بخش دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے لے لیتا ہے۔ وہی عزت دیتا ہے اور وہی جسے چاہتا ہے خاکِ زلت میں بٹھا دیتا ہے۔ یہ سب کچھ اس کے قبضہ قدرت میں ہے اور اُس کے زیر فرمان ہے۔ وہ اپنے افعال میں مجبور نہیں ہے۔ وہ فاعل مختار ہے نہ کہ فاعل مجبور۔

ہم کہتے ہیں کہ مشیت و ارادہ سے ان آیات میں یہ مراد نہیں کہ وہ بغیر کسی حساب کتاب کے یا بغیر کسی وجہ کے کسی کو کوئی چیز عطا کرتا ہے اور کسی سے کوئی چیز لے لیتا ہے بلکہ اُس کی مشیت حکمت سے وابستہ ہے جہاں



خلقت کا پورا نظام اور عالم انسانیت کا سارا پروگرام اس کی مصلحت و حکمت کے تحت چل رہا۔ اس لیے وہ جو کام بھی کرتا ہے اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہترین اور صحیح ترین ہوتا ہے۔

”بیدك الخیر انتك علیٰ كل شیء قدير“ :

لفظ ”خیر“ کا فارسی میں متبادل ہے ”بہتر“۔ یہ افضل التفصیل اور ایک چیز کی دوسری پر برتری بیان کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ تاہم ہر اچھے امر کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ مثلاً سورہ بقرہ آیہ ۲۶۱ میں ہے :

”و لعلد مؤمن خیر من مشرك“

بت پرست کی نسبت بندہ مرمن سے شاد تھا کہ بہتر ہے

ظاہر ہے کہ مشرک میں تو کوئی اچھائی اور خوبی نہیں کہ کہا جاسکے کہ وہ اچھا ہے اور مؤمن اس سے بہتر ہے۔ افضل التفصیل کے مفہوم میں بھی بعض اوقات یہ بات آجاتی ہے مثلاً سورہ یوسف کی آیہ ۳۴ میں حضرت یوسف کی زبانی فرمایا گیا ہے :

”رَبِّ السَّجْنِ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ“ :

میں — پروردگار ! — یہ غرنک محل زنا جس کی مجھے مصری حویلی رحمت

دے رہا ہے اس سے تیرے لیے زیادہ محبوب ہے۔

واضح ہے زنا کوئی ایسا عمل نہیں کہ جو حضرت یوسفؑ کی نظر میں محبوب ہو کہ اسے قید سے زیادہ محبوب قرار دیا جائے اس بناء پر افضل التفصیل صرف موازنے کے لیے استعمال ہوتا ہے اگرچہ ایک طرف وہ صفت بالکل موجود نہ ہو اور فقط دوسری طرف پائی جاتی ہو۔

”بیدك الخیر“ یہ الفاظ دو حوالوں سے یہ بتاتے ہیں کہ تمام خیرات اور اچھائیاں خدا تعالیٰ میں منحصر ہیں۔

۱۔ لفظ خیر کے ساتھ الف اور لام ہے اور یہاں اسے الف لام استفراق کہتے ہیں۔

۲۔ یہاں مبداء یعنی ”خیر“ بعد میں ہے اور ”بیدك“ جو اس کی خبر ہے وہ پہلے ہے۔

اور یہ دونوں چیزیں صبر کی دلیل ہیں۔

اس لیے ان الفاظ کا معنی کچھ یوں ہوگا : تمام نیکیاں تیرے ہی قبضہ قدرت میں ہیں۔

”بیدك الخیر“ سے ختمنا یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ ہر قسم کی خیر اور سعادت کا سرچشمہ ہے۔ وہ

عزت بختشایا ذات دیتا ہے تو یہ سب کچھ قانون عدالت کے مطابق ہوتا ہے اور اس میں کچھ بھی ”شر“ نہیں ہوتا۔

”رَبُّكَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ“

یہ جملہ گزشتہ صفحے کی دلیل کے طور پر آیا ہے۔ یعنی جب خدا قدرت مطلقہ کا مالک ہے تو پھر کوئی اشکال اور شبہ نہیں

ہے کہ تمام نیکیاں اور اچھائیاں اس کے امداد سے کے ماتحت ہوں گی۔



صالح اور غیر صالح حکومتیں

یہاں ایک اہم مسئلہ درپیش ہوا اور وہ یہ کہ ممکن ہے مندرجہ بالا آیت سے کچھ لوگ یہ نتیجہ اخذ کریں کہ جس شخص کو بھی حکومت حق ہے اور جس سے بھی حکومت کھوجاتی ہے سب ارادۃ الہی کے تحت جوتا ہے اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ تاریخ میں گزرنے والے چنگیز اور ہنگری جیسے جابر اور ستمگر حکمرانوں کی حکومت پر بھی ہر قصہ بقی ثبت کر دی جائے۔ اتفاق ہے کہ تاریخ کہتی ہے کہ یزید بن معاویہ نے اپنی شرمناک اور ظالمانہ حکومت کے جواز اور توجیہ کے لیے اسی آیت سے استدلال کیا تھا۔ لہذا یہی وجہ ہے کہ مفسرین نے اس اعتراض کے جواب میں آیت کی مختلف وضاحتیں پیش کی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ آیت خدائی حکومتوں سے مخصوص ہے یا پیغمبر کریم کی حکومت کے قیام اور قریش کی عالم حکومتوں کے اختتام سے مخصوص ہے۔

لیکن حق یہ ہے کہ آیت ایک کلی اور عمومی مفہوم کی حامل ہے جس کے مطابق تمام اچھی اور بُری حکومتیں خدا تعالیٰ کی مشیت اور ارادے کے مطابق ہیں مگر اس کا مفہوم یہ ہے کہ خداوند عالم نے اس دنیا میں کامیابی اور پیش رفت کے لیے عوامل و اسباب کا ایک سلسلہ پیدا کیا ہے مثلاً ان آثار سے فائدہ اٹھانا ہی مشیت خدا ہے۔ اس لیے خدا کی مشیت سے مراد وہ آثار ہیں جو ان عوامل و اسباب میں پیدا کیے گئے ہیں۔ اب اگر چنگیز، یزید اور فرعون جیسے ظالم اور غیر صالح افراد کامیابی کے ان وسائل سے استفادہ کریں اور کمزور، پسماندہ اور بزدل قومیں اپنے آپ کو ان کے سپرد کر دیں اور ان کی شرمناک حکومت کو گوارا کریں تو یہ ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے۔ کہاوت ہے: ہر قوم اسی حکومت کی لائق ہے جو اُس پر قائم ہے۔ اگر قومیں بیدار ہوں اور جابحدہ نابہر باد شاہوں سے یہ اسباب چھین کر صالح اور اہل با تقویٰ میں دے دیں اور عادلانہ حکومتیں قائم کریں تو یہ بھی ان کے اعمال کا نتیجہ ہے جو الہی اسباب و عوامل سے استفادہ کے طریقے سے وابستہ ہے۔

درحقیقت یہ آیت تمام افراد اور تمام انسانی معاشروں کی بیداری کے لیے ایک پیغام ہے تاکہ وہ ہوشیار رہیں اور اس سے پہلے کہ غیر صالح افراد ان عوامل کے ذریعے معاشرے کے حساس منصب بنسال میں اور تمام اہم موجدوں پر قبضہ کر لیں، یہ خود کامیابی کے وسائل سے فائدہ اٹھائیں۔

”تولج النیل فی الشہار و تولج الشہار فی النیل“ :

”دو بج، لغت میں اور دن کو رات میں داخل کرنا ہے۔ آیت کہتی ہے: اللہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔ قرآن مجید میں آٹھ دیگر مقامات پر بھی اس بات کا تذکرہ موجود ہے۔

اس آیت سے مراد وہی تبدیلی اور جیسی تبدیلی ہے جو مثل بھر میں رات دن میں ہم دیکھتے ہیں۔ یہ تبدیلی اس کرمۃ ارض کے محور کے اپنے مدار سے جھکاؤ کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے جو ۲۳ درجے سے کچھ زیادہ ہے اور اس سے سورج کی کرنوں کے زاویے بھی بدل جاتے ہیں۔ اسی لیے بجا و شملی و خطا استواء سے اوپر والے حصے میں سردیوں کی ابتداء میں دن بڑھنے لگتے ہیں اور راتیں چھوٹی ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس گرمیوں کے آغاز میں راتیں بڑھنے لگتی ہیں اور دن



چھوٹے جوتے جلتے ہیں اور سردیوں کی ابتداء تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جب کہ بلاد جنوبی خط استوا کے نیچے والے حصے میں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔

اس لیے خدا تعالیٰ ہمیشہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا رہتا ہے یعنی ایک میں کمی کرتا ہے اور دوسرے میں اضافہ کر دیتا ہے ممکن ہے کہا جائے کہ خط استوا کے اوپر اور اس طرح قطب شمالی اور قطب جنوبی کے اصلی نقطے میں رات دن تمام سال برابر رہتے ہیں اور ان میں کسی قسم کی تبدیلی اور تغیر نہ ہوتا۔ خط استوا پر سال بھر رات دن باہر باہر گھٹنے کے اور قطب شمالی اور جنوبی میں سال میں ایک رات چھ ماہ کی اور ایک دن بھی چھ ماہ کا ہوتا ہے اس لیے یہ آیت عمومی پہنچ نہیں رکھتی۔ اس کے جواب میں کہنا چاہیے کہ حقیقت میں خط استواء ایک فرضی خط کے سوا کچھ نہیں اور لوگ ہمیشہ سے خط استوا کے اس طرف یا اس طرف زندگی بسر کرتے چلے آ رہے ہیں اس طرح نقطہ قطب بھی فرضی نقطے سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتا اور شمالی و جنوبی قطب میں رہنے والے لوگوں کی زندگی اگر وہاں کوئی رہتا ہو تو یقیناً قطب کے حقیقی نقطے سے وسیع تر جگہ میں ہوگی اس بناء پر دونوں صورتوں میں رات اور دن کا اختلاف موجود ہے۔

مکن ہے اس آیت کا مندرجہ بالا مضمون کے علاوہ ایک اور معنی بھی ہو اور وہ یہ کہ کرۂ ارض میں نصاب کے طبقات کی وجہ سے اس میں ہر ایک رات اور دن پیدا نہیں ہوتے بلکہ فجر اور شفق سے شروع ہو کر دن آہستہ آہستہ پھیلتا جاتا ہے اور رات کا آغاز مشرق کی طرف سے ہوتا ہے اور رات کی تمام جگہوں پر تاریکی چھا جاتی ہے۔ رات اور دن میں تبدیلی جس عرصے سے بھی جو انسان اور کرۂ ارض کے دیگر جہات کے لیے فائدہ مند ہے۔ سبزلوں، فصلوں اور بہت سے جانوروں کی پرورش و تربیت کی تدبیر بھی روشنی اور حرارت کی موجودگی پر مشتبہ ہے۔ آواز پیدا سے جانوروں و حشرات کی شدت اور صحت میں اضافہ ہوتا ہے نباتات اور حیوانات اپنے تکامل کے نئے نئے مرحلے میں آتے ہیں اور انہیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ روشنی اور حرارت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ ضرورت شب و روز کے تبدیلی سے سفر سے پوری ہوتی ہے اور یہاں وہ اپنے ارتقاء کے آخری نقطے تک پہنچ جاتے ہیں۔

اگر رات اور دن ایک سے جوتے تو بہت سے نباتات اور حیوانات نشوونما اور رشد و تکامل سے محروم رہ جاتے اور جانوروں کا تصور بھی نہ ہوتا کیونکہ وہ بھی مختلف میل و شمار اور تربیت کی گروں کے بدلتے ہوئے نالیوں کے مروجہ منت ہیں۔ یوں انسان فطری طور پر موسموں کے اختلاف کے فوائد سے بے بہرہ رہ جاتا۔

اسی طرح اگر آیت کے دوسرے مضمون کو پیش نظر رکھیں کہ رات اور دن تبدیلی کے طور پر تبدیل ہوتے ہیں ناگہانی طور پر نہیں اور شفق، طلوع صبح صادق اور طلوع آفتاب رات اور دن کے درمیان ظہور پذیر ہوتے ہیں تو واضح ہوتا ہے کہ رات اور دن کا یہ تبدیلی عمل زمین میں رہنے والوں کے لیے ایک عظیم نعمت ہے کیونکہ اس طرح وہ آہستہ آہستہ تاریکی یا روشنی سے ہلکا رہ جاتے ہیں اور یہی صورت ان کی جسمانی اور اجتماعی کیفیت میں سازگار ہے جب کہ دوسری صورت بہت سی پریشانیوں کا سبب بن سکتی تھی۔

”وَتَخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتَخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ“

یہ تفسیر قرآن کی کئی ایک آیات میں موجود ہے۔ ارشاد خداوندی ہے: خدا زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے۔

زندہ کو مردہ سے نکالنے سے مراد بے جان موجودات سے حیات کو پیدا کرنا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ جب زمین زندگی

کو قبول کرنے کے قابل ہوئی تو زندہ موجودات بے جان مادہ سے معرض وجود میں آئے۔ علاوہ ازیں جلد سے بدن میں اور تمام عالم کے زندہ موجودات میں بے جان مواد غلیوں (CELLS) کا جزیں کو زندہ موجود میں تبدیل ہو جاتا ہے۔
 زندہ موجودات سے مراد وجود کی پیدائش کا عمل بھی ہلاری غلیوں کے سامنے جاری و ساری رہتا ہے۔
 یہ آیت درحقیقت موت و حیات کے دائمی قانون تبدیل کی طرف اشارہ ہے جو بہت عام اور بہت ہمیدہ ہے اس کے باوجود نہایت جاذب نظر اور عجیب ترین قانون ہے جو ہم پر حکم ران ہے۔

اس آیت کی ایک اور تفسیر بھی ہے جو گذشتہ تفسیر کی نفی نہیں کرتی اور وہ ہے معنوی و روحانی زندگی اور موت کا سلسلہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات صاحبان ایساں جو حقیقی زندہ ہیں بے ایساں افراد جو دراصل مردہ ہیں سے معرض وجود میں آتے ہیں اور بعض اوقات اس کے برعکس بے ایساں افراد اہل ایساں سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ قرآن نے معنوی زندگی اور موت کو متعدد آیات میں ایساں اور کفر سے تعبیر کیا ہے۔

اس تفسیر کے مطابق قرآن قانون توارث کی بنیادوں کو منہدم کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے جب کہ دانشور اسے طبیعت کے قطعی قوانین میں سے سمجھتے ہیں۔ انسان طبیعت کے بے جان موجودات کی طرح نہیں ہے کیونکہ یہ موجودات مختلف عوامل کے زیر اثر مہرور ہیں جب کہ انسان ارادے کی آزادی کا حامل ہے اور یہ بذات خود اللہ کی ایک قدرت خدائی ہے کہ وہ کافر کی اس اولاد سے آثار کفر کو کر دیتا ہے جو واقعی مومن بننا چاہے اور مومن کی اس اولاد سے آثار ایساں دھو ڈالتا ہے جو کافر بننا پسند کرے۔ ارادے کا یہ استقلال جو ہر طرح کے مساعد و نامساعد حالات میں توارث پر غالب آ جاتا ہے، اُسی کی طرف سے ہے۔

یہی مفہوم پیغمبر اسلام کی ایک روایت میں ہم تک پہنچا ہے، تفسیر درمختور میں سلطان فارسی سے منقول ہے:

رسول اللہ نے "تَخْرِجُ نَجَسٍ مِنَ الصَّيِّتِ"..... کی

تفسیر بیان کرتے ہوئے فرمایا: اللہ تعالیٰ مومن کو کافر کی صلب سے اور کافر کو مومن کی صلب سے نکالتا ہے۔

"وَمَنْ زُفِّتَ مِنْ قَشَاءٍ بَغْيٍ حَسَابٌ"

اصطلاح کے مطابق یہ جملہ "خاص" کے بعد "عام" کے قبیل میں سے ہے۔ گذشتہ جملوں پر خدا کی طرف سے بندوں کو رزق دینے کے چند نمونے بیان ہوئے تھے اور اس جملے میں مسند عمومی صورت میں بیان کیا گیا ہے جس میں ہر طرح کے رزق اور تمام عطیات کا ذکر آ گیا ہے یعنی نہ صرف یہ کہ عزت، حکومت، موت اور زندگی خدا کے قبضہ قدرت میں ہے بلکہ ہر روزی، نعمت اور عنایت اُسی کی طرف سے ہے۔

"بغیر حساب" اس طرف اشارہ ہے کہ عنایات خداوند کے دربار اس قدر وسیع اور گہرے ہیں کہ وہ جتنی بھی مقدار جسے بھی بخش دے ان میں کچھ فرق نہیں آتا اور وہ حساب رکھنے کا محتاج نہیں کیونکہ حساب تو وہ رکھتے ہیں جن کا سرمایہ محدود ہو اور اس کے کم یا ختم ہونے کا خوف ہو لیکن وہ خدا جو عالم وجود و کمالات کا بے کلام مسند ہے اسے کم ہونے کا خوف ہے نہ اس سے کوئی حساب لینے والا ہے اور نہ ہی اسے حساب کی ضرورت ہے۔



جو کچھ کہا گیا ہے اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ جملہ ان آیات کی نفی نہیں کرتا جن میں تقدیر الہی، حساب کتاب، لوگوں کی لیاقت و اجیت اور خلقت کی حکمت و تدبیر کا تذکرہ ہے۔

جبر و اکراہ کی نفی

یہاں مختصر طور پر اس نکتے کی یاد دہانی ضروری ہے کہ قانون آفرینش، حکم عقل اور دعوتِ انبیاء کی نظر سے ہر شخص سعادت و خوش بختی، عزت و ذلت اور رزق کے حصول کے لیے کوشش کرنے میں آزاد اور مختار ہے، تو پھر مندرجہ بالا آیت میں ان چیزوں کی نسبت خدا تعالیٰ کی طرف کیونکر دی گئی ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ عالم آفرینش اور افرادِ بشر کے پاس جو عنایات، عطیات، توانائیاں اور صلاحیتیں ہیں سب کا اصلی سرچشمہ خدا ہے۔ اُسی نے عزت اور خوش بختی کے تمام ذرائع لوگوں کے اختیار میں دیے ہیں۔ اُسی نے اس دنیا کے لیے ایسے قوانین وضع کیے ہیں کہ جنہیں ٹھکرا دینے کا نتیجہ ذلت ہے اس لیے ان تمام کی نسبت اس کی طرف دی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ نسبت انسان کے ارادے کی آزادی کی نفی نہیں کرتی کیونکہ یہ انسان ہی ہے جو اللہ کی ان عنایات اور عطیات سے اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کے ذریعے صحیح یا غلط فائدہ اُٹھاتا ہے۔

۲۸- لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ
الْمُؤْمِنِينَ ۚ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ
فِي شَيْءٍ إِلَّا أَنْ تَتَّبِعُوا مِنْهُمْ ثِقَلٌ ۖ وَيُحَذِّرُكُمْ
اللَّهُ نَفْسَهُ ۖ وَاللَّهُ الْعَصِيمُ ۝

ترجمہ

۲۸- اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست اور سرپرست نہ بناؤ اور جو شخص ایسا کرے گا اُس کا کسی چیز میں اللہ سے کوئی ربط نہیں ہے (یعنی اُس کا رابطہ پروردگار سے باطل ٹوٹ چکا ہے) مگر یہ کہ ان سے (اور اہم تر مقاصد کے لیے) قیہ کرو اور خدا تمہیں اپنی نافرمانی سے ڈراتا ہے اور تمہاری بازگشت خدا کی طرف ہے۔



تفسیر

غیروں سے رشتہ

”اولیاء“ ”ولی“ کی جمع ہے۔ یہاں اس کا معنی ہے حامی، مددگار، ہم سپاہی، یار اور یاد۔ یہ آیت فی الواقع مسلمانوں کو ایک اہم سیاسی، اجتماعی اور معاشرتی درس دیتی ہے کہ وہ غیروں سے دوستی، حامی، مددگار یا کسی اور حواسے سے کوئی ربط نہ رکھیں اور ان کی چکنی چٹری باتوں، دلکش تقریروں، بظاہر گہری اور بطناً بہت سے دھوکا دہ کھائیں کیونکہ تاریخ گواہ ہے کہ اہل ایمان اور با مقصد زندگی گزارنے والوں نے اس طرح سے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔

استبداد اور سامراج کی تاریخ کو غور سے دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ اس نے ہمیشہ مظلوموں کی نظر میں دوستی، غم گساری اور انسان دوستی کے لباس میں اثر و نفوذ پیدا کیا ہے۔ یہاں تک کہ نفوذ، استبداد جس کا معنی ہے ”آبادی کی کوشش کرنا“ اسی مفہوم کی نشاندہی کرتا ہے کہ استبداد ہمیشہ استبداد شدہ معاشرے کی جڑوں میں اپنے بچے مضبوط کرنے کے بعد وہاں کے عوام پر بے دری سے لوٹ پڑتے ہیں اور ان کا سب کچھ نوٹ لے جاتے ہیں۔

اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر آیت میں شدید تنبیہ اور دھمکی آئی ہے اور وہ یہ کہ جو شخص اپنے تئیں غیروں کے سپرد کر دے گا وہ خدا سے ہر قسم کا ربط منقطع کر لے گا۔

”من دوست المؤمنین“ اس طرف اشارہ ہے کہ معاشرتی اور اجتماعی زندگی میں ہر شخص مجبور ہے کہ اس کے کچھ دوست احباب ہوں لیکن اہل ایمان کو چاہیے کہ وہ دوستی اور سہارہ پرستی کے لیے ایمان والوں کا ہی انتخاب کریں اور ان کی جگہ کافروں سے رشتے استوار نہ کریں۔

”فلیس من ائله فی شیء“

اس جملے کا مفہوم یہ ہے کہ جو افراد دشمنانِ خدا سے دوستی اور ہم کاری کرتے ہیں وہ کسی چیز میں خدا سے مربوط نہیں ہیں یعنی وہ فرماں الہی، خدا پرستوں اور فرمانِ خدا کے پیروکاروں سے بیگانے ہیں اور ان سے بر لمانہ سے ان کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔

”اِنَّ اَنْ تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ دُؤْلًا“

اس جملے کے ذریعے مندرجہ بالا حکم میں استثناء کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ تعین کے موقع پر حرج نہیں کہ مسلمان اپنی جان کی حفاظت کے لیے یا ایسے اور امور میں بے ایمان افراد سے دوستی کا اظہار کریں اور آخر میں دو مزید جملوں سے مندرجہ بالا حکم کی تاکید کی گئی ہے:-

”وَبِحَذْرٍ كُمْ اِنَّهُ فَعِلٌ“

یعنی — خدا تمہیں اپنی سزا اور غضب سے ڈراتا ہے

”وَالْحَبْ اَقْلَهُ الْعَصْبِ“

یعنی — تم سب کی بازگشت خدا کی طرف ہے اور اگر تم نے دشمنوں

سے دوستی کر لی تو اپنے اعمال کا نتیجہ بہت جلد دیکھ لو گے۔

”تقیہ“ ایک حفاظتی ڈھال ہے

یہ صحیح ہے کہ کہیں انسان اعلیٰ ترین مقام مثلاً حقیقہ شرافت، تقویت حق اور باطل کی کمر توڑنے کے لیے اپنی جان عزیز تک خدا کرنے کو تیار ہوتا ہے لیکن کیا کوئی عقل مند بغیر کسی اہم مقصد کے اپنی جان خطرے میں ڈالنے کو جائز کہہ سکتا ہے اسوہ نے صراحت سے اجازت دی ہے کہ جب انسان کی جان، اہل اور عزت و کار و خطرے میں ہو اور اظہار حق سے کوئی اہم نتیجہ اور نائدہ بھی حاصل نہ ہوتا ہو تو وقتی طور پر اظہار حق نہ کیا جائے اور اپنے فرائض مخفی طور ادا کر لیے جائیں جیسا کہ مندرجہ بالا آیت میں قرآن نے یاد دلایا ہے ایک اور تعبیر کے ذریعے سورہ نحل آیہ ۱۰۶ میں ہے:

”اَلَا مَن اُكْثِرَہٗ وَّقَلْبُہٗ مُطَاعٌ فَلَا اِلٰہَ اِلَّا نِیْعَانُ“

مگر جو شخص مجبور ہو جائے اور اپنے ایمان کے خلاف کسی چیز کا اظہار

کر دے، جب کہ اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو۔

تاریخ اور حدیث کی اسلامی کتابوں نے عمار، ان کے والد اور والدہ کی سسر گذشت کو فراموش نہیں کیا کہ وہ بت پرستوں کے جھگڑ میں پیش گئے تھے انہوں نے انہیں سنت اذیت میں مبتلا کر دیا اور کہتے تھے کہ اسلام سے بیزاری کا اظہار کریں۔ عمار کے مال باپ نہ مانے اور مشرکین کے ہاتھوں قتل ہو گئے لیکن عمار نے ان کے کہنے کے مطابق اظہار کر دیا بعد میں خدائے بزرگوار کے خوف سے روتے ہوئے پیغمبر اکرم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ان سے فرمایا:

”اِنَّ عَادَ وَاللَّتِ فَعَدْلَهُمْ“

اگر پھر پھر سے جاؤ تو وہ جو کہیں کہہ دینا

بول آپ نے عمار کے اضطراب اور گریہ کو سکون بخشا۔

جس نکتے کی طرف پوری توجہ کی ضرورت ہے یہ ہے کہ تمام مقامات پر ”تقیہ“ کا حکم ایک جیسا نہیں بلکہ وہ کہیں واجب ہے، کہیں حرام ہے اور کہیں مباح ہے۔

”تقیہ“ اس حالت میں واجب ہوتا ہے جب بغیر کسی اہم نائدہ سے کہ انسان کی جان خطرے سے دوچار ہو

لیکن جہاں ”تقیہ“ باطل کی تردید، لوگوں کی گمراہی اور ظلم و ستم کی تقویت کا باعث ہو وہاں حرام اور منوع ہے۔

اسی بنیاد پر اس سلسلے میں کیے گئے تمام اعتراضات کا جواب دیا جائے گا۔

حقیقت میں اعتراض کرنے والے تحقیق کرتے تو انہیں پتہ چلا کہ یہ شیعوں کا ہی عقیدہ نہیں بلکہ سنی ”تقیہ“ اپنی



مگر ہر ایک قطعی حکم عقل سے اور انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ یہ دنیا کے تمام عقائد جب کہیں اپنے آپ کو کسی دودھ سے پر پاتے ہیں جہاں یا تو انہیں اپنے عقیدے کو چھپانا پڑتا ہے یا عقیدے کا انکار کر کے اپنی جان، مال اور عزت کو خطرے سے دوچار کرنا پڑتا ہے تو اگر عقیدے کا انکار کرنا جلل و مال اور عزت و آبرو کی قربانی کی قیمت رکھتا ہو تو وہ فساداری کی راہ کو درست سمجھتے ہیں لیکن اگر اس کو واضح فائدہ نظر نہ آئے تو پھر عقیدے کو چھپانا بہتر سمجھتے ہیں۔

”تقیہ“ مقابلے کی دوسری صورت

مذہبی، اجتماعی اور سیاسی مقابلوں کی تاریخ میں ایسے واقعات درپیش آتے ہیں کہ جب ایک حقیقت کا دفاع کرنا ہو سکے کلمہ کلام مقابل کریں تو وہ خود، ان کا نظریہ، مکتب اور مذہب نابودی کا شکار ہو جائے یا کم از کم خطرے میں پڑ جائے۔ اس کی مثال نبی امیہ کی غاصب حکومت کے زمانے میں شیعیان مکی کی حالت ہے۔ ایسے مواقع پر صیغ اور عاتلانہ راہ یہ ہے کہ اپنی توانائیاں ضائع نہ کی جائیں اور اپنے مقدس مقاصد و اہداف کے لیے غیر واضح اور منفی طور پر مقابلہ بدرجہ رکھا جائے ”تقیہ“ درحقیقت ایسے مکاتب فکر اور ان کے پیروکاروں کے لیے ایسے لمحات میں مقابلے کی ایک تبدیل شدہ شکل کا نام ہے۔ یہ طریقہ انہیں تباہی سے بچا سکتا ہے اور اپنی سرگرمیوں جاری رکھنے کا موقع دیتا ہے۔ جو لوگ بے سوچے سمجھے ”تقیہ“ پر قلم بھران پھیر دیتے ہیں بنانے ایسے مواقع کے لیے ان کے پاس کیا طریقہ کار ہے۔ کیا نابود اور ختم ہو جانا اچھا ہے یا مقابلے کو صیغ اور منطقی صورت میں باقی رکھنا۔ دوسری راہ کو ”تقیہ“ کہتے ہیں اور پہلی صورت کو کوئی شخص بھی تجویز نہیں کر سکتا۔

۲۹۔ قُلْ اِنْ تَخْشَوْنَ مَا فِیْ صُدُورِکُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ یَعْلَمْہُ اللّٰہُ ۚ وَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝

ترجمہ

۲۹۔ کہیے کہ جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے اسے چھپائے رکھو یا آشکار کر دو، خدا (بہر حال) اسے جانتا ہے اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے۔ وہ اس سے آگاہ ہے اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیت میں کفار سے تعاون و دوستی کرنے اور ان پر اعتقاد و مجبور کرنے سے سختی سے منع کیا گیا ہے۔ ہاں البتہ "تقیہ" کے مقام کے لیے اس حکم میں استثناء رکھا گیا ہے۔

ممکن ہے کہ لوگ بعض مواقع پر تقیہ کا نام لے کر غلط طور پر کفار سے دوستی کر لیں یا انہیں اپنا سرپرست بنائیں دوسرے لفظوں میں تقیہ کے مفہوم سے غلط فائدہ اٹھائیں اور اس کا نام لے کر دشمنان اسلام سے تعلقات استوار کر لیں اس لیے محل بحث آیت میں ایسے افراد کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے علائقہ میں علم کو فراموش نہ کریں کیونکہ خدا تعالیٰ تو سینوں میں چھپے ہوئے اسرار سے ظہری امور کی طرح واقف ہے۔

درحقیقت یہ آیت لوگوں کو اس طرف متوجہ کرتے ہوئے کہ خدا تعالیٰ دلوں کے رازوں کو جانتا ہے، یہ اشارہ کرتی ہے کہ وہ نہ صرف اسرار سے آگاہ ہے بلکہ یہ تو اس کے علم کے پایاں کا ایک مختصر سا گوشہ ہے اس کا علم تو زمین اور آسمانوں کی دستوں پر محیط ہے اور اس کے علاوہ وہ توانا بھی ہے اور گناہگاروں کو سزا دینے کی قدرت رکھتا ہے "واللہ علیٰ کلّ شئ قدير"۔

۳۰۔ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۖ وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ تَتَوَدُّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَ أَمَدًا بَعِيدًا ۗ وَيُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ ۗ وَاللَّهُ سَرِيعٌ ۖ وَفِي ۖ بِالْعِبَادِ ۝

ترجمہ

۳۰۔ وہ دن کہ جب ہر شخص اپنے انجام دیے ہوئے نیک کام کو موجود پائے گا اور خواہش کرے گا کہ (کاش) اُس کے اور اُس کے بُرے کاموں کے درمیان زیادہ زمانی فاصلہ ہوتا اور خدا تمہیں (اپنی نافرمانی سے) ڈراتا ہے اور اس کے باوجود، اللہ تمام بندوں پر مہربان ہے۔



تفسیر

یہ آیت روزِ قیامت نیک و بد اعمال کے حاضر ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ آیت کہتی ہے: تمام لوگ بلاستثناء جو بھی نیک و بد انجام دے چکے اُس دن موجود پائیں گے بس فرق یہ ہوگا کہ نیک اعمال کو دیکھ کر خوش ہوں گے اور بُرے اعمال دیکھ کر وحشت و پریشانی میں مبتلا ہو جائیں گے اور چاہیں گے کہ یہ دن سے دُور رہیں۔

لفظ میں "اعد" کا معنی ہے "محدود زمانہ" "ابد" اور "اعد" میں فرق یہ ہے کہ "ابد" غیر محدود زمانے کو کہتے ہیں اور "اعد" محدود زمانے کو اور اکثر اوقات "اعد" اتنا بڑے زمانے کے مفہوم میں آتا ہے مگر بعض اوقات مطلقاً "محدود زمانہ" کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

اس بناء پر مندرجہ بالا آیت میں یہ معنی پیدا ہوتا ہے کہ گنہگار زندہ کریں گے کہ ان کے اور ان کے بُرے اعمال کے درمیان زیادہ زمانے کا فاصلہ ہو اور یہ اپنے کردار سے ان کی انتہائی بیزاری کا اظہار ہے کیونکہ تنفر اور بغیراری کے اظہار کے لیے یہ مکانی فاصلے کی نسبت زمانی فاصلہ زیادہ سوزوں ہے کیونکہ مکانی فاصلے میں حاضر ہو جانے کا احتمال زیادہ ہو سکتا ہے جبکہ زمانی فاصلے میں اس کا احتمال بالکل نہیں ہے مثلاً عالمی جنگوں کے دوران میں جو شخص میدانِ جنگ سے دور زندگی بسر کرتا تھا وہ بھی تھوڑا بہت پریشانی اور اضطراب کا شکار ہوتا تھا۔ لیکن جو لوگ زمانی اعتبار سے ان جنگوں سے دور ہیں انہیں ان سے پریشانی کا کوئی احساس نہیں بعض مفسرین نے اگرچہ "اعد" کو یہاں مکانی فاصلے کے مفہوم میں لیا ہے لیکن لغت میں ظاہراً یہ لفظ اس معنی کے لیے نہیں آیا۔

جیسے گنہگار زندہ کریں گے کہ کاش ان کے اور ان کے اعمال کے درمیان زیادہ زمانی فاصلہ ہوتا اس کے برعکس نیکوکار اپنے اعمال دیکھنے کے بعد سوچیں گے کہ کاش بہت جلد ان تک پہنچے جوتے اور تھوڑے سے زمانے کا فاصلہ بھی نہ ہوتا۔

"و یحذّرکم املہ نفسہ" و املہ مرء و عتق بالعباد؛

پہلے تو خدا تعالیٰ لوگوں کو اپنے حکم کی نافرمانی سے ڈراتا ہے اور پھر بندوں پر اپنی مہربانی کا ذکر کرتا ہے یوں لگتا ہے کہ آیت کے یہ دونوں حصے سنتِ قرآنی کے مطابق خوف اور امید کا ایک امتزاج ہیں لیکن یہ بھی احتمال ہے کہ دوسرا حصہ "املہ مرء و عتق بالعباد" پہلے حصے "و یحذّرکم املہ نفسہ" کے لیے تاکید ہو۔ بالکل اس طرح جیسے کوئی شخص دوسرے سے کہے کہ میں تجھے اس کام کے خطرناک انجام سے ڈراتا ہوں اور چونکہ میں تجھ پر مہربان ہوں لہذا تجھے خطرے سے باخبر کر رہا ہوں۔ اگر مجھے تجھ سے محبت نہ ہوتی تو تجھ اس خطرے سے سزاگاہ نہ کرتا۔

تجسم اور حضورِ اعمالِ قرآن کی نظر میں

محل بحث آیت میں قرآن وضاحت سے قیامت کے دن اعمال کے تجسم ہونے اور حاضر ہونے کے امر کو پیش کرتا ہے۔ "تجدّد و جدان" (پانا، ضد ہے "فقدان" (نابود ہونا کی "خیر" اور "سمو" دونوں الفاظ یہاں نکرہ

کی صورت میں ہیں جو عمومی مفہوم دیتے ہیں یعنی روز قیامت انسان اپنے اچھے بُرے اعمال چاہے کم مقدار میں ہی کیوں نہ ہوں اپنے سامنے حاضر پائے گا

بعض چاہتے ہیں کہ اس آیت کی اور اس جیسی دیگر آیات کی یہ توجیہ کریں کہ اعمال کے حضور سے مراد یہ ہے کہ اُن کی جزا یا سزا حاضر ہوگی یا اس سے مراد اعمال نامہ ہے کہ جس میں تمام اعمال ثبت ہوں گے لیکن واضح ہے کہ یہ توجیہات آیت کے ظہری مفہوم سے میل نہیں کھاتیں کیونکہ آیت وضاحت سے بتاتی ہے کہ قیامت کے دن انسان خود عمل کو موجود پائے گا اور آیت میں ہے کہ گنہگار آرزو کرے گا کہ کاش اس کے اور اُس کے انجام دیے ہوئے بُرے عمل کے درمیان جلدائی پیدا ہو جائے، یہاں بھی خود عمل زیر بحث ہے نہ کہ نام اعمال اور نہ ہی عمل کی جزا و سزا۔

اس ضمن میں دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ گنہگار پسند کرے گا کہ اس کے اور اس کے عمل کے درمیان زیادہ فاصلہ ہو جائے اور اپنے عمل کی نابودی کی آرزو ہو کر نہیں کرے گا۔ یہ امر فاشانہ ہی کرتا ہے کہ اعمال کی نابودی اور غلتے کا امکان نہیں ہے۔ اسی بناء پر وہ اس کی تمنا نہیں کرے گا کہ بہت سی دوسری آیات بھی اس مفہوم کی تائید کرتی ہیں۔ مثلاً سورہ کہف کی آیت ۴۹ میں ہے۔

”وَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا وَلَا

يُظْلِمُ سَرَابٌكٌ أَحَدًا“

”قیامت کے دن گنہگار اپنے تمام اعمال کو اپنے سامنے

موجود پائیں گے اور خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا۔“

سورہ زلزال کی آیت ۷ اور ۸ یوں ہے:

”فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ

وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ“

”جو شخص ایک یا بُرا عمل انجام دے گا، کتنا ہی کم

ہو اسے اپنی آنکھوں سے دیکھے گا“

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ بعض مفسرین کسی کجبار ان آیات میں لفظ جزا کو ”مقدّر“ مانتے ہیں حالانکہ یہ

آیات کے ظہری مفہوم کے خلاف ہے۔

بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دنیا دوسری دنیا کی کھیتی ہے اور انسان کا عمل اس دانے کی طرح ہے جسے

کس زمین میں ڈالتا ہے پھر اُسی دانے میں رشد اور نشوونما پیدا ہوتی ہے اور اسی دانے کو بہت سے اضافے کے ساتھ

اُٹھاتا ہے انسان کے اعمال میں بھی بہت سی تبدیلیاں اور تغیرات رونما ہوں گے اور پھر وہ خود اس کی طرف پلٹ آئیں

گے اور یہ عمل قیامت کا لازمہ ہے۔ جیسا کہ عشاء وند عالم سورہ شوریٰ آیہ ۲۰ میں فرماتا ہے:

”مَنْ كَانَ يَرِيْدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ لَعَلَّهِ فِي حَرْثِهِ“



”جو آخرت کی کیفیت چاہتا ہے اُس کی کیفیت میں ہم اضافہ کریں گے۔“

بعض دیگر آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جہان کے نیک عمل دوسرے جہان میں نور اور روشنی کی صورت میں ظاہر ہوں گے۔ منافقین اس نور کے لیے مومنین سے تعاضد کریں گے اور کہیں گے:

”انظرونا نقتبس من نورکم“

مٹھو! تاکہ ہم تمہارے نور سے کچھ فائدہ اٹھالیں

جواب میں ان سے کہا جائے گا:

”ارجعوا وراءکم فالتمسوا نورا“

کوٹ جاؤ اور دنیا میں جا کر یہ نور حاصل کرو (حدید-۱۳)

یہ اور اس جیسی بہت سی آیات بتاتی ہیں کہ قیامت کے دن ہم اپنے اسی عمل کو کامل تر صورت میں پائیں گے۔ اسی کا نام تجسم اعمال ہے جس کے علماء اسلام قائل ہیں۔ اسلام کے عظیم پیشواؤں سے اس ضمن میں بہت سی روایات منقول ہیں جو اسی مفہوم پر دلالت کرتی ہیں۔ یہاں ہم صرف ایک کو نمونے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ایک شخص نے پیغمبر اسلامؐ سے نصیحت کی تو آپؐ نے فرمایا:

”لا بدلت یا قیس! من قدرین یدفن معک وهو

محمّد وانت میت فان کان حکریما اکرمک وانت

کان لثیما اسلمک مثم لا یحشر الا معک ولا تحشر

الا معہ ولا تستل الا عنہ فلا تجعلہ الا صالحا

فانما انت صالح انت بل و ان فسد لا تسترحش

الا معہ وهو فعلک“

”اس سے معذرتیں کہ تیرا ایک ہم نشین ہے جو موت کے بعد تیرے ساتھ ہی

دفن ہوگا لیکن وہ زندہ ہوگا اور تیرا مردہ۔ اگر وہ نیک اور عظیم ہوا تو تیرا احترام اور عزت

کرسے گا اور اگر وہ پست اور گینہ ہوا تو تجھے عار و کشتی دے گا۔ وہ تیرے علاوہ

کسی اور کے ساتھ محشر نہیں ہوگا اور تو بھی میدانِ قیامت میں اس کے علاوہ کسی اور

کے ساتھ نہیں آئے گا۔ تجھ سے اُس کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوال نہیں کیا

جائے گا۔ لہذا کوشش کرو کہ اسے بہتر شکل میں انجام دو کیونکہ وہ درست ہوا تو تو

اُس سے مانوس رہے گا ورنہ اس کے علاوہ کسی اور سے تجھے وحشت نہ ہوگی اور وہ

تیرا مل ہے۔“

اس بحث کی وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ اعلیٰ کی جزا و سزا کی کیفیت کے بارے میں تحقیق کی جائے۔



جزا و سزا کے بارے میں علماء کے نظریات

اعمال کی جزا اور سزا کے بارے میں علماء کے مختلف عقائد و نظریات ہیں جو یہاں بیان کئے جاتے ہیں:

(۱) بعض کا عقیدہ ہے کہ اعمال کی جزا اس دنیا کی جزا و سزا کی طرح طے شدہ امور کی مانند ہے، یعنی جیسے اس دنیا میں ہر نبی کے کام کے لیے قانون بنائے، دلوں کی طرف سے ایک سزا معین ہے اسی طرح خدا نے بزرگ و برتر نے ہر عمل کے لیے ایک خاص سزا یا جزا معین کر رکھی ہے۔ یہ نظریہ اجر و مزدوری اور مقرر شدہ سزائیں کا سہ ہے۔

(۲) بعض کا اعتقاد ہے کہ تمام سزائیں اور جزائیں نفس اور روح انسانی کی پیداوار ہیں جنہیں انسانی روح بغیر اختیار کے اس دنیا میں پیدا کرتی ہے کیونکہ نیک اور بد اعمال روح انسانی میں اچھے اور بُرے ملکات پیدا کر دیتے ہیں اور یہ ملکات انسانی ضمیر اور ذات کا جز بن جاتے ہیں اور ان ملکات میں سے ہر ایک اپنے حسبِ حال نعمت یا عذاب کی ایک شکل بناتا ہے۔ جن لوگوں کا باطن اس دنیا میں اچھا ہے ان کا تعلق اچھے افکار و تصورات سے رہتا ہے اور ناپاک افراد سوتے جاگتے باطل افکار اور بُرے تصورات میں مشغول رہتے ہیں یہی ملکات قیامت کے دن نعمت و عذاب اور راحت و تکلیف کی تخلیق کریں گے۔ دوسروں لفظوں میں جنت کی نعمتوں اور دوزخ کی سزائوں کے بارے میں جو کچھ بھی ہم پڑھتے ہیں وہ انسان کی اچھی بُری صفات کی مخلوق ہیں کوئی دوسری چیز نہیں۔

(۳) بزرگ علماء اسلام نے ایک اور راہ انتخاب کی ہے اور اس کے لیے آیات و روایات میں سے بہت سے ثواب پیش کئے ہیں، ان کے موقف کا خلاصہ یہ ہے:

بندہ کر فار۔ اچھا ہو یا بُرا ایک دنیاوی شکل و صورت رکھتا ہے جس کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں اور ایک اس کی اُخروی شکل و صورت ہے جو اس وقت عمل میں چھپی ہوئی ہے اور قیامت کے دن تغیر و تبدل کے بعد وہ اپنی دنیاوی شکل و صورت کھو بیٹھے گا اور ایک نئی شکل میں سامنے آئے گا جو عمل کرنے والے کے لیے راحت و سکون یا آزار و تکلیف کا باعث ہوگی۔

ان تینوں مذکورہ نظریات میں سے، آخری نظریہ بہت سی شرعی آیات سے مطابقت اور موافقت رکھتا ہے۔ ان کے اعمال صلاحیتوں اور توانائیوں کی مختلف شکلیں ہیں، قانون بقائے مادہ کی ترمیم شدہ شکل کے مطابق توانائی (ENERGY) کبھی ختم نہیں ہوتی اور ہمیشہ اس دنیا میں رہتی ہے اگرچہ ظاہراً ہم یہی سمجھتے ہیں کہ وہ ختم ہو چکی ہے۔

ان اعمال کی بقاء اور ابدیت کی وجہ سے قیامت میں ہر شخص حساب کتاب کے وقت اپنے تمام اعمال دیکھ سکے گا چاہے اسے تکلیف دہ یا آگاہی ہو یا آگاہی نہ ہو۔ انسانی ذرائع اور وسائل ابھی تک اس قابل نہیں ہو سکے کہ وہ چند ایک کے سوا گزشتہ لمحات کے بارے میں حقائق معلوم کر سکیں۔

اللہ ماضی قریب میں بارے میں سائنس دانوں نے "انٹرایکٹ" نامی ایک دور میں دنیا کی بے پروائی سے جوئے چند لمحہ کی قدر سے متعلق ہے۔ یہ نئی مشین



لیکن مسلم ہے کہ اگر کوئی کامل تر آراء وجود میں آجائے یا نکلے اور ادراک زیادہ کامل ہوں تو ہو سکتا ہے کہ جو کچھ گذشتہ زمانے میں ہو چکا ہے ہم اسے محسوس کر سکیں اور جان سکیں۔

ابنہ اس میں بھی کوئی مضائقہ اور مانع نہیں کہ بعض جزائیں اور سزائیں بے شدہ قوانین کے حوالے سے ہوں۔

تجسم اعمال آج کے علم کی روشنی میں

گذشتہ اعمال کے تجسم ہونے کے امکان کے ثبوت کے لیے ہم آج کے طبیعیات کے مسئلہ اصول سے استفادہ کر سکتے ہیں جس کے مطابق مادہ توانائی میں تبدیل ہو جاتا ہے مادہ اور توانائی کے بارے میں طبیعیات (Physics) کا جدید نظریہ یہ ہے کہ مادہ اور توانائی ایک حقیقت کے دو مظہر ہیں۔ مادہ متراکم اور منضبط توانائی ہے جو مخصوص حالات میں توانائی میں بدل جاتا ہے اور بعض اوقات ایک گرم مادہ میں چھپی ہوئی توانائی میں (Explosion) کی طاقت تیس ہزار ٹن ڈائنامیٹ سے زیادہ ہوتی ہے۔

نیز یہ ہوا کہ مادہ اور توانائی ایک ہی حقیقت کے دو مختلف روپ ہیں اور ان کی بقاء کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ بعید نہیں کہ چھپی ہوئی توانائیاں دوبارہ مل جائیں اور جسم کی صورت اختیار کر لیں، اصلاح اور راستی کی راہ پر صرف شدہ توانائیاں اور ظلم و جور کے راستے پر صرف شدہ توانائیاں آپس میں مل کر قیامت کے دن ایک خاص جہانی صورت میں ڈھل سکتی ہیں۔ اس میں کوئی مانع نہیں کہ نیک اعمال جاذبِ نظر اور خوبصورت مادی نعمتوں کی شکل اختیار کر لیں اور بُرے اعمال سزا اور عذاب کے سانچوں میں ڈھل جائیں۔

۳۱۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

۳۲۔ قُلْ اَطِيعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِيْنَ ۝

ترجمہ: (۳۱) اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری گناہوں کو بخشتے گا۔ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

بیٹہ سہم (Heat system) کے ذریعے کام کرتی ہے۔ یہ اجسام سے نکلنے والی ہوا کو جذب کرتی ہے اور مخصوص ٹرک گرم کے ذریعے انہیں سرد اور گرم درجوں میں تنظیم کرتی ہے۔ پھر انہیں واضح یا نامی ایک تصویر کی صورت میں پیش کرتی ہے اور نہر کیلین، شمارہ ۱۹۹۸، سال ۱۹۹۸ء میں اس ذریعے سے جرم کے وقوع اور کیفیت کو معلوم کیا جاسکتا ہے اور مجرموں کے گزشتہ کردار کی تصویریں کے سامنے پیش کی جاتی ہے اور ان کے جرم کا پردہ چاک ہو جاتا ہے۔



ترجمہ

۳۱۔ کہہ دیجیے! اگر خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو تاکہ خدا بھی تمہیں اپنا دوست بنا لے اور تمہارے گناہوں کو بخش دے اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

۳۲۔ کہہ دیجیے! خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اگر روگردانی کریں تو خدا کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔

شان نزول

ان آیات کے بارے میں مجمع البیان اور المستدر میں دو شان نزول مذکور ہیں : پہلی : یہ کہ کچھ افراد نے پیغمبر اکرمؐ کے سامنے پروردگار کی محبت کا دعویٰ کیا جب کہ وہ احکام الہی پر کم عمل کرتے تھے اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں۔ دوسری : یہ کہ خیران کے کچھ حسانی مدینے میں پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی گفتگو کے دوران میں کہنے لگے ہم اگر حضرت مسیحؑ کا بہت زیادہ احترام کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہی خدا سے محبت ہے اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور انہیں جواب دیا گیا۔

تفسیر

حقیقی محبت

پہلی آیت کہتی ہے کہ محبت ایک نفسِ متعلق ہی کا نام نہیں بلکہ انسان کے عمل میں اس کے آثار دکھائی دینے چاہئیں۔ جو شخص پروردگار سے محبت کا مدعی ہے اس کے لیے پہلی نشانی یہ ہے کہ وہ پیغمبر اور اللہ کے پیچھے ہونے کی پیروی کرے "ان حکمتہم محبتون اللہ فاشیعون"..... حقیقت میں محبت کا یہ فطری ثمر ہے کہ وہ انسان کو محبوب اور اس کی خواہشات کی طرف کھینچ لے جاتی ہے البتہ کمزور محبتیں بھی ہو سکتی ہیں کہ جن کی شعلہ دل سے باہر نہ پڑ سکے لیکن ایسی محبتیں اس قدر حقیر ہیں کہ انہیں محبت کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ ایک حقیقی محبت یقیناً عملی آثار کی حامل ہوتی ہے اور ایسی محبت محب کا محبوب سے ضرور متعلق قائم کر دیتی ہے، محبوب کی آرزوؤں کی راہ میں شمرِ بخش ہوتی ہے اور اس کی آرزوؤں کی تکمیل کے لیے محب کو سعی و کوشش کے لیے ایسا تہ کر دیتی ہے۔



اس بات کی دلیل اور وجہ واضح ہے کیونکہ انسان کا کسی سے عشق اور ٹکڑا یقیناً اس لیے ہے کہ اسے اس میں کوئی کمال نظر آیا ہے۔ انسان کبھی کسی ایسی شے سے عشق و محبت نہیں کرتا جس میں کوئی نقطہ کمال نہ ہو۔ اس لیے خدا سے انسان کی محبت کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے کمال کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ اس لیے مسلم ہے کہ ایسی ہستی کے تمام پروگرام اور احکام بھی کامل ہوں گے۔ ان حالات میں کیسے ممکن ہے کہ جو انسان تکامل و ارتقاء کا حقیقی عاشق ہو وہ ان پروگراموں سے منہ پھیرے اور نگاہ روگردان ہو جاتا ہے تو یہ اس کے عشق و محبت کی عدم صداقت کی نشانی اور علامت ہے۔

یہ آیت نجران کے عیسائیوں اور زناہ رسولؐ کے درمیان محبت کے بارے میں ہی نہیں بلکہ یہ تمام ادوار کے لیے اسلام کی ایک منطق ہے۔ وہ لوگ جو رات دن عشق الہی یا پیشوایان اسلام، مجاہدین راہِ خدا اور صالحین سے محبت کا دم بھرتے ہیں لیکن عمل کی دنیا میں ان سے کچھ بھی مشابہت نہیں رکھتے ان کی حیثیت جھوٹے دویداروں سے زیادہ نہیں ہے۔ وہ لوگ جو سر تپا گناہوں سے آلودہ ہیں اور اس کے باوجود اپنے دل کو خدا، رسولؐ، امیر المومنینؑ اور عظیم پیشواؤں کے عشق سے لرزہ بگھنے میں یا یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ایمان، عشق اور محبت کا تعلق صرف دل سے ہے اور عمل سے ان چیزوں کا کوئی ربط نہیں، وہ اسلام کی منطق سے بالکل لاتعلق ہیں۔ معافی! اخبار میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

”ما احب الله من حصاء“

جو گناہ کرتا ہے وہ خدا کو دوست نہیں رکھتا

اس کے بعد آپؑ نے یہ مشہور شعر پڑھے:

تعصى الا لله وانت تظلم رحمة

هذا الممرك في الفعالي بديع

لو كان حبلك صادقاً لا طعنت

انت الصحت لمن يحب مطيع

یعنی

تو خدا کی نافرمانی کرتا ہے اور اس کے باوجود اس کی محبت کا اظہار کرتا ہے۔

مجھے اپنی جان کی قسم یہ بڑی عجیب و غریب بات ہے۔

اگر تیری محبت سچی ہوتی تو تو اس کی اطاعت کرتا۔

کیونکہ جو کسی سے محبت کرتا ہے وہ اُس کے حکم کی پیروی کرتا ہے۔

”يعحبكم الله و يغفر لكم ذنوبكم والله غفور رحيم“

قرآن پاک اس جملے میں کہتا ہے: اگر تم نے خدا سے محبت رکھی اور اُس کے آثار و تبارک سے عمل اور زندگی پر مرتب ہوئے تو خدا تمہیں دوست رکھے گا اور اس دوستی کے اثرات حسبِ عمل تم پر آشکار ہوں گے، وہ تمہارے گناہوں کو بخش



دے گا اور اپنی رحمت تہدہ سے شامل کر دے گا۔

خدا کی طرف سے متبادل دوستی کی دلیل بھی واضح ہے کیونکہ وہ ایسی مہستی ہے جو ہر لحاظ سے کامل و اکمل ہے اور بھرپور کند ہے۔ جو موجود بھی تعامل و ارتقا کی راہ میں قدم اٹھانے کا اس کے بس پسندیدہ عمل کی وجہ سے خدا تعالیٰ بھی اس سے محبت کا رشتہ قائم کرے گا۔

اس آیت سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ محبت ایک طرف نہیں ہو سکتی کیونکہ ہر محبت محب کو دعوت دیتی ہے کہ وہ محب محبوب کی حقیقی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے قدم بڑھائے اس طرح محبوب کو بھی اس سے منور محبت ہوگی ممکن ہے یہاں سوال کیا جائے کہ اگر محب ہمیشہ محبوب کے فرائض کو بھالائے تو پھر اس کے ذمے تو گناہ ہی کوئی نہ ہوگا کہ جسے بخشے جانے کی بات کی جائے لہذا یغفر لکوز فوجیکو کی یہاں کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو ممکن ہے یہ جہد گزشتہ گناہوں کی بخشش کی طرف اشارہ ہو۔ دوم یہ کہ محب محبوب کی ہمیشہ نافرمانی نہیں کرتا لیکن شہوات و خواہشات کی تسکین کی وجہ سے ممکن ہے کبھی کبھی اس سے نفرتش بھی سرزد ہو جائے جو ہمیشہ فرائض پر دل رہنے کی وجہ سے بخش دی جائے گی۔

دین اور محبت

پیشوایان اسلام سے متعدد روایات میں منقول ہے کہ دین محبت کے علاوہ کچھ نہیں، ان میں سے ایک روایت خصال اور کافی میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے۔

آپؑ نے فرمایا:

”هل الذین الا الحب، ثم تلا هذه الآية: ”ان محبتکم

تعجبون الله فاشبهونف“

کیا دین محبت کے علاوہ بھی کچھ ہے؟ پھر آپؑ نے یہ آیت تلاوت

فرمائی: ”قل اطیعوا الله والرسول“

ان روایات سے مراد یہ ہے کہ روح دین اور حقیقت دین اصل میں ایمان باللہ اور عشق الہی ہی ہے۔ وہ ایمان اور عشق کہ جس کی شعاع تمام وجود انسانی کو روشن کر دیتی ہے اور اس کے تمام اعضاء و اوج اور قوت بدن اس کے زیر اثر آجاتے ہیں اور اس کا ظاہری اور روشن ثریہ ہے کہ انسان فرائض خدا کی اطاعت کرنے لگتا ہے۔

”اطیعوا الله واطیعوا الرسول“

اس آیت میں گزشتہ آیت کی بحث کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: چونکہ تم پروردگار کی محبت کے دعویدار ہو اس لیے فرائض خدا کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی پیروی کرو اور اگر تم نے اس سے روگردانی کی تو یہ پروردگار سے محبت نہ کرنے کی نشانی ہوگی اور خدا ایسے لوگوں کو دوست نہیں رکھتا۔ ”فان تولوا فان الله



لا یحبیب الکفرین :

مترنا واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول " سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا اور رسول کی اطاعت ایک دوسرے سے جدا نہیں ہے ۔ رسول کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے اور خدا کی اطاعت رسول کی اطاعت ہے ۔ اسی لیے گزشتہ آیت میں صرف اطاعت رسول کی بات کی گئی ہے یہیں خدا اور رسول دونوں کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے ۔

"فَإِن تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْکَافِرِیْنَ"

اس کے بعد فرمایا گیا ہے : اگر یہ لوگ روگردانی کریں اور دوستی کے تقاضوں پر عمل نہ کریں تو یہ انجید بہت میں پئے نہیں ہیں اور خدا پر ایمان نہیں لائے ۔ لہذا فطری بات ہے کہ خدا ایسے اشخاص کو دوست نہیں رکھتا ۔

۳۳۔ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّآلَ اِبْرٰهٖمَ
وَآلَ عِمرٰنَ عَلَی الْمَلٰٓئِیْنِ
۳۴۔ ذُرِّیَّۃً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ ۝ وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ

ترجمہ

۳۳۔ اللہ نے آدم ، نوح ، آل ابراہیم اور آل عمران کو سب جہانوں پر منتخب کر لیا ۔

۳۴۔ وہ ایسے فرزند (اور خاندان) تھے جو (پاکیزگی ، تقویٰ اور فضیلت کے اعتبار سے)

ایسے تھے کہ بعض کو بعض میں انتخاب کیا گیا اور خدا سننے والا اور جانتے والا ہے (اور اپنی

رسالت کی راہ میں ان کی کادشوں سے بھی آگاہ ہے) ۔

تفسیر

اس آیت سے حضرت مریم اور ان کے آباؤ اجداد کی داستان شروع ہوتی ہے ۔

"اصطفیٰ" لغت کے لحاظ سے "صنفو" (بر وزن "عفو") سے یا گیا ہے جس کا معنی ہے

"خالص چیز" اہل عرب صاف و شفاف پتھر کو بھی "صفا" خاص اور پاکیزہ ہونے کی وجہ سے کہتے ہیں ۔ اس بناء پر

"اصطفاء" کا معنی ہے "خالص چیز کے ایک حصے کو منتخب کرنا" ۔

قرآن حکیم مندرجہ بالا آیت میں کہتا ہے : خدا نے آدم ، نوح ، خاندان ابراہیم اور آل عمران کو تمام جہانوں پر منتخب



کر لیا ہے۔ یہ چناؤ ممکن ہے تکنیکی طور پر بھی ہو اور شرعی اعتبار سے بھی۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کی خلقت کو شروع ہی سے ممتاز قرار دیا ہے اگرچہ اس امتیاز کے باوجود وہ راہ حق کے انتخاب میں مجبور نہ تھے بلکہ اپنے ارادے اور اختیار سے یہ راستہ طے کر رہے تھے لیکن ان کی اس مخصوص خلقت و آفرینش نے ان میں نوع بشر کی ہدایت کی صلاحیت پیدا کر دی تھی اور پھر فرمان خدا کی اطاعت، تقویٰ و پرہیزگاری اور انسانوں کی راہنمائی کے راستے میں جدوجہد کرنے کی وجہ سے ایک طرح کا اکتسابی امتیاز بھی انہیں حاصل ہو گیا جو ان کے ذاتی امتیاز سے مل گیا اور وہ برگزیدہ انسانوں کی حیثیت سے ظاہر ہوئے۔

پیغمبروں کا امتیاز

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ انبیاء کو حاصل ہونے والا ذاتی امتیاز اگرچہ انہیں راہ حق پر چلنے کے لیے مجبور نہ کرتا تھا اور یہ امر اختیار و ارادہ کے مسئلے کے بھی متافی نہیں ہے حال ایک طرح کی تعین تو ضرور ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ایسی خلقت جو صحیح نظام سے ہم آہنگ ہو، اس میں ایسا فرق قابل قبول ہوتا ہے (غور کیجئے) مثلاً انسانی بدن ایک منظم خلقت ہے اور اس کے نظام کو صحیح رکھنے کے لیے اعضاء و جوارح میں فرق ہونا چاہیے ورنہ انسانی بدن کے تمام خلیے CELLS اکٹھے کے اندر مدنی پردوں کی سی نزاکت، پتلی کی ہڈی کے خلیوں جیسی قسا، دماغ کے خلیوں کی سی حسیت یا دل کے خلیوں جیسی دھڑکن رکھتے ہوئے تو یقیناً بدن کی عمارت گر جاتی، ضروری ہے کہ دماغ بھی خفیہ بدن میں ہوں جو جسم کے عصبات اور اعضاء کی رہبری کی ذمہ داری نبھائیں، ہڈیوں کے محکم خلیوں کو بھی ہونا چاہیے جو بدن کی استقامت کے ضامن ہوں، حساس خلیے بھی چاہئیں جو چھوٹے چھوٹے حوادث سے آگاہ ہوں اور متحرک خلیے بھی درکار ہیں جو حرکت پیدا کریں۔

کوئی شخص نہیں کہتا کہ تمام جسم دماغ اور مغز کیوں نہیں یا مثلاً گھاس کے خلیے پھول کی پتیوں کی سی نزاکت، لطافت اور زیبائی کیوں نہیں رکھتے کیونکہ کیفیت تو گھاس کی ساخت کو ہی ختم کر دیتی۔

قابل توجہ نکتہ یہاں یہ ہے کہ ذاتی امتیاز جو ایک منظم نظام کے لیے انتہائی ضروری ہے، آسان کام نہیں بلکہ اس کے ساتھ ایک بھاری ذمہ داری اور مسئولیت منسلک ہے جو اتنی ہی عظیم ہے جس قدر یہ امتیاز زیادہ ہے۔ یہ بھاری ذمہ داری خلقت کے ترازو کے دونوں پڑوں میں اعتدال برقرار رکھتی ہے یعنی جس قدر پیغمبر اور مادی نوع بشر سے امتیاز رکھتے ہیں اسی قدر ذمہ داری اور مسئولیت بھی رکھتے ہیں اور دوسروں کی ذمہ داری بھی اپنے امتیاز کے لحاظ سے کم ہے۔ علامہ ازیں بدگاہ الہی میں اقرب کے لیے انسان کے ذاتی امتیازات برگزیدہ نہیں بلکہ انہیں اکتسابی امتیازات کے ہمراہ ہونا چاہیے۔

چند اہم نکات

۱۱، آل ابراہیم : آیت خدا کے تمام برگزیدہ بندوں کا ذکر نہیں کر رہی بلکہ ان میں سے صرف بعض کی طرف اشارہ کر



رہی ہے۔ لہذا اگر بعض انبیاء جو مذکورہ غفلتوں سے نہیں، یہ آیت ان کے برگزیدہ نہ ہونے پر دلیل نہیں ہے۔
ساتھ یہ بھی توجہ رہے کہ آل ابراہیم میں موسیٰ بن عمران، پیغمبر اسلام اور آپ کے خاندان کے برگزیدہ افراد بھی شامل ہیں۔ کیونکہ وہ سب اولاد ابراہیم علیہ السلام میں سے ہیں۔

۲۔ لفظ آل کا مفہوم : مفردات میں راجعت نے لکھا ہے کہ ”آل“ ”اہل“ سے یا گیا ہے اور فرق یہ ہے کہ ”آل“ عام طور پر بزرگ اور شریف افراد کے نزدیک رشتہ داروں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اہل ”زیادہ وسیع معنی رکھتا ہے اور سب کے لیے بولا جاتا ہے۔ اسی طرح ”آل“ کی اضافت انسانوں کے لیے ہوتی ہے لیکن ”اہل“ کی اضافت زمان و مکان اور دوسری ہر طرح کی چیزوں کے لیے مستعمل ہے۔ مثلاً کہتے ہیں ”اہل شہر“ لیکن آل شہر نہیں کہتے۔

۳۔ آل عمران اور آل ابراہیم کے مفہوم کی حدود : بغیر کچھ ہی واضح ہے کہ آل ابراہیم اور آل عمران کو چن لینے سے یہ مراد نہیں کہ ابراہیم اور عمران کی ساری اولاد برگزیدہ ہے کیونکہ ممکن ہے ان کی اولاد میں کفار تک موجود ہوں بلکہ اس سے مراد ان کے خاندان اور دو دھان سے کچھ برگزیدہ ہستیاں ہیں۔

۴۔ عمران کون ہیں : مندرجہ آیت میں مذکور عمران حضرت مریم کے باپ ہیں حضرت موسیٰ کے والد نہیں کیونکہ قرآن حکیم میں جہاں کہیں بھی عمران کا نام آیا ہے وہاں حضرت مریم کے والد ماجد ہی مراد ہیں۔ بعد کی آیات جو حضرت مریم کے حالات کے ہیں میں ہیں وہ بھی اس بات کی شاہد ہیں۔

۵۔ عصمت انبیاء و آئمہ پر دلیل : اہل بیت علیہم السلام کے حوالے سے پہنچنے والی متعدد روایات میں اس آیت سے انبیاء اور آئمہ کی عصمت پر استدلال کیا گیا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کہیں بھی گناہ، شرک، کفر اور فسق سے آلودہ افراد کو منتخب نہیں کرتا بلکہ ایسے لوگوں کو منتخب کرتا ہے جو آلودگیوں سے کنارہ کش اور معصوم ہوں۔ البتہ آیت سے عصمت کے متعدد مراحل بھی معلوم ہوتے ہیں۔

۶۔ تکامل انواع پر استدلال :۔ جنس قریب کے بعض مؤلفین نے اس آیت سے تکامل انواع پر استدلال کیا ہے۔ ان کا نظریہ ہے کہ حضرت ”آدم“ اہل بشر تھے بلکہ ان کے زمانے میں بہت سے انسان موجود تھے جن میں سے خدا تعالیٰ نے حضرت آدم کو منتخب فرمایا اور ان کی اولاد میں سے ممتاز نسل کو وجود بخشا۔ اس نظریے کے حامل ”علیٰ الملحمین“ کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت آدم کے دور میں تمام انسان ”عالمین“ یعنی ”انسانی معاشرہ“ موجود تھا اس لیے اس بناء پر یہ ماننے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ پہلا انسان لاکھوں سال قبل پیدا ہوا، وہ بھی باقی حیوانات کی طرح ارتقاء و تکامل کی منزلیں طے کرتا رہا۔ اس لیے حضرت آدم تو ایک برگزیدہ انسان تھے۔

اس گلدستہ کے مقابلے میں کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں کہ جس کی وجہ سے ہم یہ سمجھیں کہ عالمین سے یہاں مراد حضرت آدم کے ہم عصر انسان تھے بلکہ ممکن ہے تمام انسان تمام انسانی اوقات کے انسان ہوں۔ اس بناء پر آیت کا معنی یہ ہوگا : خدا نے تمام انسانی معاشروں میں انسانوں کی طویل تاریخ میں سے جنہیں منتخب فرمایا ان میں پہلے



آدمؑ، پھر نوحؑ، پھر "آل ابرہیم" اور "آل عمران" ہیں۔ چونکہ یہ سب منتخب افراد مختلف زمانوں میں تھے اس سے ہم سمجھتے ہیں کہ عالمین سے مراد تمام زمانوں اور اولاد کا انسانی معاشرہ ہے۔ اس سے ضروری نہیں کہ ہم یہ اعتقاد رکھیں کہ حضرت آدمؑ کے زمانے میں بہت سے انسان موجود تھے جن میں سے حضرت آدمؑ چنے گئے تھے (ملاحظہ فرمائیے)۔

"ذُرِّيَّةَ بَعْضِهَا مِنْ بَعْضٍ"

"ذریۃ" کا معنی ہے "چھوٹی اولاد"۔ لیکن کسی کیسی یا واسطہ یا بالواسطہ کی تمام اولاد کے لیے ہمیں یہ نظر برآ جائیگا کہ اس آیت میں قرآن اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ منتخب افراد اسلام، پاکیزگی، تقویٰ اور نوحِ بشر کی رہنمائی کے لیے کوشش کے لحاظ سے ایک جیسے تھے اور ایک ہی کتاب کے تحت سنہوں کی مانند تھے جیسے ان میں سے ایک دوسرے کا اقتباس یا کیا ہو "بَعْضِهَا مِنْ بَعْضٍ"۔

"وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ"

آیت کے آخر میں اس حقیقت کی نشاندہی کی گئی ہے کہ خدا تعالیٰ ان کی کوشش اور فعالیت کو دیکھتا ہے، ان کی باتیں سنتا ہے اور ان کے اعمال سے آگاہ ہے۔ اس جگہ میں چاہئے کہ ہم نے ان کی خدا تعالیٰ اور مخلوق خدا کے بارے میں مشہور ذمہ داریوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ضمنی طور پر آیت میں حضرت آدمؑ کے علاوہ تمام اولاد العزم پیغمبروں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ حضرت نوحؑ کا ذکر تو مرحلت سے موجود ہے اور آل ابرہیم میں خود ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور پیغمبر اسلامؐ بھی شامل ہیں۔ نیز آل عمران میں حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی طرف مکرر اشارہ ہے۔ اس نکتہ کی وجہ یہ ہے کہ زیر نظر آیت ان کے حالات کی تفصیل کے لیے مقدمے کی حیثیت رکھتی ہے۔

۳۵۔ اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرَانَ رَبِّ اِنِّیْ تَدْرُسْ لِّکَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُعْزَرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ۚ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝

۳۶۔ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَا اُنْثٰی ۚ وَاِنَّہٗ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعْتَ ۚ وَلَیْسَ الذَّکَرُ کَاُنْثٰی ۚ وَاِنِّیْ سَمَّیْتُہَا مَرْیَمَ ۚ وَاِنِّیْ اَعِیْذُہَا



يَاكَ وَ ذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۝

ترجمہ

۲۵۔ (وہ وقت یاد کرو) جب عمران کی بیوی نے عرض کیا: خداوند! جو کچھ میرے رحم میں ہے میں اسے تیری نذر کرتی ہوں تاکہ وہ (تیرے گھر کی خدمت کے لیے) محرر (اور آزاد) ہو اور تو یہ مجھ سے قبول فرمائے کہ تو سننے اور جاننے والا ہے۔

۲۶۔ لیکن جب اسے جنم دیا، تو دیکھا تو وہ بڑی تعجبی عرض کیا: خداوند! میں نے لڑکی کو جنم دیا لیکن خدا اس سے آگاہ تھا کہ اُس نے کیا جنم دیا ہے (پھر اُس نے کہا) لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا (اور لڑکی عبادت گاہ کی خدمت کی ذمہ داری لڑکے کی طرح انجام نہیں دے سکتی) اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود (کے دوسروں) سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔

تفسیر

حضرت مریم کی ولادت

گذشتہ آیت میں آل عمران کا ذکر تھا اور ان آیات میں عمران کی بیٹی مریم کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی ہے۔ ان آیات میں اس عظیم خاتون کی ولادت، پرورش اور زندگی کے دیگر اہم واقعات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ تاریخ، اسلامی روایات اور مفسرین کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ حسنہ اور اسحاق دو بہنیں تھیں۔ پہلی حضرت عمران کے نکاح میں آئیں۔ حضرت عمران بنی اسرائیل کی بہت اہم شخصیت تھے۔ دوسری کو اللہ کے ایک نبی زکریا نے اپنی زوجیت کے لیے منتخب فرمایا۔

کئی سال گزر گئے۔ حسنہ کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہ ہوا۔ ایک روز وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھی تھیں، دیکھا کہ ایک پرندہ اپنے بچوں کو خدا سے رہا ہے۔ یہ منکر دیکھا تو اولاد کی خواہش ان کے دل میں آگ کی طرح بھڑک اٹھی۔ انہوں نے غلوں کے دل سے بدگاہ خداوندی میں بیٹے کی درخواست کی، مگر اسی پروردگار تعالیٰ مخلصانہ دعا پر قبہ ابراہیم کو پہنچا اور وہ حاملہ ہو گئیں۔

یہ روایات سے مستند روایات ہیں جو اس واقعے اور اس کے بارے میں مختلف روایات سے مستند روایات ہیں۔ ان روایات میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔



بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حسد کے شوم حضرت عمران کی طرف وحی کی تھی کہ انہیں ایک بابرکت لڑکا عطا کیا جائے گا۔ جو لا محالہ جبرائیل کو شفا دے گا۔ حکم خدا سے مردوں کو زندہ کرے گا اور بنی اسرائیل کے یہ پیغمبری کے فرائض بھی سرانجام دے گا۔ انہوں نے یہ واقعہ اپنی بیوی حسد سے بیان کیا۔ وہ حاملہ ہوئیں تو ان کا خیال تھا کہ یہی وہ لڑکا ہے جو اس وقت ان کے رحم میں ہے۔ وہ بے خبر تھیں کہ ان کے رحم میں تو اس لڑکے کی والدہ جناب مریم ہیں۔ اسی لیے انہوں نے نذر کی تھی کہ جیسے کوئی غارتگریست المقدس کا خدمت گزار بنائیں گی۔ یہ پیش ہوئی تو انہوں نے دیکھا کہ وہ لڑکی تھی۔ اب وہ پریشان ہوئیں۔ سوچنے لگیں کہ کیا نروں کو بیت المقدس کی خدمت تو لڑکے کیا کرتے ہیں۔ قبل ازیں کبھی لڑکی کو بیت المقدس کی خدمت گزار دی گئی تھی۔ یہ مستحب نہیں کی گئی تھی۔ اب ہم آیات کی تفسیر کی طرف لوٹتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس واقعے کے آخری حصے کو قرآن نے کیسے بیان کیا ہے۔

”اذ قالت امرات عمران“

اس آیت میں زوجہ عمران کی نذر کا تذکرہ ہے۔ وہ حاملہ ہوئیں تو انہوں نے نذر کی کہ اپنے بچے کو بیت المقدس کا خدمت گزار بنائیں گی کیونکہ اللہ نے ان کے شوہر عمران کو جو احسان دی تھی اس سے وہ یہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتے ہیں لڑکا ہوگا۔ اس لیے انہوں نے لفظ ”محسورہ“ استعمال کیا۔ اور ”محسورہ“ نہیں کہہ سکتے۔ انہوں نے خدا سے درخواست کی کہ وہ ان کی نذر قبول کرے۔ ”فتقبل منی انک انت السميع العليم“

”محسورہ“ ”محسورہ“ کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے ”آزاد کرنا“۔ اس نذر میں یہ لفظ ایسی اولاد کے لیے بولا جاتا تھا جو عبادت خانے کی خدمت کے لیے عین کی جائے تاکہ وہ عبادت خانے کی صفائی اور دوسری خدمات سرانجام دیں اور فراغت کے وقت پھر وہ لڑکا کی عبادت میں مشغول رہیں۔ ”محسورہ“ ان خدمت گزاروں کو اس لیے کہتے تھے کہ وہ ماں باپ کی ہر قسم کی خدمت سے آزاد ہوتے تھے اور عبادت خانے کی خدمت کو اپنے لیے باعث افتخار سمجھتے تھے۔ بعض کہتے ہیں جب بچے خدمت کے کچھ قابل ہو جاتے، باغ جوئے تک ماں باپ کی نگرانی میں خدمت سرانجام دیتے تھے اور بعد ازاں خود سے کام کرنے لگتے۔ چاہتے تو عبادت خانے میں اپنا اور ختم کر کے باہر چلے جاتے اور چاہتے تو کام جاری رکھتے۔

”فلما وضعتها قالت رب اقبضتها منی“

اس آیت میں بچی کی ولادت کے بعد حضرت مریم کی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے۔ انہوں نے پریشان ہو کر کہا: خداوند! میں نے بچی کو جنم دیا ہے اور تو جانتا ہے کہ جو نذر میں نذر کی ہے اس کے لیے لڑکی لڑکے کی طرح نہیں ہو سکتی اور لڑکی لڑکے کی طرح ان فرائض کو انجام نہیں دے سکتی۔

”ولیس الذکر کالانثی“

آیت میں موجود قرآن اور آیت کی تفسیر میں درج ہونے والی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ”ولیس الذکر کالانثی“ ”آلہ کا لڑکی کی طرح نہیں“ یہ جملہ حضرت مریم کی والدہ کا ہے نہ کہ کلام خدا ہے لیکن قاعدۂ حضرت مریم کی والدہ کو کہنا چاہیے تھا ”ولیس الانثی کا نذر ذکر“ ”لڑکی لڑکے کی طرح نہیں ہے۔ کیونکہ انہوں نے تو لڑکی کو جنم دیا تھا نہ کہ لڑکے کو۔ اس لحاظ سے ممکن ہے کہ اس جملے میں تقدیم و تاخیر ہو جیسا کہ اہل عرب اور غیر عرب کے کلام میں ہوتا



ہے۔ ہر کتاب کے وضع حمل کے وقت پیش آنے والی اچانک پریشانی کے سبب بے کچے یوں کہہ دیا جو کہ وہ توڑنے کی آس لگنے بیٹھی تھیں تاکہ وہ بیت المقدس کا خدمت گزر بنے۔ اسی رجہاں کے پیش نظر مکن ہے بے ساختہ انہوں نے پہلے بیٹے کا ذکر کیا جو ملائکہ جبریل اور میکائیل کا آفت صاف تھا کہ وہ پیش کا نام پہلے لیتیں۔

آیت میں ”وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعْتَ“ خدا بہتر جانتا ہے کہ عمرہاں کی بیوی نے کیا جنم دیا ہے! اصطلاح میں جملہ مترفعہ ہے۔ یعنی ضرورت نہ تھی کہ مریم کی والدہ کہتیں کہ خدایا! میں نے توڑنے کی کو جنم دیا ہے کیونکہ خدا تو جانتا ہی تھا کہ اُس نے کیا جنم دیا ہے وہ شروع سے انصاف و نطق اور رحم مادر کے تمام مرحلوں سے آگاہ ہے۔

”وَاللّٰہُ سَفِیْتُہَا مَرْیَمَ“

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم کا یہ نام اُن کی والدہ کے ذریعے سے وضع حمل کے وقت ہی رکھ دیا گیا تھا۔ یاد رہے کہ مریم ان کی نعت میں ”عبادت گزیر خاتون“ کہلاتے تھے۔ یہ نام حضرت مریم کی پاکباز والدہ کے اس انتہائی عشق اور علاؤ کا منظر ہے جو انہیں اپنے بچے کو عبادت الہی کے لیے وقف کرنے کے لیے تعالٰیٰ انہوں نے نام رکھنے کے ساتھ ہی خدا سے درخواست کی کہ وہ اس نوسورچی اور اس کی آئندہ اولاد کو شیطانی دوسوں سے بچانے رکھے اور انہیں اپنے لطف و کرم کی پناہ میں رکھے۔ ”وَاللّٰہُ اَعِیْذُ مَا بَلَکَ وَذَرِیَّتُہَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ“۔

۳۷۔ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّہَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ ۖ وَأَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۖ وَكَفَّلَهَا زَكَرِیَّا ۖ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَیْہَا نَرْحَرِیَّا الْمِحْرَابَ ۖ وَجَدَ عِنْدَہَا رِزْقًا ۖ قَالَ یٰمَرْیَمُ ۖ اِنِّیْ لَکِ هٰذَا ۖ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ ۖ اِنِّیْ اِنْتُ اللّٰہُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِفَیْرِ حِسَابٍ ۝

ترجمہ
۳۷۔ اُس کے پروردگار نے اُس (مریم) کو خوشی سے قبول فرمایا اور اُس کے وجود اس کے پورے کو خوب اچھی طرح پروان چڑھایا۔ ذکر کیا کہ ان کا کفیل بنایا جب ذکر کیا وہاں داخل ہوتے خاص غذا وہاں موجود پاتے اُس سے پوچھتے: یہ کہاں سے لائی ہو۔ وہ کہتی: یہ خدا کی طرف سے ہے۔ خدا جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔



تفسیر

گزشتہ آیات حضرت مریم کی ولادت کے بارے میں تھیں۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ نے مریم کو محسن قبول سے نوانا اور اُن کی پرورش اچھے پودے کی طرح کی۔

درحقیقت جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے کہ جناب مریم کی والدہ کو یقین نہیں آتا تھا کہ کسی لڑکی کو غانہ خدا بیت المقدس کی خدمت کے لیے قبول کر لیا جائے گا لہذا وہ چاہتی تھیں کہ ان کے شکم میں جو بچہ ہے وہ لڑکا ہو کیونکہ قبل ازیں کہیں کسی لڑکی کو اس مقصد کے لیے منتخب نہیں کیا گیا تھا۔

زیر نظر آیت کہتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس پاکیزہ لڑکی کو پہلی مرتبہ اس روحانی اور معنوی خدمت کے لیے قبول کر لیا۔ بعض مفسرین کہتے ہیں: قبولیت کی نشانی یہ تھی کہ حضرت مریم بیت المقدس کی خدمت کے دوران میں مابواری میں کبھی مبتلا نہیں ہوئیں کہ انہیں اس روحانی مرکز سے دور ہونا پڑتا۔ ممکن ہے اس نذر کی قبولیت اور جناب مریم کا قبول بارگاہ ہونا، اس کے بارے میں اللہ کی والدہ کو ابہام کے ذریعے مطلع کیا گیا ہو۔

”انبات“ یعنی ”آگ“ یہ تعبیر حضرت مریم کی نشوونما اور پرورش کے بارے میں ان کے معنوی، روحانی، اور اخلاقی پہلوؤں کے تعامل و ارتقاء کی طرف اشارہ ہے۔

ضمناً یہ جلد ایک لطیف نکتے کی طرف اشارہ ہے اور وہ یہ کہ خدا کا ”انبات“ یعنی اگانا ہے، جیسے پھولوں اور پودوں کے بیج میں اہمیت اور استعداد مخفی ہوتی ہے اور وہ باغبان کی نگرانی میں پرورش پاتے ہیں اور خود کو آشکار کرتے ہیں۔ اسی طرح انسانی وجود میں بھی ہر قسم کی بلند ترین انسانی صلاحیتیں رکھ دی گئی ہیں مگر انسان اپنے نفس تربیت کے لیے غلطی نہائندوں اور باغ انسانیت کے باغبانوں کے سپرد کر دے تو وہ بہت جلد تربیت حاصل کر لیتا ہے اور اس کی خیال استعداد ظاہر ہو جاتی ہے اور یوں ”انبات“ کا مفہوم حقیقت کا روپ و صلا لیتا ہے۔

”وڪفٰلھا نرڪسرتيا“

”کفالت“ کا معنی ہے ”کسی چیز کو دوسری میں ضم کرنا“ اسی مناسبت سے ان افراد کو کافل ”یا“ ”کفیل“ کہتے ہیں جو چھوٹے بچوں کی سرپرستی اپنے ذمے لے لیں کیونکہ وہ درحقیقت اپنے آپ کو اُن کے ساتھ منضم کر لیتے ہیں۔ یہ مادہ جب ثنائی مجرور یعنی ”کفیل“ بنیر شد کے، کی صورت میں استعمال ہو تو کفالت دوسرے پرستی کو اپنے ذمے لینے کا مفہوم دیتا ہے اور جب ثنائی مزید کی صورت میں ”کفیل“ شد کے ساتھ استعمال ہو تو کسی کے لیے کفیل منتخب کرنے کا مفہوم دیتا ہے۔

اس جملے میں قرآن کہتا ہے: خدا نے زکریا کو مریم کی کفالت کے لیے منتخب کیا تھا۔ کیونکہ جیسا کہ تاریخ میں آیا ہے مریم کے والد اللہ کی پیدائش سے پہلے وفات پا چکے تھے۔ اُن کی والدہ انہیں یہودی علماء کے پاس بیت المقدس میں لے آئیں اور کہا کہ یہ بچی بیت المقدس کا دیہ ہے، اس کی سرپرستی تمہیں عکوفی اپنے ذمے لے لیں۔ علماء نبی اسرائیل نے اس مسئلے میں آپس میں گھٹکی کی، ہر



کوئی چاہتا تھا کہ مریم کی سسر پرستی کا اقتدار اور منصب اُسے نصیب ہو۔ اس مقصد کے لیے مصلوہ مخصوص مرسوم سے گزرا جن کی تفصیل اسی سورہ کی آیہ ۳۴ کی تفسیر میں آئے گی اور آخر کار ان کی کفالت کے لیے حضرت زکریا کا انتخاب عمل میں آیا۔

”كَلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا“

”محراب“ ایک مخصوص جگہ کو کہتے ہیں جو عبادت گاہ میں اس کے امام یا مخصوص افراد کے لیے عین کی جاتی ہے۔ اس لفظ سے اس جگہ کو موسوم کرنے کی دو وجوہ بیان کی جاتی ہیں:

پہلی یہ کہ ”محراب“ مادہ ”حرب“ سے ہے جس کا معنی ہے ”جنگ“ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل ایمان اس مقام پر شیطان، سرکش خرابات اور جوہل کے خلاف جنگ کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اس لیے اسے محراب کہتے ہیں۔ دوسری یہ کہ ”محراب“ اصولی طور پر مجلس کی بلانی اور اوپر والی جگہ کے معنی میں ہے اور چونکہ محراب کو عبادت خانے کی اوپر والی جگہ پر بنایا جاتا ہے، اس لیے یہ نام رکھا گیا ہے۔

یہ بھی خیال رہے کہ نبی اسرائیل کے ہاں محراب کی کیفیت ہمارے ہاں سے مختلف تھی وہ محراب سطح زمین سے بلند بناتے تھے اور اس کے نیچے بیڑھیں بنائی جاتی تھیں اور اس کے اطراف کو کمرے کی دیواروں کی طرح بناتے تھے تاکہ اسے محفوظ کر دیا جائے اور جو لوگ محراب کے اندر ہوتے وہ باہر سے بہت کم نظر آتے تھے۔

حضرت مریم حضرت زکریا کی سسر پرستی میں پرہیز گاری اور خدا کی عبادت و بندگی میں اس طرح مستغرق ہوئیں کہ ابن عباس کے بقول جب وہ نو سال کی ہوئیں تو دن کو روزہ رکھتیں اور رات کو عبادت کرتیں۔ پرہیز گاری اور مروت البھی میں انہوں نے اتنی ترقی کی کہ اس قدر کے اہل اور پارس علماء سے بھی سبقت لے گئیں یہ

حضرت زکریا ان کے محراب کے پاس آکر دیکھتے تو خاص غذائیں وہاں پڑی ہوئیں۔ انہیں بہت حیرانی ہوتی، ایک دن پوچھنے لگے:

”يَا مَرْيَمُ أَنَّى لَكَ هَذَا“

مریم! یہ غذا کہاں سے ملتی جو۔

مریم برہیں:

”قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ“

یہ خدا کی طرف سے ہے اور وہ تو مجھے پامتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔

یہ غذا کیسی تھی؟ اور جناب مریم کے لیے کہاں سے آتی تھی؟ اس بارے میں آیت میں کچھ بیان نہیں کیا گیا لیکن بہت سی شیعہ و سنی کتب کی روایات جو تفسیر عیاشی وغیرہ میں مذکور ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنت کے پھلوں کی ایک قسم تھی جو بے موسم حکم پر درکار سے جناب مریم کے محراب کے پاس پہنچ جاتے اور یہ بات کوئی بامشہور تعبیر نہیں ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے کسی پرہیزگار بندے کی یوں پزیرائی کرے۔

یہاں رزق سے مراد بھشت کی ایک غذا ہے اور یہ بات آیت میں موجود قرآن سے بھی ثابت ہوتی ہے کیونکہ ”رَزَقْنَا“ یہاں مکروہ کی صورت میں ہے اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ کوئی خاص قسم کی غذا تھی جو حضرت زکریا کے لیے انجانی تھی اور

دوسری نشانی خود حضرت مریم کا جواب ہے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اور تیسری دلیل ہے حضرت زکریا کا جوش میں آنا اور پردہ دہار سے فرزند کی آرزو کرنا جس کے بارے میں بعد والی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔
لیکن صاحب المنار اور دیگر مفسرین کا اعتقاد ہے کہ "سرافشا" سے مراد یہی عام دنیا کی غذائیں ہیں کیونکہ ابن جریر نے لکھا ہے:-

بنی اسرائیل قحط سال میں مبتلا ہو گئے، نوح کی بڑی کٹی تھی، حضرت زکریا مریم کے معارف برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ایسے عالم میں قرعہ ڈال گیا، قرعہ نوح نامی ایک شخص کے نام نکلا، وہ بڑے غم سے اپنی پاکیزہ آمدنی میں سے حضرت مریم کے لیے غذا ہتیا کرنا سنا زکریا ان کے عراب کے پاس جلتے تو ایسے شدید حالات میں ان کے پاس ایسی غذا دیکھ کر انہیں تعجب ہوتا، جناب مریم ان سے کہتیں: خدا نے ان حالات میں ایک صاحب ایسٹن کے ذمے یہ کام کر دیا ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم کہ چکے ہیں یہ تفسیر قرآن پاک میں موجود قرآن سے موافقت رکھتی ہے اور نہ ہی ان روایات سے موافقت رکھتی ہے جو آیت کے بارے میں وارد ہوئی ہیں ان میں سے ایک روایت امام باقر سے منقول ہے جسے تفسیر عیاشی میں درج کیا گیا ہے ہم یہاں اس کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔

"ایک روز پیغمبر اکرم جناب فاطمہ زہرا کے گھر تشریف لائے، حالت یہ تھی کہ کئی روز سے ان کے ہاں ٹھیک سے کھانا بھی میسر نہ تھا اچانک آپؐ نے ان کے پاس مخصوص غذا دیکھی، آپؐ نے پوچھا: "یہ کھانا کہاں سے آیا ہے؟" حضرت فاطمہ نے عرض کیا:

"خدا کے ہاں سے، کیونکہ وہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔" اس پر پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

"یہ واقعہ حضرت زکریا کے واقعے کی طرح ہے، وہ جناب مریم کے عراب کے پاس آئے تھے، وہاں کھانے کی کوئی خاص چیز دیکھی تو پوچھنے لگے یہ کھانا کہاں سے آیا ہے تو انہوں نے جواب میں کہا کہ خدا کے ہاں سے آیا ہے۔"۔

"بغیر حساب" کے معنوم کے بارے میں سورۃ بقرہ کی آیت ۲۷۲ اور اس سورہ کی آیت ۲۷۱ کے ذیل میں ہم گفتگو کر چکے ہیں۔

۳۸- هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ ۖ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي



مِنْ لَدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ ۝

۲۹۔ فَتَادَتُهُ الْمَلِكَةُ وَمُوفَاتَيْمُ يُصَلِّي فِي الْمَخْرَابِ

أَنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ مُّصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنْ

اللَّهِ وَسَيِّدًا وَحَصُورًا وَنَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ ۝

۴۰۔ قَالَ رَبِّ إِنِّي يَكُونُ لِيَ عُلَاوَةٌ فَعَدْ بَلْفَنِيَ الْكِبَرُ

وَأَمْرًا قِيًّا عَافِرٌ ۖ قَالَ كَذَلِكَ اللَّهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ ۝

ترجمہ

۲۸۔ جب مریم میں یہ لیاقت و اہلیت دیکھی اُس وقت زکریا نے اپنے پروردگار سے دعا

کی اور عرض کی: خداوند! اپنی طرف سے مجھے ابھی پاکیزہ فرزند عطا فرما کہ تو دعا کو سننے والا ہے۔

۲۹۔ جب وہ عراب میں مشغول عبادت تھا تو فرشتوں نے اسے پکار کر کہا: خدا تجھے بھلی کی بشارت

دیتا ہے وہ خدا کے کلمہ (سیح) کی تصدیق کرے گا، رہبر و رہنما ہوگا، ہوا بوس سے دور ہوگا، پیغمبر

ہوگا اور صالحین میں سے ہوگا۔

۴۰۔ اُس نے عرض کیا: پروردگار! میرے ہاں لڑکا کیسے ہو سکتا ہے، جب کہ مجھے بڑھاپے نے

آگیا ہے اور میری بیوی بانجھ ہے۔ فرمایا: اسی طرح خدا جو کام چاہتا ہے انجام دیتا ہے۔

تفسیر

ہم کہہ چکے ہیں کہ حضرت زکریا کی بیوی اور جناب مریم کی والدہ آپس میں بنیں تھیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ دونوں ابتداء

میں بانجھ تھیں۔ جناب مریم کی والدہ کو ایسی لائق بیٹی نصیب ہوئی، حضرت زکریا نے حضرت مریم کے غم و حیران کن خصوصیات

کو دیکھا تو آرزو کی اُن کی بھی مریم جیسی پاکیزہ اور پرہیزگار اولاد ہو جس کا چہرہ عظمت الہی اور توحید کی علامت ہو۔ حضرت



زکریا اور ان کی بیوی کی طویل زندگی اسی طرح گزر چکی تھی ظاہری طبیعی قوانین اور فطرت کے نقطہ نظر سے یہ بعید نظر آتا تھا کہ اب ان کی کوئی اولاد ہو لیکن عشقِ الہی اور مریم کے محرابِ عبادت کے پاس بے موسم کے پھل دیکھنے کا اثر تھا کہ حضرت زکریا کے دل میں بھی امید پیدا ہوئی اور انہوں نے بڑھاپے کے موسم میں خواہش کی کہ ان کے وجود کی شمع پر بھی فرزند کی صورت میں سیرو پیدا ہو جائے لہذا جب وہ عبادت اور مناجات میں مشغول تھے انہوں نے خدا تعالیٰ سے فرزند کا تقاضا کیا "قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِي ذُرِّيَةً ذَاتَ عِلْمٍ إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ" یعنی خداوند! مجھے پاکیزہ فرزند عطا فرما کہ توبندوں کی دعائیں سننے والا ہے۔

"فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ نائمٌ یٰصَلِّیْ فِی الْمَحْرَابِ"

زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ زکریا کی دعا قبول ہو گئی۔ وہ محرابِ عبادت میں مناجات کر رہے تھے اور مشغولِ عبادت تھے کہ خدا کے فرشتوں نے انہیں آواز دی اور بشارت دی کہ خدا تعالیٰ انہیں بہت جلد ایک بیٹا دے گا جس کا نام یحییٰ ہوگا اور جو ان صفات کا حامل ہوگا۔

۱۔ وہ حضرت مسیح پر ایمان لائے گا اور اپنے ایمان سے انہیں تقویت پہنچائے گا ("مَصَدَّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنْ اٰلٰہِہٖ")۔

یاد رہے کہ اس آیت میں اور بعض دیگر آیات میں جس کا ذکر آگے کئے گا کلمہ "سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور جیسا کہ تاریخ میں آیا ہے حضرت یحییٰ حضرت عیسیٰ سے چھ ماہ بڑے ہیں اور وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے جنابِ مسیح حیدر السلام کی نبوت کی تصدیق کی اور چونکہ وہ لوگوں میں پاکیزگی اور زہد و تقویٰ کے اعتبار سے بہت زیادہ شہرت رکھتے تھے لہذا جب حضرت مسیح کی طرف انہی رجعت حضرت عیسیٰ کی دعوت و نبوت کی طرف لوگوں کی توجہ کسے بے بہت مقرر ثابت ہوئی۔

۲۔ علم و عمل کے لحاظ سے معاشرے کی رہبری ان کے ذمے ہوگی ("وَسَيَدِّعُ") علاوہ انہیں وہ اپنے تئیں کرشمہ براہِ ہوس اور دنیا پرستی سے محفوظ رکھیں گے ("وَحَصُورًا")۔

"حَصُورًا" ماہ "حصور" سے ہے۔ اس کا معنی ہے وہ شخص جو کسی حوالے سے اپنے آپ کو محاصرے میں رکھے۔ کہیں یہ لفظ عدمِ ازدواج اور شادی نہ کرنے کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ بعض مفسرین نے مندرجہ بالا آیت میں اس لفظ سے یہی دوسرا مفہوم مراد لیا ہے نیز بعض روایات میں بھی اسی مفہوم کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

۳۔ وہ خدا کے پیغمبر اور صالحین میں سے ہوں گے۔

کیا شادی نہ کرنا باعثِ فضیلت ہے

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اگر حضور کا معنی شادی نہ کرنا ہے تو کیا یہ عمل کسی انسان کے لیے امتیاز اور خصوصیت شہرہ ہوتا ہے کیونکہ یہاں حضرت یحییٰ کا ذکر اس حوالے سے کیا گیا ہے۔



اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو ہمارے پاس کوئی یقینی دلیل موجود نہیں کہ آیت میں "حضور" سے مراد شادی کو ترک کرنا ہے نیز اس سلسلے میں منقول روایت سند کے لحاظ سے مسلم نہیں ہے۔ بعید نہیں کہ لفظ "حضور" آیت میں شہوات، ہوا و ہوس اور دنیا پرستی کو ترک کرنے کے معنی میں ہو اور زہد کی ایک صفت کے لحاظ سے ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ ممکن ہے حضرت یحییٰ بھی حضرت عیسیٰ کی طرح زندگی کے خاص حالات کی وجہ سے اور دین کے لئے بار بار سفر کرنے کی وجہ سے مجبور زندگی کو زبردستی پر مجبور ہوں۔ اس لیے یہ سب کے لیے نئی قانون نہیں ہو سکتا اور خدا نے ان کی یہاں اس صفت سے اس لیے تعریف کی ہے کہ انہوں نے خاص حالات کے باعث شادی نہیں کی اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو گناہ سے باز رکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور وہ کسی طرح بھی گناہ سے آلودہ نہیں ہوئے۔ قانون ازدواج تو کئی طور پر ایک فطری قانون ہے اور ممکن نہیں کہ کوئی بھی دین اس فطری قانون کے خلاف کوئی حکم جاری کرے اس لیے اسلام یا کسی اور دین میں شادی نہ کرنا کوئی اچھا کام نہیں سمجھا جاتا تھا۔

یحییٰ اور عیسیٰ

"یحییٰ" "حنیۃ" کے مادہ سے ہے اور اس کا معنی ہے "زندہ رہتا ہے" اور یہ اُس عظیم پیغمبر کا نام رکھا گیا تھا۔ زندگی سے یہاں مراد مادی اور معنوی دونوں طرح کی زندگی ہے جو ایمان، منصب نبوت اور خدا سے ربط کے زیر سایہ ہو۔ سورہ مریم کی آیہ ۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے حضرت یحییٰ کی پیدائش سے قبل ہی یہ نام ان کے لیے انتخاب فرمایا تھا۔

"یا زکریا انا نبشرك بغلام اسمه یحییٰ"

لَمْ نَجْعَلْ لَهُ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا"

"اے زکریا! ہم تجھے ایک فرزند کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہے اور

قبل از یہ کسی کا یہ نام نہیں تھا۔"

جیسا کہ گزشتہ آیات سے معلوم ہوا ہے یحییٰ کے تولد کی خواہش حضرت زکریا کے دل میں جناب مریم کی روحانی پیش رفت دیکھ کر پیدا ہوئی۔ یہ بات یہاں جانب نظر ہے کہ اس دعا کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا کو ایک ایسا بیٹا عطا فرمایا جو کئی لحاظ سے حضرت مریم کے بیٹے سے مشابہت رکھتا ہے۔

مشلاً :

_____ بچپن میں بشت نبوت کے لحاظ سے ،

_____ نام کے مفہوم کے اعتبار سے _____ کیونکہ عیسیٰ اور یحییٰ دونوں کا معنی ہے "زندہ رہتا ہے" اللہ

_____ اللہ تعالیٰ نے دونوں پر پیدائش، موت اور حشر و نشر تین مواقع پر درود و سلام بھیجا ہے۔



”قال رب انی یکون لی غلام.....“

علامہ نے بھیجی کی پیدائش کی بشارت دی تو حضرت زکریا تعجب میں پڑ گئے اور بدعا و خداوندی میں عرض کرنے لگے: خداوند اچھے ممکن ہے کہ مجھ سے بچہ ہو جب کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔
جواب میں وحی آئی: خدا اسی طرح جو کہ چاہے انجام دے دیتا ہے۔
اس آیت میں حضرت زکریا اپنے بڑھاپے کا ذکر کرتے ہیں کہتے ہیں: ”وقتہ ہلغنی الکبر“ (بڑھاپا مجھ تک آپہنچا ہے، لیکن سورہ مریم کی آیہ ۸ میں ان کا یہ قول درج ہے۔

”وقتہ ہلغنی من الکبر عتیتا“

میں بڑھاپے کے آخری درجے تک جا پہنچا ہوں

تفسیر کا یہ اختلاف اس لیے ہے کہ جیسے انسان بڑھاپے کی طرف جاتا ہے گویا بڑھاپا اور موت بھی دوسری طرف سے اس کی تلاش میں آگے بڑھتی ہے جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

”اذا حکمت فی ادبار والموت فی اقبال فمنا سرع الملتقی“

”چونکہ تم عمر کے آخری حصے کی طرف جا رہے ہو اور موت تباہی طرف بڑھ رہی ہے

اس لیے کس قدر جلدی تم ایک دوسرے سے مل جاؤ گے۔

”غلام“ لغت میں ”جوان لڑکے“ کو کہتے ہیں ”حافظ“ ”حاضر“ سے ہے اس کا معنی ہے

”بڑا اور زیادہ“ اس کا ایک معنی جس بھی ہے، بانجھ عورتوں کو اس لیے ”حافظ“ کہتے ہیں کہ ان کا معیار آخر تک پہنچ چکا ہوتا ہے یا یہ کہ وہ بچہ جنمے سے رک چکی ہوتی ہیں پس اس سے بڑھ چکی ہوتی ہیں۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت زکریا کا تعجب اور حیرانی کس بنا پر تھی جب کہ خدا تعالیٰ کی بے پایاں قدرت پر بھی ان کی نظر تھی۔

قرآن کی دیگر آیات پر نظر کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ حضرت زکریا موصوم کرنا چاہتے تھے کہ ایک بانجھ عورت جو کئی سال سے ماوانعادت بھی چھوڑ چکی تھی اُس کے اُن بچہ پیدا ہونا کیونکر ممکن ہے، اُس میں کیا تغیر و تبدل ہو گا کیا پھر سے جان یا ادب و شرف کی محروقی کی طرح انہیں مابواری آنے لگے گی یا وہ کسی اور طرح سے بچے کی پیدائش کے قابل ہو جائیگی۔ علاوہ ازیں قدرت خداوندی پر ایمان شہود اور مشاہدے سے الگ چیز ہے۔ حضرت زکریا دراصل چاہتے تھے کہ ایمان و رجحان شہود تکسیر پہنچ جائے۔ یہ بات حضرت ابراہیمؑ کے پرندوں کے واقعے سے جتنی جلتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ساد اور قیامت پر ایمان تو تھا لیکن وہ اس طرح اچھٹان حاصل کرنا چاہتے تھے۔ یہ فطری امر ہے کہ انسان جب طبعی قوانین کے خلاف کسی امر کا سامنا کرتا ہے تو وہ غور و فکر میں پڑ جاتا ہے اور اُسے غائبش ہوتی ہے کہ اس کے لیے کوئی حسی دلیل حاصل کرے۔



۴۱۔ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِي آيَةً ۖ قَالَ آيَتُكَ أَلَّا تُكَلِّمَ
النَّاسَ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ إِلَّا رَمْزًا ۖ وَادْكُرْ رَبَّكَ كَثِيرًا
وَسَبِّحْ بِالنَّعِثِ وَالْإِنْبَارِ ۝

ترجمہ

۴۱۔ (حضرت زکریاؑ نے عرض کیا: پروردگار! میرے لیے کوئی نشانی مقرر فرما۔ (خدا نے) کہا: تیرے لیے نشانی یہ ہے کہ تو تین دن تک لوگوں سے اشارے سے گفتگو کر کے گا اور تیری زبان بغیر کسی ظاہری سبب کے لوگوں سے بات نہیں کر پائے گی، اور اس عظیم نعمت پر شکرانے کے طور پر، اپنے پروردگار کو بہت یاد کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرو۔

تفسیر

یہاں حضرت زکریاؑ کی بھینٹ کی ولادت کی بشریت پر کسی نشانی کی درخواست کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہم کہ چکے ہیں اس عجیب و غریب واقعے پر حضرت زکریاؑ کا انتخاب تعجب اور پروردگار سے کسی نشانی کا تقاضا کسی طرح سے بھی اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر بے اعتدالی کی دلیل نہیں ہے۔ خصوصاً جب کہ ”كَذَٰلِكَ أَفْعَلُ بِمَنْ يَشَاءُ“ (اسی طرح خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے) الہی کی تاکید بھی کی جا چکی ہے۔ حضرت زکریاؑ چاہتے تھے کہ اس امر سے اُن کا ایمان، ایمان شہودی کا درجہ حاصل کرے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کا دل ایمان سے مالا مال ہو جائے جیسے حضرت ابراہیمؑ نے مشاہدہ حسی کے ذریعے ایمان کے حصول کی خواہش کی تھی وہ بھی اس مرحلے تک جا پہنچیں۔

”قَالَ آيَتُكَ أَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ إِلَّا رَمْزًا“

”رمز“ اصل میں جوتھوں سے اشارہ کرنے کو کہتے ہیں۔ آہستہ آہستہ کی جانے والی گفتگو کو بھی ”رمز“ کہتے ہیں۔ تدریجاً ”رمز“ کے مفہوم میں وسعت پیدا ہو گئی ہے اور اب ہر ایسی بات، اشارے اور نشانی کو رمز کہا جانے لگا ہے جو غیر صریح اور مخفی طور پر ہو۔

خدا تعالیٰ نے حضرت زکریاؑ کی یہ درخواست بھی قبول فرمائی اور ان کے لیے ایک نشانی مقرر فرمائی گئی کہ ان کی زبان کسی طبعی عامل کے بغیر تین دن کے لیے بے کار ہو گئی۔ وہ عام گفتگو نہ کر سکتے تھے لیکن خدا تعالیٰ کے ذکر اور اس کی تسبیح

مے وقت ان کی زبان بغیر کسی تکلیف کے کام کرتی تھی۔ یہ عجیب و غریب کیفیت تمام امور پر اللہ کی قدرت کے لیے ایک نشانی تھی۔ وہ خدا جو ہند زبان کو اپنے ذکر کے وقت کھولی دینے کی طاقت رکھتا ہے وہ یہ قدرت بھی رکھتا ہے کہ کسی باخبر رجم سے ایک ایسا باایمان بچہ پیدا کر دے جو ذکر پروردگار کا منظر ہو اسی سے اس نشانی کا اُس چیز سے ربط ظاہر ہو جاتا ہے جو حضرت زکریاؑ چاہتے تھے۔

یہی مضمون سورہٴ مریم کی ابتدائی آیات میں بھی ہے۔

ممکن ہے اس نشانی میں ایک اور نکتہ بھی چنبھ جائے اور وہ یہ کہ اس مسکے میں جناب زکریا کا زیادہ اصرار اور نشانی کا تقاضا اگرچہ فعل حرام اور مکروہ نہ تھا لیکن بہر حال ترکِ اولی سے کچھ مشابہ ضرور تھا اسی لیے خدا تعالیٰ کی طرف سے ایسی نشانی دی گئی جو قدرتِ نہانی بھی متنبی اور ترکِ اولی پر تنبیہ اور اشارہ بھی تھا۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ کیا پیغمبر کی زبان کی بندش اُنکے مقامِ نبوت اور تبلیغی فریضے سے مناسبت رکھتی ہے؟
اس سوال کا جواب بنیاداً مشکل نہیں کیونکہ یہ بات اس وقت فریضہ نبوت سے مناسبت نہ رکھتی جب اس کا عرصہ طویل ہوتا۔ ایسی تشریح
سی مدت جس میں پیغمبر اپنی امت سے الگ ہو کر عبادتِ خدا میں مشغول رہے تو کچھ فریضہ مناسب نہیں جبکہ وہ اس مدت میں بھی ضروری امورِ اللہ
سے بنا سکتے تھے یا آیاتِ خدا کے ذریعے حقائق سمجھا سکتے تھے کیونکہ آیاتِ خدا تو ذکرِ پروردگار شہد ہوتی تھیں اور اتفاق کی
بات ہے کہ انہوں نے یہ کام کیا بھی اور اللہ سے لوگوں کو ذکرِ خدا کی تبلیغ کی۔

”واذکر ربیک کثیراً و مستبح بالعمش والإبکار“

لفظ "عشی" مراد "دن کے آخری لمحات" کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے "دن کی ابتدائی گھڑیوں" کو "ابھکار" کہتے ہیں۔ بعض کا نظریہ ہے کہ ابتدائے نزال سے لے کر غروب آفتاب تک "عشی" ہے اور طبع فجر کی ابتداء سے لے کر زوال تک "ابھکار" ہے۔ یہ لیکن جیسا کہ ہم کہ چکے ہیں یہ دونوں لفظ زیادہ تر پہلے معانی کے لیے ہی استعمال ہوتے ہیں۔

اس جیلے میں قرآن نے بتایا ہے کہ خدا تعالیٰ نے حضرت زکریا کو پروردگار کی تسبیح اور ذکر کا حکم دیا۔ جب آپ کی زبان بند ہو چکی تھی ایسے میں یہ تسبیح اور ذکر اس بات کی بھی نشانی تھی کہ خدا تعالیٰ بندہ اور کو کھولنے کی قدرت رکھتا ہے نیز خدا کے عظیم عطیے پر شکر گزاری کے حوالے سے یہ ایک ذمہ داری بھی تھی۔

سورہ مریم کی ابتدائی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زکریاؑ نے خود ہی اس پر درگاہ پر عمل نہیں کیا بلکہ اشارے سے لوگوں کو بھی اس کی دعوت دی کیونکہ خدا تعالیٰ کی اس بخشش و عطا کا تعلق ان کے معاشرے سے تھا اور حضرت یحییٰ کی مصورت میں انہیں ایک لائق قیادت نصیب ہو رہی تھی۔ اس لیے انہیں دعوت دی گئی کہ صبح اور عصر کے وقت پر درگاہ کی تسبیح اور ذکر میں مشغول رہیں۔ اور حقیقت یہ سب کچھ بے شک و تسبیح کے دل قرار پائے تھے۔

٢٢- وَإِذْ قَالَتِ الْمَلِكَةُ يَمْرُؤُا إِنَّكَ لَمُصْطَفًى



وَطَهَّرَكَ وَاصْطَفٰكَ عَلٰٓى نِسَاءِ الْعٰلَمِيْنَ ۝

۴۳۔ يٰمَرْيَمُ افْنِيْكَ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ
مَعَ الرَّاكِعِيْنَ ۝

ترجمہ

۴۲۔ اور (وہ وقت یاد کرو) جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! خدائے تعالیٰ تجھے چنا، پاک کیا اور تمام جہان کی عورتوں پر برتری اور فضیلت دی۔

۴۳۔ اے مریم! اس نعمت کے شکرائے کے طور پر، اپنے پروردگار کے سامنے خضوع کرو، سجدہ بجا لاؤ اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں جناب عمران اور ان کی بیوی کے متعلق بحث تھی۔ اب حضرت مریم کا نام بھی لیا گیا ہے اور ان آیات میں ان کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ پہلے اس طرف اشارہ ہوا ہے کہ فرشتوں نے مریم سے باتیں کیں: "اذ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ....." یہ آیت نشان دہی کرتی ہے کہ ممکن ہے کہ فرشتے پیغمبروں کے علاوہ دوسرے انسانوں سے بھی گفتگو کریں نیز یہ جہد حضرت مریم کے بلند مرتبے کی بھی حکایت کرتا ہے۔

فرشتے حضرت مریم کو بشارت دیتے ہیں کہ خدائے انہیں برگزیدہ کیا اور چن لیا ہے اور انہیں پاک قرار دیا ہے یعنی تقویٰ، پرہیزگاری، ایساں اور عبادت کے نتیجے میں وہ خدا کے برگزیدہ اور پاک لوگوں میں سے ہو گئی ہیں اور انہیں حضرت عیسیٰ جیسے پیغمبر کی پیدائش کے لیے چن لیا گیا ہے۔

”وَاصْطَفٰكَ عَلٰٓى نِسَاءِ الْعٰلَمِيْنَ“:

”اصطفاً کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: خدائے تعالیٰ تجھے جہان کی عورتوں میں سے چن لیا ہے اور تجھے سب پر برتری عطا کی ہے۔“

آیت کا پہلا حصہ جناب مریم کی اعلیٰ انسانی صفات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور برگزیدہ انسان کے طور پر آپ کا نام لیتا ہے اور دوسرے حصے میں ”اصطفاً“ ان کے اپنے زمانے کی تمام عورتوں پر برتری کی طرف اشارہ ہے۔



نہاڑ پڑھو، وضو کرو اور پاک و پاکیزہ ہو۔ یعنی ان تمام خرافات کو اسبابِ دو کیونکہ واؤ سے جو عطف جو وہ ترتیب پر دلالت نہیں کرتا۔ علاوہ ازیں رکوع و سجود اصل میں جزا اور خضوع کے معنی میں ہے اور عام رکوع و سجود ان الفاظ کے مساوی ہیں۔ یہ سب ایک شمار ہوتے ہیں۔

۴۴۔ ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ اِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُونَ اَقْلَامَهُمْ اَتْيَهُمْ يَكْمُلُ مَزِيْمٌ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُونَ ۝

ترجمہ

۴۴۔ یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تمہیں وحی کے ذریعے بتا رہے ہیں اور جب وہ اپنی قلمیں (قرعہ اندازی کے لیے پانی میں) اچھینک رہے تھے کہ مریم کی کفالت اور سرپرستی کون کرے اور اُس وقت، (بھی) جب اس کی سرپرستی کا اقتدار اور منصب حاصل کرنے کے لیے (علماء) آپس میں محاذِ کشمکش تھے، تم موجود نہ تھے، اور یہ سب باتیں تمہیں وحی کی معرفت بتائی گئی ہیں۔

تفسیر

جب کہ گذشتہ آیات کی تفسیر میں کہا جا چکا ہے جنابِ مریم کی والدہ پیدائش کے بعد اپنی نواسیدہ بھی کو ایک کپڑے میں پیٹ کر مہدت خانے میں ملے آئیں۔ وہاں بنی اسرائیل کے علماء اور بزرگوں سے کہنے لگیں: یہ نورِ موعود بھی خاندانِ خدا کی خدمت کے لیے نذر کی گئی ہے اس کی سرپرستی اپنے ذمے لے لیں۔ جنابِ مریم چونکہ حضرت عمران کے خاندان سے تھیں اور یہ ایک بزرگ خاندان تھا اس لیے بنی اسرائیل کے علماء اور عبادان کی سرپرستی کا منصب حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے پر ہفت سے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ قرعہ ذیل کر فیصلہ کرنے پر ان کا اتفاق ہو گیا۔ وہ ایک ہجر کے کنارے گئے وہاں انہوں نے اپنی قرعہ ڈالنے کی گھڑیاں پیش کیں۔ ان میں سے ہر ایک مکاری یا قلم پر ان میں سے ایک ایک کا نام لکھا گیا۔ جو قلم پانی میں ڈوب مباتی اس کا قرعہ نکلتا صرف جس کی قلم سلج آب پر رہتی اُس کے نام قرعہ شمار ہوتا۔ جس قلم پر حضرت زکریا کا نام تھا پیسے پانی کی گہرائی میں چلی گئی اور پھر پانی پر ابھرائی۔ یوں حضرت مریم کی سرپرستی کا منصب حضرت زکریا کے حصے آیا اور حقیقت میں بھی وہی اس کام کے لیے اہل تر تھے کیونکہ ایک قرعہ پیلیر خدا تھے اور دوسرا ان کی بیوی حضرت مریم کی خالہ تھیں۔

مندرجہ بالا آیت اس واقعے کے ایک پہلو کی طرف اشارہ کر رہی ہے فرمایا گیا ہے: مریم کی جو کچھ سرگذشت ہم نے

تہیں بیان کی ہے یہ غیب کی خبروں میں سے ہے کیونکہ یہ واقعہ اس طرح سے خرافات سے پاک گزشتہ تحریف شدہ کتب میں بھی کہیں موجود نہیں تھا اس لیے آسانی دہی ہی اس کی سند بن سکتی تھی ("ذاللت من انباء الغیب نوحيہ الیہ") ۔

پھر اس واقعہ کے ایک حصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے، مریم کی سرپرستی کے تعین کے لیے جب وہ اپنی قلبیں پانی میں ڈال رہے تھے تم موجود نہ تھے (ما کنت لدیہم اذ یلقون اقلامہم انہم یکمنل مریم) یعنی جب وہ کلمات مریم پر جھگڑ رہے تھے تم پاس نہ تھے اور یہ سب کچھ تم پر مرفوعی دہی کے ذریعے نازل ہوا ہے ۔

اختلاف دور کرنے کا آخری طریقہ قرعہ اندازی ہے

زیر نظر آیت اور سورہ طہ میں حضرت یونس کے بارے میں موجود آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مشکل کو حل کرنے کے لیے یا تنازعے میں معاطہ آخری حد تک پہنچ جانے پر جب جھگڑا ختم کرنے کا کوئی راستہ سمجھائی نہ دے تو قرعہ اندازی سے مدد لی جاسکتی ہے ان آیات کے ساتھ ساتھ پیشوایان اسلام سے منقول روایات بھی اس سلسلے میں موجود ہیں ۔ انہی آیات و روایات کے باعث فقہی کتابوں میں "قاعدۃ قرعہ" فقہی قواعد و اصول میں سے ایک کے طور پر زیر بحث آنے لگا ۔

لیکن جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے کہ قرعہ اندازی فقط بے بسی اور سسٹے کے حل کی کوئی دوسری صورت باقی نہ رہ جانے کی صورت میں ہی کی جاسکتی ہے ۔ اس لیے مننے کے حل کے لیے اور راستہ نکل آنے کی صورت میں قرعہ سے مدد نہیں لی جاسکتی ۔ قرعہ نکالنے کے لیے اسلام میں کوئی خاص طریقہ معین نہیں ہے بلکہ تیر کی کلڑیوں، منگڑیوں یا کاغذ کا اس طرح استعمال کیا جانے کو کسی کے خلاف سازش یا کسی کو نقصان پہنچنے کا احتمال باقی نہ رہے ۔

واقعہ ہے کہ اسلام میں قرعہ اندازی کے ذریعے کاروبار، لین دین اور معاطہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہ کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے حل کرنے کے لیے قرعہ کو ذریعہ بنایا جانے اور ایسی آمدنی جائز نہیں ہے ۔

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ قرعہ لوگوں کے تنازعات اور اختلافات سے ہی مخصوص نہیں بلکہ اس سے دیگر مشکلات کے حل میں بھی مدد لی جاسکتی ہے ۔ مثلاً جیسا کہ احادیث میں آیا ہے کہ اگر کوئی کسی بھیرے سے بد فعل کرے اور پھر اسے بھیر کر یوں کے ریڑ میں چھوڑ دے ۔ اب اگر اسے پہچانا نہ جاسکے تو قرعہ اندازی کے ذریعے ان میں سے ایک بھیر نکال لی جائے اور اس کا گوشت کھانے سے پرہیز کیا جائے کیونکہ سارے ریڑ کو چھوڑ دینا تو بڑے نقصان کا باعث بنے گا اور پھر ان سب کا گوشت کھانا بھی جائز نہیں ۔ یہاں قرعہ اس مشکل کو حل کرتا ہے ۔

۲۵۔ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ



بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اِسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ
وَجِئْنَاهُمَا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ۝

ترجمہ

۲۵۔ وہ وقت (یاد کرو) جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! خدا اپنی طرف سے تجھے ایک
کلر (اور با عظمت شخصیت) کی بشارت دیتا ہے جس کا نام عیسیٰ بن مریم ہے، وہ دنیا
و آخرت میں مقام و عظمت کا مالک ہوگا اور وہ مقربین میں سے ہے۔

تفسیر

اس آیت میں حضرت مسیح کی ولادت کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ فرشتوں کی طرف سے جناب مریم کو
بشارت دینے سے شروع ہوتا ہے۔ فرشتے خدا کی طرف سے جناب مریم کو خوشخبری دیتے ہیں کہ خدا انہیں ایک بچہ
کا جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا۔ وہ دنیا و آخرت میں مقام و عظمت کا مالک ہوگا۔ اور بلا لاوا الہی کے مقربین میں
سے ہوگا۔ اَوَافَاتِ الْمَلَائِكَةِ يَلْمِزِيْمِ اِنَّ اَقْلَامَ يَبْشُرُكَ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ
اِسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۝

چند اہم نکات

۱۔ عیسیٰ کو کلر کیوں کہا گیا؟ اس آیت میں اور دو مزید آیات میں حضرت مسیح کو "کلمہ" کے
عنوان سے یاد کیا گیا ہے۔ یہ تعبیر عہد جدید کی کتب میں بھی دکھائی دیتی ہے۔
اس بارے میں مفسرین میں بہت اختلاف ہے کہ حضرت عیسیٰ کو "کلمہ" کیوں کہا گیا ہے لیکن زیادہ تر
یہی نظر آتا ہے کہ اس کا سبب ان کی غیر معمولی پیدائش ہے جو اس فرمان الہی کی مصداق ہے:-
"اَمَّا اَمْرًا اِذَا ارَادَ شَيْئًا اَنْ يَقُولَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ"
اس کا امر تو بس یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا
بس وہ ہو جاتی ہے۔
۱۔ یس - ۸۲

یا اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ولادت سے پہلے خدا تعالیٰ نے ان کی والدہ کو ایک کلام کے ذریعے



بشارت دی تھی ۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اس تعبیر کی وجہ یہ ہو کہ لفظ " کلمۃ " قرآن کی اصطلاح میں مخلوق کے معنی میں استعمال ہوتا ہے ، مثلاً :

" قتل لَو کان البحر مدادًا لِّلکلمات دَبی
لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی
ولو جئنا بمثلہم مددًا "۔

کہہ دیجئے ! میرے پروردگار کے کلمات لکھنے کے لیے اگر دریا یا سمندر
جائیں تو وہ ختم ہو جائیں گے لیکن میرے رب کے کلمات ختم نہیں ہوں
اگرچہ انہی جتنے اور دریا بھی ان میں شامل ہو جائیں ۔ (احکاف : ۱۰۰)

اس آیت میں کلمات خدا سے مراد مخلوقات خدا ہی ہے اور چونکہ حضرت " مسیح " خدا کی عظیم مخلوقات میں
سے ایک تھے اس لیے ان پر " کلمۃ " کا اطلاق ہوا ہے ۔ ضمناً اس میں حضرت عیسیٰ کی الوہیت کے دھندلے
کا جواب بھی آگیا ہے ۔

۲۔ حضرت عیسیٰ کو مسیح کیوں کہتے ہیں ؟ : ممکن ہے یہ اس لیے ہو کہ " مسیح " کا معنی
ہے " مسیح کرنے والا " یا " مسیح شدہ " اور وہ ناقابل علاج بیماروں کے بدن پر ہاتھ پھیر کر حکم خدا سے اُسے شفا یاب
کر دیتے تھے ۔ اس افتخار اور عظمت کی اُن کے لیے پہلے سے پیش گوئی کی گئی تھی اس لیے خدا تعالیٰ نے ولادت
سے پہلے ہی ان کا نام مسیح رکھ دیا ۔

یا یہ اس بناء پر ہے کہ خدا تعالیٰ نے انہیں ناپاک اور گناہ سے مسیح یعنی پاک رکھا ۔

۳۔ عیسیٰ مریم کے بیٹے ہیں : قرآن نے اس آیت میں مزاحمت سے حضرت عیسیٰ کو جناب مریم کے
بیٹے کی حیثیت سے متعارف کروایا ہے تاکہ یہ حضرت عیسیٰ کی الوہیت کے دھندلے کا جواب ہو کیونکہ جو مال سے
پیدا ہوتا ہے ، عالم جنین کے تغیرات میں سے گزرتا ہے اور عالم مادہ کے تغیرات و تحولات میں داخل ہے وہ کس
طرح خدا ہو سکتا ہے خدا تو ہم تغیرات اور تبدیلیوں سے بالاتر ہے ۔

۴۶۔ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَعَادِ وَكَهْلًا وَمِنْ

الصَّلٰحِیْنَ ○

ترجمہ : اور وہ لوگوں سے گہوارے میں اور ادھیڑ عمر میں گفتگو کرے گا اور وہ صالحین میں سے ہے ۔



تفسیر

اب اس آیت میں حضرت عیسیٰ کی گہوارے میں گفتگو کا تذکرہ ہے کیونکہ جیسا کہ سورہ مریم میں آئے گا وہ اپنی والدہ سے تہمت دور کرنے کے لیے گہوارے میں بول اُٹھے اور فصیح زبان میں خدا کے حضور اپنے مقام بنی اور مقام نبوت کو آشکار کیا۔ اور چونکہ ممکن نہیں کہ پیغمبر پاک اور آلودہ گناہ رحم سے پیدا ہو اس لیے اس المیہ کے ذریعے اپنی والدہ کی پاکیزگی کو ثابت کیا۔

توجہ رہے کہ ”مہد“ نوزائیدہ بچے کے سونے اور آرام کرنے کے لیے تیار کی جانے والی چیز یا جگہ کہتے ہیں۔ فارسی میں یہ ”گہوارہ“ کے مفہوم کے قریب قریب ہے البتہ ”گہوارہ“ پورے طور پر ”مہد“ کا ہم معنی نہیں کیونکہ گہوارہ میں حرکت کا مفہوم بھی پوشیدہ ہے لیکن مہد ہر ایسی جگہ کہتے ہیں جو نوزائیدہ بچے کے لیے بنائی جائے۔ سننا اس آیت میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ حضرت مسیح لہی ولادت سے لے کر ادھیڑ عمر تک حق بات کہتے رہیں گے۔ گویا تمام عمر مخلوق کو تبلیغ و ہدایت کے لیے قدم اٹھاتے رہیں گے اور ایک لمحے کے لیے بھی آرام سے نہیں بیٹھیں گے۔

یہ بھی توجہ رہے کہ ”کہلولہ“ ”کہل“ کے مادہ سے ہے اور یہ ”بوڑھے“ کے معنی میں نہیں ہے بلکہ ادھیڑ عمر افراد کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض علماء لغت نے مراحت کی ہے کہ ۴۴ سے لے کر ۵۱ سال تک کا درمیانی زمانہ کہولت ہے۔ اس سے کم عمر والے کو ”شباب“ اچوان کہتے ہیں اور اس سے زیادہ عمر والے کو ”شیخ“ کہتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ کے بارے میں یہ تعبیر گویا ایک قسم کی پیش گوئی ہے کہ وہ اس دنیا میں دوبارہ آئیں گے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ تواریخ کے مطابق ۳۳ سال کی عمر میں حضرت عیسیٰ لوگوں کے درمیان سے اُٹھ گئے اور آسمان کی طرف صعود کیا اور یہ امر ان تمام روایات سے ہم آہنگ ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ امام مہدی علیہ السلام کے زمانے میں لوگوں میں پٹ آئیں گے اور آسمانیت کی تائید کریں گے۔

آیت کے آخر میں حضرت عیسیٰ کی مختلف صفات کے تذکرے کے بعد فرمایا گیا ہے: وہ صالحین میں سے ہوں گے (وَمِنَ الصَّالِحِينَ) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صالح ہونا بہت بڑا اعزاز اور افتخار ہے اور صالح کے مفہوم میں تمام انسانی قدیں مجتمع ہیں۔

۴۷۔ قَالَتْ رَبِّ اَنْفِیْکُوْنُ لِیْ وَلَدٌ وَلَمْ یَمْسَسْنِیْ

بَشَرٌ ۚ قَالَ کَذٰلِکَ اَللّٰهُ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ۚ اِذَا



قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝

ترجمہ

۴۷۔ (مریم نے) کہا: پروردگار! مجھ سے بچہ کیوں کر ہوگا جب کہ کسی شخص نے مجھے چھوا نہیں (جواب میں) فرمایا: خدا اسی طرح جسے چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جب وہ کسی چیز کا فیصلہ کر لیتا ہے تو بس کہتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔

تفسیر

ہم جانتے ہیں کہ یہ جہاں عالم اسباب ہے۔ خدا تعالیٰ نے خلقت کے عمل کو اس طرح سے جاری فرمایا ہے کہ ہر وجود عوامل کے ایک سلسلے کے بعد ہی دائرہ وجود میں قدم رکھتا ہے مثلاً ایک بچے کے پیدا ہونے کے لیے شادی بیاہ جنسی ملاپ اور "اسپر" اور "اول" کا باہمی پیوند ضروری ہے۔ اس لیے یہ باعث تعجب نہیں کہ بہت جلد صاحبِ فرزند ہونے کی بشارت پر مریم حیران و پریشان ہو گئیں۔ انہوں نے سوال کیا، میرے خدا، کیسے ہو سکتا ہے کہ مجھ سے بچہ پیدا ہو جب کہ کسی بشر نے مجھے مس تک نہیں کیا۔ "قَالَ رَبُّنَا يَكُونُ لَكَ وَلَدٌ زَلَمَ يَمْسَسُكَ بَشَرٌ"۔

خدا نے فرشتوں کے ذریعے انہیں خبر دی: خدا جسے چاہتا ہے پیدا کرتا ہے یعنی جہاں طبیعت کا نظام خدا کا پیدا کردہ ہے، اس کے تابع فرمان ہے، وہ جب چاہے اسے دگرگوں کر سکتا ہے اور غیر مادی عمل و عوامل سے بھی موجودات کو پیدا کر سکتا ہے "كَذَٰلِكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ"۔

اس کے بعد بات کی تکمیل کے لیے فرمایا ہے: جب وہ کسی چیز کے کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے علم دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ فوراً ہو جاتی ہے "اِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ"۔ "قَالَ رَبُّنَا يَكُونُ لَكَ وَلَدٌ زَلَمَ يَمْسَسُكَ بَشَرٌ"۔

واضح ہے کہ لفظ "قَالَ رَبُّنَا يَكُونُ لَكَ وَلَدٌ زَلَمَ يَمْسَسُكَ بَشَرٌ" درحقیقت خدا کے حتمی ارادے کا بیان ہے ورنہ اسے کہنے کی ضرورت نہیں ہے یعنی کسی چیز کے بارے میں اس کا صرف ارادہ ہو اور فرمانِ آفرینش صادر ہو تو اسے فوراً لباسِ وجود پہنا دیا جاتا ہے۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ اس آیت میں حضرت عیسیٰ کی خلقت کے بارے میں لفظ "يَخْلُقُ" (خلق کرے) استعمال ہوا ہے جب کہ گذشتہ چند آیات میں حضرت عیسیٰ کی آفرینش کے بارے میں لفظ "يَفْعَلُ" (ہم دیتا ہے) استعمال کیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے تفسیر کا یہ اختلاف ان دو پیغمبروں کی خلقت کے اختلاف کی طرف اشارہ ہو کہ ایک معمول کے



مطابق اور دوسرا غیر معمولی طریقے سے عالم وجود میں آیا ہے۔

۲۸۔ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْحِيدَ وَالْإِنجِيلَ ۝
 ۲۹۔ وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَءِيلَ ۚ أَتَىٰ قَدْ جِئْتُكُمْ
 بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ ۚ أَتَىٰ أَخْلَقَ لَكُمْ مِنَ الظِّلِّينَ
 كَهَيْئَةِ الظِّلِّ فَإِنَّفُخْ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ
 اللَّهِ ۚ وَأُبْرِئُ الْأَكْمَةَ وَالْأَبْرَصَ وَأُخِي الْمَوْقُفَ
 بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاكُلُونَ وَمَا تَدْخِرُونَ
 فِي بُيُوتِكُمْ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِن
 كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ۝

ترجمہ

۲۸۔ اور اُسے کتاب و دانش اور تورات و انجیل کی تعلیم دے گا۔

۲۹۔ اور اُسے رسول کی حیثیت سے بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گا (جو ان سے کہے گا)
 میں پروردگار کی طرف سے تمہارے لیے نشانی لایا ہوں۔ میں گیلی مٹی سے پرندے جیسی
 مورت بناتا ہوں۔ پھر اس میں پھونکتا ہوں تو وہ حکم خدا سے پرندہ بن جاتا ہے۔ نیز مادرِ زاد
 اندھے کو اور برص میں مبتلا لوگوں کو شفا دیتا ہوں۔ مردوں کو زندہ کرتا ہوں اور جو کچھ تم کھاتے ہو
 اور اپنے گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو، اس کی تمہیں خبر دیتا ہوں بے شک اس میں تمہارے
 لیے نشانی ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔

تفسیر

جو افراد خدا کی طرف سے لوگوں کی ہدایت کے لیے مامور ہوتے ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ پہلے مرحلے میں



علم و دانش کے ذریعے لوگوں کو دعوت دیں۔ اور زندہ و انسان ساز آئین و قوانین پیش کریں۔ پھر دوسرے مرحلے میں خدا سے اپنے ارتباط کے لیے واضح استاد دکھائیں اور یوں خدا کی طرف سے اپنے منصوبہ ہونے کا ثبوت پیش کریں۔

اس مقصد کے لیے ہر پہلو پر اپنے ذمے کے ترقی یافتہ علوم کی قسم کے معجزے سے یس جتنا تھا تا کی جہاں بطوراء طبیعت سے ان کا ارتباط زیادہ واضح نہ جائے اور ہر زمانے کے علماء و ان کے مقلبے میں اپنے معجز کی وجہ سے ان کی دعوت کی حقیقت کا اعتراف کریں۔

یہ بات ایک حدیث میں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے منقول ہے۔ ان سے سوال کیا گیا تھا، ہر پیغمبر کے پاس کچھ نہ کچھ معجزات کیوں ہوتے تھے۔ اس سوال کے جواب میں آپ نے وضاحت فرمائی جس کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

حضرت موسیٰ کے زمانے میں جادوگر بہت زیادہ تھے۔ حضرت موسیٰ نے ایسا عمل انجام دیا جس کے مقابلے میں تمام جادوگر عاجز آ گئے۔ حضرت مسیح کے زمانے اور دعوت کے موقع پر اطباء، بیماروں کے علاج معالجے میں نہت مہارت رکھتے تھے۔ جناب عیسیٰ نے علاج بیماروں کو مادی وسائل کے بغیر شفا دیکر اپنی حقیقت کو ثابت کر دیا۔ پیغمبر اسلام کے زمانے میں خطباء، شعرا اور سخنور بہت زیادہ فصاحت و بلاغت کے مالک تھے اور ان سب نے قرآنی فصاحت و بلاغت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔

مندرجہ بالا آیت میں حضرت مسیح کی ماموریت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خداوند عالم نے پہلے فرمایا ہے: اَلْخُذْ اَنْتَ كِتَابَ وَحْيِكَ كِي تَعْلِمَ اَنَّكَ اَنْتَ رَسُوْلُ رَبِّكَ الْكَرِيْمُ (”اور اس کے بعد کتاب وحی کے مصداق کی نشاندہی کی گئی ہے۔ فرمایا: تورات و انجیل سکھائی“ وَالشُّرُوْطُ وَالْاَنْجِيْلُ) اس کے بعد بنی اسرائیل کے معروف لوگوں کی ہدایت کے لیے ان کی ماموریت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ وہ ان دنوں طرح طرح کے خرافات، آلودگیوں اور اختلافات میں گرفتار تھے۔ فرمایا: ”وَرَسُوْلًا اَلْمُتَّبَعُ اسْرَآءِیْلُ“

یہ بات قابل ذکر ہے کہ مندرجہ بالا آیت سے ابتداء میں یہ گمان ہے کہ حضرت عیسیٰ کے ذمہ صرف بنی اسرائیل کو دعوت دینا تھا لیکن یہ اُن کے اولیٰ العزم ہونے کی نفی نہیں ہے کیونکہ اولیٰ العزم پیغمبر وہ ہے جو نیا دین و آئین لے کر آئے اگرچہ اُس کی ماموریت عالمی نہ ہو۔ تفسیر نور الثقلین میں حضرت عیسیٰ کی بنی اسرائیل میں منحصر ماموریت کے بارے میں ایک روایت بھی منقول ہے۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰ کی ماموریت عالمی تھی اور بنی اسرائیل میں منحصر نہ تھی۔ البتہ وہ کہتے ہیں کہ جن کی ہدایت اُن کے ذمے تھی لکن میں بنی اسرائیل پہلے صف میں تھے۔

مرحوم علامہ مجلسی نے بحار الانوار میں اولیٰ العزم کے معنی میں روایات نقل کی ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ ان کی دعوت جہانی اور پوری دنیا کے لیے ہونی چاہیے۔

در حقیقت انبیاء کی دعوت حقیقی زندگی کی طرف دعوت ہے اس لیے مندرجہ بالا آیت میں حضرت مسیح کے معجزات



کی تفصیل کے موقع پر سب سے پہلے حکم خدا سے بے جان چیزوں میں زندگی پیدا کرنے کا تذکرہ ہے اور حضرت عیسیٰ کی زبانی نساہت فرمایا گیا ہے۔ میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لیے نشانی لایا ہوں۔ میں گیلی مٹی سے پرندے کی شکل کی کوئی چیز بنانا ہوں اور اس میں پھر خلقت ہوں تو وہ حکم خدا سے پرندہ بن جاتا ہے۔

حکم خدا سے لکھو حیات کا مسئلہ کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ذنب کے تمام زندہ موجودات مٹی اور پانی سے وجود میں آئے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اسے تبدیل بھی تحول و تغیر کہہ سکتے ہیں اور یہ تبدیلی عرصہ دراز میں وقوع پذیر ہوئی ہے تو کیا مانع ہے کہ خدا تعالیٰ تمام عوامل کو جمع کر دے اور وہ تمام مراحل تیزی سے صورت پذیر ہو جائیں اور مٹی زندہ موجود میں بدل جائے۔ جب کہ یہ معجزہ پیش کرنے والے کا ربط مادیات اور پروردگار کی لامتناہی قدرت کے ساتھ ہے۔

ہم کے بعد ان بیداریوں کے علاج کا تذکرہ ہے جن کا علاج بہت مشکل ہے یا جو معمول کے طریقوں سے قابل علاج نہیں ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: "میں بلورناؤ اندھے اور ابرص اور سفید داغ والی بیماری میں مبتلا لوگوں کا علاج کر سکتا ہوں اور مردوں کو بھی لباس حیات پہنا سکتا ہوں۔"

داخل ہے کہ یہ امور خصوصاً اُس زمانے کے اطباء اور علماء کے لیے ناقابل انکار معجزات تھے۔

بعد کے سچے میں لوگوں کے پوشیدہ امور کی خبر دینے کی بات کی گئی ہے کیونکہ ہر شخص کی اپنی انفرادی اور شخصی زندگی سے کچھ ایسے اسرار اور راز ہوتے ہیں جن سے دوسرے لوگ آگاہ نہیں ہوتے۔ اب اگر کوئی شخص کسی قسم کے سابقہ روابط کے بغیر ایسے امور کی اطلاع دے دے مثلاً جو کھانے انہوں نے کھائے ہیں ان کی خبر دے یا جو کچھ بنوں نے پس انداز کر رکھا ہے اس کی تمام تفصیلات بتا دے تو یہ اس امر کی دلیل ہوگی کہ اُس نے غیبی منبع و مصدر سے الہام حاصل کیا ہے۔ جناب مسیحؑ کہتے ہیں: "میں ان امور سے آگاہ ہوں اور تمہیں ان کی خبر دیتا ہوں۔" "وانبئتکم بسا مکاتون و ما تدرکون فہیوتکم۔"

آخر میں فرمایا گیا ہے، "ان تمام چیزوں میں بندہ میرے نشانیں ہیں مگر تم صاحب ایمان ہو اور حقیقت کے متلاشی ہو۔"

"انف ف ذلک لایۃ لکم ان کنتم مؤمنین۔"

کیا یہ معجزات باعث تعجب ہیں؟ تفسیر المائدہ کے مؤلف اور بعض دیگر مفسرین مصر ہیں کہ آیت بالا میں مذکور معجزاتی امور جو حضرت مسیحؑ کے بارے میں قرآن نے بیان کیے ہیں ان کی کچھ نہ کچھ توجیہ کی جانا چاہیے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ نے وقتاً فوقتاً کہا تھا کہ میں حکم خدا سے ایسا کر سکتا ہوں لیکن عملی طور پر یہ کام ہرگز انجام نہیں دے سچے۔ حالانکہ مگر فرض کریں کہ اس آیت میں یہ احتمال ہو پھر بھی سورہ مائدہ آیت ۱۱۰ میں ہے:

"واذ تخلق من الظلیم کھینۃ الظلیم۔۔۔۔۔"

(اے عیسیٰ) خدا کی نعمتوں میں سے ایک نعمت تم پر یہ بھی تھی کہ تم گیلی مٹی سے پرندہ بناتے تھے، اس میں پھونکتے تھے اور وہ حکم خدا سے زندہ ہو جاتا تھا۔



لہذا مندرجہ بالا دلیل قابل قبول نہیں کیونکہ سورہ مائدہ کی مذکورہ آیت میں تو پوری مراحت سے اُن کے عساکر گزرنے کا ذکر ہے۔

علاوہ ازیں ایسی توجیہات پر اصرار کے لیے کوئی وجہ بھی نہیں کیونکہ اگر مرد و انبیاء کے غارق عادت افعال کا انکار ہے تو قرآن نے بہت سے مواقع پر اس کی تصریح کی ہے اور بالفرض ایک آدمہ جگر پر توجیہ کر بھی لیں تو بقیہ مواقع پر لیا کریں گے۔
ان سب پہلوؤں سے صرف نظر کرتے ہوئے جب ہم خدا کو تمام قوانین فطرت و طبیعت پر حاکم جانتے ہیں نہ کہ ان کا محکوم تو ہم کیا مانع ہے کہ اس کے حکم سے استثنائی مواقع پر طبیعت کے معمول کے قوانین میں غیر معمولی طریقے سے تبدیلی وقوع پذیر ہو جائے۔

اگر وہ یہ تصور کرتے ہیں کہ یہ امر خدا کی توحید افعالی، اس کی خالقیت اور لاشریک ہونے کے ساتھ سازگار نہیں تو قرآن نے اس کا جواب دیا ہے کیونکہ تمام جہوں پر ان واقعات کے وقوع کو حکم خدا سے مشروط قرار دیا ہے یعنی کوئی شخص بھی اپنی ذاتی قوت و طاقت کے ذریعے ایسے کاموں میں دخل نہیں ڈال سکتا مگر یہ کہ خدا اور اس کی بے پایاں قدرت کو منظور ہو اور یہ مبین توحید ہے شرک نہیں۔

ولایت تکوینی

اس آیت اور اس سے مشابہ دیگر آیات جن کے بارے میں ہم انشاء اللہ اشارہ کریں گے۔ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے پیچھے جوئے افراد اور اولیاء اللہ اللہ کے فرمان اور اذن سے ہر وقت ضرورت عالم تکوین و آفرینش میں تصرف کر سکتے ہیں اور خلافت معمول اور طبعی قوانین سے بہت کرکچر واقعات کو جنم دے سکتے ہیں۔ "ابرہہ" (شقاوتیہاں) "احی المواتی" (مردوں کو زندہ کرنا ہوں) اور اس قسم کے دیگر الفاظ جو فصل متکلم کی صورت میں ذکر ہوئے ہیں۔ اس بات کی دلیل ہیں کہ اس قسم کے افعال خود پیغمبروں سے صادر ہوتے ہیں اور ان عبادات کو انبیاء و انبیاء کے اولیاء ذاتی طور پر صاحب استقلال زیادہ سے زیادہ اس چیز کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ کوئی شخص یہ تصور نہ کرے کہ خدا کے انبیاء و اولیاء ذاتی طور پر صاحب استقلال اور ان کی کوئی قدرت خدا کی قدرت خلقت کے مقابل متقی نیز دو گانہ پرستی کے احتمال کو برطرف کرنے کے لیے چند مواقع پر "بإذن اللہ" کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں، مکمل بحث آیت میں دومرتبہ اور سورہ مائدہ کی آیت ۱۰ میں چار مرتبہ "بإذن اللہ" کا تکرار ہے۔

ولایت تکوینی سے بھی اس کے علاوہ کچھ مراد نہیں کہ انبیاء اور آئمہ عظیمہ اسلام ضرورت کے وقت اذن پروردگار سے علم خلقت میں تصرفات کر سکتے ہیں اور یہ چیز ولایت تشریفی یعنی عوام پر حکومت، قوانین کی نشر و اشاعت اور براہ راست دعوت و ہدایت کرنے سے بالاتر ہے۔

جو کچھ کہا جا چکا ہے اس سے ان لوگوں کا جواب بھی اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے جو مردان خدا کی ولایت تکوینی کے منکر ہو



جاتے ہیں اور اسے خراب کی ایک قسم سمجھتے ہیں کیونکہ کوئی شخص بھی معجزات انبیاء اور آئمہ علیہم السلام کو خدا کے مقابلے میں صاحب قدرت نہیں سمجھتا۔ وہ حضرت یہ صاحب کام خدا کے فرمان اور اس کی اجازت سے انجام دیتے ہیں لیکن ولایت ملکوتی سے منکر یہ کہتے ہیں کہ انبیاء کا کام صرف تبلیغ احکام اور خدا کی طرف دعوت دینا ہے اور کبھی بھی وہ بعض امور ملکوتی کی انجام دہی کے لیے دُعا و سے استفادہ کرتے ہیں اور اس سے زیادہ ان سے کوئی کام نہیں جو سکتا حالانکہ مندرجہ بالا آیت اور اس کے مشابہ دیگر آیات کچھ اور کہتی ہیں۔

ضمنی طور پر مندرجہ بالا آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم انبیاء کے بہت سے معجزات تو ایسے افعال ہیں جو خود انہی کے ذریعے انجام پاتے ہیں اگرچہ وہ فرماں خدا کے تحت اور خدائی طاقت کی مدد سے ہوتے ہیں۔ اس لیے حقیقت میں کہا جاسکتا ہے کہ معجزہ انبیاء کا فعل بھی ہے کیونکہ ان کے ذریعے انجام پاتا ہے اور خدا کا کام بھی ہے کیونکہ یہ درکار کی قدرت سے مدد طلب کرتے ہوئے اور اس کے اذن سے انجام پاتا ہے۔

۵۔ وَمُصَدِّقَاتِ الْمَائِنِ يَدَيَّ مِنَ الشُّرُطَةِ وَلَا حِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجَنَّتُكُمْ بِآيَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا

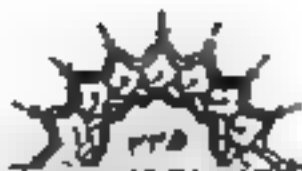
ترجمہ

۵۔ اور میں تصدیق کرتا ہوں اور گواہی دیتا ہوں اس کی جو تورات میں سے مجھ سے پہلے تھا اور (میں آیا ہوں تاکہ) بعض چیزیں جو ظلم و گناہ کی وجہ سے تم پر حرام تھیں (جیسے بعض چوپایوں کا گوشت اور بچھلیاں) انہیں حلال کروں اور تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لیے نشانی لایا ہوں۔ اس لیے تم خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

تفسیر

یہ آیت حضرت عیسیٰ کی زبان سے یوں نقل ہوئی ہے: میں تورات کی تصدیق کرتے ہوئے اس کے مابانی و اصول حکم کرنے کے لیے آیا ہوں اور اس لیے بھی کہ دین موسیٰ میں جو بعض مہذبیاں (مثلاً اونٹ کا گوشت، کچھ حیوانات کی چرمیں) بعض پرندے اور بچھلیاں منوث تھیں، تمہاری خلاف ورزیوں کی وجہ سے تمہیں انہیں قبلہ سے لیے مباح کر دیں۔

سے ہذا یہ صریح آئمہ علیہم السلام کے بارے میں ہے۔



جیسا کہ سورہ نساء کی آیہ ۱۶۰ کی تفسیر میں آئے گا کہ وہ یہودی کی ہٹ دھرمی اور سرکشی کی وجہ سے کچھ پائیزہ نعمتیں وقتی طور پر ان پر حرام ہو گئی تھیں :

”فَبَطَلْهُمْ مِنْ الدِّينِ هَادُوا حَزَمْتَ
عَلَيْهِمْ طَائِفَاتٌ احْتَلَتْ لَهُمْ“
پس ان کے دین کی وجہ سے ان یہودیوں پر اللہ نے ہٹ سی

پائیزہ چیزیں حرام قرار دے دی تھیں۔

لیکن حضرت عیسیٰ کی رسالت اور اس عظیم پیغمبر کے ظہور پر قسم درحالی کے طور پر وہ مانعیتیں ختم کر دی گئیں۔
اس کے بعد حضرت عیسیٰ کی زبانی ایک مجدد جو گزشتہ آیت میں آیا تھا اس کا ذکر کیا گیا ہے : ”میں خدا کی طرف سے
اپنی دولت کی صداقت کے لیے ایک نشانی لایا ہوں اس بناء پر یہ جونا چاہیے کہ خدا سے ڈرو اور میرے احکام کی پیروی کرو
”وَجِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ فَاسْتَمِعُوا لِلَّهِ وَأَطِيعُوا“۔

۵۔ اِنَّ اللّٰهَ رَقِيبٌ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ
مُّسْتَقِيْمٌ ○

ترجمہ

۵۔ خدا میرا اور تمہارا پروردگار ہے پس اسی کی عبادت کرو (نہ کہ میری یا کسی اور چیز کی) یہی
سیدھی راہ ہے۔

تفسیر

اس آیت سے اور قرآن کی دیگر آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ ہر قسم کے ابہام اور اشتباہ کے غلاتے
کے لیے اور اس لیے کہ آپ کی استثنائی ولادت کو آپ کی اہمیت پر سند نہ سمجھ لیں بار بار کہتے تھے : اللہ ہی میرا
اور تمہارا پروردگار ہے۔ نیز کہتے : میں اس کا بندہ ہوں اور اس کا بھیجا ہوا ہوں۔ اس کے برخلاف مروجہ تحریف مشدہ
انجیلوں میں حضرت مسیح کی زبان سے خدا کے بارے میں ”باپ“ کا لفظ نقل کیا گیا ہے۔ قرآن میں ایسے مقامات پر لفظ
”رب“ یا اس جیسے الفاظ نقل ہوئے ہیں ”اِنَّ اللّٰهَ رَقِيبٌ وَرَبُّكُمْ“۔ اور یہ چیز دعوائے الوہیت کے
خلاف اور اس کے مقابلے میں حضرت مسیح کی انتہائی توجہ کی نشاندہی کرتی ہے۔



آخر میں زیادہ تاکید کے لیے فرمایا: ”فَاعْبُدُوهُ“ یعنی خدا کی پرستش اور عبادت کرو نہ کہ میری اور یہ توحید و یگانہ پرستی ہی سیدھی راہ ہے۔

۵۲۔ فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَىٰ مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ؟ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ ؕ آمَنَّا بِاللَّهِ ؕ وَاشْهَدْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ۝

ترجمہ

۵۲۔ حضرت عیسیٰ نے ان سے کفر اور مخالفت کو دیکھا تو کہا: کون خدا کی طرف (اور اس کے دین کے لیے) میرا یا اور مددگار بنے گا؟ حواریین (جو ان کے مخصوص شاگرد تھے) کہنے لگے ہم خدا کے یا اور مددگار ہیں، اس پر ایمان لاتے ہیں اور آپ ابھی گواہ رہیں کہ ہم اسلام لے آئے ہیں۔

تفسیر

اہل یہود حضرت عیسیٰ کے آنے سے پہلے حضرت موسیٰ کی پیشین گوئی اور نبوت کے مطابق حضرت مسیح کے ظہور کے منتظر تھے لیکن جب انہوں نے خبر دیا اور بنی اسرائیل کے ایک سنگر اور منحرف گروہ کو اپنے منافع خواہ میں نظر آنے تو صرف تھوڑے سے لوگ آپ کے گرد جمع ہوئے اور جن لوگوں کا خیال تھا کہ حضرت مسیح کی دعوت قبول کرنے اور احکام خدا کی پیروی سے ان کی حیثیت اور قدر و منزلت خطرے سے دوچار ہو جائے گی انہوں نے قوانین الہی کو قبول کرنے سے منہ پھیر لیا۔

دلیل و برہان سے انہیں کافی دعوت دینے کے بعد حضرت عیسیٰ اس نتیجے پر پہنچے کہ بنی اسرائیل کا ایک گروہ مخالفت اور گناہ پر مصر ہے اور وہ کسی انکار اور کج روی سے دستبردار نہیں ہوگا لہذا انہوں نے پکار کر کہا: کون ہے جو دین خدا کی حمایت اور بیادناغ کرے ”فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَىٰ مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ؟“

صرف تھوڑے سے افراد نے اس کا مثبت جواب دیا۔ یہ چند پاک باز افراد تھے جنہیں قرآن نے حواریین کا نام دیا ہے۔



انہوں نے حضرت مسیح کی پلہ کا جواب دیا اور ہر رسم کی مدد کی ان کے مقدس مقاصد کی پیش رفت کی راہ میں دفع کرنے سے دریغ نہ کیا۔

حواریوں نے حضرت عیسیٰ کی ہر طرح سے مدد کا اعلان کیا اور جیسا کہ قرآن نے مندرجہ ذیل آیت میں اُن سے نقل کیا ہے کہنے لگے :

”قَالَ الْخَوَارِيُّونَ نَحْنُ اَنْصَارُكَ .
اَمْنَا يَا مَلِكُ . وَاشْهَدُ بِاَقْلَامِنَا“

”ہم خدا کے یاد و مددگار ہیں ، خطا پر ایسٹن کرنے ہیں اور
آپ کو اپنے اسلم پر گواہ بناتے ہیں ۔“

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ حواریوں نے حضرت عیسیٰ کی دعوت کے جواب میں یہ نہیں کہا کہ ہم آپ کے مددگار ہیں بلکہ اپنی انتہائی توحید پرستی اور غلو کے ثبوت کے لیے اور اس مقصد کے لیے کہ ان کی بات سے کسی شرک کی جو نہ آئے ، وہ کہنے لگے : ہم خدا کے مددگار اور ساتھی ہیں اور اس کے دین کی مدد کریں گے اور آپ کو اس حقیقت پر گواہ بناتے ہیں ، گویا وہ بھی یہ محسوس کرتے تھے کہ صرف اور کچھ راہِ افلاک آئندہ حضرت مسیح کی اہمیت کا دعویٰ کریں گے لہذا وہ اُن کے ماتحتوں میں کوئی دلیل نہیں دینا چاہتے تھے ۔

حواری کون تھے

”حواریین“ ”محدی“ کی جمع ہے اس کا مادہ ”حور“ ہے جس کا معنی ہے ”دھڑا اور سفید کرنا“ ، کبھی کبھی یہ لفظ ہر سفید چیز کے لیے بھی بولا جاتا ہے اسی لیے سفید غذا کو عرب لوگ ”حواری“ کہتے ہیں ۔ بہشت کی حوریں کو بھی اُن کے سفید رنگ کی وجہ سے ”حواریہ“ کہتے ہیں ۔

حضرت عیسیٰ کے شاگردوں کو ”حواری“ کیوں کہا گیا ، اس کے لیے بہت سے احتمالات پیش کیے گئے ہیں مگر جو چیز زیادہ ترین عقل ہے اور دین کے عظیم رہبروں سے منقول احادیث میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے یہ ہے کہ وہ پاک دل لوگ تھے اور روح باصفا کے مالک تھے اس کے علاوہ وہ دوسروں کے افکار کو پاکیزہ اور روشن کرنے ، لوگوں کے دامن کو کھردگی اور گناہ سے دھونے اور انہیں پاک کرنے میں بہت کوشش رہتے تھے ۔

عمر بن العزیز میں امام علی بن موسیٰ علیہ السلام سے منقول ہے :

آپ سے سوال کیا گیا ۔

حواریین کا یہ نام کیوں رکھا گیا ؟

آپ نے فرمایا :



بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اُن کا مشغلوں پر ہے دھوڑتا رہتا لیکن ہمارے نزدیک اس کی عفت یہ ہے کہ انہوں نے خود کو بھی گناہ کی آلودگی سے پاک رکھا جو اتنا اور دوسروں کو بھی پاک کرنے میں کوشاں رہتے تھے۔

حواری قرآن اور انجیل کی نظر میں

قرآن نے سورہ صف آیت ۱۲ میں حواریوں کے بارے میں گفتگو کی ہے اور ان کے ایمان کا تذکرہ کیا ہے لیکن انجیل میں حواریوں کے بارے میں جو جے ایس ایف سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سب حضرت عیسیٰ کے بارے میں لغزش کرتے تھے۔ انجیل متی اور لوقا کے باب ۶ میں حواریوں کے نام اس طرح سے بیان کیے گئے ہیں۔

۱، پطرس	۲، اندریاس	۳، یعقوب
۴، یوحنا	۵، فیلوپس	۶، برتولوما
۷، توما	۸، متی	۹، یعقوب ابن حلفا
۱۰، شمعون	۱۱، یہودا	۱۲، یہووانے اسخریوطی
(جن کا تب غیر تھا)	(جو بیت کے بھائی تھے)	(جس نے عزت مسیح سے خیانت کی)

مشہور مفسر طبری صحیح البیان میں لکھتے ہیں :

حواری حضرت عیسیٰ کے ساتھ سفر کرتے تھے۔ جب کبھی انہیں جھوک یا پیاس لگتی، حکم خدا سے آب و غذا اُن کے لیے جتایا جاتا۔ وہ اسے اپنے لیے عظیم افتخار اور بڑا اعزاز سمجھتے۔ وہ حضرت عیسیٰ سے پوچھتے: کیا ہم سے بڑھ کر بھی کوئی افضل و بالاتر ہے۔ تو وہ کہتے: ہاں، افضل منکم من یعمل بیدہ و یا کل من کسبہ۔ (یعنی وہ شخص تم سے افضل ہے جو اپنے ہاتھ سے کھاتا ہے اور اپنی کھائی کھاتا ہے) اس نے بعد وہ لوگوں کے پیڑے دھوئے تھے اور اس کام سے اُجرت لیتے تھے۔ دیوں عمدہ انہوں نے سب لوگوں کو درس دیا کہ کام اور کوشش کرنا کوئی ننگ و عار نہیں ہے۔

۵۳۔ رَبَّنَا اٰمَنَّا بِمَا اَنْزَلْتَ وَاشْبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا
مَعَ الشَّٰهِدِيْنَ ۝



ترجمہ

۵۲۔ پروردگار! جو کچھ تو نے نازل کیا ہے ہم اس پر ایمان لائے ہیں اور ہم نے (تیرے) رسول کی پیروی کی ہے۔ ہمیں گواہوں کے ذمے میں بلے۔

تفسیر

حضرت مسیح کی دعوت قبول کرنے کے بعد حواریوں نے ان کا ساتھ دیا، ان کی مدد کی اور انہیں اپنے ایمان پر گواہ بنایا۔ پھر بارگاہِ الہی کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنا ایمان پیش کیا اور کہنے لگے، پروردگار! جو کچھ تو نے بھیجا ہے ہم اس پر ایمان لائے ہیں ("وَمَتَّبِعْنَا أَمْرًا سَمِعْنَا") لیکن ایمان کا چونکہ دعویٰ ہی کافی نہیں تھا، اس لیے ساتھ ہی آسمانی احکام پر عمل کرنے اور پیغمبر خدا، حضرت عیسیٰ کی پیروی کا ذکر کرنے کے اند کہنے لگے: ہم نے تیرے بھیجے ہوئے مسیح کی پیروی کی ("وَاتَّبَعْنَا الْمَسْعُومَ") اور یہ بارے ایمان راسخ کا زندہ ثبوت ہے۔ یہ اس لیے کہ جب ایمان راسخ انسانی میں اتر جاتا ہے تو اس کے عمل میں منکس ہوتا ہے اور عمل کے بغیر ممکن ہے دعویٰ صرف خیالی ایمان ہو اور حقیقی واقعی ایمان نہ ہو۔

اس کے بعد انہوں نے یہاں کیا کہ غلطیوں کے کام شہادت دینے والوں اور گواہوں کے ذمے میں شمار کرے ("فَاكْتَبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ")۔ یہ گواہ وہی لوگ ہیں جو اس دنیا میں امتوں کی رہبری کرتے ہیں اور قیامت میں لوگوں کے نیک و بد اعمال کے گواہ ہوں گے۔

۵۳۔ وَمَكْرُؤًا وَمَكَرَانِئًا ۖ وَابْتِغَاءَ مَكْرُومٍ ۚ

ترجمہ

۵۴۔ اور ایہودیوں اور مسیح کے دشمنوں نے ان کی اور ان کے دین کی بربادی اور نابودی کے لیے سازش کی اور خدا نے (ان کی اور ان کے دین کی حفاظت کے لیے) چارہ جوئی کی اور خدا بہترین چارہ جوئی کرنے والا ہے۔

خدا کی مکر سے کیا مراد ہے۔ "حواریوں" کے دین کا تذکرہ کرنے کے بعد اب اس میں یہودیوں کی شیطانی



سازشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: انہوں نے سیح کو نابود کرنے والوں کی آواز کو خاموش کرنے اور ان کے دین کی پیش رفت روکنے کے لیے کئی مکر و فریب اور سازشیں کیں لیکن خدا کی تدبیر اور چارہ جوئی ان سب مکاریوں اور سازشوں سے بالاتر اور زیادہ موثر تھی۔

قرآن میں اس جیسے کئی ایک آیات و احادیث ہیں جن میں مکر کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے۔ لغت عرب میں ”مکر“ کا معنی اس سے بہت مختلف ہے جو اس کا معنی آج کی فارسی میں ہے۔ فارسی میں آج کل ”مکر“ شیطانی سازشوں اور نیاں کاریوں کے لیے استعمال ہوتا ہے حالانکہ لغت عرب کے اصول معانی میں ”مکر“ ہر طرح کی چارہ جوئی کو کہتے ہیں جو اچھی بھی ہوتی ہے اور کبھی بُری بھی۔ مغزواتِ راغب میں ہے۔

”المحکر صرف الغیر عما بقصدہ“

مکر یہ ہے کہ کسی کو اس کے مقصد سے ہٹا دیا جائے۔

(اس سے قطع نظر کہ اس کا مقصد اچھا ہے یا بُرا)

قرآن مجید میں بھی ”مکر“ کبھی لفظ ”خیر“ کے ساتھ آیا ہے، مثلاً

”وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمُحْكِرِينَ“

یعنی - خدا بہترین چارہ جوئی کرنے والا ہے۔

اور کبھی لفظ ”سئ“ (یعنی - بُرا) کے ساتھ مذکور ہے، مثلاً

”وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ“

یعنی - بُری سازش اور مکر اپنے اہل کے علاوہ کسی کا احاطہ نہیں کرے گی۔ (ناظرہ ۲۴)

اس بناء پر محل بحث آیت سے مراد یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کے دشمن اپنی شیطانی سازشوں کے ذریعے اس خدائی دعوت کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنا چاہتے تھے لیکن خدا تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی جان کی حفاظت اور اس کے دین کی پیش رفت کے لیے تدبیر کی اور ان کے نقشے نقش بر آب ثابت ہوئے۔

۵۵۔ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يَا عِيسٰى اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ
وَمُطَهِّرُکَ مِنَ الذِّیْنِ کَفَرُوْا وَجَاعِلُ الذِّیْنِ
اَتَّبَعُوْکَ فَنُوْفِ الذِّیْنِ کَفَرُوْا اِلَیَّ یَوْمَ الْقِیَامَةِ
سَمِیْعٌ اِلَیَّ مَرْجِعُکُمْ فَاَحْکُمْ بَیْنَکُمْ فَاِذَا کُنْتُمْ



فِيهِ تَخْتَلِفُونَ

ترجمہ

۵۵۔ (وہ وقت یاد کرو جب خدا نے عیسیٰ سے کہا : میں تمہیں لے لوں گا اور اپنی طرف اٹھا لوں گا اور جو لوگ کافر ہو گئے ہیں ان سے پاک کروں گا اور جو لوگ تیری پیروی کرتے ہیں انہیں ان لوگوں سے یوم قیامت تک کے لیے برتر قرار دوں گا جو کافر ہو گئے ہیں۔ پھر تمہاری بازگشت میری طرف ہے اور جس چیز میں تم اختلاف کرتے ہو اس کا تمہارے درمیان فیصلہ کروں گا۔

تفسیر

جمع نے کہا ہے کہ یہودیوں نے بعض جرائم پیشہ عیسائیوں کی مدد سے حضرت مسیح کے قتل کا مقصد ارادہ کر لیا تھا لیکن خدا تعالیٰ نے ان کی سازشوں کو نقش بر آب کر دیا اور اپنے پیغمبر کو ان کے چنگل سے رہائی بخشی۔ اس آیت میں خدا تعالیٰ نے اس سے پہلے جو احسان حضرت مسیح پر کیا اُس کا ذکر فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے : اے عیسیٰ ! میں تمہیں لے لوں گا اور اپنی طرف اٹھا لوں گا (”إِنَّا قَدْ مَتَوَفَّيْنٰكَ وَرَافَعْنٰكَ اِلٰی“)

سورہ نساء کی آیت ۱۵۷ سے استناد کرتے ہوئے مفسرین میں یہ مشہور ہے کہ حضرت عیسیٰ قتل نہیں ہوئے اور خدا انہیں آسمان کی طرف لے گیا۔ لیکن خود عیسائی موجودہ انجیل کے مطابق کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ قتل ہوئے اور بعد ازاں انہیں دفن کر دیا گیا، پھر وہ مردوں کے درمیان سے اُٹھے، تھوڑی مدت زمین پر رہے اور آسمان کی طرف اُٹھ گئے۔

المسند کے مؤلف کی طرح بعض مفسرین اسلام کا عقیدہ ہے کہ حضرت مسیح قتل ہوئے اور خدا صرف ان کی روح کو آسمان کی طرف لے گیا۔

اس بارے میں ضروری گفتگو یہ کہ ان دونوں میں سے کونسا حق ہے اس مسئلے میں بحث انشاء اللہ سورہ نساء کی آیت ۱۵۷ کے ذیل میں آئے گی۔

یہاں جس بات کی طرف توجہ ضروری ہے۔ یہ ہے کہ محل بحث آیت حضرت عیسیٰ کی موت پر دلالت نہیں کرتی اگرچہ بعض یہ تصور کرتے ہیں کہ ”متوفیٰ“ کا مادہ ہے ”وفات“ اور یہ موت کے معنی میں ہے



اس لیے ان کا خیال ہے کہ جو عقیدہ مسلمانوں میں مشہور ہے کہ حضرت عیسیٰ نے وفات نہیں پائی اور وہ زندہ ہیں اس مفہوم کے متعلق ہے حالانکہ احادیث بھی اس عقیدے کی تائید کرتی ہیں نیز فضوت ہاتھ سے نکل جانے کے معنی میں ہے اور توقف ابرو لان ترقی "وقف" کے مادہ سے ہے جس کا مطلب ہے "کسی چیز کی تکمیل کرنا"۔ عہد و پہلین پر عمل کرنے کو "وقف" بھی تکمیل کرنے اور اسے انجام تک پہنچانے کی وجہ سے کہتے ہیں۔ اسی بنا پر اگر کوئی شخص کامل طور پر اپنا حق دوسرے سے اپنی تحویل میں دے دے تو عرب کہتے ہیں "توقف دینہ" یعنی اپنا حق پورا پورا وصول کر لیا۔

آیات قرآنی میں بھی "توقف" بار بار دینے کے معنی استعمال ہوا ہے مثلاً

"وهو الذي يتوقفكم بالليل"

ويعلم ما جرحتم بالاشهار"

وہ ذات وہ ہے جو تہدی روح کو رات کے

وقت سے ممتی ہے اور جو کچھ تم دن کو انجام دینے پر اس

سے آگاہ ہے۔ (انعام - ۱۶۰)

اس آیت میں خنڈ کو "توقف روح" کہا گیا ہے۔ یہی معنی سورہ زمر کی آیہ ۴۲ میں بھی آیا ہے۔ قرآن کی

متعدد دیگر آیات میں بھی لفظ "توقف" دینے کے معنی میں نکلا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ "توقف" بعض اوقات "موت" کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے لیکن وہاں بھی حقیقت

موت کے مفہوم میں نہیں بلکہ روح کو اپنی تحویل میں لے لینے کے معنی میں ہے۔ اصولی طور پر "توقف" کے

معنی میں "موت" پوشیدہ نہیں ہے۔ اور "فوت" کا مادہ "وقف" کے مادہ سے باطل ہوا ہے۔

جو کچھ کہا جا چکا ہے اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے کل بحث آیت کی تفسیر دوسرے طور پر واضح جو جاتی ہے خداوند

عالم فرماتا ہے۔ اے عیسیٰ میں تجھے اپنی تحویل میں لے لوں گا۔ تجھے اٹھائے جاؤں گا اور یہ مفہوم حضرت عیسیٰ کی حیات

اور زندگی پر دلالت کرتا ہے نہ کہ اُن کی موت پر (غور کیجئے)۔

"و معلنهم من الذین کفروا"

پروردگار نے حضرت عیسیٰ سے جو خطاب فرمایا اس جملے میں اُس کا ایک حصہ آیا ہے۔ ارشاد ہے اجر کا فرماں ان

سے میں تمہیں پاک و پاکیزہ رکھوں گا۔ اس پاکیزگی سے مراد ہے ایمان، ناپاک اور حق و حقیقت سے بٹے ہوئے افراد

کے چنگ سے نجات دینا ہے۔ وہ کوشش کرتے تھے کہ ناروا تہمتوں اور بزدلانہ سازشوں کے ذریعے انہیں گمراہ

کرویں لیکن خدا نے اُن کے دین کو کامیابی بخش اور انہیں تہمتوں سے پاک کیا جیسا کہ سورہ فتح میں پیغمبر اسلام کے بارے

میں ہے۔

"انما فتحنا لک فتحاً مبیناً لیخضعن لک القہ"

ما تعظم من ذلک وما تاخسر"



”ہم نے تمہیں واضح کامیابی عطا فرمائی تاکہ خدا تمہارے گزشتہ
ہزار آئندہ گناہ بخش دے اور تمہیں ان تبتوں سے جو گناہ کی شکل
میں دشمنوں نے تم سے باز رکھی تھیں پاک رکھے“ (فتح - ۱۲۰)

یہ بھی ممکن ہے کہ پاک کرنے سے مراد حضرت مسیح کو اس اکودہ ماحول سے باہر نکالنا ہو اور اس جہے سے پہلے
وہ جہے سے بھی یہی معنی مناسب لگتا ہے۔

”وجاعل الذین اشعروا فوق الذین کفروا الی
”یوم القیمۃ“

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: تیرے پیروکاروں کو قیامت تک کے لیے کافروں پر برتری دوں گا۔ یہ ایک
بشارت ہے جو — خدا نے حضرت مسیح اور ان کے پیروکاروں کو دی تاکہ جو راہ انہوں نے مشتبہ کی تھی
اُس پر چنے رہنے کے لیے اُن میں ولولہ پیدا ہو۔ درحقیقت یہ آیت قرآن کی ہجر نائیٹوں اور غیبی پیشین گوئیوں میں
سے سب سے جس میں کہا گیا ہے کہ حضرت مسیح کے پیروکار ہمیشہ یہودیوں پر جو کہ مسیح کے مخالف تھے ابرتر رہیں گے
آج کی دنیا میں ہم یہ حقیقت اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ یہودی اور مسیحیوں کے مابین
اور ان پر ہر دوسرے کے بغیر ایک دن بھی سیاسی اور سماجی طور پر زندہ نہیں رہ سکتے۔ واضح ہے کہ ”الذین کفروا“
کے یہاں مراد وہی یہودی ہیں جنہوں نے حضرت مسیح کا انکار کیا۔

کیا اہل یہود اور مسیح کا دین باقی رہے گا

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے وہ یہ کہ اس آیت کے مطابق یہود و نصاریٰ قیامت تک اس دنیا میں ہیں
گے اور ان مذاہب کے پیروکار ہمیشہ موجود رہیں گے جب کہ حضور حضرت ”مسجدی علیہ السلام“ سے مربوط اخبار
اور روایات میں ہم پڑھتے ہیں کہ آپ تمام ادیان پر غالب آئیں گے اور آپ پوری دنیا پر حکومت کریں گے۔
اس سوال کا جواب مذکورہ روایات پر غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کیونکہ حضرت ”مسجدی علیہ السلام“ کے
بار سے میں مروی روایات میں ہے کہ کوئی گھر، شہر اور بیابان ایسا نہیں رہے گا جس میں توحید داخل نہ ہو۔ یعنی
اسلام ایک باقاعدہ اور عمومی دین کی حیثیت سے دنیا کو اپنے اندر سمو لے گا اور اُس وقت کی حکومت ایک اسلامی
حکومت کے طور پر ابھرے گی اور اسلامی قوانین کے علاوہ دنیا پر کسی چیز کی حکمرانی نہیں ہوگی۔ لیکن اس سے کوئی
مانع نہیں کہ یہود و نصاریٰ کی ایک اقلیت حضرت ”مسجدی علیہ السلام“ کی حکومت کے زیر سایہ ”اہل ذمہ“ کی
حیثیت سے موجود ہو کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ حضرت ”مسجدی علیہ السلام“ لوگوں کو جبری طور پر اسلام کی طرف نہیں
کھینچیں گے بلکہ مطلق و دلیل کے بل بوتے پر آگے بڑھیں گے اور آپ کی طاقت تو تلف ماحول کے قیام، ظالم
حکومتوں کو سرنگوں کرنے اور دنیا کو زیر پرچم اسلام لانے کے لیے استعمال ہوگی، نہ کہ آپ لوگوں کو اپنا دین قبول



کرسنے پر مجبور کریں گے ورنہ تو آزادی اور اختیار کا کوئی مفہوم نہیں رہے گا۔

ثُمَّ اِلٰی مَرْجِعِكُمْ فَحُكْمٌ بَيْنَكُمْ فَبِمَا كُنْتُمْ
فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ۝

جو کچھ گذشتہ جہلوں میں کہا جا چکا ہے وہ اس جہان کی کامیابیوں کے بارے میں تھا لیکن آخری فیصلہ جو دراصل
احل کے نتائج پر مبنی ہے اُس کا ذکر اس جیسے میں کیا گیا ہے۔ فرمایا: تم سب میری طرف چٹ آؤ گے اور میں تمہارے
اور ان چیزوں کے درمیان جن میں تم اختلاف کرتے ہو فیصلہ کروں گا۔

۵۶۔ فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاَعَذُّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا

فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَّصِيْرٍ ۝

۵۷۔ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّٰلِحٰتِ

فَيُوَفِّيهِمْ اَجْرَهُمْ ۝ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظَّٰلِمِيْنَ ۝

۵۸۔ ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنْ الْاٰیٰتِ وَالذِّكْرِ

الْحَكِيْمِ ۝

ترجمہ
۵۶۔ رہے وہ لوگ جو کافر ہو گئے ہیں (اور انہوں نے حق کو پہچاننے کے باوجود

اس کا انکار کر دیا ہے) انہیں دنیا و آخرت میں سخت عذاب کروں گا اور ان کے پاس مددگار
نہیں ہیں۔

۵۷۔ اور رہے وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک عمل انجام دیے
ہیں تو خدا انہیں ان کا پورا پورا اجر و ثواب دے گا اور خدا ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔

۵۸۔ یہ جو کچھ ہم تیرے لیے پڑھتے ہیں، تیری حقانیت کی نشانی اور حکیمانہ تذکرہ ہے



تفسیر

”فَإِنَّمَا الَّذِينَ كَفَرُوا غِنَا عَذَابُهُمْ شَدِيدًا“

الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ“

یہ ذکر کرنے کے بعد کہ لوگوں کی بازگشت اللہ کی طرف ہے اور وہی ان کے درمیان فیصلہ کرے گا اب اس آیت میں اس تضاد کا ختمہ بیان ہوا ہے کہ وہ افراد جو کافر ہیں اور حق و عدالت کے مخالف ہیں، جیسے وہ اس دنیا میں دوزخ و عذاب اور تکلیف میں مبتلا ہوں گے اُس جہان میں بھی ان کی یہی حالت ہوگی اور کوئی بھی ان کی حمایت اور مدد نہیں کرے گا۔

”وَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُوَفِّيهِمْ

أَجْرَهُمْ“

لیکن جو ایمان لائے ہیں اور عمل صالح بجالاتے ہیں وہ لوگ اپنا پورا پورا اجر و ثواب حاصل کریں گے اور خدا کسی ظالم کو پسند نہیں کرتا۔ ”وَأَمَّا لَا يَعْجِبُ الْقَائِلِينَ“

پہلی آیت میں عذاب دنیا کی طرف بھی اشارہ ہوا تھا اس سے ہم ضمناً یہ استفادہ کرتے ہیں کہ کفار و جن سے یہاں یہودی مراد ہیں اس جہان میں بھی پریشانیوں اور مصیبتوں میں گرفتار رہیں گے۔ یہودی قوم کی تاریخ اس دعویٰ پر گواہ ہے۔ ان پر دوسری حکومتوں کے تفوق کا یہ ایک اثر ہے جس کی طرف گذشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے۔

”ذَٰلِكَ نَتْلُوهُ عَلَيْكَ مِنَ الْآيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ“

حضرت یسٰح کی سہ گزشت اور ان کی عجیب و غریب تاریخ کے ایک گوشے کا ذکر کرنے کے بعد

اب رُسنے سخن پر غیر اسلام کی طرف ہے۔ فرماتا ہے: اور جو کچھ ہم نے تیرے سامنے پڑھا ہے وہ تیری دعوت و رسالت کی صداقت کی آیات اور نشانیاں ہیں اور حکمت آمیز یاد آوری ہے جو آیات قرآن کی صورت میں تجھ پر نازل ہوئی اور یہ وہ آیات حکم ہیں جو ہر قسم کے منہرل، باطل اور خرافات سے پاک ہیں اور حقائق کو واضح کرتی ہیں۔

۵۹۔ اِنَّكَ مِثْلُ عِيسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمِثْلِ اٰدَمَۃٖ خَلَقْنٰهُ مِنْ

تَرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝

۶۰۔ اَلْحَوٰثُ مِنْ زَيْتٍ فَلَا تَكُنْ مِنَ الْمُسْتَرْبِیْنَ ۝



ترجمہ

۵۹۔ عیسیٰ کی مثال خدا کے نزدیک آدم کی سی ہے، جسے خدا نے مٹی سے پیدا کیا۔ پھر اُس سے کہا: ہو جا تو وہ قوراً ہو گیا (اس لیے باپ کے بغیر مسیح کی ولادت ہرگز اُن کی الوہیت کی دلیل نہیں بن سکتی)۔

۶۰۔ یہ چیزیں تیرے پروردگار کی طرف سے حقائق ہیں لہذا تم تردد و شک کرنے والوں میں سے نہ بنو۔

شان نزول

جیسا کہ سورہ کی ابتداء میں تفصیل سے بیان ہو چکا ہے اس سورہ کی کافی آیات نجران کے عیسائیوں کے سوال کے جواب کے طور پر نازل ہوئیں۔ وہ ایک سامعہ رکنی وفد کی صورت میں پیغمبر اسلام کے پاس مدنیہ میں آئے۔ اُس میں اُن کے چند شاگرد مذہباً اور بزرگ شامل تھے۔

انہوں نے جو مسائل پیغمبر اکرمؐ کے سامنے پیش کیے ان میں سے ایک مسئلہ یہ تھا کہ وہ پوچھنے لگے کہ آپ ہمیں کس چیز کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ رسول اللہؐ نے فرمایا: خدا نے یگانہ کی طرف اور یہ کہ میں اُس کی طرف سے ہدایت مخلوق کی رسالت کے منصب پر فائز ہوں نیز یہ کہ مسیح اُس کے بندوں میں سے ایک تھے، حالات بشری رکھتے تھے اور دوسرے لوگوں کی طرح غذا کھاتے تھے۔ انہوں نے یہ بات نہ مانی اور باپ کے بغیر حضرت عیسیٰ کی ولادت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے ان کی الوہیت کے لیے دلیل کے طور پر پیش کیا۔ اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور انہیں جواب دیا گیا۔ لیکن جب وہ یہ جواب قبول کرنے پر بھی تیار نہ ہوئے تو انہیں مباہلہ کی دعوت دی گئی، جس کی تفصیل عنقریب بیان کی جائے گی۔

تفسیر

پہلی آیت میں ایک مختصر اور واضح استدلال ہے جس میں نجران کے عیسائیوں کے حضرت عیسیٰ کے بارے میں دعویٰ الوہیت کا جواب ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ باپ کے بغیر پیدا ہوئے تو یہ امر اس کی دلیل کبھی نہیں بن سکتا کہ وہ خدا کے بیٹے یا خود خدا تھے۔ کیونکہ یہ بات تو حضرت آدمؑ کے بارے میں عجیب ترین صورت میں محقق اور ثابت ہو چکی ہے۔ وہ تو ماں باپ دونوں کے بغیر دنیا میں آئے تھے۔ اس لیے جیسے حضرت آدم کی مٹی



سے پیدائش کوئی تعجب کی بات نہیں اور خدا جو کامل انجام دینا چاہے اس کا فعل اور ارادہ ہم آہنگ ہیں۔ اس طرح حضرت عیسیٰ کا اپنی والدہ سے بغیر باپ کے پیدا ہونا کوئی محال مسئلہ نہیں ہے بلکہ حضرت آدم کی پیدائش کئی لحاظ سے نیاہ تعجب خیز ہے۔ پس اگر بغیر باپ کے حضرت عیسیٰ کی پیدائش ان کی بلوغت کی دلیل ہے تو حضرت آدم اس امر کے زیادہ مستحق ہیں۔

مندرجہ بالا آیت میں پہلے حضرت آدم کی خلقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "خلقت من تراب" (یعنی۔ اسے مٹی سے پیدا کیا)۔ دوسرے جہوں کے قرینے سے۔ اس جیسے سے مراد حضرت آدم کے جسم اور مادی پہلو سے ان کی خلقت ہے۔ اس کے بعد دوسرے جہے میں ان کی حیات اور روح کی خلقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "ثم انزلنا من السماء ماء فیکون" (پھر اس سے کہا ہوا تودہ ہو گیا) یعنی حکم خلقت کے ساتھ حیات، اور روح آدم کے قالب میں پھونک دی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض حضرات عوالم کو درجہ حقوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ عالم خلق (عالم مادہ) اور عالم امر (عالم مادائے مادہ) اور یہ دونوں ہی فرمان خدا کے تابع ہیں اور شاہد الہی ہے:

"الا لله الخلق والامر"

۱۲۰۔ جو کہ عالم خلق و امر اسی کی طرف سے ہے۔ (اعراف - ۵۴)

پھر اس بات کی تاکید کے طور پر فرمایا: جو کچھ ہم نے مسیح کے بارے میں تم پر نازل کیا ہے۔ یہ پروردگار کی طرف سے ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں اور اس کے بارے میں اپنے اندر کسی قسم کے تردد کو جگہ نہ دینا۔

"الحوث من تہنبت" — اس جگہ کے بارے میں مفسرین نے دو احتمالات پیش کیے ہیں۔

پہلا یہ کہ یہ جہد مبتداء اور غیرے مرتب ہے۔ یعنی الحوث بتداء ہے اور من زبنت خبر ہے۔ اس بناء پر اس کا معنی یہ ہوگا: حق ہمیشہ تیرے پروردگار ہی کی طرف سے ہو گا کیونکہ حق کا معنی ہے واقعیت اور واقعیت میں ہستی وجود ہے اور تمام ہستیاں اور وجود اُنس کے وجود سے ہیں اور باطل عدم و نیستی ہے جو اس کی ذات سے بیگانہ ہے۔

دوسرا یہ کہ یہ جہد مبتداء محذوف کی خبر ہے جو کہ ذلت الاخبار ہے۔ یعنی یہ خبریں جو آپ کو بتائی گئی ہیں، سب پروردگار کی طرف سے حقائق ہیں۔ یہ دونوں مفسریم آیت کے لیے مناسب ہیں۔

۶۱۔ فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنْ



الْعِلْمِ فَفَعِلَ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ
وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ فَتَشْمُ
نَبْتَهُمْ فَنَجْعَلُ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ ○

ترجمہ

۶۱۔ اس علم و دانش کے بعد جو (عیسیٰ کے بارے میں) تمہارے پاس پہنچا ہے۔ پھر بھی کوئی تم سے جھگڑے تو اسے کہہ دو: آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلاتے ہیں تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ، ہم اپنی عورتوں کو بلاتے ہیں۔ تم اپنی عورتوں کو بلاؤ اور ہم اپنے نفسوں کو بلاتے ہیں تم اپنے نفسوں کو بلاؤ۔ پھر مباہلہ کریں گے اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت کریں گے۔

تفسیر

مُبَاهَلَةٌ کیا ہے۔

”مُبَاهَلَةٌ“ دراصل ”بَتْلُ“ کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنی ہے ”دعا کرنا“ اور کسی کی قید و بند کو ختم کر دینا۔ اسی بناء پر جب کسی جائز کو اُس کے حال پر چھوڑ دیں اور اُس کے پستان کسی عقیل میں نہ باندھیں تاکہ اُس کا فرائضہ بچہ آزادی سے اُس کا دودھ پی سکے تو اسے ”بَاحِلٌ“ کہتے ہیں۔ دعا میں ”ابتہالی“ تفرع و زاری اور کام خدا کے سپرد کرنے کے معنی میں آتا ہے۔

کبھی کبھار یہ لفظ بلاکت، لعنت اور خدا سے دوری کے معنی میں اس لیے استعمال ہوتا ہے کہ بندے کو اُس کے حال پر چھوڑ دینا معنی نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ یہ تو تھا ”مُبَاهَلَةٌ“ کا مفہوم اصل لعنت کے لحاظ سے لیکن اس مردح مفہوم کے لحاظ سے جو اوپر والی آیت میں مراد لیا گیا ہے یہ دو اشخاص کے درمیان ایک دوسرے پر نظریں کرنے کے کہتے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ دو گروہ جو کسی اہم مذہبی مسئلے میں اختلاف رائے رکھتے ہوں، ایک جگہ جمع ہو جائیں، بارگاہِ الہی میں تفرع کریں اور اُس سے دعا کریں کہ وہ جھوٹے کو رسوا و ذلیل کرے اور اسے سزا و عذاب دے۔

مندرجہ بالا آیت میں خدا تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا ہے کہ ان واضح دلائل کے بعد بھی کوئی شخص تم سے حضرت عیسیٰ کے بارے میں گفتگو اور جھگڑا کرے تو

كَذَّبْتَ مُبَاهَلَةٌ



اسے "مُباہلہ" کی دعوت دے گا اور کہو کہ وہ اپنے بچوں، عورتوں اور نفسوں کو لے آئے اور تم بھی اپنے بچوں عورتوں اور نفسوں کو ہم پر بھردنا کرو تاکہ خدا جھوٹوں کو رسوا کر دے۔

"مُباہلہ" کی یہ صورت شاید قبل ازیں عرب میں مروج نہ تھی اور یہ ایک ایسا راستہ ہے جو سونی صد پیغمبر اکرم کے ایمان اور دعوت کی صداقت کا پتہ دیتا ہے۔

کیسے ممکن ہے کہ جو شخص کامل ارتباط کے ساتھ خدا پر ایمان نہ رکھتا ہو وہ ایسے میدان کی طرف آئے اور مخالفین کو دعوت دے کہ آؤ! اگلے درگاہ خدا میں چلیں، اس سے درخواست کریں اور دعا کریں کہ وہ جھوٹے کو رسوا کر دے اور پھر یہی کہے کہ تم عنقریب اسی کا نتیجہ دیکھ لو گے کہ خدا کس طرح جھوٹوں کو سزا دیتا ہے اور عذاب کرتا ہے۔

یہ مسلم ہے کہ ایسے میدان کا رخ کرنا بہت خطرناک معاملہ ہے کیونکہ اگر دعوت دینے والے کی دعا قبول نہ ہوئی اور مخالفین کو ملنے والی سزا کا اثر واضح نہ ہوا تو نتیجہ دعوت دینے والے کی رسوائی کے علاوہ کچھ نہ ہوگا۔

کیسے ممکن ہے کہ ایک عقلمند اور سمجھ دار انسان نتیجے کے متعلق ایمان کے بغیر اس مرحلے میں قدم رکھے۔ اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ پیغمبر اکرم کی طرف سے دعوت مُباہلہ اپنے نتائج سے قطع نظر، آپ کی دعوت کی صداقت اور ایمان قاطع کی دلیل بھی ہے۔

اسلامی روایات میں ہے کہ "مُباہلہ" کی دعوت دی گئی تو بخوان کے عیسائیوں کے نمائندے پیغمبر اکرم کے پاس آئے اور آپ سے نہلت چاہی تاکہ اس بارے میں سوچ بچا کر لیں اور اس سلسلے میں اپنے بزرگوں سے مشورہ کر لیں۔ مشورے کی یہ بات ان کی نفسیاتی حالت کی چٹلی کھاتی ہے۔ بہر حال مشورے کا نتیجہ یہ نکلا کہ عیسائیوں کے مابین یہ طے پایا کہ اگر محمد شور و غل، جمع اور داد و فریاد کے ساتھ "مُباہلہ" کے لیے آئیں تو ڈرانے جاسٹے اور مایا ہد کر لیا جائے کیونکہ اگر اس طرح آئیں تو ہر حقیقت کچھ بھی نہیں جیسی شور و غل کا سہارا دیا جائے گا اور اگر وہ بہت عرصہ افراد کے ساتھ آئیں، بہت قریبی خواص اور چھوٹے بچوں کو لے کر دعوہ گاہ میں پہنچیں تو پھر جان لینا چاہیے کہ وہ خدا کے پیغمبر ہیں اور اس صورت میں ان سے مُباہلہ کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے کیونکہ اس صورت میں معاملہ خطرناک ہے۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق عیسائی میدان مبادلہ میں پہنچے تو اچانک دیکھا کہ پیغمبر اپنے بیٹے حسین کو گود میں لیے مسن کا ہاتھ پکڑے اور علی و فاطمہ کو ہمراہ لیے آپہنچے ہیں اور انہیں فرما رہے ہیں کہ جب میں دعا کروں، تم آمین کہنا۔ عیسائیوں نے یہ کیفیت دیکھی تو انسانی پریشانی برسنے اور مبادلہ سے رک گئے اور صلح و مصالحت کے لیے تیار ہو گئے اور اہل ذمہ کی حیثیت سے رہنے پر آمادہ ہو گئے۔

"فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ....."

گذشتہ آیات میں حضرت مسیح کی اہمیت کی نفی پر استدلال تھا۔ اب اس آیت میں پیغمبر اکرم کو حکم دیا گیا ہے کہ اگر اس علم و دانش کے بعد بھی جو تمہارے پاس پہنچا ہے کچھ لوگ تم سے لڑیں جھگڑیں تو انہیں مبادلہ کی دعوت دے اور ان سے کہو



و ہم اپنے بیٹوں کو جاتے ہیں تم بھی اپنے بیٹوں کو جانو۔ ہم اپنی عورتوں کو دعوت دیتے ہیں تم بھی اپنی عورتوں کو جانو اور ہم اپنے انفسوں کو بلا تے ہیں تم بھی اپنے انفسوں کو دعوت دو پھر ہم سباجہ کریں گے اور جموں پر خدا کی لعنت کریں گے۔

بغیر کچے یہ بات واضح ہے کہ سباجہ سے مراد یہ نہیں کہ طرفین جمع ہوں، ایک دوسرے پر لعنت اور لعین کریں اور پھر منتشر ہو جائیں کیونکہ یہ فعل تو غیر خیر نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ دُعا اور لعین فعلی طور پر اپنا اثر ظاہر کرے اور جو جھوٹا ہو تو رَا غلاب میں مبتلا ہو جائے۔

آیت میں سباجہ کا نتیجہ تو بیان نہیں کیا گیا لیکن چونکہ یہ طریقہ کار منطقی و استدلال کے غیر موثر ہونے پر اختیار کیا گیا تھا اس لیے یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ مقصود صرف دُعا نہ تھی بلکہ اس کا خدا ہی اثر پیش نظر تھا۔

عظمت اہل بیت کی ایک زندہ سند

شیخ اور سنی مفسرین اور محدثین نے تو یہ بھی کہ "اہل بیت رسول" کی شان میں ازال ہوئی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں افراد کو اپنے ہمراہ "ندہ کاہ" کی طرف سے لئے تھے وہ صرف اُن کے بیٹے امام حسن اور امام حسین، ان کی بیٹی فاطمہ زہرا اور حضرت علی تھے۔ اس بناء پر آیت میں "اہل بیتنا" سے مراد صرف امام حسن اور امام حسین ہیں۔ "فساختنا" سے مراد غلاب واقعہ میں اور "انقضت" سے مراد حضرت فاطمہ علی ہیں۔ اس سلسلے میں بہت سی احادیث نقل ہوئی ہیں۔ اہل سنت کے مابین یہ مسئلہ جو بہت کم تعداد میں ہیں۔ اس سلسلے میں وارد ہونے والی احادیث کا انکار کرنے کی کوشش کی ہے، مثلاً مؤلف "الخصار" نے اس آیت کے ذیل میں کہا ہے کہ:

یہ تمام روایات شیخ طریقوں سے مروی ہیں۔ ان کا مقصد معین ہے۔ انہوں نے ان احادیث کی نشر و اشاعت اور ترویج کی کوشش کی ہے۔ جس سے بہت سے علماء اہل سنت کو بھی اشتباہ ہو گیا ہے۔

لیکن اہل سنت کی بنیادی کتابوں کی طرف رجوع کیا جائے تو وہ فساد ہی کرتی ہیں کہ ان میں سے بہت سے طریقوں کا شیعوں یا اُن کی کتابوں سے بزرگوں کی تصدیق نہیں اور اگر اہل سنت کے طریقوں سے مروی ان احادیث کا انکار کیا جائے تو ان کی باقی احادیث اور کتب بھی درجہ اعتبار سے گر جائیں گی۔

اس حقیقت کو زیادہ واضح کرنے کے لیے اہل سنت کے طریقوں کے کچھ روایات ہم یہاں پیش کریں گے۔

قاضی نور محمد شوکتی اپنی کتاب "نفیس الاحادیث" کی جلد سوم ص ۶ پر لکھتے ہیں:

"مفسرین اس سلسلے میں متفق ہیں کہ "اہل بیتنا" سے اس

آیت میں امام حسن اور امام حسین مراد ہیں۔ "فساختنا"



سے "حضرت خاتمہ" مراد میں اور "انفسنا" میں حضرت

علی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اس کے بعد کتاب مذکور کے حاشیے پر تقریباً ساٹھ بزرگانِ اہل سنت کی فہرست دی گئی ہے جنہوں نے تفسیر کی ہے کہ آیت مبارکہ اہل بیت رسول کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ ان کے نام اور ان کی کتب کی خصوصیات صفحہ ۲۶ سے لے کر صفحہ ۷۶ تک تفصیل سے بیان کی گئی ہے ان شخصیتوں میں سے یہ زیادہ مشہور ہیں۔

۱۔ مسلم بن جہلیج نیشاپوری۔ سولہ صیح مسلم جو نامور شخصیت ہیں اور ان کی حدیث کی کتاب اہل سنت کی چھ قابلِ اعتماد صحاح میں سے ہے ملاحظہ ہو مسلم، ج ۷، ص ۷۷، ص ۷۸ طبع معزز پراہتمام محمد علی بیس۔

۲۔ احمد بن حنبل نے اپنی "مسند" میں لکھا ہے ملاحظہ ہو جلد ۱، صفحہ ۱۵، طبع مصر۔

۳۔ طبری نے اپنی مشہور تفسیر میں اسی آیت کے ضمن میں لکھا ہے۔ دیکھئے جلد ۲، ص ۱۹۲ طبع بیس۔ مصر۔

۴۔ سہاکم نے اپنی "مستدرک" میں لکھا ہے۔ دیکھئے جلد ۲، ص ۱۵ مطبوعہ حیدرآباد دکن۔

۵۔ صفی بن اسماعیل صنفی نے "تذکرۃ الفقہاء" ص ۲۹، مطبوعہ حیدرآباد دکن۔

۶۔ راجی بن یثاویری نے "کتاب التذکرۃ للفقہاء" ص ۷۷، طبع ہند۔

۷۔ نصر بن زکریا نے اپنی مشہور تفسیر کبیر میں لکھا ہے۔ دیکھئے جلد ۸، ص ۷۷، طبع بیس۔ مصر۔

۸۔ ابن زبیر نے "بیان ملامت الاموال" جلد ۹، ص ۷۷، طبع سنۃ الحمد۔ مصر۔

۹۔ ابن جریج نے "تذکرۃ الفقہاء" ص ۷۷، طبع بیس۔

۱۰۔ قاضی بیضاوی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے۔ ملاحظہ کریں جلد ۲، ص ۷۷، طبع مصطفیٰ محمد۔ مصر۔

۱۱۔ زکریا نے تفسیر "روح المعانی" میں لکھا ہے۔ دیکھئے جلد سوم، ص ۱۳۷، طبع بیس۔ مصر۔

۱۲۔ سید محمد طہطاوی نے اپنی تفسیر "الدر المنثور" میں لکھا ہے۔ جلد ۲، ص ۷۷، مطبوعہ مصطفیٰ الہابی الجبلی۔ مصر۔

۱۳۔ زکریا نے تفسیر "کشف الخفاء" میں لکھا ہے۔ دیکھئے جلد ۱، ص ۱۳۷، مطبوعہ مصطفیٰ محمد۔ مصر۔

۱۴۔ خلیفۃ الاسلام ابن حجر عسقلانی نے "الاصحاح" جلد ۲، ص ۷۷، مطبوعہ مصطفیٰ محمد۔ مصر۔

۱۵۔ ابن صبیح نے "تذکرۃ الفقہاء" ص ۷۷، مطبوعہ بیس۔

۱۶۔ علامہ ابن عربی نے "الجامع لکلام الفقہاء" جلد ۲، ص ۷۷، مطبوعہ مصر ۱۹۳۱۔

"خاتمہ الامم" میں صحیح مسلم کے حوالے سے لکھا ہے۔

ایک روز معاویہ نے سعد بن ابی وقاص سے کہا: تم ابو تراب (علی) کو

سب و شتم کیوں نہیں کہتے۔ وہ کہنے لگا:

جب سے علی کے بارے میں پیغمبر کی کہی ہوئی تین باتیں مجھے یاد آئی ہیں،



میں نے اس کام سے صرف نظر کر دیا ہے، ان میں سے ایک یہ تھی کہ جب آیت مبادیہ نازل ہوئی تو پیغمبرؐ نے صرف فاحشہ، حسن، حسین اور علیؑ کو دعوت دی۔ اس کے بعد فرمایا "الْحَمْدُ لِلّٰہِ اَمْسَلُ" (یعنی — خدا یا! یہ میرے نزدیک اور خواص چیز ہے)۔

تفسیر "کشاف" کے مؤلف ابن شہر آشوبؒ نے لکھا کہ ان میں سے جس، وہ اس آیت کے ذیل میں کہتے ہیں۔
"یہ آیت اہل کساء کی فضیلت کو ثابت کرنے کے لیے تھی
قرین و میل ہے یہ۔"

شعید مفسرین، محدثین اور مؤرخین بھی سب کے سب اس آیت کے "راہل بیت" کی شان میں نازل ہونے پر متفق ہیں چنانچہ "تذکرۃ الفضلین" میں اس سلسلے میں بہت سی روایات نقل کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب "عینون لخصائص" ہے۔ اس میں ایک مجلس مناظرہ کا حال بیان کیا گیا ہے جو مامون نے اپنے بار میں منعقد کی تھی۔ اس میں ہے کہ امام علی بن موسیٰ رضاؑ نے فرمایا :-

فما سئلہ اپنے آپکے بندوں کو آیت مبادیہ میں شخص کر دیا ہے اور اپنے پیغمبر کو حکم دیا ہے:

"فمن حاجتک فیہ من بعد ما جاءک من السلم فقل....."

اس آیت کے نزول کے بعد پیغمبرؐ کی "فما سئلہ" اور یہ ایسی

فہمیت اور اعزاز ہے کہ جس میں کوئی شخص اہل بیت پر سبقت حاصل نہیں کر سکا

اور یہ ایسی منزلت ہے جہاں تک کوئی شخص بھی نہیں پہنچ سکا اور یہ ایسا شرف

ہے جو اس سے پہلے کوئی حاصل نہیں کر سکا۔

تفسیر "نوشا" "تعارف اللہ" اور تفسیر "عیاشی" میں بھی اس مضمون کی بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں جو تمام اس امر کی حکایت کرتی ہیں کہ مندرجہ بالا آیت "راہل بیت" کے حق میں نازل ہوئی ہے

ایک اعتراض اور اس کا جواب

اس مقام پر ایک مشہور اعتراض کیا جاتا ہے۔ یہ اعتراض فخر الدین رازی اور بعض دوسرے لوگوں نے کیا ہے۔
اعتراض یہ ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ "ابن آشتا" (ہمارے بیٹے) سے مراد "حسن و حسین" دونوں ہیں کہ "ابن آشتا" جمع ہے اور (عربی میں) جمع کا لفظ دوسرے بے نہیں ہوتا، اس طرح کیسے ممکن ہے فسا آشتا

۱۔ نور الثقلین جلد ۱، صفحہ ۲۳۹، ۲۔ اربع جلد ۱، صفحہ ۲۹۰، تفسیر عیاشی جلد ۱، صفحہ ۱۵۰، بحار جلد ۱، صفحہ ۲۰
صفحہ ۱۵، در جلد ۱، صفحہ ۲۰



دہلری عورتیں اگر جمع کا لفظ ہے صرف شہزادی اسلام خاتون کے لیے ہو اور یوں ہی "انفسنا" سے صرف علی مراد ہوں؟ اگر ایسا ہے تو پھر یہاں جمع کا صیغہ کیوں آیا ہے؟

اس کے جواب میں عرض ہے کہ پہلی بات اسی ضمن میں یہ ہے کہ بہت سی احادیث، بہت سے مشہور منابع اور معتبر اسلامی کتب میں چچ میں شیعہ سنی سب شامل ہیں یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ آیت "اھل بیت" کے حق میں نازل ہوئی ہے اور ان میں تصریح کی گئی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ سوائے خلی، خاتم، حسنؑ اور حسینؑ کے کسی کو مباہلہ کے لیے نہیں لے گئے۔ یہ بات آیت کی تفسیر کے لیے خود ایک واضح قرینہ ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ بعد ان قرآن کے جو آیات قرآن کی تفسیر کرتے ہیں ایک سنت اور قطعی نشان نزول بھی ہے۔

اس بنا پر مذکورہ اعتراض کے جواب کی ذمہ داری فقط شیعوں پر نہیں ہے بلکہ تمام علماء اسلام کو اس کا جواب دینا ہوگا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جمع کے صیغے کا مفرد یا تشبیہ پر الحاق کوئی نئی بات نہیں۔ قرآن اور قرآن کے علاوہ ادبیات عرب بلکہ ادبیات غیر عرب میں ایسا کثرت سے دکھائی دیتا ہے۔

اس کی وضاحت کچھ یوں ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک قانون بیان کرتے وقت یا کوئی عہد نامہ لکھتے وقت حکم کی شکل میں اور جمع کے صیغے کے ساتھ آتا ہے۔ مثلاً کسی عہد نامہ میں یوں لکھا جاتا ہے:-

اس کے اجزاء کے ذمے دار عہد نامے پر دستخط کرنے والے اور ان کے بیٹے ہوں گے۔

حالانکہ ممکن ہے کہ طرفین میں سے ایک طرف صرف ایک یا دو بیٹے ہوں اور ایسا ہونا قانون یا عہد نامے کے صیغہ جمع کے منافی نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ مرحلے دو ہیں۔ ایک مرحلہ قرار داد اور دوسرا مرحلہ اجراء۔ مرحلہ قرار داد میں بعض اوقات الفاظ جمع کی صورت میں آتے ہیں تاکہ وہ تمام مصداق پر منطبق ہوں لیکن مرحلہ اجراء میں ممکن ہے بمصادیق ایک ہی فرد ہو اور ایک فرد کا ہونا منسلک کے لگی ہونے کی نفی نہیں کرتا۔

دوسرے افکاروں میں پیغمبر اکرمؐ نصاریٰ سے ملے کی گئی قرار داد کے مطابق ذمہ دار تھے کہ اپنے مخصوص خاندان کے تمام فرزند، عورتیں اور وہ تمام اشخاص جو آپؐ کی جان کے مندرجہ بالا نہیں اپنے ساتھ مباہلہ کے لیے لاتے لیکن ان کا مصداق دو بچوں، ایک قانون اور ایک مرد کے سوا کوئی نہ تھا (خود کیجئے گا)۔

آیات قرآن میں ایسے متعدد مواقع ہیں جہاں عبارت میں جمع کا صیغہ آیا ہے لیکن اس کا مصداق کسی جہت سے ایک ہی فرد ہے۔ مثلاً سورہ آل عمران، آیت ۱۰۳ میں ہے:

"الَّذِينَ قَاتَلُوا لَكُمْ أَمْثَالَهُمِ النَّاسُ لَقَدْ جَعَلُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ"

وہ افراد کہ جنہیں لوگوں نے کہا کہ دشمنوں نے تم پر مجھے کے لیے لکھ کر لیا ہے، ان سے ڈرو۔



مفسرین کی ایک جماعت نے تصریح کی ہے کہ یہاں "التناس" سے مراد نعیر بن مسعود ہے جس نے ابو سفیان سے کچھ مال لے رکھا تھا تاکہ مسلمانوں کو مشرکین کی طاقت سے ڈرایا جائے۔
اس طرح سورہ آل عمران آیہ ۱۵۱ میں ہے:-

"لَعَنَ مَسْمَعُ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ
فَقِيْرٌ وَنَحْنُ اَغْنِيَا"۔

"خدا نے ان لوگوں کی بات سن لی جو کہتے تھے: خدا فقیر
ہے اور ہم تو گروہ بنائے ہیں، اسی لیے اُس نے ہم سے
زکوٰۃ کا مطالبہ کیا ہے۔"

مفسرین کی ایک جماعت کی تصریح کے مطابق آیت میں "الَّذِيْنَ" سے مراد "سُحَيْبُ بْنُ اَخْطَبٍ" یا
"فُضَيْلُ بْنُ اَبِيّ سُوَيْبٍ" ہے۔

ایک اور بات یہ ہے کہ کبھی مغزو کے لیے بیچ کا میڈاؤس کی زندگی کے اعتبار کے لیے بھی جوتا بن گیا کہ قدرت
ابراہیمؑ کے بارے میں ہے۔

"اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِلّٰهِ :

ابراہیم بارگاہِ الہی میں خضوع کرنے والی امت تھے۔ (نمل - ۱۳۱)

بیٹی کی اولاد

آیہ مبارکہ سے ضمنی طور پر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بیٹی کی اولاد کو بھی "ابن" بیٹا کہا جاتا ہے۔ زمانہ
جاہلیت میں اس کے برعکس رسوم تھا کہ صرف بیٹے کی اولاد کو اپنی اولاد سمجھا جاتا اور کہا جاتا تھا کہ:
بنو ناز بنو اہنا ننا و بناتنا

بنوہن اہنا الزباجال الاباعد

یعنی — ہماری اولاد تو فقط جاہل سے پرتے ہیں۔ رہے جاہل سے لڑے تو
وہ دوسروں کی اولاد میں نہ کہ ہماری۔

بیٹوں اور عورتوں کو انسانی معاشرے کا حقیقی حصہ نہ سمجھنے کی طرز فکر بھی اسی غلط سنت جاہلیت کی پیداوار تھی۔ وہ
عورتوں کو اپنی اولاد کی نگہداری کے لیے فقط غرت سمجھتے تھے۔
جیسا کہ ان کے شاعر نے کہا ہے:-

وَأَفْصَحَ أَفْهَامَاتِ النَّاسِ أَوْعِيَةً

مستودعات وللافساب آباء

یعنی۔ لوگوں کی باتوں کی پردریش کے لیے غروف کی حیثیت رکھتی ہے۔

اور نب کے لیے تو صرف باپ ہی پہچانے جاتے ہیں۔

اسم نے اس طرز فکر کی شدید نفی کی اور اولاد کے احکام پوتوں اور نواسوں پر ایسا ہی طرح سے جاری ہے۔
سودہ انعام آیہ ۴۴ اور ۵۵ میں حضرت ابراہیمؑ کی اولاد کے بارے میں ہے :

”وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ وَيَسْعَىٰ وَإِسْحَاقَ وَيُحْيَىٰ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا“

یوسف و موسیٰ و ہارون و کذا لک نجرى

المحسنین و ذکرنا و یحییٰ و عیسیٰ و

الیاس کل من الصالحین ؟

”اور اولاد ابراہیم میں سے داؤد، یسحاق، یسوع، یحییٰ، یوسف، موسیٰ

اور ہارون تھے اور اس طرح ہم نیک لوگوں کو جزاء دیتے ہیں نیز

ذکرنا، یعنی اور عیسیٰ ابھی تھے، جو سب کے سب صالحین میں سے تھے۔“

اس آیت میں حضرت عیسیٰ کو حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں سے شمار کیا گیا ہے حالانکہ وہ بیٹی کی اولاد تھے اور جو

شیدائی روایات امام حسنؑ و امام حسینؑ کے بارے میں مذکور ہیں ان میں بارگاہ ”ابن رسول اللہ“ فرزند رسولؐ کا لفظ ان کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

وہ آیات جن میں ایسی صورتوں کا ذکر ہے جن سے نکاح کرنا حرام ہے ان کے لیے فرمایا گیا ہے :

”وَمَحَلًّا لِّلْأَسْنَانِکُمْ“

یعنی۔ تبار سے بیٹوں کی بیویاں۔

فقہائے اسلام کے درمیان یہ مسئلہ مستم ہے کہ بیٹوں، پوتوں اور نواسوں کی بیویاں انسان پر حرام ہیں اور وہ

سب مندوبہ بالا آیت میں داخل ہیں۔

کیا مَبْنَاهُکُمْ ایک عمومی حکم ہے

اس میں شک نہیں کہ مندوبہ بالا آیت میں مسلمانوں کو مباہلے کی دعوت نہیں دی گئی بلکہ روئے سخن پیغمبر اسلامؐ

کی طرف ہے تاہم یہ بات مخالفین کے مقابلے میں مباہلے کے عمومی حکم سے مافع نہیں۔ یعنی جب دلائل پیش کرنے

کے باوجود دشمن مصرعوں اور حبش و حمری کا ثبوت دیں تو کامل تقویٰ اور خدا پرستی کے حامل اہل ایسلا انہیں مباہلے



کی دعوت دے سکتے ہیں۔

اسلامی منابع میں اس ضمن میں مذکور روایات سے بھی اس حکم کی عمومیت ثابت ہوتی ہے۔ تفسیر نور الثقلین، جلد ۳ صفحہ ۳۵۱ میں امام صادق سے ایک حدیث منقول ہے۔ آپ نے فرمایا:

مناہین تباری حق کی باتیں قبول نہ کریں تو انہیں دعوت مبادلہ دو۔

راوی کہتا ہے:

میں نے سوال کیا کہ کیسے مبادلہ کریں۔

فرمایا:۔

تین دن تک اپنی اخلاقی اصلاح کرو۔

راوی مزید کہتا ہے:۔

”میرا گناہ ہے کہ آپ نے فرمایا روزہ رکھو اور فصل کرو۔ جس سے مبادلہ کرنا چاہتے ہو اسے صوم میں لے جاؤ۔ پھر اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیاں اس کے دائیں ہاتھ میں ڈالو اور اپنی طرف سے ابتداء کرو اور کہو: خداوند! اتنا سات آسمانوں اور سات زمینوں کا پروردگار ہے اور پرشیدہ اسرار سے آگاہ ہے اور رحمن و رحیم ہے۔ میرے مخالف نے اگر حق کا انکار کیا ہے اور باطل کا دعویٰ کیا ہے تو آسمان سے اس پر بلا و مصیبت نازل فرما اور اسے دھنک عذاب میں مبتلا کر دے۔ اس دعا کو دھراؤ اور کہو: یہ شخص اگر حق کا انکار کرتا ہے اور باطل کا دعویدار ہے تو آسمان سے اس پر بلا نازل کر دے اور اسے عذاب میں مبتلا کر دے۔“

اس کے بعد آپ نے فرمایا:

زیادہ وقت نہیں گزرے گا کہ اس دعا کا خیرہ آشکار ہوگا۔ خدا کی قسم میں نے ہرگز ایسا کوئی شخص نہیں پایا جو تیار ہو کہ اس طرح اس کے ساتھ مبادلہ کیا جائے۔

شمسی طور پر اس آیت سے ان لوگوں کو بھی جواب مل جاتا ہے جو بے سوچے سمجھے اسلام کو مردوں کا دین قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں عورتیں کسی شہر میں نہیں ہیں۔ لیکن یہ آیت ثابت کرتی ہے کہ خاص مواقع پر اسلامی مقامات کی پیش رفت کے لیے عورتیں بھی مردوں کے ساتھ ساتھ دشمن سے مقابلے کے لیے اٹھ کھڑی ہوتی تھیں۔

بانوئے اسہام جناب فاطمہ زہراؑ۔ ان کی دختر ثناء اختر جناب زینب کبریٰؑ اور ایسی خواتین جو ان کے نقش قدم پر چلیں ان کی زندگی کے درخشاں صفحات اس حقیقت پر گواہ ہیں۔

۶۲۔ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ وَمَا مِنْ دَوْلَةٍ اِلَّا



اللَّهُ ۖ وَإِنَّ اللَّهَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

ترجمہ

۶۲۔ یہ (حضرت عیسیٰؑ کی) حقیقی سرگذشت ہے (اور ان کی الوہیت اور خدا کا بیٹا ہونے کی سب باتیں بے بنیاد ہیں) اور خدائے یگانہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور خدا توانا و حکیم ہے۔

تفسیر

”قصص“ مفرد ہے اور ”قصہ“ کے معنی میں ہے۔ دراصل یہ لفظ ”قص“ کے بارے سے ہے اور کسی چیز کی جستجو کرنے کے معنی میں لیا گیا ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ بن عمران کے واقعہ میں ہے۔
”وَقَالَتْ لِأُخْتِهِ قُصِّیْهِ“

حضرت موسیٰ کی داد نے ان کی بہن سے کہا: موسیٰ کی جستجو میں جاؤ۔ (قصص ۱۱)
یہ جو خون کے جلے کو ”قصاص“ کہتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح مقتول کے حق کی جستجو کی جاتی ہے۔

گذشتہ واقعات اور گزرے ہوئے لوگوں کی تاریخ بھی ان کے حالات زندگی کی جستجو ہے اسی لیے ان کے واقعہ کو ”قصہ“ کہتے ہیں۔

حضرت مسیحؑ کی زندگی کے حالات بیان کرنے کے بعد مندرجہ بالا آیت میں کہا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں ہم نے جو تفصیل تم سے بیان کی ہے وہ ایک واقعیت اور حقیقت ہے جو پروردگار کی طرف سے تم پر نازل ہوئی ہے اس لیے حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں الوہیت، خدا کا بیٹا یا اس کی بجائے (صحاذ اللہ) غیر شرعی بچہ قرار دینے کے سب دعوے بے بنیاد اور بے ہودہ ہیں۔

اس کے بعد تاکید کے طور پر مزید کہا گیا ہے: جو ذات پرستش کے لائق ہے وہ صرف خداوند توانا و حکیم ہے اور خدا کے علاوہ کسی کے لیے اس منصب کا قائل ہونا غیر مناسب اور خلاف حقیقت ہے۔

۶۳۔ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِالْمُفْسِدِينَ ۝



ترجمہ

۶۳۔ اگر ان واضح شواہد کے باوجود وہ قبولِ حق سے روگردانی کرتے ہیں (تو جان لو کہ وہ حقیقت کے متلاشی نہیں اور) خدا فساد کرنے والوں سے آگاہ ہے۔

تفسیر

آیت مجتبیٰ ہے کہ مسیح کے بارے میں قرآن کے منطقی دلائل کے باوجود اور دعوتِ مہدی کے بعد بھی اگر وہ حق کو تسلیم نہیں کرتے اور اپنی ہٹ دھرمی جاری رکھتے ہیں تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ طالبِ حق نہیں بلکہ ناروا تعصبات، سرکشی، ہوا و ہوس اور اندھی تقلید میں گرفتار ہیں اور ان کا کام بہر صورت معاشرے میں فساد پیدا کرنا ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ جو گمراہ حق کے واضح ہوجانے کے باوجود اپنی ڈھٹائی ترک نہیں کرتا وہ حق کا متلاشی نہیں ہو سکتا بلکہ وہ طالبِ فساد ہے اور اس کا مقصد لوگوں کے صحیح عقائد کی بنیادوں کو کھوکھلا اور خراب کرنا ہے۔

۶۴۔ قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أُمَّةً بَا بَا مِنْ دُونِ اللَّهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَمَقُولُوا أَشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ○

ترجمہ

۶۴۔ کہیے: اے اہل کتاب! آؤ ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک

ہے کہ سوائے خدا کے یگانہ کے کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی چیز کو اس کا شریک قرار نہ دیں اور ہم میں سے بعض مٹھا کو چھوڑ کر بعض دوسروں کو خدا کے طور پر قبول نہ کریں۔ جب ۱۔ وہ

اس دعوت سے روگردانی کریں تو کہیے: گواہ رہو کہ ہم تو مسلمان ہیں۔

تفسیر

قرآن نے سب سے پہلے عیسائیوں کو گزشتہ آیات کے ضمن میں منطقی استدلال پیش کیا اور ان کی مخالفت کے بعد دعوتِ مبادعوئی۔ جب اس دعوت نے ان پر کافی نفسیاتی اثر ڈالا تو چونکہ وہ مابیت کے لیے تیار نہ ہوئے اور شرائطِ ذمہ قبول کر لیں تو ان کی اس روحانی آمادگی سے استفادہ کرتے ہوئے پھر سے استدلال شروع کیا لیکن یہ استدلال پہلے سے بہت مختلف ہے۔ گزشتہ آیات میں اسلام کی دعوت اس کی تمام تر خصوصیات کے ساتھ تھی لیکن اس آیت میں اسلام اور اہل کتاب کے مشترک نقاط کی طرف دعوت دی گئی ہے۔ حقیقت میں اس طرز استدلال سے قرآن ہمیں سکھاتا ہے کہ اگر کچھ لوگ اس بات پر تیار نہیں کہ تبار سے تمام مقدس مبادف و مقاصد میں تباہی و تباہی تو تباہی پر تباہی کو نہ بیڑا اور کوشش کرو کہ کم از کم جس قدر تبار سے ساتھ وہ اشتراکِ عرف رکھتے ہیں اتنا ہی ان کی ہمکاری حاصل کرو اور اسے اپنے مقدس اہاف و مقاصد کی پیش رفت کے لیے بنیاد قرار دو۔

مندرجہ بالا آیت اہل کتاب کے لیے وحدت و اتحاد کی پکار ہے اور انہیں کہتی ہے کہ تم دعویٰ کرتے ہو ہندو اعتقاد رکھتے ہو کہ "سند" "تشنیٹ" "تھ" "توحید" کے عقیدے کے منافی نہیں اس لیے تشنیٹ میں وحدت کے قائل ہو اور اس طرح یہودی شرک آوروں کے باوجود اور عزیز کو خدا کا بیٹا جاننے کے باوجود توحید کے مدعی ہیں یوں تم سب کے سب اصل میں اپنی توحید کو مشترک سمجھتے ہو اس لیے آؤ ہم ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اس مشترک بنیاد کو مستحکم کریں اور ایسی غیر مناسب تفسیروں سے اجتناب کریں جن کا نتیجہ شرک ہو اور توحید خالص سے دوری ہو۔

"وَلَا يَتَّخِذْ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللّٰهِ"

آیت کی ابتدا میں دو مرتبہ سند توحید کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ ایک "اَلَا نَعْبُدُ اِلَّا اللّٰه"

یعنی۔ آؤ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور دوسرا "لَا تُشْرِكْ بِهٖ شَيْئًا" (یعنی۔ کسی کو اس کا شریک قرار نہ دیں) اب زیرِ نظر آیت میں تیسری دفعہ اس اصل کا تذکرہ ہے لیکن زیادہ صراحت سے اور ذمہ داری کے حقیقی نقطہ پر انکی رہنمائی کی تاکہ کہ جسے کا مفہوم یہ ہے کہ ہم میں سے بعض کو نہیں چاہیے کہ بعض دوسروں کو اپنا مسبود اور پروردگار قرار دے لیں۔ ممکن ہے یہ تفسیر ان دو مطالب میں سے ایک کی طرف اشارہ ہو:

پہلا یہ کہ حضرت عیسیٰ جو انسان اور ہمارے ہمنوع ہیں انہیں الوہیت کے عنوان سے نہیں پہچانا جانا چاہیے۔

دوسرا یہ کہ معروف اور کچھ رو علماء جو اپنے مقام سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں اور خدا کے حلال و حرام کو اپنی مرضی سے بدلتے ہیں انہیں سند نہیں سمجھنا چاہیے اور نہ ان کی پیروی کرنا چاہیے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ علماء اہل کتاب میں ایک ایسا گروہ بھی تھا جو احکامِ خدا کی اپنے منافع اور تعصبات سے مطابق تشریف کرتا تھا۔ منطوقِ اسلام کی نظرت جو شخص ایسے افراد کی جان بوجھ کر بلا مشروط پیروی کرتے اس نے ایک قسم کی عبودیت اور ان کی پرستش کی ہے۔

اس کے لیے روشن دلیل موجود ہے یہود قانون بنانا اور حلال و حرام کی تشریح خدا سے مربوط ہے جو شخص کسی اور کو اس سے



میں صاحب اختیار مجھے اس نے اسے خدا کا شریک قرار دیا۔

مفسرین نے اس آیت کو ذیل میں نقل کیا ہے کہ :

”عدی بن حاتم پیسے چسائی تھا۔ پھر اسلام سے آیا۔ اس آیت کے نزول کے بعد اس نے لفظ ”او باب“ سے یہ بھلا کر قرآن کہنا ہے کہ اہل کتب اپنے بعض علماء کی پرستش کرتے ہیں۔ لہذا اس نے پیغمبر اکرم کی خدمت میں عرض کیا کہ شہ زدنے میں ہم کبھی اپنے علماء کی عبادت نہیں کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا : کیا تم لوگ جانتے تھے کہ وہ اپنی مرضی سے احکام خدا میں تغیر و تبدل کرتے ہیں اور پھر بھی تم ان کی پیروی کرتے تھے۔ عدی نے کہا : جی ہاں۔ پیغمبر اکرم نے فرمایا : یہی پرستش و عبادت ہے۔“

درحقیقت اسلام غلامی اور نظری استوار کو ایک قسم کی عبودیت دے رہا تھا جس سے شرک اور بت پرستی کا مقابلہ کیا ہے اسی شدت سے نظری استوار سے بھی جنگ کی ہے کیونکہ یہ بھی بت پرستی کی مانند ہے۔ توجہ رہے کہ ”ارباب“ جمع کا صیغہ ہے اس بناء پر اس آیت سے صرف حضرت عیسیٰ کی پرستش کی ہنسی نہیں ہوتی۔ لیکن ممکن ہے کہ یہاں حضرت عیسیٰ کی عبودیت سے بھی ہنسی ہو اور صرف دیگر علماء کی عبودیت سے بھی۔

”فان قولوا فقولوا اشھدوا باننا مسلمون“

اگر وہ لوگ توحید کے مشترک نقطے کی طرف منطقی دعوت کے بعد بھی منہ پھیریں تو انہیں کہا جانا چاہیے کہ گواہ رہنا کہ ہم تو حق کے سامنے سسر تسلیم خم کرتے ہیں اور تم نہیں کرتے۔ دوسرے منظر میں جان لو کہ کون لوگ حق کے متلاشی ہیں اور کون متعصب اور مبہم و محرم۔

اس وقت انہیں ”اشھدوا باننا مسلمون“ (یعنی — گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں) کے چیلے سے خطرے کا الارم دیا کہ حق سے تباہی روگردانی اور عدلی ہم پر کچھ بھی اثر نہیں رکھتی اور ہم اس طرح اپنے اسلام کے راستے پر چلتے رہیں گے، صرف خدا کی عبادت کریں گے، صرف اس کے قوانین قبول کریں گے (اور پٹنگل سے پیچائیں گے) اور ہمارے دلیان کسی بشری پرستش کا کسی شکل و صورت میں وجود نہیں ہوگا۔

پیغمبر اکرمؐ کے خطوط دنیا کے بادشاہوں کے نام

تاریخ اسلام سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سرزمین حجاز میں اسلام کافی نفوذ کر چکا تو پیغمبر اکرمؐ نے اس زمانے کے بڑے بڑے حکمرانوں کے نام کئی ایک خطوط روانہ کیے۔ ان میں بعض خطوط میں مندرجہ بالا آیت کا سہارا لیا گیا ہے، جس میں آسانی ادیان کی قدر مشترک کا تذکرہ ہے۔

ان میں سے بعض اہم خطوط کا ذکر کیا جاتا ہے۔



۱۔ مقوقس کے نام خط

”بسم اللہ الرحمن الرحیم“

من ————— محمد بن عبد اللہ
ال ————— المقوقس عظیم القبط،

سلام علی من اشبع الہدیٰ
اقرب بعد: فان ابعد عوک بد عابۃ الاسلام،
اسلم تسلم، یؤتک اللہ اجرک مزیٰن فان
تولیت فانما علیک اسم القبط ————— یا اہل
الکتاب قالوا ال ————— کلمۃ سواد بیننا و بینکم
ان لا نعبد الا اللہ ولا نشرك به شیئا ولا
یشخذ بعضنا بعضا اربابا من دوت اللہ فان
تولوا فقولوا اشهدوا باننا مسلمون“

اللہ کے نام سے جو بخشنے والا بڑا مہربان ہے
از ————— محمد بن عبد اللہ
بطرف ————— قبطیوں کے مقوقس بزرگ
حق کے پیروکاروں پر سلام ہو۔

میں تجھے اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اسلام سے آؤ تاکہ سالم رہو۔
خدا تجھے دو گنا اجر دے گا ۱۰ ایک خود تمہارے ایمان لانے پر اور دوسرا ان لوگوں کی
وجہ سے جو تمہاری پیروی کر کے ایمان لائیں گے اور اگر تو نے کافروں اسلام سے
روگردانی کی تو قبطیوں کے گناہ تیرے ذمہ ہوں گے ————— اے اہل کتاب! ہم
تمہیں ایک مشترک بنیاد کی طرف دعوت دیتے ہیں اور وہ یہ کہ ہم خدا سے یگانہ
کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک قرار نہ دیں اور ہم میں سے
بعض آدمی سے بعض کو خدا کے طور پر قبول نہ کریں اور جب وہ دین حق سے روگردانی
کریں تو ان سے کہو کہ گناہ رہو ہم تو مسلمان ہیں۔

(مکاتیب الرسول، ج ۱، ص ۱۱۱)

”مقوقس“ (۱) دون مضمون۔ (۲) ہم سرور، فتح، (۳) مقوقس، ایک قوم کی طرف سے بعد کا والی۔ (۴) قبطی قوم جس میں آہل حق۔



جب مرقس مصر کا حاکم تھا پینیر اسلام نے دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں اور حکام کو خط لکھے اور انہیں اسلام کی دعوت دی۔ ماریٹین ابلی جتو نو آپ نے عالم مصر مرقس کی طرف یہ خط دے کر روانہ کیا۔

پینیر کا سفیر مصر کی طرف روانہ ہوا۔ اسے اطلاع ملی کہ حکام مصر اسکندریہ میں بے ہنگامی اور اس وقت کے ذرائع آمد و رفت کے ذریعے اسکندریہ پہنچا اور مرقس کے محل میں گیا۔ حضرت کا خط اسے دیا۔ مرقس نے خط کھول کر پڑھا کہ وہیر تک سوچا رہا۔ پھر کہنے لگا:

”اگر دافعہ عسندہ خدا کا بھیجا ہوا ہے تو اُس کے مخالفین اسے اس کی پیدائش کی جگہ سے باہر نکالنے میں کیوں کامیاب ہوئے اور وہ مجبور ہوا کہ مدینہ میں سکونت اختیار کرے؟ اُن پر نظرین اور جہاد کیوں نہیں کی تاکہ وہ نابود ہو جاتے؟“

پینیر کے قاصد نے جواب کیا:

”حضرت عیسیٰ خدا کے رسول تھے اور آپ بھی ان کی حقانیت کی گواہی دیتے ہیں۔ بنی اسرائیل نے جب ان کے قتل کی سازش کی تو آپ نے ان پر نظرین اور جہاد کیوں نہیں کی تاکہ خدا انہیں ہلاک کر دیتا؟“

یہ منطقی سن کر مرقس تسکین کرنے لگا اور کہنے لگا:

”احسن انت حکیم من عند حکیم؟“

”آخرین ہے۔ تم مجھ دار آدمی جو اور ایک صاحبِ غلت کی طرف سے تھے ہو۔“

ماریٹین نے پھر گفتگو شروع کی اور کہا:

”آپ سے پہلے ایک شخص (یعنی فرعون) اس ملک پر حکومت کرتا تھا۔ وہ مدتوں لوگوں میں اپنی ندائی کا سردار سمجھا رہا۔ بالآخر اللہ نے اُسے نابود کر دیا تاکہ اس کی زندگی آپ کے لیے باعثِ عبرت ہو لیکن آپ کو شش کریں کہ آپ کی زندگی دوسروں کے لیے نمونہِ عبرت نہ بن جائے۔“

”پینیر اسلام نے ہمیں ایک پاکیزہ دین کی طرف دعوت دی ہے۔ قریش نے ان سے بہت سخت جنگ کی اور ان کے مقابلے میں آراءِ بوٹ و یہودی بھی کینہ پروری سے ان کے مقابلے میں آکھڑے ہوئے اور اسلام سے زیادہ نزدیک جیسائی ہیں۔“

”مجھے اپنی جان کی قسم جیسے حضرت موسیٰ نے حضرت عیسیٰ کی موت کی مثال دہی تھی اس طرح حضرت عیسیٰ حضرت مسیحہ کے جیسا تھے۔ ہم آپ کو اسلام کی دعوت دیتے ہیں جیسے آپ لوگوں نے تواریات کے ماننے والوں کو انجیل کی دعوت دی تھی۔ جو قوم پینیر حق کی دعوت کو سننے اُسے چاہیے کہ اس کی پیروی کرے۔ میں

نے محنت کی دعوت آپ کی سرزمین تک پہنچا دی ہے۔ مناسب یہی ہے کہ آپ ہر مہری قوم پر دعوت قبول کرے۔

حاجب کچھ احمد اسکندریہ ہی میں ٹھہرا مگر رسول اللہ کے خط کا جواب حاصل کرے۔ چند روز گزرتے۔ ایک دن متوقس نے حاجب کو اپنے محل میں بلایا اور خواہش کی کہ اسے اسلام کے بارے میں کچھ مزید بتایا جائے۔ حاجب نے کہا:-

”محنت ہمیں خدا سے یکتائی پرستش کی دعوت دیتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ لوگ روز و شب میں پانچ مرتبہ اپنے پروردگار سے قریبی رابطہ پیدا کریں اور نماز پڑھیں، سال میں ایک ماہ روزے رکھیں، خاندان کو توحید کی زیارت کریں، اپنے عہد و چہان پر سے کریں، خون اور مردار کھانے سے اجتناب کریں۔“
علاوہ انہی حاجب نے پیغمبر اسلام کی زندگی کی بعض خصوصیات بھی بیان کیں۔ متوقس کہنے لگا:

”یہ تو بڑی اچھی نشانیاں ہیں۔ میرا خیال تھا کہ خاتم النبیینؐ سب سے پہلے شام سے ظہور کریں گے جو انبیاء کی سرزمین ہے۔ اب مجھ پر واضح ہوا کہ وہ سرزمین حجاز سے مبعوث ہوئے ہیں۔“

اس کے بعد اُس نے اپنے نائب کو حکم دیا کہ وہ عربی زبان میں اسی مضمون کا خط تحریر کرے:-
محنت بن عبد اللہ کی طرف
قبیلوں کے بزرگ متوقس کی جانب سے

”آپ پر سلام ہو۔ میں نے آپ کا خط پڑھا، آپ کے مقصد سے باخبر ہوا اور آپ کی دعوت کی حقیقت کو سمجھا۔ میں یہ تو جانتا تھا کہ ایک پیغمبر مبعوث ہو کرے گا لیکن میرا خیال تھا کہ وہ ملت شام سے مبعوث ہوگا۔ میں آپ کے قاصد کا احترام کرتا ہوں۔“

پھر خط میں ان نبیوں اور صحفوں کی طرف اشارہ کیا جو اُس نے آپ کی خدمت میں بھیجے۔ خط اُس نے ان الفاظ پر ختم کیا۔

”آپ پر سلام ہو۔“

تاریخ میں ہے کہ متوقس نے کوئی گیدہ قسم کے بدیہ پیغمبر اکرمؐ کے لیے بھیجے۔ تاریخ اسلام میں ان کی تفصیلات موجود ہیں۔ ان میں سے ایک حبیب بھی تھا تاکہ وہ بیلہ ہونے والے مسلمانوں کا علاج کرے۔ نبی اکرمؐ نے دیگر بدیہ کو قبول فرمایا لیکن حبیب کو قبول نہ کیا اور فرمایا:

”ہم ایسے لوگ ہیں کہ جب تک بھوک نہ لگے گا تاہم کھاتے اور سیر ہونے سے



پہلے کھانے سے ہاتھ روک لیتے ہیں۔ یہی چیز جاری صحت و سلامتی کے لیے کافی ہے۔
 شاید صحت کے اس عظیم اصول کے علاوہ پیغمبر اسلامؐ اس حبیب کی وہاں موجودگی کو درست نہ سمجھتے ہوں کیونکہ وہ ایک
 متعصب عیسائی تھا لہذا آپؐ نہیں چاہتے تھے کہ اپنی اور مسلمانوں کی جان کا معاملہ اس کے سپرد کر دیں۔
 متو قس نے جو پیغمبرؐ کا احترام کیا، آپؐ کے لیے بدیہ بھیجے اور خط میں نام غنیمہؓ اپنے نام سے مقدم رکھا۔ یہ
 سب اس بات کی حکایت کرتے ہیں کہ اس نے آپؐ کی دعوت کو باطن میں قبول کر لیا تھا یا کم از کم اسلام کی طرف مائل ہو گیا تھا
 لیکن اس بناء پر کہ اس کی حیثیت اور وقت کو نقصان نہ پہنچے ظاہری طور پر اس نے اسلام کی طرف اپنی رغبت کا اظہار نہ کیا۔

۲۔ قصیر روم کے نام خط

”بسم اللہ الرحمن الرحیم“

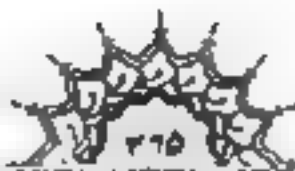
من _____ مُحَمَّدٌ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ
 إِلَى _____ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ

سَلَامٌ عَلَى مَنْ اتَّبَعَ الْهُدَى — اَمَّا بَعْدُ ؛
 فَاتَّقِ ادْهَوَكَ بَدْءَ عَايَةِ الْإِسْلَامِ اسْمَ قَسَمٍ ،
 بِوَسْطِكَ اللَّهُ اجْرُكَ مَرَّتَيْنِ فَإِنَّ قَوْلِيكَ فَإِنَّمَا
 عَلَيَّكَ أَشْمُ الْأَرْدِيِّينَ — يَا أَهْلَ الْكُتُبِ تَعَالَوْا
 إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا
 نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا إِرْهَابًا
 مِنْ دُونِ اللَّهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَعَتَوَلَّوْا أَشْهَدُ وَأُ
 بِأَنَا مُسْلِمُونَ“

خدا کے رحمن و رحیم کے نام سے

از _____ محمد بن عبد اللہ

یعنی _____ ہرقل بادشاہ روم



”اُس پر سلام ہے جو ہدایت کی پیروی کرے۔۔۔ میں تجھے اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اسلام سے آؤ تاکہ ایمان میں رہو۔ خدا تجھے دو گنا اجر دے گا۔ ایک تیرے ایمان لانے کا اور دوسرا ان لوگوں کا جو تیری وجہ سے ایمان لائیں گے) اور اگر تو نے روگردانی کی تو اریسیوں کا گناہ بھی تیری گردن پر ہوگا۔ اسے اہل کتاب ہم تمہیں مشترک بنیاد کی طرف دعوت دیتے ہیں۔۔۔ کہ نیر خدا کی عبادت نہ کرو اور کسی کو اس کا شریک قرار نہ دو۔ ہم میں سے بعض ہودوسے بعض کو خدا کے طور پر قبول نہ کریں اور اگر وہ دین حق سے سست رہیں تو کبہ دو کہ گواہ رہو ہم تو مسلمان ہیں۔“

قیصر کے پاس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیغام پہنچانے کے لیے وحید گلی مامور ہوا۔ سفیر پیغمبرِ عظیم روم ہوا۔ قیصر کے دار الحکومت قسطنطنیہ پہنچنے سے پہلے اسے معلوم ہوا کہ قیصر بیت المقدس کی زیارت کے ارادے سے قسطنطنیہ چھوڑ چکا ہے لہذا اُس نے بصری کے گورنر حضرت بن ابی شمر سے رابطہ پیدا کیا اور اسے اپنا مقصد سفر بتایا۔ ظاہر پیغمبر اکرم نے بھی اجازت دے رکھی تھی کہ وحید وہ خطا حکم بصری کو دے دے تاکہ وہ اسے قیصر تک پہنچا دے۔ سفیر پیغمبر نے گورنر سے رابطہ کیا تو اُس نے عدی بن حاتم کو بولایا اور اسے حکم دیا کہ وہ وحید کے ساتھ بیت المقدس کی طرف جائے اور خطا قیصر تک پہنچا دے۔ جمعہ میں سفیر کی قیصر سے ملاقات ہوئی لیکن ملاقات سے قبل شاہی دربار کے کارکنوں نے کہا: ”تمہیں قیصر کے سامنے سجدہ کرنا پڑے گا ورنہ وہ تمہاری پرواہ نہیں کرے گا۔“ وحید ایک سمجھدار آدمی تھا۔ کہنے لگا:

”میں ان غیر مناسب بدعتوں کو ختم کرنے کے لیے اتنا سفر کر کے آیا ہوں۔ میں اس مراسلے کے بھیجنے والے کی طرف سے آیا ہوں تاکہ قیصر کو یہ پیغام دوں کہ بشر پرستی کو ختم ہونا چاہیے اور خدا نے واحد کے سوا کسی کی عبادت نہیں ہونی چاہیے۔ اس عقیدے کے باوصف کیسے ممکن ہے کہ میں غیر خدا کے لیے سجدہ کروں۔“

پیغمبر کے قاصد کی قوی منطق سے وہ بہت حیران ہوئے۔ درباریوں میں سے ایک نے کہا:

”تمہیں چاہیے کہ خطا بادشاہ کی مخصوص میز پر رکھ کر چلے جاؤ۔ اس میز پر رکھنے ہوئے خطا کو قیصر کے علاوہ کوئی نہیں اٹھا سکتا۔“

وحید نے اس کا شکریہ ادا کیا، خطا میز پر رکھا اور خود واپس چلا گیا۔ قیصر نے خطا کھولا۔ خط نے جو بسم اللہ سے شروع ہوتا تھا اسے متوجہ کیا اور کہنے لگا:

”حضرت سلیمانؑ کے خط کے سوا آج تمہ میں نے ایسا خط نہیں دیکھا۔“

اُس نے اپنے مترجم کو بولایا تاکہ وہ خط پڑھے اور اس کا ترجمہ کرے۔ بادشاہ روم کو خیال ہوا کہ جو سکتا ہے خط کہنے والا وہی بنی ہو جس کا وعدہ انجیل اور تورات میں کیا گیا ہے۔ وہ اس جستم میں لگ گیا کہ آپ کی زندگی کی خصوصیات



معلوم کرے۔ اُس نے حکم دیا کہ شام سے پردے علاقے میں چھان بین کی جائے۔ شاید عمر کے رشتہ داروں میں سے کوئی شخص بل جائے جو ان کے حالات سے واقف ہو۔ اتفاق سے ابوسفیان اور قریش کا ایک گروہ تجارت کے لیے شام آیا ہوا تھا۔ شام اس وقت سلطنت روم کا مشرقی حصہ تھا۔ قیصر کے آدمیوں نے ان سے رابطہ قائم کیا اور انہیں بیت المقدس لے گئے۔ قیصر نے اُن سے سوال کیا :-

کیا تم میں سے کوئی شخصہ کا نزدیک رشتہ دار ہے؟

ابوسفیان نے کہا :-

میں اور شخصہ ایک ہی خاندان سے ہیں اور ہم جو حق پشت میں ایک دوسرے

سے مل جاتے ہیں۔

پھر قیصر نے اُس سے کچھ سوالات کئے۔ دونوں میں یوں گفتگو ہوئی :-

قیصر : اس کے بزرگوں میں سے کوئی حکمران ہوا ہے؟

ابوسفیان : نہیں

قیصر : کیا بنوت کے دعویٰ سے پیچہ وہ جھوٹ بولنے سے اجتناب کرتا تھا؟

ابوسفیان : ہاں کھنڈ راست گرو اور نچا افسان ہے۔

قیصر : کونسا طبقہ اس کا مخالف ہے اور کونسا موافق؟

ابوسفیان : اشراف اُس کے مخالف ہیں۔ عام اور متوسطہ رجب کے لوگ اُسے چاہتے ہیں۔

قیصر : اس کے پیرو کاروں میں سے کوئی اسی کے دین سے پہرا بھی ہے؟

ابوسفیان : نہیں

قیصر : کیا اُس کے پیرو کار روز بروز بڑھ رہے ہیں؟

ابوسفیان : ہاں

اس کے بعد قیصر نے ابوسفیان اور اُس کے ساتھیوں سے کہا :-

”اگر یہ باتیں سچی ہیں تو پھر یقیناً وہ پیغمبر موعود ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ ایسے پیغمبر

کا ظہور ہوگا لیکن مجھے یہ پتہ نہ تھا کہ وہ قریش میں سے ہوگا۔ میں تیار ہوں

کہ اس کے لیے غصہ کر دوں اور احترام کے طور پر اُس کے پاؤں دھوؤں

میں پیش گوئی کرتا ہوں کہ اس کا دین اور حکومت سرزمین روم پر غالب

آئے گی۔“

پھر قیصر نے دھوکہ دیا اور اس سے احترام سے پیش کیا۔ پیغمبر اکرمؐ کے خط کا جواب لکھا اور آپؐ کے لیے درجہ

کے ذریعے درجہ بھیجا اور آپؐ کے نام اپنے خط میں آپؐ سے اپنی سعادت و تسلیق کا اظہار کیا۔

اس نے یہ احترام نہ کیا کہ وہ ایک نبیؐ کی طرف سے تھا۔ اسے سبک دیا اور اس نے اسے



- ۶۵۔ یَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تُحَاجُّونَ فِتْ إِبْرَاهِيمَ وَمَا
 أُنْزِلَتِ التَّوْرَةُ إِلَّا مِنْ بَعْدِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ○
 ۶۶۔ مَا أَنْتُمْ هَؤُلَاءِ حَا جَجْتُمْ فِيمَا لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ
 فَلِمَ تُحَاجُّونَ فِيمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ
 وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ○
 ۶۷۔ مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَكِنْ
 كَانَ حَنِيفًا مُسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ○
 ۶۸۔ إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ
 وَهَذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ ○

ترجمہ

- ۶۵۔ اے اہل کتاب! (حضرت) ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو اور تم میں سے ہر
 ایک انہیں اپنے دین کا پیرو کار سمجھتا ہے، حالانکہ تورات اور انجیل تو ان کے بعد نازل ہوئی
 ہیں، کیا تم عقل و فکر نہیں رکھتے۔
 ۶۶۔ تم تو وہی ہو جو اس چیز کے بارے میں گفتگو کرتے تھے جس کے بارے میں آگاہ ہوتے
 تھے اب ان چیزوں کے بارے میں گفتگو کیوں کرتے ہو جن سے آگاہ نہیں ہو، خدا
 جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔
 ۶۷۔ ابراہیم یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ وہ مخلص موحّد اور مسلمان شخص تھے اور وہ ہرگز مشرکین میں

سے نہیں تھے۔

۶۸۔ ابراہیم سے اولیت (اور زیادہ نسبت) رکھنے والے وہ لوگ ہیں جو ان کی پیروی کرتے ہیں اور ان کے دور میں ان کے مکتب کے وفادار تھے اور اس طرح) یہ پیغمبر اور وہ لوگ جو (اس پر) ایمان لائے ہیں اور خدا مومنین کا ولی اور سرپرست ہے۔

تفسیر

”يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَعَادُونَ فِتْرَةَ إِبْرَاهِيمَ.....“

تاریخ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ یہودی ظہور اسلام کے وقت ہی سے اس دین سے خاص دشمنی اور عداوت رکھتے تھے۔ اسلام کے نفوذ، پھیلاؤ اور اس جدید دین کے ذریعے دینِ مسیح کے منسوخ ہو جانے سے عیسائیوں کا ایک گروہ بھی اُس کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ لوگ کبھی کبھی بحث مباحثے، جھگڑا بازی اور جھگڑائے کے لیے اپنے وفادار افراد کو نبی اکرمؐ کے پاس بھیجتے تھے اور وہ اس طرح اپنے دین کو بہتر ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

ان امور میں سے ایک یہ تھا کہ سب کے سب کوشش کرتے کہ خدا کے عظیم پیغمبر حضرت ابراہیمؑ کو اپنے میں سے ثابت کریں کیونکہ حضرت ابراہیمؑ تمام مذاہب کے پیروکاروں میں معظم و مہترم سمجھے جاتے تھے۔ یہودی مدعی تھے کہ وہ ان میں سے ہیں اور ان کے دین کے پیرو ہیں۔ یہی دعویٰ عیسائی بھی کرتے تھے۔

سندرجہ بالا آیت میں قرآن انہیں جواب دیتا ہے کہ اصولی طور پر خدا کے مبارک و مہابہ پیغمبر حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں تمہارا جھگڑا اور گفتگو ہی بیکار ہے کیونکہ وہ تو سالہا سال حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ سے پہلے ہو گزرے ہیں اور توہمات و انجیل ان کے کئی سال بعد نازل ہوئیں۔

(”وَمَا أُنْزِلَتْ التَّوْرَةُ وَالْإِنْجِيلُ إِلَّا مِنْ بَعْدِهِ“)

کیا یہ چیز معقول ہے کہ گزشتہ پیغمبر اپنے سے بعد والے دین کا پیروکار ہو اور انہیں تعقل و تفکر و عقل نہیں کرتے۔

”مَا أَنْتُمْ هَؤُلَاءِ جَاءْتُمْ فِيمَا لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ فَلِمَ تُعَادُونَ“

”فِيمَا لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ“

یہاں خدا تعالیٰ انہیں سہ زنجیر کرتا ہے کہ اپنے مذہب سے مربوط مسائل جن کا تمہیں علم تھا ان کے بارے میں تم نے گفتگو اور بحث کی ہے اور تم نے دیکھ لیا جن مباحث کے بارے میں تمہارے خیال میں تمہیں علم تھا ان میں



بھی تم کیسے کیسے بڑے اشتباہات میں مبتلا اور حقیقت سے دور تھے اور واقع میں تمہارا علم جبل مرکب تھا۔ اس کے باوجود جس چیز کی تمہیں خبر نہیں اس کے بارے میں بحث مباحث کرتے ہو اور نتیجے کے طور پر تم ایسا دعوئی کرتے ہو جو کسی تاریخ کے مطابق درست نہیں۔

اس کے بعد آیت کے آخر میں گذشتہ مطالب کی تاکید کے لیے اور بعد والی آیت کی بحث کی طرف متوجہ کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے: خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے "وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ"۔
 "مَا كَانَ اِبْرٰهٖمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا....."

یہاں صراحت سے ان کے دعووں کا جواب دیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے: ابراہیم یہودی تھے نہ عیسائی بلکہ پاک اور خالص موحّد تھے اور خدا کے حضور سر تسلیم خم کیے ہوئے تھے اور کسی تمہاری طرح شریک خدا کے قائل نہیں ہونے تھے۔
 توجہ رہے کہ لفظ "حنیف" اور "حنف" (بروزن "حنف") سے ہے اور ایسے شخص یا چیز کے معنی میں بولا جاتا ہے جو کسی طرف مائل ہو اور قرآن کی زبان میں ایسے شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو اپنے زمانے کے باطل دین سے منہ موڑ کر دین حق کی طرف مائل ہو۔

مندرجہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی "حنیف" کے لقب سے توصیف کی ہے کیونکہ انہوں نے تعلید اور قصب کے پردے چاک کر دیئے تھے آپ ایسے ماحول اور زمانے میں ہرگز جنوں کے سامنے نہیں جھکے جو بت پرستی میں مفرق تھا لیکن زمانہ جاہلیت کے بت پرست عرب بھی اپنے آپ کو حضرت ابراہیمؑ کے دین "حنیف" پر جکتے تھے اور یہ بات اتنی مشہور تھی کہ اہل کتاب انہیں حنفیہ کہتے تھے یوں لفظ "حنیف" کا باطل مفاد معنی پیدا ہو گیا تھا اور ان کی نظر میں یہ لفظ بت پرستی کا مترادف اور ہم معنی ہو چکا تھا لہذا خداوند عالم نے حضرت ابراہیمؑ کی "حنیف" کے عنوان سے توصیف کرنے کے بعد "مسلمًا" اور "وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ" کہہ کر ہر قسم کے دوسرے احتمال کی نفی کر دی۔

حضرت ابراہیمؑ کس طرح مسلمان تھے

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو دین موسیٰ و عیسیٰ کا پیروکار نہیں کہا جاسکتا تو بطریق اولیٰ انہیں مسلمان بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ وہ تو ان ادیان سے پہلے تھے۔ پھر قرآن ان کا تعارف "مسلم" کے طور پر کیوں کر دیا ہے۔
 اس سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن کی اصطلاح میں مسلم صرف پیغمبر اسلامؐ کے پیروکاروں کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اسلام کا ایک وسیع معنی ہے اور خدا کے حضور تسلیم مطلق، توحید کامل، نیز ہر قسم کے شرک اور دوگانہ پرستی سے پاک کے معنی میں ہے اور اسی کے حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام تھے۔

مکتب و ہدف کارشہ
 "اِنَّ اَوْلٰى النَّاسِ بِاِبْرٰهٖمَ الْغَدِيْنِ"



۶۹۔ وَذَتْ طَائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يُضِلُّوكُمْ
وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ○

ترجمہ

۶۹۔ اہل کتاب (یہود) کا ایک گروہ چاہتا تھا کہ تمہیں گمراہ کر دے لیکن (انہیں جان لینا چاہیے کہ وہ تمہیں گمراہ نہیں کر سکتے) وہ اپنے آپ کو ہی گمراہ کرتے ہیں۔ مگر سمجھتے نہیں۔

شان نزول

بعض مفسرین نے نقل کیا ہے کہ بعض یہودیوں کی کوشش تھی کہ پاک دل مسلمانوں میں سے مشہور افراد مثلاً عاز اور ہار وغیرہ کو اپنے دین کی طرف دعوت دیں اور شیطانی دوسروں کے ذریعے انہیں اسلام سے موڑ لیں۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس کے ذریعے تمام مسلمانوں کو اس سلسلے میں خطر سے باخبر کیا گیا۔

تفسیر

”وَذَتْ طَائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يُضِلُّوكُمْ“

جیسا کہ شان نزول میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ دشمنان اسلام خصوصاً یہودی مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ پیغمبر اسلام کے نزدیک صحابہ کے بارے میں بھی وہ خواہشمند تھے کہ انہیں اسلام سے پھیریں ظاہر ہے کہ اگر وہ رسول اللہ کے قریبی صحابہ میں سے ایک یا چند افراد ہی کو برگشتہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو اسلام پر ایک عظیم مہرب پڑتی اور دوسروں کو متزلزل کرنے کے لیے یہ نفس ہمارا ہر جاتی۔

مندرجہ بالا آیت میں دشمنوں کی اس سازش سے باخبر کیا گیا ہے۔ نیز انہیں کہا گیا ہے کہ وہ اس بے جا کوشش سے دست کش ہو جائیں۔ اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ مکتب پیغمبر میں ان مسلمانوں کی تربیت اس حساب اور نگاہی سے ہوئی ہے کہ ان کے ٹوٹ جانے کا کوئی احتمال نہیں۔ انہوں نے اسلام کو دل و جان سے اپنا لیا ہے انہوں نے اس عظیم انسانی مکتب سے گہرائی سے سیکھ لیا ہے اور وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ لہذا دشمن انہیں گمراہ نہیں کر سکتے بلکہ وہ تو فقط اپنے تئیں گمراہ کرتے ہیں اور یہ اس لیے کہ وہ جذبات پیدا کرتے ہیں۔ اسلام اور پیغمبر

کی طرف غلط نسبتیں دیتے ہیں یوں وہ خود بدعتی کی روح اپنے وجود میں پروان چڑھاتے ہیں۔ زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو شخص عیب جوئی اور اعتراض کرنے ہی میں مصروف رہتا ہے اسے نفاذِ قوت دکھائی نہیں دیتے یا پھر تعصب اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے قرآنی نفاذ بھی اسے تاریک معلوم ہوتے ہیں۔ اس امر میں اصرار کے نتیجے میں روز بروز وہ حق سے دور ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس لیے قرآن کہتا ہے :-

(وَمَا يَضِلُّونَ إِلَّا أَنفُسُهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ)

”وَمَا يَضِلُّونَ“ — یعنی وہ شعور اور توجہ نہیں رکھتے۔ یہ جملہ اس نفسیاتی نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ کبھی انسان اپنے آپ سے آشنا نہیں ہوتا اور وہ اپنی باتوں کے زیر اثر بھی ہو جاتا ہے۔ جب وہ کوشش کرتا ہے کہ جھوٹ اور تہمت کے ذریعے دوسروں کو گمراہ کرے تو وہ اپنے آپ کو بھی اس کے اثرات سے نہیں بچا سکتا اور یہ غلط باتیں آہستہ آہستہ خود اس کے قلب و جان پر اثر کرنے لگتی ہیں۔ زیادہ وقت نہیں گزرتا کہ غلط بات اس کا راسخ عقیدہ بن جاتی ہے۔ ایسی باتوں کو اختیار کر کے وہ خود گمراہ ہو جاتا ہے۔

۴۔ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ

۵۔ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَتَّبِعُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْفُرُونَ بِالْحَقِّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ

ترجمہ

۴۔ اے اہل کتاب! کیوں آیاتِ خدا سے کفر کرتے ہو جبکہ (ان کی صحت و صداقت کی) گواہی (بھی) دیتے ہو۔

۵۔ اے اہل کتاب حق کو باطل سے کیوں ملا تے ہو (اور انہیں مشتبہ کرتے ہو تاکہ لوگ سمجھ نہ سکیں اور گمراہ ہو جائیں) اور حقیقت چھپاتے ہو حالانکہ تمہیں معلوم ہے۔

تفسیر

”يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ“

یہاں بھی روئے سخن اہل کتاب کی طرف ہے کہ وہ اپنی دشمنی اور ہٹ دھرمی سے کیوں دست کش نہیں ہوتے



اور تورات و انجیل میں پیغمبر اسلام کی نشانیاں پڑھنے اور ان سے علم و آگاہی رکھنے کے باوجود انہار کی راہ کیوں اختیار کرتے ہیں

”يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَتَّبِعُونَ الْحَقَّ بِلَا حِلٍّ“

دوبارہ اہل کتاب کو ڈرایا گیا ہے کہ وہ کیوں حق و باطل کو ایک دوسرے سے ملا دیتے ہیں اور علم رکھنے کے باوجود حقیقت کو کیوں چھپاتے ہیں اور تورات و انجیل کی وہ آیات جن میں پیغمبر اسلام کا تعارف کر دیا گیا ہے اور جو ان کی حقانیت کی نشانیاں ہیں انہیں کیوں چھپاتے ہیں۔

در حقیقت پہلی آیت میں علم و آگاہی کے باوجود راہ حق سے خود ان کے انحراف پر مواخذہ کیا گیا ہے اور دوسری آیت میں دوسرے لوگوں کو منحرف کر سنبھرا۔

سورہ بقرہ آیہ ۴۲ کے ذیل میں بھی ہم اس سلسلے میں گفتگو کر چکے ہیں۔ وہ آیت مندرجہ بالا آیت کے مشابہ ہے :

۴۱۔ وَتَالَّتِ طَائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمَنُوا بِالَّذِي
أُنْزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَبِغَةِ الثَّهَارِ وَكَفَرُوا
آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝

۴۲۔ وَلَا تَوْمِنُوا إِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِينَكُمْ قُلِ إِنَّ
الْهُدَىٰ هُدَىٰ اللَّهِ ۚ أَنْ يُؤْتِيَ أَحَدٌ مِّثْلَ مَا
أُوْتِيتُمْ أَوْ يُحَاجُّوَكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ قُلِ إِنَّ
الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ ۖ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ
وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝

۴۳۔ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ
الْعَظِيمِ ۝



ترجمہ

۷۲۔ اہل کتاب (یہود) کی ایک جماعت نے کہا، جاؤ اور جو کچھ مومنین پر نازل ہوا ہے (ظاہراً) دن کی ابتداء میں اس پر ایمان لے آؤ اور دن کے آخر میں کافر ہو جاؤ (اور لوٹ آؤ، شاید وہ تمہارے اس عمل سے اپنے دین سے برگشتہ ہو جائیں) کیونکہ وہ تمہیں اہل کتاب اور گزشتہ آسمانی بشارتوں سے آگاہ سمجھتے ہیں اور یہ سازش انہیں متزلزل کرنے کے لئے کافی ہے۔

۷۳۔ اور سوائے اس شخص کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتا ہے اور کسی پر ایمان نہ رکھو، کہو کہ بایں تو وہ ہے جو خدا کی طرف سے ہو (اور تمہاری یہ سازش اس کے مقابلے میں بے اثر ہے) (پھر وہ اپنے ساتھیوں سے مزید کہنے لگے کہ یہ نہ سمجھنا کہ کسی کو تمہاری طرح (آسمانی کتاب) دی جائے گی یا یہ کہ تمہارے پروردگار کے دربار میں کوئی تم سے بحث کر سکے گا) (بلکہ نبوت اور منطق، یہ دونوں چیزیں صرف تمہاری قوم اور نسل میں ہیں) کہہ دو کہ فضل (نبوت، عقل اور منطق کی عطا کسی میں منحصر نہیں ہے بلکہ وہ) خدا کے ہاتھ میں ہے اور وہ جسے چاہتا ہے (اور اس کا اہل سمجھتا ہے) عطا کرتا ہے اور خدا واسع (وسیع عطیات و عنایات کا مالک) اور (ان کے مناسب مواقع سے) آگاہ ہے۔

۷۴۔ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت سے نوازتا ہے اور اللہ عظیم عنایات و فضل کا مالک ہے۔

شان نزول

بعض گزشتہ مفسرین نے نقل کیا ہے کہ خیر اور دیگر مقامات کے بارے میں یہودی علماء نے مل کر بعض مومنین کا ایمان متزلزل کرنے کے لیے ایک سازش بنائی۔ انہوں نے پروگرام بنایا کہ ایک صبیح پیغمبر اسلام کی خدمت میں



جائیں اور ظاہراً ایسا نہ آئیں اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کریں لیکن دن کے آخر میں اس دین سے پلٹ آئیں اور جب ان سے پوچھا جائے کہ تم نے ایسا کیوں کیا ہے تو کہیں کہ ہم نے مسند کی صفات کو قریب سے دیکھا ہے لیکن جب اپنی دینی کتب کی طرف رجوع کیا ہے یا اپنے علماء سے مشورہ کیا ہے تو دیکھا ہے کہ ان کی صفات اور طور طریقے اس سے مطابقت نہیں رکھتے جو کچھ ہماری کتب میں ہے لہذا ہم اپنے دین کی طرف پلٹ آئے ہیں۔

یہودی علماء کا خیال تھا کہ اس طرح بعض مسلمان کہیں گے کہ چونکہ یہ لوگ ہماری نسبت آسمانی کتب کا زیادہ علم رکھتے ہیں اس لیے جو کچھ یہ کہتے ہیں یقیناً سچ اور حق ہے اور یوں وہ متزلزل ہو جائیں گے۔ آیت کے متعلق ایک اور شان نزول بھی مذکور ہے۔ لیکن درج بالا شان نزول آیت کے سنی سے زیادہ نزدیک ہے۔

تفسیر

مندرجہ بالا آیت یہودیوں کی ایک اور تباہ کن سازش سے پردہ اٹھاتی ہے اور نشان دہی کرتی ہے کہ وہ مسلمانوں کا ایسا متزلزل کرنے کے لیے ہر ذریعہ استعمال کرتے تھے۔ ایک گروہ کے اراکین جنہیں قرآن نے "حلفائے حق اہل الکتاب" کہا ہے آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگے: آؤ اور جو کچھ مسلمانوں پر نازل ہوا ہے دن کے آغاز میں اس پر ایساں لے آئیں اور دن کے آخر میں اس سے پلٹ آئیں۔ بعید نہیں کہ دن کے آغاز و اختتام سے مراد اتنی کم مدت ہو کہ لوگ کہہ سکیں کہ وہ اسلام کو دور سے کچھ اور سمجھتے تھے لیکن نزدیک سے کچھ اور پایا ہے۔ اس لیے بہت ہی جلد پلٹ آئے ہیں ان کا خیال تھا کہ یہ سازش یعنی طور پر ضعیف الاعتقاد لوگوں پر کافی اثر کرے گی خصوصاً اس لحاظ سے کہ وہ لوگ علماء یہود میں سے ہیں اور سب لوگ جانتے ہیں کہ وہ آسمانی کتابوں اور آخری پیغمبر کی نشانوں سے پوری واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ایساں و کفر کم از کم نئے مسلمانوں کے اعتقاد کی بنیادیں تو فرو بردارے گا۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں اپنی ماہر سازش کی کامیابی کی بیٹ امید تھی اور نعتہم یرجعون "ان کی اسی امید کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

"وَلَا تَقْوَمُوا بِالْاِيمَانِ تَتَّبِعِ دِينَكُمْ"

انہوں نے تاکید کی کہ تمہارا ایساں فقط ظاہری ہونا چاہیئے اور تمہارا رشتہ صرف اپنے دین کے پیروکاروں سے ہونا چاہیئے۔ بعض تفاسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ خیبر کے یہودیوں نے مدینہ کے یہودیوں کو وصیت کی تھی کہ ہمیں ایسا نہ ہو کہ تم ان لوگوں کے زیر اثر آ جاؤ جو پیغمبر اسلام کے زیادہ قریب ہیں اور یوں ان پر ایساں لے آؤ کیونکہ ان کا عقیدہ اور نظریہ تھا کہ نبوت صرف نسل یہود میں رہے گی اور اگر کوئی بغیر غیور کرے تو اسے یہودیوں میں سے ہونا چاہیئے۔

لیکن مفسرین نے "لَا تَقْوَمُوا" کو "ایساں" کے مادہ سے "اعملوا ایماناً" کے معنی میں لیا ہے۔ کیونکہ لغوی طور پر بھی اس کا یہی معنی ہے۔ اس بناء پر مندرجہ بالا جملے کا مفہوم یہ ہوا کہ یہ سازش بالکل محقق ہونا چاہیئے اسے



سوائے یہودیوں کے یہاں تک کہ مشرکوں سے بھی بیان نہ کرو تاکہ یہ راز فاش نہ ہو جائے اور یہ پروگرام نقش بر آب ہو کر نہ رہ جائے۔ مندرجہ بالا آیت کے ذریعے خدا تعالیٰ نے یہودیوں کی اس خفیہ سازش سے پردہ اٹھا کر انہیں رسوا کیا تاکہ مومنین کے لیے بھی یہ درس عبرت ہو اور مخالفین کے لیے بھی ذریعہ ہدایت بنے۔

”قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هَدٰى اِلَیْهِ“

یہ جملہ اصطلاح میں ایک جو معتبر ہے جو پروردگار کی طرف سے ہے جب کہ اس سے پہلے اور بعد والے جملے میں یہودیوں کی گفتگو نقل کی گئی ہے۔

یہودیوں کی گفتگو کے درمیان زیر نظر جملے میں خدا تعالیٰ نے انہیں ایک مختصر اور جامع جواب دیا ہے کہ ہدایت تو خدا کی طرف سے ہے اور وہ کسی خاص نسل اور قوم میں منحصر نہیں ہے اور کوئی ضروری نہیں کہ پیغمبر صرف یہود میں سے ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ جنہیں پروردگار کی ہر قسم کی ہدایت میر ہے وہ ان سازشوں سے متزلزل نہیں ہوں گے اور یہ تحریری منصوبے ان پر انداز نہیں ہو سکتے۔

”اِنَّ يَسُوْٓفَ اَحَدٌ مِّثْلُ مَا اَوْتَيْتُمْ اَوْ يَحْمِلُكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ“

یہ یہودیوں کی گفتگو کا آخری حصہ ہے۔ اس جملے کی ابتدا میں ”وَلَا تَصْدُقُوْا اِعْرَافًا وَّ اَعْتَادًا“

کر دیا مقدر ہے۔ اس بناء پر اس جملے کا معنی یہ ہوگا کہ کہیں یہ باور نہ کرو ساری دنیا کے لوگوں میں سے کوئی شخص وہ انتظار اور امتیاز اور آسانی کتب جو تمہیں نصیب ہیں، اس کے گام اور یہ بھی باور نہ کرو کہ کوئی شخص روز قیامت درگاہ خداوندی میں تم سے مباحثہ اور گفتگو کر کے تمہیں مغلوب کر سکے گا کیونکہ تم دُنیا کی بہترین قوم اور خاندان ہو نیز نبوت، عقل، وراثت، منطق اور استدلال صرف تمہارے پاس ہے۔

خلاصہ یہ کہ یہودی اس فضول منطق کے ذریعے خدا سے اپنا ارتباط ظاہر کرتے اور تمام قوموں سے اپنے تئیں برتر سمجھتے تھے اسی لیے بعد والے جملے میں خدا تعالیٰ نے انہیں ملامت جواب دیا ہے۔

”قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيْدِ اللّٰهِ اَيُّوْتٰیہٗ مِنْ يَّشَآءُ“

”وَاللّٰهُ وَّاسِعٌ عَلِيْمٌ“

کہئے کہ مقام نبوت جو عقل و خلقی استعداد ہو یا کوئی اور امتیاز، سب فضل و عطا خدا کی طرف سے ہے وہ جسے چاہتا ہے اور اہل سمجھتا ہے اسے نوازتا ہے۔ کسی نے اس سے عید و پیمان نہیں لے رکھا

”لَا تَوْمِنُوْا“ (ایمان نہ کرو) کے معنی میں جو تو ”اِنَّ تَوَلَّیْتُمْ اَحَدًا مِّثْلَ مَا اَوْتَيْتُمْ“

اور یحییٰ جو کہم ”کے دونوں حصے جو سکتا ہے اس پر معلوم ہوں۔



اور نہ ہی کوئی اُس سے قرابت یا رشتہ داری رکھتا ہے اس کا جو وجود و علاوہ اس سے ہے اور استغاث کے مواقع سے وہ علیم و آگاہ ہے۔

”يَخْتَصِمُ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ“ وَنَحْنُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ :

اس آیت میں بھی گذشتہ بحث کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : ”خدا جسے چاہتا ہے اور اہل سمجھتا ہے اپنی نفوس رحمتوں سے نوازتا ہے“ اور مقام نبوت و منصب رببری بھی اس کی رحمتوں میں سے ہیں اور کوئی شخص انہیں محدود نہیں کر سکتا اور ہر حالت میں عنایات، عطیات اور فضل عظیم اسی کی طرف سے ہے۔

پرانی سازشیں

مندرجہ بالا آیات دراصل قرآن کی پُر اعجاز آیات ہیں جو یہودیوں اور دشمنان اسلام کے اصرار سے پردہ اٹھاتی ہیں اور ان کی صدر اول میں مسلمانوں کو متزلزل کرنے کی سازشوں کو فاش کرتی ہیں۔ ان کی وجہ سے مسلمان بیدار ہو گئے اور دشمن کے تباہ کن دسوسوں سے بچ گئے۔ اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ موجودہ دور میں بھی اسلام کے خلاف ایسے ہی منصوبے بنتے رہتے ہیں۔ دشمن کے ذرائع ابلاغ جو پوری دُنیا میں سب سے قوی ہیں اس سلسلے میں استمال ہو رہے ہیں۔ دشمنوں کی کوشش ہے کہ اصل اسلام خصوصاً ان کی نوجوان نسل کے افکار کو اسلامی عقائد سے متزلزل کر دیں۔ وہ اس کے لیے عالم، دانشور، مؤرخ، سائنسدان، سماجی یہاں تک کہ فلمی اداکار بھییں بھی استمال کرتے ہیں وہ یہ حقیقت نہیں چھپاتے کہ ان کے پراپیگنڈا کا مقصد مسلمانوں کو یہودی یا عیسائی بنانا نہیں بلکہ ان کا ہدف نوجوانوں کو اسلامی عقائد سے برگشتہ کرنا ہے اور انہیں اپنے دین اور ثقافت کے مظاہر سے لائق کرنا ہے۔ قرآن آج مسلمانوں کو ان سازشوں سے ہوشیار رہنے کی دعوت دیتا ہے۔

۷۵۔ وَمِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ إِنْ تَأْمَنَهُ بِقِنطَارٍ يُؤْدِهَ إِلَيْكَ ۖ وَمِنْهُمْ مَنْ إِنْ تَأْمَنَهُ بِدِينَارٍ لَا يُؤْدِهَ إِلَيْكَ إِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ فَتَائِمًا ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيَّةِ شَيْءٌ ۖ وَ يَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝

۷۶۔ بَلَىٰ مَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ وَاتَّقِ ۖ فَإِنَّ اللَّهَ



يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ○

ترجمہ

۷۵۔ اور اہل کتاب میں سے کچھ ایسے بھی ہیں کہ اگر تم انہیں بہت سی دولت بطور امانت دو تو وہ تمہیں لوٹا دیں گے اور کچھ ایسے بھی ہیں کہ اگر انہیں ایک دینار بھی سپرد کرو تو وہ تمہیں ہرگز واپس نہ کریں گے مگر اس وقت تک جب تک تم ان کے سر پر کھڑے رہو (اور ان پر مسلط رہو) یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں ہم اُمیین (یہودیوں کے علاوہ کسی) کے سامنے جواب دہ نہیں ہیں اور خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں حالانکہ جانتے ہیں۔

۷۶۔ جی ہاں جو شخص اپنے عہد و پیمان پورے کرے اور پرہیزگاری اختیار کرے (خدا اُسے دوست رکھتا ہے کیونکہ) خدا پرہیزگاروں کو پسند کرتا ہے۔

شان نزول

یہ آیت دو یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ان میں سے ایک امین اور صحیح آدمی تھا اور دوسرا خائن اور پست فطرت۔ پہلا شخص عبداللہ بن مسام تھا۔ اس کے پاس ایک دولت مند نے ۱۲۰۰ اوقیہ سونا بطور امانت رکھا۔ عبداللہ نے وہ سب معین موقع پر واپس کر دیا۔ دوسرا شخص نغماس بن عازدرا تھا۔ ایک قریشی نے اُس کے پاس ایک دینار بطور امانت رکھا۔ نغماس نے اس میں خیانت کی۔ اس خیانت کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے زیرِ نظر آیت میں اس کی مذمت کی ہے۔ بعض کہتے ہیں یہود جو نصاریٰ کی ایک جماعت کے بارے میں ہے اور خیانت کرنے والے یہودی تھے۔ اگر آیت ان دونوں واقعات کے متعلق ہو تو بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اگرچہ زیادہ تر قرآنی آیات نصوص سوانح پر نازل ہوئی ہیں لیکن وہ عمومی پہلو بھی رکھتی ہیں اور اصطلاح کے مطابق موقع و محل سے تختہ نہیں ہیں۔

تفسیر

یہ آیت اہل کتاب کے ایک اور چہرے سے نقابِ مٹتی ہے اور وہ یہ کہ بعض یہودی عقیدہ رکھتے تھے کہ وہ

سے اوقیہ۔ جمع اوقیہ۔ ہر ایک ہاونی چھ دانے میں سات مختلف کے درجہ تھا۔



دوسروں کی امانتوں کی حفاظت کے جواب وہ نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ وہ سمجھتے تھے کہ انہیں حق پہنچتا ہے کہ وہ امانتوں کو اپنی ملکیت بنالیں۔

وہ کہتے تھے: ہم اہل کتاب ہیں۔ پیغمبر ہم میں سے ہیں اور آسمانی کتاب ہمارے پاس ہے لہذا دوسروں کے اموال ہمارے لیے کوئی احترام نہیں رکھتے۔ یہ خیال ان کے ہاں اتنا مسلم تھا کہ وہ اختلافی اور مذہبی رُخ اختیار کر چکا تھا۔ "یَقُولُونَ عَلَىٰ اٰمَنَةِ الْكَذِبِ" یعنی وہ اللہ پر جھوٹ باندھتے تھے۔ یہ جملہ ان کے اسی رُخ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

یہودی جتنے تھے ہم عربوں کے مال میں تصرف کرنے اور انہیں غصب کرنے کے مجاز ہیں کیونکہ وہ مشرک ہیں اور حضرت موسیٰ کے پرگرام پر عمل نہیں کرتے۔

یہاں بات کا ایک اور پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ یہودیوں کا عربوں سے اقتصادی معاہدہ تھا اور وہ عربوں سے تجارت کرتے تھے۔ جب عرب اسلام لے آئے تو یہودیوں نے ان کے حقوق کی ادائیگی سے انکار کر دیا اور یہ استدلال پیش کیا کہ معاملہ کے وقت تم ہمارے مخالف نہیں تھے، اب جب کہ تم نے نیا مذہب اختیار کر لیا ہے ہمارا حق ساقط ہو گیا ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ آیت تصریح کرتی ہے کہ تمام اہل کتاب اس غیر انسانی طرزِ فکر کے موافق نہیں تھے۔ بلکہ ان میں سے بعض لوگ دوسروں کے حقوق ادا کرنا اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے۔ یہ اس امر کی علامت ہے کہ قرآن ہرگز نہیں چاہتا کہ ایک گروہ کی غلط کاری کی بناء پر سب کی مذمت کی جائے۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے:

"وَمِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ اِنْ تَاْمَنَّا بِقِنطَارٍ يُؤَدُّهُ الْمِلَّةُ
وَمِنْهُمْ مَنْ اِنْ تَاْمَنَّا بِدِينَارٍ لَا يُؤَدُّهُ الْمِلَّةُ الْاَلَا مَادُمْتُ
عَلَيْهِ قَانِعًا"

یعنی — بعض اہل کتاب ایسے ہیں کہ اگر انہیں کثیر دولت بھی امانت کے طور پر دی جائے تو وہ واپس کر دیں گے اور کچھ ایسے بھی ہیں کہ اگر انہیں ایک دینار بھی امانت کے طور پر سپرد کریں تو وہ لوٹتے نہیں مگر یہ کہ کوئی ان کے مقابلے میں زیادہ طاقتور ہو۔

"الْاَمَانَةُ عَلَيْهِ قَانِعًا" — یعنی جب تک تم ان کے سپرد مسئلہ نہ ہو، آیت کے اس حصے سے یہودیوں کے بارے میں ایک نئی اصوں بھی معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ان میں سے بہت سے لوگ ایسے میں جو دوسروں کے حقوق کی ادائیگی کے بارے میں وہ طاقت و قدرت کے علاوہ کسی طریقے کو نہیں پہچانتے۔ مسلمانوں کے پاس ان سے اپنے حقوق کے حصول کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ وہ طاقت حاصل کریں۔ اسی طرح یہودی ان کے حقوق ادا کرنے کے لیے آمادہ ہو سکیں گے۔ حالیہ سالوں میں ایشیا میں جو بہت سے حوادث رونما ہوئے ہیں انہوں نے یہ حقیقت پایہ ثبوت کو پہنچا دی ہے کہ عالمی رائے عامہ

سے "قنطار" سے سونے کے تھیلے کی تعداد کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔



دنیا بھر کے لوگوں کے افکار و نظریات اور حق و عدالت اور ایسی کوئی چیز ہمارے دشمنوں کے لیے کوئی مفہوم نہیں رکھتی اور وہ صرف طاقت کے سامنے جھکتے ہیں۔ کسی اور چیز کو خاطر میں نہیں لاتے اور یہ ان قابل توجہ حقائق میں سے ایک ہے جن کی قرآن میں ہمیشہ گہرائی کی گئی ہے۔

”ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَاتَلُوا لَيْسَ عَلَيْنَا فِی الْأَوَّلِ سَبِيلٌ“

اس جملے میں ان کی وہ منطقی بیان کی گئی ہے جو وہ دوسروں کا مال کھانے کے لیے اختیار کیے ہوئے تھے اور وہ یہ کہ ”اہل انکتاب“ ”نصرتین“ مشرکین اور عرب جو طوفاً لکھنا پڑھا نہیں جانتے تھے، پر برتری رکھتے ہیں لہذا کوئی حرج نہیں اگر اہل کتب ان کے مال کو اپنی ملکیت بنالیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اس پر کوئی سواغندہ نہیں ہوگا یہاں تک کہ اس جوئے امتیاز کی وہ خدا کی طرف نسبت دیتے تھے۔

مستم ہے کہ یہ منطقی تو امانت میں خیانت کرنے سے زیادہ غھڑنگ ہے کیونکہ وہ خود کو اس معاملے میں حق بجانب سمجھتے تھے۔ قرآن ان کے جواب میں صراحت سے کہتا ہے: ”وَيَقْتُولُونَ عَلَى الْمَلِكِ الْكَذِبَ وَهَٰذَا يُفْتَنُونَ“ یعنی — وہ جان بوجھ کر خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں اور اس کی طرف ناروا نسبت دیتے ہیں۔ وہ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ ان کی آسانی کتب میں دوسروں کے مال میں خیانت کرنے کی کوئی اجازت نہیں دی گئی لیکن وہ اپنے بُرے اعمال کی توجیہ کے لیے ایسی دروغ سازی کرتے ہیں اور اس کی نسبت خدا کی طرف دیتے ہیں۔

”بَلَىٰ مَنْ أَفْلَحَ بِمُغْهَمٍ وَاقْتُلَىٰ فَبِإِنِّ الْمَلِكِ يُحْبِبُ الْمُنَافِقِينَ“

عربی زبان میں ”بلی“ کسی مطلب کے ثابت کرنے کے لیے آتا ہے لیکن عام طور پر اسے موقع پر آتا ہے کہ جہاں سوال منطقی صورت میں ہو، جیسا کہ خدا فرماتا ہے۔

”الْمَنَافِقُ بَرٌّ بِكُمْ“

کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟

”قَالُوا بَلَىٰ“ — انہوں نے کہا ہاں۔ جیسے لفظ ”نعم“ اثبات کے لیے آتا ہے مثلاً

”فَهَلْ وَجَدْنَا مَثَلًا مِّثْلَ مَا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَتَّىٰ قَالُوا نَعَمْ“

کیا جس چیز کا تمہارے پروردگار نے وعدہ کیا اسے تم نے حقیقی طور پر پایا

انہوں نے کہا ہاں۔ (اعراف - ۴۴)

ذکورہ آیت یہودیوں کے کلام کی نفی ہے۔ وہ کہتے تھے: ”لَيْسَ عَلَيْنَا فِی الْأَوَّلِ سَبِيلٌ“ — یعنی — غیر اہل کتب کا مال کھانا ہمارے لیے حرام نہیں ہے (یہ کہہ کر وہ اپنے آپ کو عملی طور پر آزاد سمجھتے تھے۔ اسی بے دلیل اور غیر مناسب دعوے کی بنیاد پر وہ دوسروں کے حقوق پر تجاوز کرنے سے باز نہیں آتے تھے۔

اس دور میں بھی جو لوگ انسانوں کی قسمت سے کہیں رہے ہیں۔ انسانی حقوق پامال کرتے ہیں اور تمام اصول



اور معاہدے ان کے لیے بازیچہ اطفال ہیں اور انہیں فقط اپنی خوشحالی سے غرض ہے، شاید یہ بھی اسرائیلی منطق پر کار بند ہیں۔

اس کے برعکس قرآن نسلی اور شخصی پہلوؤں کو اہم نہیں سمجھتا اور خدا کے حقیقی دوست انہیں قرار دیتا ہے جو گناہ سے دور رہتے ہیں، معاشرے کے حقوق کا احترام کرتے ہیں اور اپنے مقام و منصب سے غلط فائدہ نہیں اٹھاتے۔

آیت میں دراصل انسان کی حقیقی قیمت اور خدا کی دوستی کی میزان ایفائے عہد بالخصوص امانت میں خیانت کرنے اور ہر موقع پر تقویٰ اختیار کئے رہنے کو قرار دیا ہے: "مَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ وَاتَّقَىٰ فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ"

آج بھی ایسے شواہد موجود ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ اس منصب کے پیروکاروں کی ایک جماعت دنیا کے دیگر انسانوں کے بارے میں وہی عقیدہ رکھتی ہے اور دوسروں کے مال و دولت اور تمام چیزوں کو اپنے لیے مباح سمجھتی ہے۔ یہ شواہد قرآن کی عظمت اور اس کی منطق کی اصالت کی دلیل ہیں۔

یہ شواہد ان سے متعلقہ مقالوں اور مختلف کتب میں جمع کیے گئے ہیں۔ شوق رکھنے والے لوگ ان سے رجوع کر سکتے ہیں۔

ایک اشکال اور اس کی وضاحت

مکن ہے یہاں یہ سوال پیدا ہو کہ اسلام میں بھی دوسروں کے مال کے متعلق یہی حکم نظر آتا ہے کیونکہ اسلام اجازت دیتا ہے کہ مسلمان دوسروں کے اموال کو اپنی ملکیت بنالیں۔

بلاشبہ اسلام کی طرف ایسی نسبت دینا تہمت ہے کیونکہ اسلام کے قطعی احکام میں سے ہے کہ امانت میں خیانت کرنا جائز نہیں چاہے وہ مسلمان کی ہو یا غیر مسلم کی یہاں تک کہ وہ مشرک و بت پرست ہی کی کیوں نہ ہو۔ ایک مشہور حدیث میں امام سیوطی سے منقول ہے:

"عَلَيْكُمْ بِأَدَاءِ الْأَمَانَةِ فَإِنَّهُ يَبْعَثُ
مُحَمَّدًا بِالْحَقِّ نَبِيًّا لِّوَأَنفِ قَاتِلَ الْإِنْفِ
الْحُسَيْنِ بْنِ عَلِيٍّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ التَّمَنَنِي
عَلَى الشَّيْطَانِ الَّذِي قَتَلَهُ بِدَلِيلٍ لَا دِيْنَةَ إِلَيْهِ" : ۱

امانت ادا کرنا تم سب پر لازم ہے۔ قسم ہے اس خدا کی جس نے

محمد کو حق کے ساتھ بھیجا۔ اگر میرے والد حسین بن علی بن ابی

طالب (عظیم السلام) کا قاتل وہی طور جس سے اُس نے انہیں شہید کیا ہے



میرے پاس بطور امانت رکھتا اور میں قبول کریتا تو (بھی) میں اس کی نمانت اسے ادا کرتا۔

دوسری روایت میں امام صادق سے منقول ہے۔ آپ نے فرمایا :-
 "إِنَّ أَمْلَهُ لَكُمْ يَبْنَعُ نَيْبًا قَطْرًا لَا يَصْدُقُ
 الْعَدِيْثُ وَ أَفَاءُ الْأَمَانَةِ مَوَدَّاتُ الْإِلَى
 الْبِرِّ وَالْفَاحِشِ" ۱

خدا نے کسی پیغمبر کو مہربان نہیں کیا مگر یہ کہ ہر ایک دہرے کے ساتھ
 راست گوئی اور امانت کی ادائیگی اس کے پروگراموں میں شامل تھی۔

اس لیے جو کچھ مندرجہ بالا آیت میں یہودیوں کی طرف سے امانت میں خیانت کرنے کے بارے میں
 بیان کیا گیا ہے، کسی طرح بھی مسلمانوں کو اس کی اجازت نہیں دی گئی اور مسلمان ذمہ دار ہیں کہ وہ بلا استثناء
 کسی کی امانت میں خیانت نہ کریں۔

۷۷۔ إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا
 قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَائِفَ لَهُمْ فِي الْأَٰخِرَةِ
 وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ
 الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝

ترجمہ

۷۷۔ جو لوگ خدا سے باندھا ہوا عہد و پیمان اور (خدا کے مقدس ناموں سے
 کھائی گئی) اپنی قسموں کو تھوڑی سی قیمت پر فروخت کر دیتے ہیں ان کا آخرت میں کوئی
 حصہ نہیں ہوگا، خدا ان سے بات نہیں کرے گا، قیامت کے دن ان کی طرف
 (رحمت کی) نظر نہیں کرے گا، انہیں (گناہ سے) پاک نہیں کرے گا اور ان کے
 لیے دردناک عذاب ہے۔



شان نزول

بعض علماء یہود نے جن میں البرافع، جی بن اخطب اور کعب بن اشرف شامل تھا، جب دیکھا کہ ان کی اجتماعی حیثیت یہودیوں کے درمیان خطرے میں ہے تو کوشش کی کہ تورات میں آخری پیغمبر کے بارے میں جو نشانیاں تھیں اور تورات کے جو نسخے خود انہوں نے لکھے تھے ان میں تحریف کر دیں یہاں تک کہ وہ اس بات پر قسم بھی کھا جاتے کہ وہ تحریف شدہ جیسے خدا کی طرف سے ہیں۔ اسی بنا پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور انہیں شدت سے خطرے کا الارم دیا گیا۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ آیت اشعت بن قیس کے بارے میں نازل ہوئی جو جھوٹے طریقے سے کسی کی زمین پر قبضہ کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے جب وہ جھوٹی قسم کھانے پر آمادہ ہوا تو مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی۔ اس پر اشت ڈر گیا اور احرار حق کر پا اور زمین اس کے ملک کو واپس کر دی۔

تفسیر

اس آیت میں یہود اور اہل کتاب کی بعض غلط کاریوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ البتہ آیت چونکہ عمومی صورت میں ہے اس لیے ان سب کے بارے میں ہے جن میں یہ صفات موجود ہیں۔

آیت کہتی ہے: "جو لوگ خدا سے باندھے ہوئے عہد و پیمان اور اس کے مقدس نام کی قسموں کو توڑی کسی قیمت پر بیچتے ہیں وہ متعدد سزاؤں میں گرفتار ہوں گے۔"

پہلی یہ کہ وہ عالم آخرت کی بے شمار نعمتوں سے قابلِ ملاحظہ فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے "وَلَا يَخْلُقُ لَهُمْ" "وَلَا يَخْلُقُ لَهُمْ"

دوسری کہ خدا تعالیٰ روز قیامت صاحبانِ ایمان سے گفتگو کرے گا لیکن ایسے افراد سے کوئی کام نہیں کرے گا "وَلَا يَخْلُقُ لَهُمْ اَمَلًا"

تیسری یہ کہ اُس دن ان سے اپنی نگاہ لطف و کرم اٹھائے گا "وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ"

چوتھی یہ کہ اس طرح انہیں گناہ کی آلودگیوں سے پاک نہیں کرے گا "وَلَا يُزَكِّيهِمْ"

پانچویں یہ کہ اسی بناء پر ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا "وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيمٌ"

"شَعَثًا قَلِيلًا"۔ کم قیمت سے مراد یہ ہے کہ انہیں ان عظیم گناہوں کے بدلے جو بھی مادی قیمت حاصل ہو جائے کم اور ناچیز ہے اگرچہ وہ وسیع حکومت ہی کیوں نہ ہو۔

واضح ہے کہ خدا کی گفتگو سے مراد زبان سے گفتگو نہیں ہے کیونکہ خدا تعالیٰ جسم و جسامت سے منزہ و بڑا



ہے بلکہ اس سے مراد دل میں الہام کے ذریعے گفتگو ہے یا فضا میں صوتی موجوں کو ایجاد کرتا ہے جیسے حضرت موسیٰؑ نے شجرہ طور سے گفتگو سنی تھی۔

جس نکتے کی طرف یہاں توجہ ضروری ہے یہ ہے کہ عہد شکنی اور جھوٹی قسموں سے پیدا ہونے والے نتائج جن کا آیت میں ذکر ہے خدا سے قرب و بقدر کے تدریجی مراحل ہیں۔

جو شخص خدا کے قریب ہو جاتا ہے اور اس کے قرب کی بساط پر قدم رکھتا ہے پہلے تو معنوی عنایت کا ایک سلسلہ اس کے شامل حال ہوتا ہے اور جب زیادہ نزدیک ہو جاتا ہے تو خدا اس سے گفتگو کرتا ہے۔ جب اور زیادہ قریب ہوتا ہے تو خدا اس پر نظر رحمت کرتا ہے اس کے نتیجے میں وہ دردناک عذاب سے نجات پا جاتا ہے اور اس کی نعمتوں میں مستغرق ہو جاتا ہے لیکن جو لوگ عہد شکنی کرتے ہیں اور پروردگار کا نام غلط طور پر استعمال کرتے ہیں وہ ان تمام نعمات و برکات سے محروم ہو جاتے ہیں اور مرحلہ بہ مرحلہ دور ہوتے جاتے ہیں۔ سورہ بقرہ کی آیہ ۱۷۴ بھی زیر نظر آیت سے کئی لحاظ سے مشابہ ہے اس کے ذیل میں اس آیت کے مہم کے بارے میں کئی ایک وضاحتیں آچکی ہیں۔

۷۸۔ وَإِنْ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا يَلْوُونَ أَلْسِنَتَهُمْ بِالنَّكِيبِ لِتَحْسَبُوهُ مِنَ الْكِتَابِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ○

ترجمہ

۷۸۔ ان ایہود میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو (خدا کی) کتاب کی تلاوت کے وقت اپنی زبان یوں پھیرتے ہیں کہ تم گمان کرنے لگو کہ (جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں) کتاب خدا میں سے ہے حالانکہ وہ کتاب خدا میں سے نہیں ہوتا (یہاں تک کہ وہ صراحت سے کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ جب کہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتا اور وہ

خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں۔ حالانکہ جانتے ہیں۔

تفسیر

”يَلْعَنُونَ“ ”لَيْ“ (برہنہ ”حق“ سے ہے۔ اس کا معنی ہے پیچ و خم کھانا۔ یہ آیت درحقیقت گذشتہ آیات کی تاکید کے طور پر آئی ہے۔ اس آیت کی شان نزول بھی گذشتہ آیات کی شان نزول سے مشابہ ہے۔ یہودیوں کا ایک گروہ کتبِ خدا پر حقے وقت اپنی زبان کو پیچ و خم دیتا ہے اور ٹیڑھا کرتا ہے۔ یہ تعبیر کلامِ خدا میں تحریف کرنے سے خوبصورت کنید ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے : وہ یہ کام ایسے ماہر و طریقے سے انجام دیتے ہیں کہ تمہیں لگن ہو گا کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں خدا کی طرف سے نازل شدہ آیات ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے (”لَتَحْسَبُوهُ مِنَ الْكِتَابِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتَابِ“)

وہ اُسی پر بس نہیں کرتے بلکہ مزاحمت سے کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے نازل شدہ ہے جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے (”وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ“)

قرآن دوبارہ کہتا ہے کہ اس سلسلے میں انہیں اشتباہ نہیں ہوا بلکہ وہ جان بوجھ کر خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں اور جانتے بوجھتے ہوئے وہ یہ بہتان باندھتے ہیں (”وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ“)

۷۹۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُتَوَكَّلَ عَلَى اللَّهِ الْكِتَابِ وَالْحُكْمِ وَالْثُبُورَةِ شَعْمَ يَقُولُ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَئِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ رَبَّنَا بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ ۝

۸۰۔ وَلَا يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلَائِكَةَ وَالنَّبِيِّينَ أَرْبَابًا أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۝



ترجمہ

۷۹۔ کسی شخص کو زیب نہیں دیتا کہ خدا آسمانی کتاب، حکم اور نبوت اُسے دے اور پھر وہ لوگوں سے کہتا پھرے کہ خدا کو چھوڑ کر میری عبادت کرو (بلکہ اُس کے شایان شان یہ ہے کہ وہ کہے) خدا واسے بنو جیسا کہ کتاب خدا کی تعظیم ہے اور جیسے تم نے درس پڑھا ہے (اور خدا کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کرو)۔

۸۰۔ اور نہ یہ کہ تمہیں حکم دے کہ فرشتوں اور انبیاء کو اپنا پروردگار بنا لو۔ تو کیا وہ تمہیں کفر کی طرف دعوت دیتا ہے جب کہ تم مسلمان ہو چکے ہو۔

شان نزول

ان دو آیات کے بارے میں دو شان نزول مذکور ہیں:

پہلی۔ ایک شخص پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا: ہم دوسروں کی طرح آپ پر سلام کرتے ہیں حالانکہ ہماری نظر میں ایسا احترام کافی نہیں۔ ہم تقاضا کرتے ہیں کہ آپ ہمیں اجازت دیں کہ ہم آپ کا امتیاز ملحوظ رکھیں اور آپ کو سجدہ کر لیا کریں۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: سجدہ خدا کے علاوہ کسی کے لیے جائز نہیں۔ اپنے پیغمبر کا ایک بشر کے طور پر احترام کرو لیکن ان (انبیاء) کا حق پہچانو اور ان کی پیروی کرو۔

دوسری۔ ہارون علیہ السلام ایک یہودی تھا۔ ایک مرتبہ وہ بخیران کے عیسائیوں کی طرف سے وفد کے قائد اور سرپرست کے ساتھ خدمت پیغمبر میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی عبادت کریں اور آپ کو مقام الوہیت پر فائز بھیجیں۔

شاید ان کا خیال تھا کہ پیغمبر حضرت عیسیٰ کی الوہیت کی مخالفت اس بناء پر کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں ان کا کوئی حقہ نہیں لہذا اگر حضرت عیسیٰ کی طرح ان کے لیے بھی مقام الوہیت کو تسلیم کر لیا جائے تو وہ خود بخود مخالفت چھوڑ دیں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تجویز پیغمبر اکرمؐ کو بدنام کرنے اور عوام کو منحرف کرنے کے لیے پیش کی گئی ہے۔ بہر حال پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

معاذ اللہ کیسے ممکن ہے کہ میں اجازت دوں کہ کوئی شخص رب واحد کے علاوہ کسی کی عبادت کرتے ہوئے ہرگز مجھے ایسے معاملے کے لیے مبعوث نہیں کیا۔



تفسیر

انہی سے پہلے ہم توجہ دلا چکے ہیں کہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کی بُری عادات میں سے ایک یہ تھی کہ وہ حقائق میں تحریف کر دیا کرتے تھے۔ حضرت عیسیٰ کے بارے میں ان کا الوہیت کا دعویٰ اپنی تحریفات میں سے ایک ہے۔ وہ کہتے تھے حضرت عیسیٰ نے خود ہمیں اس بات کا حکم دیا ہے۔ بعض لوگ چاہتے تھے کہ یہی مہیوم خیال وہ پیغمبر اسلام کے بارے میں بھی رکھیں اور اس کی وجوہات کی طرف شاخِ نزول میں اشارہ ہو چکا ہے۔ آیت نے انبیاء کی پرستش کی تجویز پیش کرنے والے ایسے تمام افراد کو صریح اور قطعی جواب دیا ہے۔

آیت کہتی ہے کہ پیغمبر اسلام، کسی اور نبی یا فرشتوں، میں سے کسی کی عبادت نہیں ہو سکتی اور اگر اہل کتاب یہ خیال کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ نے انہیں اپنی عبادت کی دعوت دی ہے تو وہ اشتباہ کرتے ہیں۔

”مَا كَانَ لِلْبَشَرِ أَنْ يُشِيرَ أَنْ يَنْتَهِيَ إِلَهُ الْحَيَاتِ وَالْخَلْقِ وَالْثَبُوتِ“

لَقَدْ يَسْئَلُونَ لِمَا نَسِ كُنْتُمْ أَعْبَادًا لِمَنْ مِنْ دُونِ اللَّهِ.....“

کسی انسان کو حق نہیں پہنچتا کہ خدا اُسے آسانی کتاب، علم و دانش اور نبوت سے نوازے اور وہ لوگوں کو اپنی عبادت کی دعوت دے۔ حالانکہ تمام انبیاء نے بالاتفاق لوگوں کو ایک اکیلے خدا کی عبادت کی دعوت دی ہے۔ یہ آیت نفی مطلق کے معنی میں ہے۔

یعنی خدا کی طرف سے کبھی کوئی جہنم علم و حکمت کا مافروضہ نہیں کیا ہے کسی وقت بھی بندگی اور عبودیت کے مرحلے سے سباز نہیں کریں گے۔ خدا کے پیچھے جوئے رہبر ہمیشہ عام لوگوں کی نسبت بارگاہ الہی میں زیادہ منکسر اور خاضع رہتے ہیں۔ لہذا وہ بندگی اور توحید کی شاہراہ نہیں چھوڑ سکتے اور لوگوں کو شُرک کے گڑھے میں نہیں پھینک سکتے۔

”وَلَكِنْ كُنْتُمْ تَزِينُونَ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَعْمُونَ الْحِكْمَةَ“

وَبِمَا كُنْتُمْ تَذَرُونَهَا“

”تَزِينُونَ“ جمع ہے ”زَيَّنَ“ کی۔ یہ لفظ ایسے شخص کے لئے بولا جاتا ہے جس کا رشتہ اور ربط پروردگار سے محکم اور مضبوط ہو۔ چونکہ یہ لفظ ”تَمَيَّنَ“ کے مادہ سے ہے اس لئے اُس شخص کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو دوسروں کی تدبیر اصلاح اور تربیت کرے عرب ادب کے قواعد کی رو سے یہ لفظ ”مَنْسُوب“ ہے البتہ ”يَزِيهِ“ کی اضافت کے وقت اس میں ”أَلِف“ کا اضافہ ہو جاتا ہے جیسا کہ ”بَحْرِيْن“ سے ”مَنْسُوب“ کو ”بَحْرَانِي“ کہتے ہیں۔ یہاں بھی اسی صورت میں ”زَيِّنِي“ کہا گیا ہے۔

مندرجہ بالا جملے میں قرآن کہتا ہے: انبیاء کو زیبا نہیں کہ وہ لوگوں کو اپنی پرستش کی دعوت دیں۔ ان کے



یہی مناسب ہے کہ وہ لوگوں کو آیات الہی کی "تعلیم" دیں اور حقائق دین کی "تدریس" کے ذریعے لوگوں کو علماء ربانی بنادیں اور وہ ایسے لوگ تیار کریں جو خدا کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کریں اور علم و دانش اور معرفت کے سوا کسی چیز کی طاقت و دعوت نہ دیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ مذکورہ جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کا مقصد فقط افراد کی تربیت کرنا نہ تھا بلکہ ان کا کام معلمین، تربیت کرنے والے اور مختلف گروہوں کے لیے رہبر تیار کرنا تھا۔ یعنی ایسے افراد تیار کرنا جن میں سے ہر کوئی ایک وسیع علاقے کو اپنے علم، ایمان اور دانش سے روشنی بخشنے۔

اوپر والی آیت میں پہلے مسئلہ تعلیم کا ذکر ہے۔ پھر تدریس کا تذکرہ ہے۔ ان دو الفاظ میں یہ فرق ہے کہ تعلیم ایک وسیع و عریض معنی کا حامل ہے۔ اس میں گفت و کردار کے ذریعے پڑھے لکھے یا ان پڑھ ہر طرح کے لوگوں کو تعلیم دینا شامل ہے لیکن تدریس ایسی تعلیم کے لیے بولا جاتا ہے جس کا تعلق کتاب اور کاغذ سے ہو اور اصطلاح کے لحاظ سے تعلیم سے "اختصاص" اور خصوصی ہے۔

"وَلَا يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُشْرِكُوا بِالْمَلِكَةِ وَالنَّبِيِّاتِ"

اس آیت کی گفتگو گذشتہ بحث کی تکمیل ہے۔ اس میں فرمایا گیا ہے: جیسے انبیاء لوگوں کو اپنی پرستش کی دعوت نہیں دیتے اسی طرح انہیں فرشتوں اور دیگر انبیاء کی عبادت کی دعوت بھی نہیں دیتے ایک طرف تو یہ جملہ مشرکین عرب کا جواب ہے، جو فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں سمجھتے تھے اور یوں ان کی ایک طرح سے ربوبیت کے قائل تھے پھر بھی اپنے تئیں دین ابراہیم کا پیروکار بتاتے تھے، یونہی یہ "صائبین" کا بھی جواب ہے جو اپنے آپ کو حضرت "یوحنا" کا پیروکار بتاتے تھے اور فرشتوں کا مقام پرستش کی حد تک اوپر لے جاتے تھے۔

دوسری طرف یہ یہودیوں کا بھی جواب ہے جو حضرت "عیسیٰ نسی" کو خدا کا بیٹا قرار دیتے تھے اور یوں ان کے لیے ربوبیت کے ایک حصے کے قائل تھے اور اس عقیدے کو پیغمبران خدا کی طرف منسوب کرتے تھے۔ آیت ان سب کا جواب دیتی ہے کہ یہ بات کسی پیغمبر کے شایان شان ہرگز نہیں کہ وہ لوگوں کو غیر خدا کی ربوبیت کی طرف دعوت دے۔

"أَيُّهَا مَنْزُكُمْ بِالْكَفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ شُرَكَاءُ"

آخر میں فرمایا: کیا یہ ممکن ہے کہ پیغمبر تمہیں کفر کی دعوت دے جب کہ تم اسلام اور توحید کا راستہ اپنا چکے ہو۔

کبھی بغیر واضح ہے کہ یہاں اسلام سے مراد دیگر بہت سے مواقع کی طرح اس کا وسیع معنی ہے یعنی فرمان خدا، ایمان اور توحید کے سامنے سسر تسلیم کرنا۔

یعنی — کیسے ممکن ہے کہ کوئی ایسا پیغمبر ہو جو پہلے تو لوگوں کو ایمان اور توحید کی دعوت دے اور پھر



انہیں مشرک کی راہ دکھائے یا یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایک پیغمبر دیگر تمام انبیاء کی زحمتوں کو برباد کر دے جنہوں نے اسلام کی دعوت دی ہے اور وہ لوگوں کو کفر و مشرک کی طرف کیے راغب کر سکتا ہے۔
غرضی طور پر آیت صحت انبیاء اور فرمانِ خدا سے ان کے اخواف نہ کرنے کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے یہ

بشر پرستی ممنوع ہے

مندرجہ بالا آیت پوری صراحت سے غیر خدا کی ہر قسم کی پرستش، بالخصوص بشر پرستی کو ممنوع قرار دیتی ہیں اور انسان میں آزادی و استقلال کی روح پیدا کرتی ہیں۔ یہی وہ روح ہے جس کے بغیر انسان انسان کہلانے کا مستحق نہیں۔

طویل انسانی تاریخ میں ایسے بہت سے افراد ہو گزرے ہیں جو اقتدار تک پہنچنے سے پہلے مصو مانہ چہرہ رکھتے تھے اور لوگوں کو حق، عدالت، حریت، آزادی اور ایمان کی دعوت دیتے تھے لیکن جب ان کے اقتدار کی بنیادیں معاشرے میں مستحکم ہو گئیں تو آہستہ آہستہ انہوں نے اپنا راستہ بدل لیا اور وہ شخص پرستی کی طرف مائل ہوئے اور لوگوں کو اپنی پرستش کی دعوت دینے لگے۔

درحقیقت دعوت حق اور دعوت باطل دینے والوں کی پہچان کا یہی ایک راستہ ہے کہ حق کی دعوت دینے والے جن کے سرکردہ افراد انبیاء اور آئمہ علیہم السلام ہیں اقتدار پالنے کے بعد بھی پیسے کی طرح لوگوں کو دین و انسانیت کے مقدس مقاصد کی طرف دعوت دیتے ہیں جن میں توحید، یگانہ پرستی اور آزادی کی دعوت شامل ہے لیکن باطل کی دعوت دینے والے جب اقتدار اور کامیابی تک پہنچتے ہیں تو پہلی چیز جو ان کے دماغ میں ٹھومتی ہے وہ اپنی طرف لوگوں کو دعوت دینا ہے اور وہ لوگوں کو ایک قسم کی اپنی عبودیت کی نشوونما و ترغیب دیتے ہیں۔ ان کے گردا گرد بے حیثیت لوگ جمع ہو جاتے ہیں جن کا کام خوشامد اور چاپوسی ہوتا ہے اور وہ غرور و کم ظرفی کے ذریعے ایسی چیزوں کو ظاہر کرتے ہیں ایک جاذب نظر حدیث حضرت علی سے منقول ہے۔ یہ حدیث آنجنابؑ کے حقیقی روحانی چہرے کو واضح کرتی ہے اور یہ جہادی بحث کے لیے شاہد بھی ہے۔ جب امام عالی مقام عراق کے سرحدی شہر ابنار میں پہنچے تو کچھ کسان اپنے

منہ مشہور قرائت میں جس کے مطابق قرآن کا سجدہ تین ہے "وَلَا يَأْخُذْكُمْ" کا جو منصوب (سراور ذہر کے ساتھ) پڑھا جاتا ہے۔ اور حقیقت میں اس کا تعلق گذشتہ آیت کے "أَنْ يَشْهَدَ لَكُمْ" سے ہے اور یہ انہی پر عطف ہے اور یہاں پر "لَا" گذشتہ آیت میں آنے والے "خَا" کی تاکید ہے جو نافیہ ہے۔ اس بناء پر اس جملے کا معنی کہہ دیں ہوگا۔

"وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَتَّبِعْتُمْ وَلَا تَتَّبِعْتُمْ وَلَا تَتَّبِعْتُمْ وَلَا تَتَّبِعْتُمْ وَلَا تَتَّبِعْتُمْ وَلَا تَتَّبِعْتُمْ وَلَا تَتَّبِعْتُمْ وَلَا تَتَّبِعْتُمْ"

یعنی: کسی بشر کو یہ حق نہیں کہ تمہیں حکم دے کہ انبیاء اور عالم کو پورا دھار بناو۔



مروجہ طریقے کے مطابق آپؐ کے سامنے سجدے میں گر پڑے۔ امام علیہ السلام نے نہ صرف یہ کہ اس فعل کو ناپسند کیا بلکہ بہت زیادہ غصہ تک ہوئے اور انہیں کہنے لگے:

”ما هذا الذي صنعتُموه؟“

تم نے یہ کیا کام انجام دیا ہے؟

فَعَالُوا: ”خَلَقَ مِنَّا نَعْلَمُ بِهِ اَصْرَانَا“

وہ کہنے لگے: یہ کام ہم اپنے بادشاہوں اور امراء کی تعظیم کے طور پر انجام دیتے ہیں۔

فَعَالُ: ”وَاللّٰهُ مَا يَنْتَفِعُ بِهَذَا اَصْرَاكُمْ

وَانَكُمْ لَتَشْفَوْنَ عَلَىٰ اَنْفُسِكُمْ فِ

دُنْيَاكُمْ وَتَشْفَوْنَ بِهَذَا اَخْرَجَتْكُمْ وَمَا

اَشْرَعَ الْمَشْفَةِ وِرَاثَهَا الْعَتَابُ، وَارْبَعُ

الدَّعَاةِ مَعَهَا الْاِيْمَانُ مِنَ النَّارِ“ لے

آپؐ نے فرمایا:-

بخدا تم بدلے امراء اور حکام کو اس عمل سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور تم اپنے

آپؐ کو اس سے دنیا میں رنج و تکلیف میں مبتلا کرتے ہوئے اور آخرت

میں بدبخشی میں گرفتار کر رہے ہو۔ کس قدر نقصان دہ ہے وہ تکلیف و سختی

کہ جس کے بعد عذاب خدا بھی ہو اور کس قدر فائدہ بخش ہے وہ ایمان کا زاد

جس کے ساتھ آتش جہنم سے بھی ایمان حاصل ہو۔

۸۱۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَّا اْتَيْنَاكُمْ
مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ
مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ
وَلَتَنْصُرُنَّهُۥ قَالَ ؕ اَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُكُمْ
عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيۥ فَاَلْوَاۤ اَقْرَرْتُمْ وَاَقَالَ
فَاَشْهَدُوۡا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيۡنَ ۝

لے ”تِلْكَ الْبَلَاغَةُ“ حکمت تصدیق



ترجمہ

۸۱۔ وہ وقت (یاد کرو) جب خدا نے انبیاء (اور ان کے پیروکاروں سے) یہ تاکید دی عہد و پیمان لیا کہ جب میں تمہیں کتاب و حکمت دے دوں اس کے بعد تمہارے پاس ایک پیغمبر آئے جو اُس کی تصدیق کرے جو تمہارے پاس ہے تو اُس پر ایمان لے آنا اور اس کی مدد کرنا اچھر خدا نے ان سے کہا: کیا اس چیز کا اقرار کرتے ہو اور اس پر تاکید عہد و پیمان باندھتے ہو۔ انہوں نے کہا: (جی ہاں) ہم اقرار کرتے ہیں۔ (خدا نے ان سے) کہا: (اس مقدس عہد و پیمان پر) گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔

تفسیر

مقدس عہد و پیمان

”وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الشَّيْبِئِ“

یہ آیت ایک عمومی بنیاد کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ گزشتہ انبیاء اور ان کی اقتداء میں ان کے پیروکاروں نے خدا تعالیٰ سے ایک عہد و پیمان باندھا تھا اور وہ یہ کہ وہ بعد میں آنے والے انبیاء و رسل کے سامنے سر تسلیم خم کریں گے اور ان پر ایمان لانے کے علاوہ ان کے اہداف و مقاصد کی پیش رفت کے لیے ان کی کسی قسم کی مدد سے دریغ نہیں کریں گے۔

دراصل جیسے انبیاء اور ان کی امتیں گزشتہ انبیاء اور ان کے دین کا احترام کرتے تھے اس طرح گزشتہ انبیاء اور ان کی امتوں پر آنے والے انبیاء کے بارے میں ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔ آیات قرآن میں بارہا پیمان خدا کے مقاصد کی وحدت کی طرف اشارہ ہوا ہے، زیر نظر آیت بھی اس امر کا زندہ نمونہ ہے۔

مندرجہ بالا آیت میں کہا گیا ہے: ”خدا نے انبیاء سے ميثاق لیا تھا۔“ ”ميثاق دراصل وثوق“ کے مادہ سے ہے اور اس کا معنی ہے ”ایسی چیز جو اطمینان اور اعتقاد کا سبب بنے“ عام طور پر ”تاکیدی عہد و پیمان“ کو ميثاق کہتے ہیں۔

انبیاء سے پیمان لینا فطری طور پر ان کے پیروکاروں سے بھی پیمان لینے کے مترادف ہے۔ مذکورہ عہد و پیمان کا مطلب یہ تھا کہ اگر کوئی ایسا پیغمبر آئے جس کی دعوت ان کی دعوت سے ہم آہنگ ہو اور یوں اس کی حقانیت ثابت ہو



جانشین اُن سے جدا نہیں ہیں اور صوب کے سب ایک ہی مقصد رکھتے ہیں۔ انبیاء ہمیشہ اپنے جانشینوں کا تعارف کر دیتے تھے، ان کی بشرت دیتے تھے اور لوگوں کو ان پر ایمان لانے اور ان کی مدد کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ اس لیے اگر ہم دیکھتے ہیں کہ پہلی تفسیر و حدیث کی کتب میں اس آیت کے ذیل میں چند روایات ہیں —————
 ”وَلَقَدْ نَصَرْنَا“ سے حضرت علیؑ کی مدد کرنا مراد لیا گیا ہے اور اس میں مسند ولایت کو بھی شامل قرار دیا گیا ہے تو وہ درحقیقت اسی مفہوم کی طرف اشارہ ہے۔

یہ بات کہے بغیر نہیں رہنا چاہیے کہ مندرجہ بالا آیت کے بارے میں مفسرین اور اہل ادب نے ترکیب بخوی کے حوالے سے بحث کی ہے۔ سہ

مزاحم تعصبات

تاریخ نشان دہی کرتی ہے کہ ایک دین کے پیروکار آسانی سے اپنے دین سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہوتے اور خدا کی طرف سے نئے مبعوث ہونے والی انبیاء کے سامنے آسانی سے سست تسلیم خم نہیں کیا کرتے بلکہ جود اور بڑی شدت سے اپنے قدیم دین پر جمے رہتے ہیں اور اُس کا دفاع کرتے ہیں گویا اسے اپنا اور اپنے آپ کو اُس کا بھگتے ہیں اور اسے چھوڑ دینے کو اپنی بی اور قوی بربادی خیال کرتے ہیں۔ لہذا وہ بہت مشکل سے نیا دین قبول کرنے کو تیار ہوتے ہیں۔ تاریخ میں مذکور بہت سی جنگوں اور اذیتناک حوادث کا سہہ چہرہ قوموں کا یہی مشکل تعصب اور پرانے ادیان پر اڑنے رہنا ہے حالانکہ تکامل و ارتقاء کا قانون حتمی ہے کہ ادیان یکے بعد دیگرے آتے رہیں اور انسان کو خدا شناسی، حق و عدالت، ایمان، اخلاق، انسانیت اور فضیلت کی راہ میں آگے سے جاتے رہیں تاکہ وہ آخری دین تک پہنچ جائیں جو کہ خاتم الادیان ہے اور اس پہلے کی طرح یہ ذرستہ ملے کریں جو تعلیم و تربیت کے مدارج پائے بعد دیگرے ملے کر کے تاریخ انحصیل ہو جاتا ہے۔

دافعی ہے کہ اگر پائری پڑھنے والے پہلے پائری سکول سے ایسا لگاؤ اور تعصب پیدا کر لیں کہ ہائی اسکول میں جانے ہی سے انکار کر دیں تو اس کا نتیجہ قافلہ سرتی میں جمود اور پسماندگی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

زیر نظر آیت میں گذشتہ انبیاء اور ان کی امتوں سے مستحکم عہد و پیمان پر جو اصرار اور تاکید موجود ہے وہ گویا ایسے تعصبات، جمود اور ہمیشہ دہری سے اجتناب و احتراز ہی کے لیے تھا لیکن بہت افسوس کا مقام ہے کہ ان تمام تاکیدوں کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ پرانے ادیان کے پیروکار آسانی سے جدید حقائق کے سامنے سست تسلیم خم نہیں کرتے۔ اس سوال کے ضمن میں کہ دین اسلام کیوں اور کیسے خاتم مذاہب اور آخری دین ہے، سورہ احزاب کی آیہ ۵۶ کے

”لَقَدْ آتَيْنَاكَ كِتَابًا فِيهِ يُبَيِّنُ لَكَ مَا نُهُكَ عَنْهُ وَيُنْذِرُكَ لِلْعَذَابِ“ اور ”لَقَدْ آتَيْنَاكَ فِيهِ“ کو خبر سمجھ لی۔
 پہلے ”مَا“ کو شرط بنادینا اور ”لَقَدْ آتَيْنَاكَ فِيهِ“ کو اس کی جز سمجھ لی۔ یہی دوسرا اہم آیت کے معنی سے زیادہ قریب



ذیل میں انشاء اللہ تفصیل گفتگو کی جائے گی۔

۸۲۔ فَمَنْ تَوَلَّىٰ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ فَاتَكَلِّفْهُمْ

الْفِسْقُونَ ○

ترجمہ

۸۲۔ اس بناو پر جو شخص اس (ستمک پیمان) کے بعد منہ پھیرے وہ فاسقین میں سے ہوگا۔

تفسیر

اس آیت میں قرآن کہتا ہے: ان سب تاکیدوں، اصرار اور ستمک عہد و میثاق کے بعد بھی جو لوگ پیغمبر اسلامؐ جیسے نبی پر ایمان لانے سے روگردانی کریں جن کے ظہور کی نشانیں گذشتہ کتب میں آچکی ہیں تو وہ لوگ فاسق اور حکم خدا سے خارج ہیں۔

۸۳۔ أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ○

۸۴۔ قُلْ أَمَّا بِالنَّبِيِّ وَاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَا أُبْنِزَلْ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَالنَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ○

۸۵۔ وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ ۖ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخُسِرَانِ ۝

ترجمہ

۸۳۔ کیا وہ لوگ دین خدا کے علاوہ کوئی چیز چاہتے ہیں (اس کا دین تو اسلام ہے) اور تمام لوگ جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اختیار یا مجبوری سے اس کے احکم کے سامنے تسلیم ہیں اور وہ اُسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔

۸۴۔ کہہ دو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور (اس طرح) اُس پر (بھی ایمان لائے ہیں) جو ہم پر، ابراہیم پر، اسماعیل پر، اسحق پر، یعقوب پر اور اسباط پر نازل ہوا ہے اور اُس پر (بھی ایمان لائے ہیں) جو موسیٰ، عیسیٰ اور (دوسرے) پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا ہے ہم اُن کے درمیان فرق نہیں کرتے اور اُس کے (فرمان) کے سامنے تسلیم ہیں۔

۸۵۔ اور جو کوئی اسلام (اور حکم حق کے سامنے تسلیم ختم کرنے) کے علاوہ اپنے لیے کوئی دین انتخاب کرے تو وہ اُس سے قبول نہیں ہوگا اور آخرت میں وہ زیاں کاروں میں سے ہوگا۔

تفسیر

”أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْتَغُونَ“

گذشتہ آیات میں اب تک گذشتہ مذاہب کے بارے میں تفصیلی بحث ہوئی ہے اب یہاں سے اسلام کے بارے میں بحث شروع ہوتی ہے اور اہل کتب اور دیگر گذشتہ ادیان کے پیروکاروں کی توجہ اس کی طرف مبذول



کروائی گئی ہے۔

زیر نظر آیات میں سے پہلی میں قرآن کہتا ہے: کیا یہ لوگ خدا کے دین کے سوا کوئی اور چیز چاہتے ہیں، خدا کا دین تو قوانینِ الہی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے علاوہ کچھ اور نہیں اور یہ بات کامل اور جامع صورت میں پنبہِ اسلام کے دین میں موجود ہے لہذا وہ اگر دینِ حقیقی کی تلاش میں ہیں تو انہیں مسلمان ہو جانا چاہیے۔

اسلام تمام موجوداتِ عالم کا دین ہے

”وَلَا أَسْأَلُكُمْ فِي الشَّعْطِ وَالْأَنْزِيفِ“.....

قرآن نے ایک مرتبہ پھر اسلام کو ایک زیادہ وسیع معنی میں پیش کیا ہے۔ قرآن کہتا ہے: تمام آسمانوں اور زمین والے یا آسمان و زمین میں موجود تمام موجودات مسلمان ہیں اور وہ اس کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہوئے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ طوعاً و کرہاً (اختیار سے یا جبر سے) کی تعبیر کا مطلب ہے کہ پروردگار کے فرمان کے سامنے سر جھکانا کبھی اختیار ہی اور ”تشرعی قوانین“ کے ذریعے ہو سکتا ہے اور کبھی ”اجباری“ اور ”تکوینی قوانین“ کے ذریعے۔ اس کی وضاحت یوں ہے کہ عالم ہستی میں خدا کے احکام دو طرح کے ہیں۔ اس کے فرمان کا ایک سلسلہ طبعی قوانین اور با فرق طبعی کا ہے جو اس جہان کے مختلف موجودات پر حکومت کرتے ہیں اور وہ سب مجبور ہیں کہ ان کے سامنے گھٹے ٹیک دیں اور وہ لمحہ بھر کے لیے بھی ان قوانین سے مدگردانی نہیں کر سکتے اور اگر خلاف ورزی کریں تو ہو سکتا ہے کہ مجبور اور نابود ہو جائیں۔ یہ فرمانِ خدا کے سامنے اسلام و تسلیم کی ایک قسم ہے۔ سوج کی شعائیں و ریادوں پر پڑتی ہیں، پانی بھلائی بن کر اٹھتا ہے، بادل کے ٹکڑے ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں، بادشہ کے قطرے آسمان سے گرتے ہیں، درخت ان سے نشوونما پاتے ہیں اور ان سے پھل کھتے ہیں۔ یہ سب کے سب مسلمان ہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک آفرینش و خلقت کے معین کردہ قانون کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہوئے ہیں۔

فرمانِ خدا کی دوسری قسم کا نام حکم تشرعی ہے یعنی وہ قوانین جو آسمانی شریعتوں اور انبیاء کی تعلیمات میں موجود ہیں ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی وجہ سے ”مسلمان“ کہنے کے اہل ہیں۔ البتہ ان قوانین سے مدگردانی بھی تو انہیں ضرورت سے مدگردانی سے کم نہیں کیونکہ یہ بھی اسقاط اور پس ماندگی یا نابودی کا سبب ہے۔ مندرجہ بالا آیت میں لفظ ”أَسْأَلُكُمْ“ اسلام کے وسیع معنی میں ہے جس میں دونوں قسمیں شامل ہیں لہذا فرمایا گیا ہے کہ ایک گروہ اختیار ہی حالت میں سر تسلیم خم کرتا ہے یعنی ”طوعاً“ مثلاً مومنین اور دوسرا مجبر ہی کی حالت میں یعنی ”کراً“ مثلاً کافرن تکوینی قوانین کے لحاظ سے۔ اس بنا پر اگرچہ کفار کچھ احکامِ خدا کے سامنے اسلام قبول کرنے سے مدگردانی کرتے ہیں لیکن بعض احکام قبول کیے بغیر انہیں کوئی چارہ نہیں، اس لیے خدا کے تمام قوانین اور دینِ حق کے سامنے وہ بالکل سر تسلیم خم کیوں نہیں کرتے۔

مذکورہ آیت کو زیر نظر آیت میں ”طوعاً و کراً“ کے لفظِ فوری العقول کے بارے میں ہیں اور یہ بیان کا مفہوم منہ نصرت کی آیت (ایم آیت) والے ہی الفاظ سے نصرت ہے۔ وہاں اس کا معنی صرف فوری العقول سے ہے۔ اس کے بارے میں شیعہ آیت کے ذیل میں گفتگو کی جاتی ہے۔



اس آیت کی تفسیر میں ایک اور اہمکل بھی ہے جسے بہت سے مفسرین نے ذکر کیا ہے اور وہ مندرجہ بالا تفسیر کی نفی بھی نہیں کرتا۔ وہ یہ ہے کہ صاحبِ ایہان لوگ اطمینان کے عالم میں رضا اور رغبت اور اختیار کے ساتھ خدا کی طرف جاتے ہیں اور بے ایہان لوگ صرف مصیبت، ابتلا اور سخت مشکلات کے وقت اس کی طرف بھاگتے ہیں اور اسے پکارتے ہیں جبکہ عام حالات میں اس کے لیے شرکاء کے قائل ہوتے ہیں لیکن ان سخت اور حساس لحظات میں اس کے علاوہ کسی کو پہچانتے ہیں نہ پکارتے ہیں۔

”وَالَّذِينَ يَزُجُّوْنَ“

آیت کے گزشتہ حصے میں مبداء کی طرف متوجہ ہونے کے لیے گفتگو تھی، جو ایک فطری چیز ہے اور اب اس جگہ میں معاد کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو اپنے مقام پر فطری ہے کیونکہ تمام اقوام و ملل موت کو تسلیم کرتی ہیں۔ اصل توجہ غرضِ خلقت اور حکمت پروردگار کی طرف نظر رکھیں تو موت کا مطلب نابودی اور فنا ہرگز نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا مطلب ایک قسم کا تعامل و ارتقاء ہے اور یہ ایک زیادہ وسیع ماحول میں قدم رکھنے کا دوسرا نام ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ خدا کی طرف بازگشت ہے۔

”فَلْ اٰمَنَّا بِهٖ اَمَلًا وَمَا اَمَلْنَا“

اس آیت میں خدا تعالیٰ نے پیغمبر اور مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ جو کچھ پیغمبرِ اسلام پر نازل ہوا ہے اس پر ایہان لانے کے علاوہ ان تمام آیات اور تعلیمات پر بھی عقیدہ رکھو جو گزشتہ انبیاء پر نازل ہوئیں اور کہو کہ ہم ان میں حقانیت اور خدا سے ارتباط کے لحاظ سے کسی قسم کے فرق کے قائل نہیں ہیں۔ ہم سب کو حقیقی طور پر خدا کا نامزدہ سمجھتے ہیں، سب خدا کے پیغمبر ہونے پر آمین ہیں، سب مخلوق کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے ہیں اور ہم حکم خدا کے سامنے ہر لحاظ سے تسلیم ہیں۔ لہذا اس طرح سے ہم تفرقہ اندازی سے اپنا اندر کھینچے ہوئے ہیں۔

سورہ بقرہ کی آیت ۱۳۶ زیر نظر آیت سے پوری مشابہت رکھتی ہے، اس میں کافی وضاحت کی جا چکی ہے۔

”وَمَنْ يُّشْرِكْ غَيْرَ اِلٰهٍ سِوَايَ الَّذِي يَتَقَبَّلُ عِبَادَهُ“

لفظ ”يُّشْرِكْ“ ”اِتِّخَذَ“ کے بارے میں ہے اور اس کا معنی ہے کوشش اور جستجو کرنا، یہ شائستہ اور ناشائستہ ہر موقع کے لیے مستقل ہوتا ہے یہاں یہ لفظ بحث کو نتیجہ پر پہنچانے کے لیے استعمال ہوا ہے اور وہ ایک حقیقی دین اور آئین ”اسلام“ ہی ہے یعنی حکم خدا کے سامنے ترقی تسلیم۔ غم کرنا ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو نسل، زبان، قومی تعلیمات اور ایسی تمام چیزوں سے بالاتر ہے اور جو لوگ ایسی راقیعت کے علاوہ کسی چیز کو دین کے طور پر مان لیں وہ ہرگز قبل نہیں کی جانے کی جگہ اس کے بدلے انہیں سزا بھی دی جائے گی۔ ”وَمَنْ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْغٰثِرِيْنَ“۔ یعنی وہ آخرت میں زبیاں کاروں میں سے ہوگا، کیونکہ اس نے اپنے وجود کا سرمایہ غیر مناسب خرافات و تقلید، جاہلانہ تعلیمات اور نسل پرستی کے عوض بیچ دیا ہے۔ مسلم ہے کہ ایسے معاملے میں وہ نقصان و زبیاں ہی میں مبتلا ہوگا اور قیامت میں انسانی وجود کے مرہٹے کے نقصان کا نتیجہ



عزیموں اور سزا و عذاب کی صورت میں ظاہر ہوگا۔
انشاء اللہ سورۃ الحجرات کی آیت ۱۳ کے ذیل میں "اسلام" اور "ایمان" کے درمیان
فرق پر بحث کی جائے گی۔

- ۸۶۔ كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ
وَشَهِدُوا أَنَّكَ الرَّسُولُ حَقٌّ وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ
وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ○
- ۸۷۔ أُولَٰئِكَ حِزَابُهُمْ أَنَّكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ
وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ○
- ۸۸۔ خَالِدِينَ فِيهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَلَا
مُمْ يَنْظَرُونَ ○
- ۸۹۔ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَأَصْلَحُوا
فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ○

ترجمہ

۸۶۔ خدا ان لوگوں کو کیونکر ہدایت کرے جو ایمان لانے ، رسول کی حقانیت کی گواہی
دینے اور ان کے لیے واضح نشانیاں آجانے کے بعد کفر کریں اور خدا ظالموں
کو ہدایت نہیں کرتا۔

۸۷۔ ان کا بدلہ یہ ہے کہ ان پر اللہ ، ملائکہ اور سب لوگوں کی لعنت ہے۔

۸۸۔ وہ ہمیشہ اس لعنت (اور سچا کار) میں (مبتلا) رہیں گے ان کے عذاب میں تخفیف



نہیں ہوگی اور انہیں مہلت نہیں دی جائے گی۔

۸۹۔ مگر وہ لوگ کہ جو بعد ازاں توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کر لیں (اور گزشتہ گناہوں کی تلافی کریں تاکہ ان کی توبہ قبول ہو) کیونکہ خدا بخشنے والا اور رحیم ہے۔

شان نزول

۱۔ مدینہ کے مسلمانوں میں سے ایک انصاری عمارت بن سوید تھا۔ اُس کے اہل بیتوں ہند بن زیاد نامی ایک بے گناہ قتل ہو گیا۔ وہ سزا کے خوف سے مرتد ہو گیا اور مکہ کی طرف بھاگ گیا۔ مکہ میں پہنچا تو اپنے کام سے سخت پشیمان ہوا اور سوچنے لگا اب کیا کروں۔ اُس نے سوچ سوچ کر فیصلہ کیا کہ ایک آدمی کو مدینہ میں اپنے رشتہ داروں کے پاس بھیجوں تاکہ وہ پیغمبر اکرمؐ سے سوال کریں کہ کیا اُس کے لیے نوشتہ کا کوئی راستہ ہے یا نہیں۔ اِس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں جن میں چند خاص شرائط کے ساتھ اُس کی توبہ قبول ہونے کا ذکر ہے۔ عمارت بن سوید پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، دوبارہ اسلام لایا اور آخری عمر تک اسلام کا دفاعار رہا۔ اُس کے پیروکاروں میں سے گیارہ افراد بھی اسلام سے پھر گئے تھے وہ اپنی حالت پر باقی رہے۔

تفسیر درمنثور اور بعض دوسری تفاسیر میں زیر نظر آیات کی کچھ اور شان نزول نقل کی گئی ہیں جو مذکورہ شان نزول سے زیادہ فرق نہیں رکھتیں۔

تفسیر

”كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ وَشَهِدُوا أَنَّكَ
الرَّسُولَ حَقًّا وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ“

یہ آیات ان لوگوں کے بارے میں ہیں جنہوں نے اسلام قبول کر لیا ہے اور پھر اس سے پھر گئے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اصطلاح میں ”مُذَرَّبٌ“ کہتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے: ایسے لوگوں کی ہدایت کے لیے خدا مدد نہیں کرتا کیونکہ ان لوگوں نے واضح علامات کے ذریعے پیغمبر کو پہچان لیا ہے اور اس کی رسالت کی گواہی دی ہے۔ یہ لوگ اسلام سے عدول کر کے اور اس سے پھر کر ظلم اور ستمگریں گئے ہیں اور خدا عالموں اور ستمگروں کی ہرگز ہدایت نہیں کرتا اَللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ۔

”أَوَلَيْسَ بِعَرَاوُنِهِمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ
وَالنَّاسِ أجمعين“



اس آیت میں ایسے لوگوں کی سزا بیان کی گئی ہے جو پہچاننے کے بعد حق سے عدول کرتے ہیں اور وہ ہے پروردگار، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت۔

”لعنہ“ اصل میں دھتکارنے اور غیظ و غضب کے ساتھ دور کرنے کے معنی میں ہے۔ لہذا پروردگار کی لعنت کا مطلب اس کی رحمت سے دوری ہے۔ باقی رہا فرشتوں اور لوگوں کی لعنت تو وہ غفہ، تنفر اور معزٰی طر پر سے یا پروردگار کی رحمت سے دور ہونے کی بددعا ہے۔

ایسے لوگ درحقیقت فساد اور گناہ میں اس طرح سے ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں کہ تمام عقلمندوں اور سادہ جہان کے بامقصد افراد چاہے انسان ہوں یا فرشتے سب کے تنفر کا ہدف بن جاتے ہیں۔

”يُنْظَرُونَ فِيهَا لَا يُخْلَقُ لَهُمْ فِيهَا نَفْسٌ وَلَا عَمَلٌ يُفْعَلُ فِيهَا“

اس آیت میں مزید ارشاد ہوتا ہے کہ یہ لوگ صرف عمومی لعنت کا مرکز نہیں ہیں بلکہ ہمیشہ لعنت کا شکار رہیں گے۔ درحقیقت شیطان کی طرح ہیں جو ہمیشہ لعنت میں گرفتار رہتا ہے۔ ستم ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ دردناک اور ناقابل تحریف عذاب میں مبتلا ہوں گے اور انہیں کسی قسم کی بہت نہیں دی جائے گی۔

”إِنَّ الَّذِينَ شَاءُوا هَذَا يُفْعَلُ بِهِمْ وَلَا يَجِدُونَ لَهُمْ جِثَةً“

یہ آیت مندرجہ بالا احکام میں استثنائی صورت بیان کرتی ہے۔ اس آیت نے ایسے افراد کے لوٹ آنے کی راہ کھول دی ہے لیکن بہت سی دیگر آیات قرآن کی طرح مستند توبہ کی طرف اشارہ کرنے کے بعد گزشتہ غلط کاریوں کی تلافی کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ ”وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ“ کے ذریعے یہ حقیقت بھیائی گئی ہے کہ توبہ صرف گزشتہ گناہ پر پیشانی اور آئندہ اپنے نیک اعمال کے ذریعے گزشتہ برے اعمال کی تلافی کی جائے۔ اسی لیے بعض آیات میں توبہ کے بعد ایمان اور عمل صالح کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ مثلاً:

”لَا يَسْمُنْ كُفْرًا وَلَا يُنْجِيهِمْ كُفْرًا“

مگر وہ شخص جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور عمل صالح انجام دے۔ وہ اس کی توبہ کامل و مکمل نہیں ہے۔

ایسے ہی افراد بخشش اور رحمت خدا کے حق دار ہوں گے ”فَيَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَبِّرُوا لِحُكْمِ رَبِّكُمْ“

کیا مرتد کی توبہ قبول ہو جاتی ہے

مندرجہ بالا آیت اور شان نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اسلام قبول کر کے اس سے پلٹ جائیں دو قسم کے ہیں :



ترجمہ

۹۰۔ جو لوگ ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے ہیں اور پھر اپنے کفر میں بڑھ گئے ہیں اور اس راہ میں اصرار کرتے ہیں، تو ان کی توبہ کبھی بھی (جو مجبوری کی بناء پر ہو یا مرتے وقت کی جائے) قبول نہیں ہوگی اور وہ (واقعاً) گمراہ ہیں اور وہ خدا کی راہ بھی کھو چکے ہیں اور توبہ کی بھی۔

شان نزول

جیسا کہ سابقہ آیات کی شان نزول میں اشارہ ہوا ہے، حادث بن سوید اور اس کے گیارہ ساتھی بوجہ اسلام سے ہٹ گئے تھے۔ حادث تو پیشین ہوا اور توبہ کر کے پیغمبر اسلام کی خدمت میں واپس آگیا لیکن دوسرے افراد اس کے ساتھ لوٹ کر نہ آئے اور اس کی دعوت کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ہم مکہ میں رہیں گے اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خلاف کام کرتے رہیں گے اور ہمیں امید ہے کہ انہیں شکست ہوگی، اگر ہمارا مقصد پورا ہو گیا تو کیا ہی اچھا ہے۔ ورنہ توبہ کا راستہ تو کھلا ہی ہے، جب چاہیں گے توبہ کریں گے اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف پلٹ آئیں گے اور وہ بھی ہماری توبہ قبول کریں گے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کی ایک اور شان نزول نقل کی ہے۔ اس کے مطابق مذکورہ آیت اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو پیغمبر اسلام کے ظہور سے قبل لوگوں کو آپ کے ظہور کی بشارت دیتے تھے اور آپؐ نے ایمان اور خدا داری کا اظہار کرتے تھے لیکن بعثت کے بعد نہ صرف یہ کہ وہ کافر ہو گئے بلکہ آپؐ کے مقابلے پر اٹھ رہے تھے۔

تفسیر
بے فائدہ توبہ

”إِنَّ الدِّينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِتْمَانِهِمْ ثُمَّ أَتَوُاكَ كَافِرًا“
”لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ“

گذشتہ آیات میں ان لوگوں کے بارے میں گفتگو تھی جو واقعاً اپنے انحرافی راستے اور کج روی پر پیشین ہو گئے تھے اور انہوں نے حقیقتاً توبہ کر لی تھی لیکن اس آیت میں ایسے اشخاص کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے جن کی توبہ قبول نہیں ہوگی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو پیچھے سرحد پر ایمان لائے، پھر کافر ہو گئے اور اپنے کفر پر ڈٹ گئے اور اس پر مصر ہیں اس لیے کسی وقت بھی احکام حق کی پیروی کے لیے توبہ نہیں کریں گے۔



معاذ ان کے لیے مشکل ہو جاتے اور اطاعت و تسلیم کے علاوہ انہیں کوئی راستہ نظر نہ آئے۔ خدا ایسے افراد کی توبہ قبول نہیں کرے گا کیونکہ وہ اختیار ہی طور پر راہ حق پر قدم نہیں رکھتے بلکہ جب وہ اہل حق کا غلبہ دیکھتے ہیں تو ظاہراً پشیمان ہو کر توبہ کا اظہار کرتے ہیں اس بناءً ان کو توبہ ظاہری ہے جو قبول نہیں ہوگی۔

آیت کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی ہے اور وہ یہ کہ ایسے افراد جب اپنے آپ کو موت کی چوکھٹ پر دیکھتے ہیں اور عمر کے آخری ایام میں ہوتے ہیں تو جو سکتا ہے کہ پشیمان ہوں اور واقعاً توبہ کر لیں لیکن پھر بھی ان کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی کیونکہ جیسا کہ ہم بعد میں بتائیں گے ایسے اوقات میں توبہ کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ مندرجہ بالا آیت سے یہ مراد ہو کہ کفر کی حالت میں عام گناہوں سے توبہ کرنا قابل قبول نہیں ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص راہ کفر پر اصرار کرتا ہے لیکن ظلم اور غیبت وغیرہ جیسے گناہوں سے توبہ کرتا ہے تو اس کی توبہ کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ گہری اور شدید آلودگیوں کے ہوتے ہوئے سطحی آلودگیوں کو دھو ڈالنا موثر نہیں ہے۔ یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ مندرجہ بالا تفسیر ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں اور ممکن ہے کہ آیت کی نظر ان سب پر ہو۔ اگرچہ پہلا احتمال گذشتہ آیات اور شان نزول کے حوالے سے زیادہ سازگار ہے۔

”وَأُولَٰئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ“

وہ حقیقی گمراہ ہیں کیونکہ وہ راہ خدا اور راہ ایمان کی طرح توبہ کا راستہ بھی کھو چکے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ حقیقی آمارگی، اخلاص اور برحق قلب و روت کی پاکیزگی کے بغیر توبہ کی حقیقت تک پہنچ سکتے ہیں۔ حالانکہ معاملہ اس طرح نہیں ہے۔

۹۱۔ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارًا فَلَن يُمْضَلَ مِنْ أَحَدِهِمْ مِمَّا الْأَرْضُ حَبَا
وَلَوْ اقْتَدَىٰ بِهِ ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ
أَلِيمٌ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَّاصِرِينَ ۝

ترجمہ

۹۱۔ جو لوگ کافر ہو گئے ہیں اور حالت کفر میں مر گئے ہیں زمین اگر سونے سے پُر ہو اور وہ

اسے (اپنے گناہوں کے کفارے کے طور پر) فدیہ کر دیں تو بھی ان سے یہ ہرگز قبول نہیں

کیا جائے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے اور ان کا کوئی یا اور مددگار نہیں۔



تفسیر فضول کفارہ

”إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَغْفِرَ
مِنْ أَعْدِهِمْ قُلْ الْآخِرُ خَيْرٌ مِنَ الْأَوَّلِ“

یہ آیت ایسے افراد کے بارے میں ہے جنہوں نے حالت کفر میں زندگی گزاری ہے اور اسی حالت میں دنیا سے چلے گئے ہیں۔ قرآن کہتا ہے: جو لوگ راہ حق واضح ہو جانے کے باوجود طغیان و سرکش کار راستہ اختیار کیے رہے ہیں اور حقیقتاً سر تسلیم خم نہیں کرتے ان کی بخششیں اور عطیات قابل قبول نہیں ہوں گے اور ان کے لیے راہ نجات نہیں ہے اگرچہ وہ تمام زمین کو سونے سے پر کر کے راہ خدا میں خرچ کر دیں۔ واضح ہے کہ اتنا ذخیرہ سونا خرچ کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان کی بخشش کتنی بھی زیادہ کیوں نہ ہو قلب و روح کی آلودگی اور حق سے دشمنی کے ہوتے ہوئے ان کے لیے موثر نہیں ہے ورنہ واضح ہے کہ اگر ساری زمین سونے سے پر ہو جائے تو سونے کی قدر و قیمت مٹی کے برابر ہو جائے گی اس بناء پر مندرجہ بالا جملہ اس معاملے کی اہمیت ثابت کرنے کے لیے ہے۔

اس بارے میں کہ اس انفاق اور خرچ کرنے سے مراد اس جہاں میں انفاق کرنا ہے یا دوسرے جہاں میں۔ تو اکثر مفسرین نے دونوں احتمالات ذکر کیے ہیں لیکن آیت کا ظہور دوسرے جہاں سے ربط رکھتا ہے یعنی حالت کفر میں مرجانے کے بعد اگر فرض کریں کہ زمین کی بہت بڑی دولت و ثروت ان کے اختیار میں ہو اور وہ خیال کریں کہ اس جہاں کی طرح اس سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو سزا سے بچالیں گے تو یہ ان کا بہت بڑا اشتباہ ہوگا اور یہ مالی جہانہ اور فانیہ ان کی نلکی کیفیت پر کسی قسم کا کوئی اثر نہیں ڈال سکے گا۔

”أَوَلَيْسَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ“

ان کے لیے دردناک عذاب یقینی ہے اور اس عظیم سزا سے بچانے کے لیے انہیں کوئی حامی و مددگار نہیں مل سکے گا اور شفاعت کرنے والوں کی شفاعت بھی انہیں سیر نہ ہوگی۔

قرآن مجید کے تیسرے پارے کی تفسیر یہاں پر ختم ہوتی ہے

اشاریه

تفسیر نمونه جلد دوم

ترتیب و تدوین :
رشد شکیل حسین موسوی
فهرست

۳۰۹	۱- اصول و عقائد
۴۱۰	۲- احکام
۴۱۱	۳- اخلاقیات
۴۱۲	۴- اقوام و مذاهب
۴۱۲	۵- شخصیات
۴۱۴	۶- علماء
۴۱۵	۷- کتب آسمانی
۴۱۶	۸- کتب تاریخ و تفسیر و غیره
۴۱۷	۹- لغات قرآن
۴۲۱	۱۰- متفرق موضوعات
۴۲۲	۱۱- مقامات

اصول و عقائد

توحید

حق و مستیوم

خدا کی ملکیت مطلقہ

عرش و کرسی سے کیا مراد ہے

اللہ مومنوں کا دل ہے

جو کچھ آسمان و زمین میں ہے وہ اللہ کا ہے

اللہ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری

نہیں دیتا

خطا کے بدلے سزا

مکروں کے لیے خدا کا عذاب

زمین و آسمان کی کوئی بھی شے خدا سے مخفی نہیں ہے

وہ ماؤں کے رحم میں جیسی چاہتا ہے صورت بناتا ہے

وہ خدا وہ ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی فیروز

جو لوگ کافر ہو گئے انہیں مال و دولت اور اولاد خدا

سے بے نیاز نہیں کر سکتے

امور باوی کو کس نے زینت دی

خدا کی اپنی یکسانی پر شہادت سے کیا مراد ہے

لا الہ الا اللہ کی تکرار

تو حکومتوں کا مالک، تمام خوبیاں تیرے ہاتھ میں تو

ہر چیز پر قادر

راست کو دن میں، دن کو راست میں داخل کرتا ہے۔ مژدہ

سے زندہ، زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے

آؤ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس

کا شریک نہ بنائیں

علم خدا

اول و آخر کا علم خدا کو ہے

وسعت علم کا ملاقہ

اپنے دلوں کے بھید چھپاؤ یا ظاہر کرو۔ خدا جانتا ہے

رجعت

رجعت کی طرف اشارہ

عدل

قیام بالقسط کیا چیز ہے

نبوت

خدا نے لوگوں کو ڈرانے اور بشارت دینے کیلئے انبیاء

کو کتاب دے کر بھیجا

بعض رسولوں کی بعض پر فضیلت

اگر تم سے جھگڑا کریں تو کہہ دو کہ میں اور میرے پروردگار خدا

کے سامنے تسلیم ہیں

اہل عدل انبیاء کے ساتھ ساتھ

خدا اسے کتاب و نبوت دے، جو کتاب پھرے کہ میری

عبادت کرو

امامت

مباہلہ کیا ہے؟ دعوت مباہلہ غلبہ اہل بیت کی

ایک زندہ سند

مباہلہ کا ایک طریق کار (بقول امام صادق)

دُعا

اے اللہ! دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی صلا کر (نیکی کر)

لاسخون فی علم کی دعا

کیا دعا کسب و اکتساب ہے

معاد

اہل ایمان قیامت میں ان (کافروں) سے بالاتر ہوں گے

معاد کے ثبوت میں ایک سستی کی مثال، مردہ گدھے کا زندہ ہونا

حضرت ابراہیمؑ کے ذبح کیے ہوئے چاروں پرندوں کا زندہ ہونا اور واپس آنا

معاد جسمانی عیا جنت میں مادی لذتیں بھی ہیں

قیامت کے دن نیک و بد اعمال کو موجود پاؤ گے

تجسم اور حضور اعمال قرآن کی نظر میں جزاء اور سزا کے بارے میں علماء کے نظریات

تجسم اعمال آج کے علم کی روشنی میں کافروں کو عذاب اور صاحبان ایمان کو جزا دینا

شفاعت کوئی شخص بھی اذن خدا کے بغیر اس کی بارگاہ میں شفاعت سفارش نہیں کر سکتا

شفاعت کوئی پارٹی بازی نہیں ہے جبر و اکراہ

دین قبول کرنے میں کوئی جبر و اکراہ نہیں مذہب جبری نہیں ہو سکتا

غیر مسلم خنزیر پر اس لیے خرچ نہ کرنے کی ممانعت کہ وہ فحش و فساد سے تنگ آکر ایمان قبول کر لیں

بیرد اکراہ کی نفی معجزہ

حضرت عزیرؑ اور ان کے گدھے کا دوبارہ زندہ ہونا

ذبح کیے ہوئے پرندوں کا زندہ ہو کر حضرت ابراہیمؑ کے پاس آنا

معجزات جناب عیسیٰ

احکام

نماز

اپنی تمام نمازوں خصوصاً نمازِ وسطیٰ کی ادائیگی میں کوتاہی نہ ہو

صلوۃ وسطیٰ کون سی نماز ہے قنوت کے دو معنی (دیکھیے لغات قرآن)

جہاد جنگ کیوں اور کس سے

فتنہ قتل سے بدتر ہے

ابتدائی جہاد۔ دفاعی جہاد شرک و بت پرستی کے خلاف جہاد۔ مدینہ میں جہاد کا حکم۔ فتنہ کا قرآنی مفہوم

اللہ کی راہ میں (جنگ کھیلنے) خرچ کرو

خرچ کرنا معاشرے کو ہلاکت سے بچاتا ہے

راہِ خدا میں جنگ کرنا تم پر فرض کیا جا چکا ہے

ماہِ حرام میں جنگ کرنا گناہ ہے

عبداللہ ابن جحش کا سر (دیکھیے شخصیات)

راہِ خدا میں جنگ کرو۔ اللہ کی عظیم ہے اسلام میں فوجی طاقت کے استعمال کے مواقع

جنگ بدر کے حالات حج

مطالعت حج

عمرہ اور حج کے اعمال، بیعت پر احرام باندھنا



۱۰۶	ایک اور ذخیرہ ٹوٹ گئی (دیکھیے عورت اور اسلام)	۳۸، ۳۹	حج معین مہینوں میں ہے
۱۱۶	مباشرت سے قبل طلاق - شافعیہ ہدیہ دے کر طہیدگی	۳۸	حج کے لیے مادی و معنوی زاوہ راہ
	اگر مہر معین ہو چکا ہو تو ایسی طلاق کے وقت نصف	۳۰، ۳۹	حج ایک اقتصادی کارکردگی
۱۱۷	مہر ادا کرو	۴۱	وفات کی وجہ تمیہ، حمدہ اور مناسب نام
۱۱۸	نکاح کی گرہ جس کے ہاتھ میں ہے - سے کون مراد ہیں	۴۲	مشعر الحرام
	حق مہر معین نہ ہو، رخصتی نہ ہوتی ہو تو طلاق کے بعد عورت	۴۳	مناسک حج کی ادائیگی کے بعد اشد کو یاد کرو
۱۲۳	کو ہدیہ دیا جانا چاہیئے	۴۴	اسے اشد دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی حکم کر دیکھئے
	عدت	۴۶	ایام تشریق
۹۳، ۹۴	صلح اور بازگشت و حفاظت نسل کا ذریعہ		رضاعت
	بیوہ کی عدت شوہر کی وفات کا علم ہونے کے بعد	۱۰۹	بچوں کو دودھ پلانے کے سات احکام
۱۱۲	چار ماہ دس دن		طلاق
۱۱۳	کیا دوران عدت خواستگاری کی جاسکتی ہے		عورتوں سے جنسی ملاپ نہ کرنے کی قسم، چار ماہ کے
	بیوہ عورت کا حق ہے کہ مرد کے وارث ایک سال	۸۸	اندر رجوع یا پھر طلاق
۱۲۲	نیک اس کے مصارف ادا کریں	۸۹	زمانہ جاہلیت کے ایک طرز عمل کا خاتمہ
۱۲۳	یہاں یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے	۹۰	حکم اسلام احمدیہ نے مغرب کا ایک تقابل
	قسم	۹۱	قرآن سے کیا مراد ہے (دیکھیے لغات قرآن)
۸۶	اشد کی قسم نہ کھایا کرو	۹۹، ۱۰۰	رجعی طلاق صرف دو مرتبہ ہے
۸۸، ۸۹	لفظ اور قابل اعتبار قسمیں		اہل سنت کے مفتی اعظم نے شیعہ نظریہ طلاق
	نکاح	۱۰۰	قبول کر لیا
	مومن و مومنہ کو مشرک و مشرکہ سے ازدواج نہ کرو اگرچہ		تیسری طلاق کے بعد عورت حلال نہ ہوگی یہاں تک
	وہ تمہیں پہلے معلوم ہوں - وہ تمہیں آگ کی طرف دعوت	۱۰۲، ۱۰۱	کہ مرد غیر سے نکاح کرے - پھر طلاق لے
۷۸	دیتے ہیں	۱۰۳، ۱۰۲	معتل بے راہ روی روکنے کا ایک عامل
۷۹	بشرکین کون ہیں (دیکھیے مترقات)		خدا کی لعنت ہر معتل پر اور اُس پر جس کے لیے یہ عمل
	اخلاقیات	۱۰۳	بنا ہے (النارح)
	اخلاق حسنہ		طلاق کے بعد عدت کے آخری دن تک - پھر غلوں
۴۹	نفس کو رمانا خدا کے بدلے بیچنا	۱۰۵، ۱۰۴	رجوع یا پھر امن طہیدگی، غلم کے خیال سے رجوع نہ کرو
		۱۰۵	خدا کے قوانین کا مذاق نہ اڑاؤ

شخصیات

۵۲	ایمان صلح و آشتی کی بنیاد ہے
۱۵۰	انفاق فی سبیل اللہ
۳۰۱	کردار و روح انسانی میں شکات پیدا کرتے ہیں جو ضمیر و ذات کا جز بن جاتے ہیں
۴۸۰ ۴۸۱	اخلاق سینہ
۵۲	افس بن شریقی کی بد خلقی اور فساد
۵۲	انحراف حق عداوت و انفاق کی بنیاد ہے
۱۹۶	حضرت ابراہیم کا بد مقابل کون تھا
۱۹۶	ابراہیم کا چار پرندوں کو ذبح کرنا۔ ان کا زندہ ہو کر واپس آنا (دیکھیے مجلہ دراصل)
۳۰۸	آل ابراہیم اور آل عمران کے مضمون کی حدود (دیکھیے عمران)
۳۹۸ ۳۹۹	حضرت ابراہیم بیہودہ تھے نہ نصرانی وہ تو عنیت و مسلم تھے
۳۹۸ ۳۹۹	حضرت ابراہیم کس طرح مسلمان تھے۔ مکتب ہدایت
۳۹۸ ۳۹۹	کارشتہ
۲۸۳	ابن صوریہ
۲۸۳	یہود کا ایک عالم جس نے توراہ کا غلط حکم بیان کیا
۲۸۳	البوراق
۲۸۳	ایک یہودی عالم جس نے دوسرے یہودی عالموں کے ساتھ مل کر توراہ میں تحریف کی
۲۸۳	بخاری و ترمذی کے ساتھ مل کر حضور کی خدمت میں آیا
۲۸۳	افس بن شریقی
۲۸۳	ایک منافق اور اس کا قصہ
۲۸۳	اشعث بن قیس
۲۸۳	حلو سے سے بھرا بنو ابرتن جناب امیر کی خدمت میں
۲۸۳	بطور رشوت لایا
۲۸۳	کسی شخص کی زمین پر قبضہ کیا

اقوام گزشتہ

۵۵	بنی اسرائیل
۳۹۸ ۳۹۹	بنی اسرائیل نے خدا کی دی ہوئی مادی و معنوی نعمتوں کو ضائع کر دیا
۳۹۸ ۳۹۹	بنی اسرائیل طاقت کی سرداری میں
۳۹۸ ۳۹۹	ایک طہرت خیز واقعہ
۳۹۸ ۳۹۹	یہود میں سے ایک عورت و مرد کا ارتکاب زنا
۳۹۸ ۳۹۹	اور اس کی سزا
۳۹۸ ۳۹۹	علماء یہود کا احکام خدا کو چھپانا اور منکر کرنا
۳۹۸ ۳۹۹	دو سوال اور ان کا جواب
۳۹۸ ۳۹۹	کیا یہود و مسیح کا دین باقی رہے گا
۳۹۸ ۳۹۹	دو یہودیوں کی امانت و خیانت کا قصہ
۳۹۸ ۳۹۹	ایک اشکال اور اس کی وضاحت
۳۹۸ ۳۹۹	علماء یہود کا توراہ میں تحریف کرنا۔ اُس پر قسم کھانا (دیکھیے توراہ)
۳۹۸ ۳۹۹	کتاب خدا کی تلاوت کے وقت زبان کو پھیرنا۔ خدا پر
۳۹۸ ۳۹۹	مہوت ہاندھنا (دیکھیے توراہ)
۳۹۸ ۳۹۹	آل فرعون
۳۹۸ ۳۹۹	کد آس آل فرعون



۸۶	عبد اللہ بن رواحہ	۳۱۰	اشیاع زوجہ جناب زکریا
	میشی اور داماد کے تنازعہ میں صلح نہ کرانے کی قسم کھانا		حضرت مریم کی خالہ کا تعارف
۳۷۸	عبد اللہ بن سلام		حارث بن سوید انصاری
	ایک امانت دار یہودی		مسلمان سے مرتد ہوا پھر تائب ہو کر مسلمان ہوا اور
	عزیز	۲۹۹	مسلمان ہی مرا
۱۷ تا ۱۷۰	حضرت عزیر کا قہقہہ	۳۰۰	کیا مرتد کی توبہ قبول ہو جاتی ہے
	علی ابن ابی طالب	۳۰۱	مرتد غنی و مرتد فطری کا تعارف
۵۱، ۵۰	شب ہجرت بستر رسول پر		حز قیل
	معاویہ نے سرہ بن جندب کو چار لاکھ درہم دے کر آیت	۱۲۶	جناب موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کے قیسے رہنا
۵۱	کو این طہ کی فضیلت میں بیان کرایا۔ مگر کامیابی نہ ہوئی		حسنہ زوجہ عمران
	عمران	۳۱۰ تا ۳۱۲	ولادت جناب مریم کی تفصیلات
۳۰۸	عمران کون تھے		حسنی بن اخطب
۳۰۸	آل عمران اور آل ابراہیم کے مخموم کی حدود (دیکھئے ابراہیم)	۳۰۳	مشہور یہودی عالم
	عمر و بن جموح		داؤد
	پڑھا دولت مند۔ حضور پاک سے دریافت کیا کہ صدقہ	۱۳۳، ۱۳۷	جناب داؤد کے ہاتھ سے ظالم طاقت کا قتل
۶۲	کس کو دوں		زکریا
	عیسیٰ		دعا اسے رب بچے اپنے لطف خاص سے ایک
۳۲۷، ۳۲۸	حضرت عیسیٰ کو کھڑا اور سیح کیوں کہتے ہیں	۳۱۷	فرزند عطا کر
۳۲۹، ۳۲۶	حضرت عیسیٰ کی ولادت کا قہقہہ		بشارت جناب یحییٰ۔ جناب زکریا کا استعجاب اور
	حقاب و حکمت توارۃ و انجیل کا عالم۔ بنی اسرائیل	۳۲۱	جناب یحییٰ کی ولادت
۳۳۱، ۳۳۰	کار رسول		طاہر
۳۳۲	کیا معجزات عیسیٰ باعث تعجب ہیں	۱۳۳	طاہر کون تھے
	نیں تصدیق کرتا ہوں اور گواہی دیتا ہوں جو کچھ توارۃ میں	۱۳۶	طاہر نے ہاگ ڈور منہمال ل
۳۳۵، ۳۳۴	ہے۔ خدا کی عبادت کرو	۱۳۸	قیادت کی شرط
۳۳۹، ۳۳۶	حواری کون تھے۔ حواری قرآن و انجیل کی نظر میں	۱۴۱	باہمت قلیل مومنوں کی کثیر فوج پر کامیابی
۳۴۲، ۳۴۱	جناب عیسیٰ کی موت کے بارے میں بحث		عبد اللہ بن جحش
۳۴۷، ۳۴۶	اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم عیسیٰ ہے	۶۵	عبد اللہ بن جحش کا سریر



حضرت عیسیٰ کی حقیقی سرگزشت - اور قصص کے

معنی (دیکھیے لغات قرآن)

فخا ص بن عازورا

ایک فائن یہودی

کعب بن اشرف

ایک یہودی عالم اور سردار

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

توریت کی بشارت کے مطابق نبی اُمتی بھی مغلوب نہ ہو

کا (یہودی ملّا) پھر انکار نبوت

خندق کھودنے کے دوران سخت پتھر پر کدال مارنے

سے تین بار شعلہ بلند ہونا۔ حیرہ و مدائن۔ روم و شام جیٹا

اور یمن کی فتح کی بشارت

یہودی رسولی باعث محبت خدا ہے

خدا سے حقیقی محبت

دعوت مہاجد ہفت اہل بیت کی ایک زندہ سند

(دیکھیے امانت) ۳۵۹ تا ۳۴۸

اسے اہل کتاب ایسی بات کی طرف آذ جو ہم اور تم

میں مشترک ہے۔ خدا کے یگانہ کی عبادت کریں ۳۵۰ تا ۳۹۰

دنیا کے بادشاہوں کے نام آپ کے خطوط ۳۹۰ تا ۳۹۹

یہود و نصاریٰ کا حضور پاک۔ آپ کے اصحاب و آپ

کے دین سے برتاؤ ۳۴۱ تا ۳۴۴

نبی آخر کے بارے میں مقدس حمد و چمان ۳۹۱ تا ۳۹۳

مرشد

مرشد کی ملاقات عناق (خوبصورت مشرک) سے یہودی

مگونکاح سے باز رہا

مریم

ولادت جناب مریم

۳۱۰ تا ۳۱۷

اللہ نے جناب مریم کو قبول کر لیا۔ مریم جناب ذکر یا

کی کفالت میں

۳۱۳

فرشتوں نے جناب مریم کو امیٹھے و طہارت کی بشارت

دی۔ اسے مریم اپنے رب کے سامنے خضوع کر دو۔ اور

۳۲۳ تا ۳۲۳

دکوح کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو

جناب مریم کی کفالت کے لیے مسترد اندازی

۳۲۴ تا ۳۲۵

(دیکھیے قرعہ اندازی در متفرقات)

جناب عیسیٰ کی ولادت کا قصہ۔ سوال و جواب۔

۳۲۶ تا ۳۲۹

اوصاف مولود (دیکھیے جناب عیسیٰ)

مفقوش

۳۴۱ تا ۳۴۲

ہرقل شاہ روم کی طرف مصر کا والی و حاکم

نوح

اللہ نے آدم۔ نوح۔ آل ابراہیم و آل عمران کو سب

۳۰۶

جہانوں پر منتخب کر لیا (دیکھیے آدم و ابراہیم عمران)

ہرقل

۳۴۳ تا ۳۴۹

قیصر روم

یحییٰ

یحییٰ کے معانی و دیگر تعارف نیز جناب عیسیٰ سے

۳۱۸ تا ۳۱۹

مباحث

علماء

۳۵۱

آلوسی

۵۰

ابن ابی الحدید

۳۵۱

ابن اسیر

۳۵۱، ۵۰

ابن جریر طبری

۳۵۱، ۵۰

ابن صباغ مائلی

۲۸۳

ابن صوری

۲۱۹	ہشام بن سالم	۵۰	ابن عباس
۲۲۶	یا قوت حموی	۵۰	ابو جعفر اسکانی
	کتب آسمانی	۳۵۱	ابو نعیم اصفہانی
	انجیل	۶۷	ابو ہاشم معتزل
۲۲۲	انجیل کیا ہے (دیکھیے لغات قرآن)	۳۵۱	احمد بن محمد معتلانی
۲۲۴، ۲۲۳	سنی، مرقش، لوقا، یوحنا کی انجیل و متفرق	۳۵۱	احمد بن حنبل
	تورات	۵۰	امام احمد
۲۲۲	تورات کیا ہے (دیکھیے لغات قرآن)	۲۹	ثعلبی
۲۸۳	علاء یہود کا تورات میں تحریرت کرنا۔ اُس پر قسم کھانا	۶۷	خواجہ نصیر الدین طوسی
	کتاب خدا کی تلاوت کے وقت زبان کو پھیرنا، خدا پر	۳۵۱	حاکم صاحب مستدرک
۳۸۵	صوٹ باندھنا	۲۲۸	ڈاکٹر رشاد خلیفہ
	قرآن	۹۷	رافعہ (مصنف مفردات)
۲۲۷	۱۔ ا۔ م۔ پھیونر کے ذریعہ حروف مقطعات کی تفسیر	۳۵۱	زعمشری
۲۲۱	قرآن مجید میں عدم تحریرت کا ثبوت	۲۵۱، ۵۰	سبط ابن جوزی
۲۵۱، ۲۵۰	حکم و متشابہ آیات سے کیا مراد	۲۸۱، ۱۲۸	شیخ صدوق
۲۵۳، ۲۵۲	کچھ آیات متشابہ کیوں ہیں	۲۹۰	شیخ مفید
۲۵۳	تاول کے کہتے ہیں (دیکھیے لغات قرآن)	۲۸۷	طبری
۲۵۷، ۲۵۵	راسخون فی العلم کون ہیں (دیکھیے لغات متفرقات)	۳۵۱	طنطاوی
۲۵۸، ۲۵۷	حکم و متشابہات کا نتیجہ کلام	۲۱۶	علی بن ابراہیم
	قرآن اور سائنس	۵۰	غسزال
۷۰، ۶۹	میڈیکل سائنس کے اعتبار سے فکر کے نقصانات	۲۹۳، ۳۵۱	غزالدین رازی
۷۲، ۷۱	قمار بازی ہیجان کا سب سے بڑا عامل	۲۲۱	فرید وحیدی
۸۲، ۸۱	عالمیت حیض میں مباشرت کے نقصانات	۳۵۱	قاضی بیضاوی
۲۴۰، ۲۳۷	حروف مقطعات کی تحقیق بذریعہ کمپیوٹر	۳۵۱	قسططبی
۲۳۷	جنین کے مراحل تخلیق کا شاہکار	۳۵۰	مسلم بن حجاج نیشاپوری
۲۹۰	راست کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرنا	۳۵۱	نور اللہ سوشتری
			وامدی نیشاپوری



انسانی کردار کی اینفرادوٹ دُور بین کے ذریعہ تصویر کشی ۳۰۲، ۳۰۳

کتب تاریخ و تفسیر وغیرہ

آفرین فریضہ ہائے تکامل

آئین ما

احقاق الحق

احیاء العلوم ج ۲

ارشاد

اسلام و محتاند بشری

اسباب النزول

الاصابہ

المجامع الاحکام القرآن

الغدیہ ج ۲

الصفت المشر

المشار

المیزان ج ۲

امالی

بحار ج ۵ جدید

برهان (تفسیر)

تاریخ طبری ج ۲

تاریخ یعقوبی ج ۲

تجربہ العقائد

مذکرۃ الخواص

تفسیر الجاہر

تفسیر درمنثور

تفسیر طبری

تفسیر لمی

تفسیر قاضی بیضاوی

تفسیر کبیر

تفسیر کشاف

جامع الاصول

حقوق زن در اسلام و اروپا

خصال

دلائل النبوة

ربا خوردی یا استعمار اقتصادی

روح المعانی

سفینۃ البحار

سیرت ابن ہشام ج ۱

سیرت ابن ہشام ج ۲

سیرت طبری ج ۱

شبہات حل الاسلام

شرح نیج البلاغہ ج ۳

مسیح سلم

عیاشی (تفسیر)

فضول المہمہ

قصص القرآن

کافی

کنز العرفان

مجمع البیان ۳۴، ۳۵، ۴۹، ۱۳۶، ۲۴۵، ۲۸۲، ۳۱۴

۳۹۰، ۳۹۰

مسند احمد قبل ج ۱

مستدرک

مشکوٰۃ انوار

بحر البندان

۲۵۱

۲۹۲، ۳۵۱

۲۵۱

۲۵۱

۹۵

۳۰۵

۲۵۱

۲۱۹

۲۵۱

۳۸۲

۴۲

۶۵، ۵۰

۵۰

۲۴

۵۰

۱۰۰

۲۵۲

۵۰

۱۳۴

۳۰۵

۱۰۰

۳۱۴

۳۹۰

۱۰۰، ۵۰

۲۵۱

۳۸۳

۲۳۶

۱۳۵

۲۹۶

۳۵۰

۵۰

۲۹۰

۱۱۲

۲۵۱

۲۵۱

۲۵۱

۵۰

۲۲۱

۱۱۳، ۱۰۲، ۱۰۰

۲۹۰، ۲۳۴

۳۸۱

۳۵۲، ۳۳۱، ۳۲۳، ۳۰۰، ۶۴

۲۵۲

۴

۵۰

۶۴

۲۵۱، ۵۰

۲۵۱

۱۳۴، ۴۳

۲۵۱

۴۶



۲۷۹	آجی - جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو	۹۷	مفردات و اقرب
	انہات - اُنھا، نشوونما، پرورش، معنوی، روحانی	۳۶۶	مکاتیب الرسول ج ۱
۳۱۳	اور اخلاقی تکامل	۵۰	نرمیت الجاس ج ۲
۲۲۳	انجیل - (یونانی) بشارت یا جدید تعلیم	۳۱۵، ۲۵۴، ۲۴۹، ۲۴۴، ۲۰۸، ۱۲۰، ۱۱۵	نور الثقلین
۱۸۳	اتفاق - خرچ کرنا	۳۷۰، ۳۶۰، ۳۵۶، ۳۵۲، ۳۴۱	
۲۲۶	اوتن مادہ اکن - معنی الطینان خاطر	۳۹۰، ۳۱۹، ۲۵۷، ۱۹۶	نیج البسلامہ
	اوقیہ - جمع ادائی - رطل کا بار ہواں حصہ جرمات	۱۲۱، ۴۰	وسائل ج ۸
۳۷۸	اشغال کے برابر ہوتا ہے	۲۲۰، ۱۹	وسائل ج ۱۲
۲۹۴	اولیاء - دل کی جمع معنی حامی مددگار		
	ایلا - ترک تعلق کی قسم کھانا، زمانہ جاہلیت کی ایک		
۸۹	رم بدائی مابین زوجہ و شوہر		
۸۹	ایمان - یمن کی جمع معنی قسم		
	ب ۱		
۱۳۳	بیروز - ظہور	۴۹، ۴۶	اشم - عشاء
۱۳۹	بسطۃ - وسعت	۱۸۳	ارذن - ہار یک دانوں کا ایک فلد
	بشرہم - بشارت و خوشخبری - یہاں بطور طنز	۲۲۶	اضرا - روکنا، محدود کرنا، سزا دینا
۲۸۱	خبر مذاب	۲۹۲	اضر - تاکید حمد و بیان
۵۹	بنیا - علم و ستم	۳۰۶	اصطط - مادہ - صفو - خالص چیز مراد چن لینا
	بلی - ہاں، منفی سوال کے جواب میں بلی کہتے ہیں	۱۹۲	اعصار - آگ سے بھرا ہوا عمود بخولا
۲۸۰	(دیکھیے نعم)		افراغ - کسی سیال مادے کو اس طرح انڈینا کہ برتن
	بلوغ اجل - صلت کا انجام کو پہنچنا - حوریت کی	۱۳۳	خالی ہو جانے
۱۱۳، ۱۰۷	عدت کا آخری دن		اکتساب - ایسے اعمال جو انسانی فطرت کے
	فت ۱	۲۲۱	خلافت ہوں
۲۵۵، ۲۵۴	تاویل - پٹانا	۱۹۸	الیاب - لب کی جمع معنی منہ و غرہ
۲۹۸	تجدد و وجدان - پالینا	۱۰۹	اُم - ماں، ہر شے کی جڑ
۱۹۸	تذکر - یاد آوری	۹۹	امسک - روکے رکھنا
۱۰۸	تزکیہ - تہ پانا - بڑھنا	۲۹۸	امد - محدود زمانہ، اکثر اوقات انتہائے زمانہ کا
			مفہوم دیتا ہے

لغات قرآن

۱. ابکار - دن کی ابتدائی گھڑیاں - طلوع فجر سے زوال

نیم کا وقت

اشم - عشاء

ارذن - ہار یک دانوں کا ایک فلد

اضرا - روکنا، محدود کرنا، سزا دینا

اضر - تاکید حمد و بیان

اصطط - مادہ - صفو - خالص چیز مراد چن لینا

اعصار - آگ سے بھرا ہوا عمود بخولا

افراغ - کسی سیال مادے کو اس طرح انڈینا کہ برتن

خالی ہو جانے

اکتساب - ایسے اعمال جو انسانی فطرت کے

خلافت ہوں

الیاب - لب کی جمع معنی منہ و غرہ

اُم - ماں، ہر شے کی جڑ

امسک - روکے رکھنا

امد - محدود زمانہ، اکثر اوقات انتہائے زمانہ کا

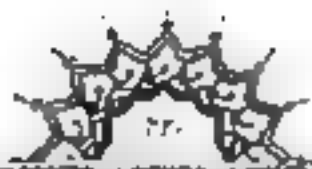
مفہوم دیتا ہے



۶۹	کرنے وال چیز	۹۹	تسریع - چھوڑ دینا
۱۸۵	خوف - ڈر جو آئندہ امور کے بارے میں ہوتا ہے	۲۲۲	توراة - (عبرانی) شریعت اور قانون
۲۶۸	خیل - ام جمع - گھوڑے - گھوڑ سوار	۲۸	تولی - مادہ ولایت سے - معنی حکومت
۲۶۸	خیل المومۃ - تربیت یافتہ	۲۲۲، ۳۲۱	توفی - مادہ ذی معنی سے لین
۵	-	۱۹۳	تیشمؤ - قصد کرنا
۲۶۱	داب - سیر و حرکت کو دائم قائم رکھنا	ج	-
۲۶۶	دین - جزا - پاداش - حکم کی اطاعت پیروی	جئود - بڑے بڑے پتھروں سے بھری ہوئی زمین -	
ذ	-	جند کی جمع	
ذوبۃ - مادہ ذرہ آفرینش اور خلق کرنا چھوٹی اولاد	۳۰۹	ح	-
ر	-	حبط - عمل کا بے اثر ہو جانا	
راسخون فی العلم - علم و دانش میں ثابت قدم	۲۵۴، ۲۵۵	حرث - بیج	
ربا - تدریجی نشوونما (میری الصدقات) تدریجی		حزن - رنج جو گزشتہ امور کے بارے میں ہوتا ہے	
رشد و نمو	۲۱۳، ۲۱۴	حسنہ - نیکی تمام مادی و معنوی نعمتیں	
ربانیین - ربانی کا حکم - وہ شخص جس کا رشتہ پروردگار		حصور - مادہ حصر سے - اپنے کو پابند کرنا - کنوارا	
سے محکم و مضبوط ہو	۳۸۶	حق - مطابقت ہم آہنگی	
ربو - سود	۲۱۳	حکمت - علم - حقائق - دانش وغیرہ	
رجال - راہل کی جمع معنی پا پیادہ	۱۲۰	حس - وہ افراد جو اپنے دین میں مستحکم ہوں - قریش کا	
رشد - راستہ پانا، واقعہ تک پہنچنا	۱۶۱	خود ساختہ فزیر خطاب	
رکبان - راکب کی جمع معنی سوار	۱۲۰	حمید - مادہ حمد سے - لائق حمد - حمد کرنے والا - ام	
ز	-	فاعل و اسم مفعول دونوں مراد ہیں	
زنانے محصنہ - شادی شدہ افراد کا زنا	۲۸۳	حنیف - مادہ حنٹ سے کسی طرف مائل ہونا - مراد	
زینت - زینت دیا گیا	۵۶	دین حق کی طرف مائل ہونا	
س	-	حواری - مادہ حور سے معنی دھونا - سفید کرنا مراد	
سحر - رات کا آخری حصہ - پوشیدہ اور پنا	۲۶۲	پاک دل لوگ	
سجور - بادو - سائر	۲۶۲	خ	-
سعیاء - تیزی سے چلنا	۱۴۸	خبط - چلتے وقت لڑکھڑانا	
سیلم - سلام صلح و آشتی	۵۲	خسر - معنی ڈھکنا چھپانا - اصطلاح شریعت میں مست	



۲۲۹	سمیع - سنا سمجھنا تصدیق کرنا	غغ :-	۱۳۱	غغی - انحراف حقیقت واقعہ سے دوری
۲۰۷	سیما - علامت و نشانی	فت :-	۱۳۱	فتنہ - فساد، شرک، گناہ، آزمائش و امتحان
۱۵۵	ش -	فصل -	۲۹۹	فصل - منبہ ہونا - فاصلہ ہونا
۲۹۹	شفاعت - قوی کا ضیعت کی مدد کرنا	فٹنہ -	۱۳۲	فٹنہ - مادہ فی گرودہ بازگشت
۱۵۵	شہوات - شهوت کی جمع معنی شدید لگاؤ	ق :-	۱۳۱	قروہ - مادہ قروہ ہجاری کی عادت مراد پاک بکون
۱۵۵	ص :-	قسط -	۳۶۳	قسط - عالم ہستی میں عدالت کا قیام
۱۷۷	صرہن - مادہ صرہن معنی ٹکڑے کرنا	قصص -	۳۵۷	قصص - مادہ قصہ معنی جہتجو کرنا
۱۸۹	صفوان - صفوان کی جمع معنی صاف شفاف پتھر	قناطیر -	۱۳۱	قناطیر - قنطار کی جمع حکم چیز - زیادہ مال - قنطرہ - پل
۲۰۹	صفہ - وسیع برآمدہ	کو کہتے ہیں	۲۹۷	قنت - خدا کے سامنے خضوع - اطاعت و بندگی
۱۷۳	ط :-	میں دوام و استمرار	۲۷۷	قنت - خدا کے سامنے خضوع - اطاعت و بندگی
۲۹۹	طاغوت - مادہ طغیان معنی تجاوز کرنا	قنوت -	۲۷۷	قنوت - پیروی خضوع و خضوع (دیکھیے نادر احکام)
۱۷۳	طوعاً - اقتیاری حالت میں تسلیم خم ہونا	قیوم -	۱۳۰	قیوم - مادہ قیام صیفہ مبالغہ - تخلیق و نگہ داری کے
۱۷۳	طیب - مادی و معنوی پاکیزگی	لیے قیام	۱۵۳	ک :-
۱۷۳	ظ :-	کری -	۱۵۸	کری - مادہ کرکس اصل - اساس - بنیاد
۵۳	ظلی - ظلت کی جمع ہر سایہ لگن شے	کروہا -	۲۹۹	کروہا - بحالہ مجبوری تسلیم کرنا
۵۳	ظلی من انعام - نہزا - سایہ لگن بادل	کسب -	۲۵	کسب - جمالی کاموں کے علاوہ روحانی و قلبی
۱۷۳	ع :-	کسب و اکتساب -	۲۳۱	کسب و اکتساب - بحسب جمل نیک - اکتساب - جمل بد
۱۷۳	حرفات - ماہ عرفت میں نے پہچان لیا - مکہ کا ایک مقام عبادت	کفالت -	۳۱۳	کفالت - کسی چیز کو دوسری میں ختم کرنا - ذمہ داری قبول کرنا
۲۱	عروش - عرش کی جمع معنی چست	کلمہ -	۲۲۷	کلمہ - مخلوق مراد حضرت عیسیٰ
۱۷۱	عزیز - مشکل چیز - ایسی زمین جسے عبود کرنا مشکل ہو	کیمول -	۲۲۸	کیمول - مادہ کمل (بڑھاپا نہیں) ادھیڑ عمر
۲۲۵	عشقی - ابتدا، زوال سے غروب زوال تک کا وقت	ل :-	۳۷۹، ۳۷۵	ل :- لا قومو - اطمینان نہ کرو
۳۲۱	عفو - بخشش، عنایت - حد وسط کسی چیز کے اثر کو مٹا کر			
۲۲۳، ۱۷۳، ۷۳	کرنادہ چیز جو سال کے مصارف سے بچ جانے			
۲۲۷	علم حصولی - اپنی ذات کے علاوہ دیگر اشیاء کا علم			
۲۲۷	علم حضوری - اپنی ذات کا علم			
۳۱۸	عیسیٰ - زندہ رہنا - ایک نبی کا نام			



۳۰۰	لعن - دھتکار - پھتکار	۳۰۰	مہد - نوزائیدہ بچہ کے لیے تیار کی ہوئی آرام دہ
۳۰۱	مباہلہ - مادہ بھل رہا کرنا - دیگر	۳۲۸	شے مثلاً جھولا
۳۰۲	مستاع - لطف اندوز کرنے والی شے	۳۲۹	میشاق - مادہ وثوق تاکیدی علم و پیمان
۳۰۳	محتاجہ - بحث عقیدے کا دفاع	۳۳۰	فیصر - مادہ یسر سہل و آسان مراد نچو
۳۰۴	مخرباب - مادہ حرب، جنگ - امام کے کھڑے ہونے کی جگہ	۳۳۱	ن -
۳۰۵	محذور - مادہ تحریر سے یا معنی آزاد کرنا	۳۳۲	نعم - مثبت سوال کے جواب میں - ہاں - کہن
۳۰۶	محکم - متشابہ آیات کے معنی	۳۳۳	(دیکھیے ن)
۳۰۷	مرتد - اسلام سے پھرنا	۳۳۴	نکاح - ازدواج - جنسی ملاپ
۳۰۸	مرتد فطری - مسلمان ماں باپ سے مسلمان پیدا ہو	۳۳۵	نفسزہا - مادہ نشوز ارتفاع
۳۰۹	میر کافر ہو جائے	۳۳۶	و -
۳۱۰	مرتد ملی - کافراں باپ سے کافر پیدا ہو - پھر مسلمان	۳۳۷	والدہ - ماں
۳۱۱	ہو جائے پھر کافر ہو جائے	۳۳۸	وجہ - چہرہ، ذات، مراد ذات خدا
۳۱۲	منس - چھوٹا، مراد مباشرت کرنا	۳۳۹	وسع - قدرت، طاقت
۳۱۳	منقومہ - ممتاز (دیکھیے قبل المسومہ)	۳۴۰	وقود - ایندھن
۳۱۴	مشرکین - بت پرست	۳۴۱	ولی - سرپرست
۳۱۵	مشرع الحرام - شرعاً حرام، شعور، شعائر حج کا مرکز کعبہ کے	۳۴۲	ک -
۳۱۶	قریب ایک مقام	۳۴۳	ہدایت شرعی - رہنمائی بذریعہ تعلیم و تربیت و قانون
۳۱۷	معروف - پسندیدہ	۳۴۴	ادراغ اولاد - حکومت کے ذریعہ
۳۱۸	منقرہ - پردہ پوشی حاجت مندوں سے مخدود درگزر	۳۴۵	ہدایت تکوینی - طبی نشو و نما
۳۱۹	مقتر - تنگ دست - قتر کا مادہ بخل میں بھی استعمال ہوتا ہے	۳۴۶	ہمزو - تسخیر کرنا
۳۲۰	مکر - چارہ جوئی تدبیر	۳۴۷	ی -
۳۲۱	ملاہ - زیادہ جمعیت، اشراف ملت	۳۴۸	یبتغ - مادہ ابتغاء کوشش و جستجو
۳۲۲	موتو - شکست کھانا	۳۴۹	یتسنہ - ایک سال
۳۲۳	موسع - توڑ	۳۵۰	یتوفون - مرنے کے قریب ہونا
		۳۵۱	یحییٰ - زندہ رہتا ہے مادہ حی
		۳۵۲	ملون - مادہ لیں پیچ و خم کھانا
		۳۵۳	یؤدہ - مادہ اوو بردوزن قول معنی سنگینی



متفرق موضوعات

اسلام

- حق کے سامنے تسلیم خم کرنا ہی رواج دین ہے ۲۷۹
- ہم اللہ پر اور جو کچھ ابراہیم واسخیل واسحق و یعقوب و اسباط موسیٰ و عیسیٰ پر نازل ہوا۔ ایمان لاتے ۲۹۰
- اسلام تمام موجودات عالم کا دین ہے ۲۹۷، ۲۹۸
- گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں ۳۹۰
- اقتصادیات
- حج کے دوران اقتصادی کارکردگی ۳۹
- اللہ بندوں سے قرض لیتا ہے اور اس طرح خرچ کی گئی رقم کو کئی گنا بڑھا دیتا ہے ۱۲۹
- انفاق فی سبیل اللہ، اسلام کا اقتصادی نظام اکمل باطل ۱۹۰ تا ۱۸۱
- آپس میں ایک دوسرے کے مال پر ناجائز قبضہ نہ کرو ۱۹
- اولوا الالباب
- اللہ جسے چاہتا ہے علم و دانش عطا کرتا ہے ۱۹۸، ۱۹۷
- انفاق فی سبیل اللہ
- فائدہ بخش مادی و معنوی سرمایہ مال، باپ، قریبیوں اور ۹۲
- تیموں مسکینوں پر خرچ کریں
- خدا بندوں سے قرض لیتا ہے، جو اس نے دیا ہے اس میں سے خرچ کرو ۱۲۹
- اسے ایمان والو! جو رزق ہم نے دیا ہے، اس میں سے خرچ کرو ۱۳۹
- انفاق کی مثال بیچ ہے ۱۸۱
- انفاق طبقاتی تفاوت کا ایک حل ہے ۱۸۲، ۱۸۱

انفاق کے لیے قرآنی تشبیہ

- ۱۸۳
- ۱۸۵، ۱۸۳
- محبت مندوں سے اپنی گفتگو اس بخشش سے بہتر ہے ۱۸۹، ۱۸۵
- نہی کے ساتھ ہو ۱۸۸، ۱۸۷
- راہ خدا میں خرچ کرنے کے اسباب و نتائج ۱۹۱
- احسان نہ جتاؤ۔ ایک اور مثال
- محنت سے کمائے ہوئے پاکیزہ اموال راہ خدا میں خرچ کرو ۱۹۳ تا ۱۹۲
- انفاق کی رکاوٹوں اور شیطانی افکار سے مقابلہ ۱۹۶، ۱۹۵
- جو خرچ کرتے اور تذکر کرتے ہو خدا اُسے جانتا ہے ۱۹۸
- خرچ پیچھے کرنا چاہیے ۲۰۰ تا ۱۹۹
- غیر مسلموں پر خرچ کرنے میں بھی حرج نہیں ۲۰۶ تا ۲۰۱
- انفاق اور ہدایت ۲۰۳، ۲۰۲
- انفاق کرنے والوں پر اس کے اثرات ۲۰۳
- انفاق کا بہترین موقع ۲۰۷
- ہر صورت میں خرچ کرنا ۲۰۸
- ایمان
- جنگل میں کامیابی و کامرانی کا اصل سرمایہ ایمان ۲۴۵
- بت پرستی
- بت پرستی کی مختصر تاریخ ۱۹۹، ۱۹۸
- بشر پرستی
- بشر پرستی منوع ہے ۲۹۰، ۲۸۹
- بیع و شری
- کچھ لوگ اپنی جانیں خدا کی خوشنودی کے بدلے بیچ دیتے ہیں۔ اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے ۲۹۴ تا ۵۱
- تاہوت کے
- تاہوت کے معنی اور مکمل تعارف ۱۳۹



۸۵، ۸۴	عورت نوح بشر کی حفاظت کا ذریعہ	۱۴۰	زشتوں نے تابوت کو اٹھا رکھا ہوگا
	دین اور محبت		تجارتی دستاویزات
۳۰۵	دین محبت کے علاوہ کچھ نہیں	۲۲۱	جب ایک دوسرے سے لین دین کرو تو لکھ لیا کرو
	راسخون فی العلم		کاتب کو چاہیے کہ دستاویزات لکھتے وقت حق کو
۲۵۴ تا ۲۵۵	راسخون فی العلم کون ہیں	۲۲۲	پیش نظر رکھے
	راہ حق میں مزاحم تعصبات		دستاویزات پر دو گواہ بھی بنانا چاہئیں، اگر دو مرد نہ ہوں
	نوائیدہ پیغمبر کے سامنے پیشتر کی امت آسانی سے	۲۲۳	تو ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی
۲۹۳	سر تسلیم خم نہیں ہوتی	۲۲۵	کاتب نہ ہو تو کچھ دہن رکھ لو
	رشوت		تقیہ
۲۰، ۱۹	رشوت خوری - ایک مصیبت	۲۹۵	تقیہ - ایک حفاظتی ڈھال
۲۱	آنحضرت کا ایک حاکم پر غضبناک ہونا	۲۹۹	تقیہ - مقابلے کی دوسری صورت
	رشد		تنازعہ بقا
۱۶۱	رشد کی تعریف	۱۴۲	تنازعہ بقا کا مفروضہ
	سحر		توبہ
۲۶۲	سحر اور سحر کے معنی اور فرق	۲۰۰	یہ امر تہ کی توبہ قبول ہو جاتی ہے
	سماجیات	۲۰۲	یہ فائدہ توبہ
۳۲	خرچ کرنا معاشرے کو ہلاکت سے بچاتا ہے		چاند کا گھٹنا بڑھنا
۳۹	دوران حج اقتصادی کارکردگی کا سماجی مفاد	۲۳، ۲۲	ایک فطری تقویم، ایک فطری پیمانہ
۴۲	حج منظر مسادات ہے		حواریوں
۵۹	دین معاشرتی برائیوں کا قاطع ہے	۳۳۴	حواری کون تھے
۱۰۲	علاق - ایک معاشرتی نقصان	۳۳۸	حواری قرآن اور انجیل کی نظر میں
	سود		حیض
۲۰۹	اللہ نے سود کو حرام اور بیع کو حلال کیا	۸۰	نقصان وہ اور ناپاک حالت
۲۱۲ تا ۲۱۰	سود خوری قرآن کی نظر میں	۸۲، ۸۱	ماہواری میں جنسی ملاپ کے نقصان
۲۱۳	سود خوردوں کی منطوق		عورتوں سے ماہواری کے دوران میل جول میں کوئی
	بوجہ شخص بار بار تاکید کے باوجود سود سے دست کش نہ ہو	۸۳	مضانہ نہیں
۲۱۴	وہ خدا کے عذاب شدید کا منتظر ہے	۸۴	پاک ہونے پر جنسی ملاپ کی اجازت



عالمی صلح و آشتی

عالمی امن صرف ایمان کے سائے میں ممکن ہے ۵۲، ۵۳

عورت اور اسلام

عورت اور اُس کے حقوق کی تاریخ ۹۵، ۹۶

عورت کی زندگی میں نیا مرحلہ ۹۶، ۹۵

مساوات زن و مرد کے مفہوم میں اشتباہ نہ ہو ۹۸، ۹۷

ایک اور زنجیر ٹوٹ گئی ۱۰۰

فرشتے

جبرائیل و میکائیل ۴۹

قرعہ اندازی

حضرت مریم کی کفالت کے لیے قرعہ ڈالا گیا ۲۲۳

اختلاف دور کرنے کا آخری طریقہ قرعہ اندازی ۲۲۵

قناطیر

قناطیر - حکم چیز، زیادہ مال، مضبوطی کے پیش نظر ہل ۲۶۷

فکر و نظر کے اعتبار سے ہا ہوش افراد ۲۶۷

کتابت و گواہی

کاتب حق کو پیش نظر رکھے (دیکھیے تجارتی دستاویزات) ۲۲۲

قابل اعتماد گواہ دو مرد یا ایک مرد و دو عورتیں ۲۲۳

(دیکھیے تجارتی دستاویزات) ۲۲۳

سفر میں لکھنے والا نہ ہو تو کوئی چیسز رہن رکھ لو ۲۲۵

(دیکھیے تجارتی دستاویزات) ۲۲۵

کفارہ

کافروں سے کفارہ میں زمین بھر سونا بھی قبول نہ ہوگا ۴۰۳

فضول کفارہ ۴۰۴

متاع حیات

دنیا کی متاع حیات سے کیا مراد ہے ۲۶۸

* * *

اللہ سود کو نابود کرتا ہے۔ صدقات کو رشد و نمودیتا ہے ۲۱۳

خدا سے ڈرو۔ سود چھوڑ دو ورنہ خدا و رسول سے جنگ ۲۱۶

کو تیار ہو جاؤ۔ قروض کو ادائیگی کے لیے ملت دو ۲۱۸

اللہ سے ڈرو۔ جبکہ پلٹ کر اس کی طرف جاؤ گے ۲۱۸

سود غوری کے نقصانات ۲۱۹

شراب اور حوا ۲۱۹

ان کے مادی فائدے سے ان کا گناہ بہت زیادہ ہے ۶۸

اٹم کیا ہے ۶۹

انکھل والے مشروبات اور شراب کے اثرات ۷۹ تا ۷۸

تھار بازی کے بُرے اثرات ۷۸ تا ۷۷

عفو سے یہاں کیا مراد ۷۹ تا ۷۸

شبہ اکل و ماکول ۷۸

شبہ اکل و ماکول کی بحث ۱۷۸

طبقاتی تفاوت ۱۷۸

قبل بعثت رسول قریش کا بطور فخر اپنے کو محسوس کتنا ۲۲

عرفات میں نہ ٹھہرنا ۲۲

دو گروہ - ایک صرف دنیا کی نعمات چاہنے والے - ۲۲

دوسرا دنیا و آخرت دونوں کا طلبگار ۲۲

ابتدا میں لوگوں کا ایک ہی گروہ تھا۔ بعد میں طبقات ۵۷

پیدا ہوئے پھر اختلافات وجود میں آئے ۵۷

طبقاتی تفاوت کی بنیاد - یعنی - علم و ستم اور ۵۷

ہمت و حمی ۵۷

بنی اسرائیل کا طاقت کی بادشاہی پر اپنی دولت مندی ۱۳۵، ۱۳۳

اور حسب و نسب پر اعتراض ۱۳۵، ۱۳۳

انفاق طبقاتی تفاوت کا ایک حل ۱۸۱

سود غوری طبقاتی کشمکش کا ایک ذریعہ ہے ۲۱۳

* * *



۵۳ سائے میں نہیں آئیں گے۔ یہ امر محال ہے
۵۶ دنیاوی زندگی کو کافروں کے لیے مزین کیا گیا ہے
۲۰۳ تا ۲۰۲ ہدایت کی اقسام
یتامی
۷۷، ۷۶ یتیموں کی اصلاح کرنا یہ ہے

مقامات

ایک برباد بستی
ایک بستی جس کی دیواریں چھتوں پر ڈھے گئی تھیں۔
۱۷۰ جناب نذیر کا واقعہ
جرم عقبہ
۳۵ مقام منی کے قریب شیطان پر کنکریاں مارنے کی جگہ
شام
جناب ابراہیم کا پرندوں کو ذبح کرنا پھر زندہ ہو کر پرندوں
کی داپسی شام میں ہوئی
۱۷۸، ۱۷۷ عرفات
عرفات کو عرفات کیوں کہتے ہیں
۴۱، ۳۵ غار ثور
۳۹ شب ہجرت رسول کی پناہ گاہ
مشعر الحرام
منکب سے ڈھانی منہ رخ دور شب و ہم ذی الحجہ مقام
کرنے کی جگہ
۴۲، ۳۵ منی
۳۵ دوران حج مقام قربانی
میںقات
معین نقاط جنہیں میںقامات کہتے ہیں احرام باندھنے
کے مقامات
۳۵

یہ مذاہب اختلافات کا سبب ہیں
۱۳۸ مذہب چہری نہیں ہو سکتا
۱۷۳ مذہبی اختلافات کا سرچشمہ جہالت و نادانی نہیں سرکشی
ظلم ذاتی مفادات
۲۷۸، ۲۷۷ مسلمانوں کا کافروں پر غلبہ
اللہ نے مسلمانوں کو کفار کی نظر میں زیادہ اور کافروں کو
مسلمانوں کی نظر میں کم کر کے دکھایا (دیکھیے جہاد)
۲۷۵، ۲۷۴ مسئلہ قومیت
عربوں کا بے جا فخر
۴۳ ایمان، زبان نسل اور جغرافیائی حدود کا قاطع
۵۲ مشرکین
مشرکین کون ہیں
۷۹ مومنین
سخت حوادثِ خدائی سنت ہیں
۶۰ مومنین خدا اس کے فرشتوں، کتابوں اور رسولوں پر
ایمان رکھتے ہیں
۲۲۹، ۲۲۸ اسے رب ہم پر گزشتہ لوگوں جیسا بوجہ نہ ڈال، ہمیں
بخش دے تو ہمارا سوا ہے
۲۳۱، ۲۳۰ موت
وہاں اور موت کے خوف سے بھاگ کھڑے ہونے لگے
۱۲۶، ۱۲۵ اسی مرض میں گرفتار ہو کر مر گئے
۱۲۷ ایک درس عبرت، تاریخ یا تمثیل
نور و ظلمت
نور و ظلمت کی تشبیہ
۱۶۵ ہدایت
کافروں کی ہدایت کے لیے خدا اور فرشتے بادل کے

ایک خاص سورتہ الفبا کے تمام حرفوں

۱) الف	۲) ب	۳) ج	۴) د	۵) ح	۶) ط	۷) ظ	۸) ث	۹) ذ	۱۰) ر	۱۱) ز	۱۲) س	۱۳) ش	۱۴) ص	۱۵) ض	۱۶) ظ	۱۷) ع	۱۸) گ	۱۹) ف	۲۰) ق	۲۱) ک	۲۲) خ	۲۳) گ	۲۴) ل	۲۵) م	۲۶) ن	۲۷) ی	۲۸) ا	۲۹) ب	۳۰) ج	۳۱) د	۳۲) ح	۳۳) ط	۳۴) ظ	۳۵) ث	۳۶) ذ	۳۷) ر	۳۸) ز	۳۹) س	۴۰) ش	۴۱) ص	۴۲) ض	۴۳) ظ	۴۴) ع	۴۵) گ	۴۶) ف	۴۷) ق	۴۸) ک	۴۹) خ	۵۰) گ	۵۱) ل	۵۲) م	۵۳) ن	۵۴) ی	۵۵) ا	۵۶) ب	۵۷) ج	۵۸) د	۵۹) ح	۶۰) ط	۶۱) ظ	۶۲) ث	۶۳) ذ	۶۴) ر	۶۵) ز	۶۶) س	۶۷) ش	۶۸) ص	۶۹) ض	۷۰) ظ	۷۱) ع	۷۲) گ	۷۳) ف	۷۴) ق	۷۵) ک	۷۶) خ	۷۷) گ	۷۸) ل	۷۹) م	۸۰) ن	۸۱) ی	۸۲) ا	۸۳) ب	۸۴) ج	۸۵) د	۸۶) ح	۸۷) ط	۸۸) ظ	۸۹) ث	۹۰) ذ	۹۱) ر	۹۲) ز	۹۳) س	۹۴) ش	۹۵) ص	۹۶) ض	۹۷) ظ	۹۸) ع	۹۹) گ	۱۰۰) ف	۱۰۱) ق	۱۰۲) ک	۱۰۳) خ	۱۰۴) گ	۱۰۵) ل	۱۰۶) م	۱۰۷) ن	۱۰۸) ی	۱۰۹) ا	۱۱۰) ب	۱۱۱) ج	۱۱۲) د	۱۱۳) ح	۱۱۴) ط	۱۱۵) ظ	۱۱۶) ث	۱۱۷) ذ	۱۱۸) ر	۱۱۹) ز	۱۲۰) س	۱۲۱) ش	۱۲۲) ص	۱۲۳) ض	۱۲۴) ظ	۱۲۵) ع	۱۲۶) گ	۱۲۷) ف	۱۲۸) ق	۱۲۹) ک	۱۳۰) خ	۱۳۱) گ	۱۳۲) ل	۱۳۳) م	۱۳۴) ن	۱۳۵) ی	۱۳۶) ا	۱۳۷) ب	۱۳۸) ج	۱۳۹) د	۱۴۰) ح	۱۴۱) ط	۱۴۲) ظ	۱۴۳) ث	۱۴۴) ذ	۱۴۵) ر	۱۴۶) ز	۱۴۷) س	۱۴۸) ش	۱۴۹) ص	۱۵۰) ض	۱۵۱) ظ	۱۵۲) ع	۱۵۳) گ	۱۵۴) ف	۱۵۵) ق	۱۵۶) ک	۱۵۷) خ	۱۵۸) گ	۱۵۹) ل	۱۶۰) م	۱۶۱) ن	۱۶۲) ی	۱۶۳) ا	۱۶۴) ب	۱۶۵) ج	۱۶۶) د	۱۶۷) ح	۱۶۸) ط	۱۶۹) ظ	۱۷۰) ث	۱۷۱) ذ	۱۷۲) ر	۱۷۳) ز	۱۷۴) س	۱۷۵) ش	۱۷۶) ص	۱۷۷) ض	۱۷۸) ظ	۱۷۹) ع	۱۸۰) گ	۱۸۱) ف	۱۸۲) ق	۱۸۳) ک	۱۸۴) خ	۱۸۵) گ	۱۸۶) ل	۱۸۷) م	۱۸۸) ن	۱۸۹) ی	۱۹۰) ا	۱۹۱) ب	۱۹۲) ج	۱۹۳) د	۱۹۴) ح	۱۹۵) ط	۱۹۶) ظ	۱۹۷) ث	۱۹۸) ذ	۱۹۹) ر	۲۰۰) ز	۲۰۱) س	۲۰۲) ش	۲۰۳) ص	۲۰۴) ض	۲۰۵) ظ	۲۰۶) ع	۲۰۷) گ	۲۰۸) ف	۲۰۹) ق	۲۱۰) ک	۲۱۱) خ	۲۱۲) گ	۲۱۳) ل	۲۱۴) م	۲۱۵) ن	۲۱۶) ی	۲۱۷) ا	۲۱۸) ب	۲۱۹) ج	۲۲۰) د	۲۲۱) ح	۲۲۲) ط	۲۲۳) ظ	۲۲۴) ث	۲۲۵) ذ	۲۲۶) ر	۲۲۷) ز	۲۲۸) س	۲۲۹) ش	۲۳۰) ص	۲۳۱) ض	۲۳۲) ظ	۲۳۳) ع	۲۳۴) گ	۲۳۵) ف	۲۳۶) ق	۲۳۷) ک	۲۳۸) خ	۲۳۹) گ	۲۴۰) ل	۲۴۱) م	۲۴۲) ن	۲۴۳) ی	۲۴۴) ا	۲۴۵) ب	۲۴۶) ج	۲۴۷) د	۲۴۸) ح	۲۴۹) ط	۲۵۰) ظ	۲۵۱) ث	۲۵۲) ذ	۲۵۳) ر	۲۵۴) ز	۲۵۵) س	۲۵۶) ش	۲۵۷) ص	۲۵۸) ض	۲۵۹) ظ	۲۶۰) ع	۲۶۱) گ	۲۶۲) ف	۲۶۳) ق	۲۶۴) ک	۲۶۵) خ	۲۶۶) گ	۲۶۷) ل	۲۶۸) م	۲۶۹) ن	۲۷۰) ی	۲۷۱) ا	۲۷۲) ب	۲۷۳) ج	۲۷۴) د	۲۷۵) ح	۲۷۶) ط	۲۷۷) ظ	۲۷۸) ث	۲۷۹) ذ	۲۸۰) ر	۲۸۱) ز	۲۸۲) س	۲۸۳) ش	۲۸۴) ص	۲۸۵) ض	۲۸۶) ظ	۲۸۷) ع	۲۸۸) گ	۲۸۹) ف	۲۹۰) ق	۲۹۱) ک	۲۹۲) خ	۲۹۳) گ	۲۹۴) ل	۲۹۵) م	۲۹۶) ن	۲۹۷) ی	۲۹۸) ا	۲۹۹) ب	۳۰۰) ج	۳۰۱) د	۳۰۲) ح	۳۰۳) ط	۳۰۴) ظ	۳۰۵) ث	۳۰۶) ذ	۳۰۷) ر	۳۰۸) ز	۳۰۹) س	۳۱۰) ش	۳۱۱) ص	۳۱۲) ض	۳۱۳) ظ	۳۱۴) ع	۳۱۵) گ	۳۱۶) ف	۳۱۷) ق	۳۱۸) ک	۳۱۹) خ	۳۲۰) گ	۳۲۱) ل	۳۲۲) م	۳۲۳) ن	۳۲۴) ی	۳۲۵) ا	۳۲۶) ب	۳۲۷) ج	۳۲۸) د	۳۲۹) ح	۳۳۰) ط	۳۳۱) ظ	۳۳۲) ث	۳۳۳) ذ	۳۳۴) ر	۳۳۵) ز	۳۳۶) س	۳۳۷) ش	۳۳۸) ص	۳۳۹) ض	۳۴۰) ظ	۳۴۱) ع	۳۴۲) گ	۳۴۳) ف	۳۴۴) ق	۳۴۵) ک	۳۴۶) خ	۳۴۷) گ	۳۴۸) ل	۳۴۹) م	۳۵۰) ن	۳۵۱) ی	۳۵۲) ا	۳۵۳) ب	۳۵۴) ج	۳۵۵) د	۳۵۶) ح	۳۵۷) ط	۳۵۸) ظ	۳۵۹) ث	۳۶۰) ذ	۳۶۱) ر	۳۶۲) ز	۳۶۳) س	۳۶۴) ش	۳۶۵) ص	۳۶۶) ض	۳۶۷) ظ	۳۶۸) ع	۳۶۹) گ	۳۷۰) ف	۳۷۱) ق	۳۷۲) ک	۳۷۳) خ	۳۷۴) گ	۳۷۵) ل	۳۷۶) م	۳۷۷) ن	۳۷۸) ی	۳۷۹) ا	۳۸۰) ب	۳۸۱) ج	۳۸۲) د	۳۸۳) ح	۳۸۴) ط	۳۸۵) ظ	۳۸۶) ث	۳۸۷) ذ	۳۸۸) ر	۳۸۹) ز	۳۹۰) س	۳۹۱) ش	۳۹۲) ص	۳۹۳) ض	۳۹۴) ظ	۳۹۵) ع	۳۹۶) گ	۳۹۷) ف	۳۹۸) ق	۳۹۹) ک	۴۰۰) خ	۴۰۱) گ	۴۰۲) ل	۴۰۳) م	۴۰۴) ن	۴۰۵) ی	۴۰۶) ا	۴۰۷) ب	۴۰۸) ج	۴۰۹) د	۴۱۰) ح	۴۱۱) ط	۴۱۲) ظ	۴۱۳) ث	۴۱۴) ذ	۴۱۵) ر	۴۱۶) ز	۴۱۷) س	۴۱۸) ش	۴۱۹) ص	۴۲۰) ض	۴۲۱) ظ	۴۲۲) ع	۴۲۳) گ	۴۲۴) ف	۴۲۵) ق	۴۲۶) ک	۴۲۷) خ	۴۲۸) گ	۴۲۹) ل	۴۳۰) م	۴۳۱) ن	۴۳۲) ی	۴۳۳) ا	۴۳۴) ب	۴۳۵) ج	۴۳۶) د	۴۳۷) ح	۴۳۸) ط	۴۳۹) ظ	۴۴۰) ث	۴۴۱) ذ	۴۴۲) ر	۴۴۳) ز	۴۴۴) س	۴۴۵) ش	۴۴۶) ص	۴۴۷) ض	۴۴۸) ظ	۴۴۹) ع	۴۵۰) گ	۴۵۱) ف	۴۵۲) ق	۴۵۳) ک	۴۵۴) خ	۴۵۵) گ	۴۵۶) ل	۴۵۷) م	۴۵۸) ن	۴۵۹) ی	۴۶۰) ا	۴۶۱) ب	۴۶۲) ج	۴۶۳) د	۴۶۴) ح	۴۶۵) ط	۴۶۶) ظ	۴۶۷) ث	۴۶۸) ذ	۴۶۹) ر	۴۷۰) ز	۴۷۱) س	۴۷۲) ش	۴۷۳) ص	۴۷۴) ض	۴۷۵) ظ	۴۷۶) ع	۴۷۷) گ	۴۷۸) ف	۴۷۹) ق	۴۸۰) ک	۴۸۱) خ	۴۸۲) گ	۴۸۳) ل	۴۸۴) م	۴۸۵) ن	۴۸۶) ی	۴۸۷) ا	۴۸۸) ب	۴۸۹) ج	۴۹۰) د	۴۹۱) ح	۴۹۲) ط	۴۹۳) ظ	۴۹۴) ث	۴۹۵) ذ	۴۹۶) ر	۴۹۷) ز	۴۹۸) س	۴۹۹) ش	۵۰۰) ص	۵۰۱) ض	۵۰۲) ظ	۵۰۳) ع	۵۰۴) گ	۵۰۵) ف	۵۰۶) ق	۵۰۷) ک	۵۰۸) خ	۵۰۹) گ	۵۱۰) ل	۵۱۱) م	۵۱۲) ن	۵۱۳) ی	۵۱۴) ا	۵۱۵) ب	۵۱۶) ج	۵۱۷) د	۵۱۸) ح	۵۱۹) ط	۵۲۰) ظ	۵۲۱) ث	۵۲۲) ذ	۵۲۳) ر	۵۲۴) ز	۵۲۵) س	۵۲۶) ش	۵۲۷) ص	۵۲۸) ض	۵۲۹) ظ	۵۳۰) ع	۵۳۱) گ	۵۳۲) ف	۵۳۳) ق	۵۳۴) ک	۵۳۵) خ	۵۳۶) گ	۵۳۷) ل	۵۳۸) م	۵۳۹) ن	۵۴۰) ی	۵۴۱) ا	۵۴۲) ب	۵۴۳) ج	۵۴۴) د	۵۴۵) ح	۵۴۶) ط	۵۴۷) ظ	۵۴۸) ث	۵۴۹) ذ	۵۵۰) ر	۵۵۱) ز	۵۵۲) س	۵۵۳) ش	۵۵۴) ص	۵۵۵) ض	۵۵۶) ظ	۵۵۷) ع	۵۵۸) گ	۵۵۹) ف	۵۶۰) ق	۵۶۱) ک	۵۶۲) خ	۵۶۳) گ	۵۶۴) ل	۵۶۵) م	۵۶۶) ن	۵۶۷) ی	۵۶۸) ا	۵۶۹) ب	۵۷۰) ج	۵۷۱) د	۵۷۲) ح	۵۷۳) ط	۵۷۴) ظ	۵۷۵) ث	۵۷۶) ذ	۵۷۷) ر	۵۷۸) ز	۵۷۹) س	۵۸۰) ش	۵۸۱) ص	۵۸۲) ض	۵۸۳) ظ	۵۸۴) ع	۵۸۵) گ	۵۸۶) ف	۵۸۷) ق	۵۸۸) ک	۵۸۹) خ	۵۹۰) گ	۵۹۱) ل	۵۹۲) م	۵۹۳) ن	۵۹۴) ی	۵۹۵) ا	۵۹۶) ب	۵۹۷) ج	۵۹۸) د	۵۹۹) ح	۶۰۰) ط	۶۰۱) ظ	۶۰۲) ث	۶۰۳) ذ	۶۰۴) ر	۶۰۵) ز	۶۰۶) س	۶۰۷) ش	۶۰۸) ص	۶۰۹) ض	۶۱۰) ظ	۶۱۱) ع	۶۱۲) گ	۶۱۳) ف	۶۱۴) ق	۶۱۵) ک	۶۱۶) خ	۶۱۷) گ	۶۱۸) ل	۶۱۹) م	۶۲۰) ن	۶۲۱) ی	۶۲۲) ا	۶۲۳) ب	۶۲۴) ج	۶۲۵) د	۶۲۶) ح	۶۲۷) ط	۶۲۸) ظ	۶۲۹) ث	۶۳۰) ذ	۶۳۱) ر	۶۳۲) ز	۶۳۳) س	۶۳۴) ش	۶۳۵) ص	۶۳۶) ض	۶۳۷) ظ	۶۳۸) ع	۶۳۹) گ	۶۴۰) ف	۶۴۱) ق	۶۴۲) ک	۶۴۳) خ	۶۴۴) گ	۶۴۵) ل	۶۴۶) م	۶۴۷) ن	۶۴۸) ی	۶۴۹) ا	۶۵۰) ب	۶۵۱) ج	۶۵۲) د	۶۵۳) ح	۶۵۴) ط	۶۵۵) ظ	۶۵۶) ث	۶۵۷) ذ	۶۵۸) ر	۶۵۹) ز	۶۶۰) س	۶۶۱) ش	۶۶۲) ص	۶۶۳) ض	۶۶۴) ظ	۶۶۵) ع	۶۶۶) گ	۶۶۷) ف	۶۶۸) ق	۶۶۹) ک	۶۷۰) خ	۶۷۱) گ	۶۷۲) ل	۶۷۳) م	۶۷۴) ن	۶۷۵) ی	۶۷۶) ا	۶۷۷) ب	۶۷۸) ج	۶۷۹) د	۶۸۰) ح	۶۸۱) ط	۶۸۲) ظ	۶۸۳) ث	۶۸۴) ذ	۶۸۵) ر	۶۸۶) ز	۶۸۷) س	۶۸۸) ش	۶۸۹) ص	۶۹۰) ض	۶۹۱) ظ	۶۹۲) ع	۶۹۳) گ	۶۹۴) ف	۶۹۵) ق	۶۹۶) ک	۶۹۷) خ	۶۹۸) گ	۶۹۹) ل	۷۰۰) م	۷۰۱) ن	۷۰۲) ی	۷۰۳) ا	۷۰۴) ب	۷۰۵) ج	۷۰۶) د	۷۰۷) ح	۷۰۸) ط	۷۰۹) ظ	۷۱۰) ث	۷۱۱) ذ	۷۱۲) ر	۷۱۳) ز	۷۱۴) س	۷۱۵) ش	۷۱۶) ص	۷۱۷) ض	۷۱۸) ظ	۷۱۹) ع	۷۲۰) گ	۷۲۱) ف	۷۲۲) ق	۷۲۳) ک	۷۲۴) خ	۷۲۵) گ	۷۲۶) ل	۷۲۷) م	۷۲۸) ن	۷۲۹) ی	۷۳۰) ا	۷۳۱) ب	۷۳۲) ج	۷۳۳) د	۷۳۴) ح	۷۳۵) ط	۷۳۶) ظ	۷۳۷) ث	۷۳۸) ذ	۷۳۹) ر	۷۴۰) ز	۷۴۱) س	۷۴۲) ش	۷۴۳) ص	۷۴۴) ض	۷۴۵) ظ	۷۴۶) ع	۷۴۷) گ	۷۴۸) ف	۷۴۹) ق	۷۵۰) ک	۷۵۱) خ	۷۵۲) گ	۷۵۳) ل	۷۵۴) م	۷۵۵) ن	۷۵۶) ی	۷۵۷) ا	۷۵۸) ب	۷۵۹) ج	۷۶۰) د	۷۶۱) ح	۷۶۲) ط	۷۶۳) ظ	۷۶۴) ث	۷۶۵) ذ	۷۶۶) ر	۷۶۷) ز	۷۶۸) س	۷۶۹) ش	۷۷۰) ص	۷۷۱) ض	۷۷۲) ظ	۷۷۳) ع	۷۷۴) گ	۷۷۵) ف	۷۷۶) ق	۷۷۷) ک	۷۷۸) خ	۷۷۹) گ	۷۸۰) ل	۷۸۱) م	۷۸۲) ن	۷۸۳) ی	۷۸۴) ا	۷۸۵) ب	۷۸۶) ج	۷۸۷) د	۷۸۸) ح	۷۸۹) ط	۷۹۰) ظ	۷۹۱) ث	۷۹۲) ذ	۷۹۳) ر	۷۹۴) ز	۷۹۵) س	۷۹۶) ش	۷۹۷) ص	۷۹۸) ض	۷۹۹) ظ	۸۰۰) ع	۸۰۱) گ	۸۰۲) ف	۸۰۳) ق	۸۰۴) ک	۸۰۵) خ	۸۰۶) گ	۸۰۷) ل	۸۰۸) م	۸۰۹) ن	۸۱۰) ی	۸۱۱) ا	۸۱۲) ب	۸۱۳) ج	۸۱۴) د	۸۱۵) ح	۸۱۶) ط	۸۱۷) ظ	۸۱۸) ث	۸۱۹) ذ	۸۲۰) ر	۸۲۱) ز	۸۲۲) س	۸۲۳) ش	۸۲۴) ص	۸۲۵) ض	۸۲۶) ظ	۸۲۷) ع	۸۲۸) گ	۸۲۹) ف	۸۳۰) ق	۸۳۱) ک	۸۳۲) خ	۸۳۳) گ	۸۳۴) ل	۸۳۵) م	۸۳۶) ن	۸۳۷) ی	۸۳۸) ا	۸۳۹) ب	۸۴۰) ج	۸۴۱) د	۸۴۲) ح	۸۴۳) ط	۸۴۴) ظ	۸۴۵) ث	۸۴۶) ذ	۸۴۷) ر	۸۴۸) ز	۸۴۹) س	۸۵۰) ش	۸۵۱) ص	۸۵۲) ض	۸۵۳) ظ	۸۵۴) ع	۸۵۵) گ	۸۵۶) ف	۸۵۷) ق	۸۵۸) ک	۸۵۹) خ	۸۶۰) گ	۸۶۱) ل	۸۶۲) م	۸۶۳) ن	۸۶۴) ی	۸۶۵) ا	۸۶۶) ب	۸۶۷) ج	۸۶۸) د	۸۶۹) ح	۸۷۰) ط	۸۷۱) ظ	۸۷۲) ث	۸۷۳) ذ	۸۷۴) ر	۸۷۵) ز	۸۷۶) س	۸۷۷) ش	۸۷۸) ص	۸۷۹) ض	۸۸۰) ظ	۸۸۱) ع	۸۸۲) گ	۸۸۳) ف	۸۸۴) ق	۸۸۵) ک	۸۸۶) خ	۸۸۷) گ	۸۸۸) ل	۸۸۹) م	۸۹۰) ن	۸۹۱) ی	۸۹۲) ا	۸۹۳) ب	۸۹۴) ج	۸۹۵) د	۸۹۶) ح	۸۹۷) ط	۸۹۸) ظ	۸۹۹) ث	۹۰۰) ذ	۹۰۱) ر	۹۰۲) ز	۹۰۳) س	۹۰۴) ش	۹۰۵) ص	۹۰۶) ض	۹۰۷) ظ	۹۰۸) ع	۹۰۹) گ	۹۱۰) ف	۹۱۱) ق	۹۱۲) ک	۹۱۳) خ	۹۱۴) گ	۹۱۵) ل	۹۱۶) م	۹۱۷) ن	۹۱۸) ی	۹۱۹) ا	۹۲۰) ب	۹۲۱) ج	۹۲۲) د	۹۲۳) ح	۹۲۴) ط	۹۲۵) ظ	۹۲۶) ث	۹۲۷) ذ	۹۲۸) ر	۹۲۹) ز	۹۳۰) س	۹۳۱) ش	۹۳۲) ص	۹۳۳) ض	۹۳۴) ظ	۹۳۵) ع	۹۳۶) گ	۹۳۷) ف	۹۳۸) ق	۹۳۹) ک	۹۴۰) خ	۹۴۱) گ	۹۴۲) ل	۹۴۳) م	۹۴۴) ن	۹۴۵) ی	۹۴۶) ا	۹۴۷) ب	۹۴۸) ج	۹۴۹) د	۹۵۰) ح	۹۵۱) ط	۹۵۲) ظ	۹۵۳) ث	۹۵۴) ذ	۹۵۵) ر	۹۵۶) ز	۹۵۷) س	۹۵۸) ش	۹۵۹) ص	۹۶۰) ض	۹۶۱) ظ	۹۶۲) ع	۹۶۳) گ</
--------	------	------	------	------	------	------	------	------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	-------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	--------	----------